تصانیف حضرت نیاز فتحپوری

نگارستان
حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ۔ نگارستان نے ملک میں جو درجہ قبولیت حاصل کیا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے قیمت علاوہ محصول ؎

گہوارۂ تمدن
مولانا نیاز کی وہ معرکۃ الآرا کتاب جس میں تاریخ اور اساطیر سے ثابت کیا گیا ہے کہ ارتقاء تمدن میں عورت نے کتنا زبردست حصہ لیا ہے اور دنیا نے تہذیب و شائستگی اسکی کس قدر ممنون ہے۔ اردو میں بالکل پہلی کتاب ہے قیمت علاوہ محصول ؎

شہاب کی سرگزشت
حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے اسکی زبان اسکی تخیل اسکی نزاکت بیان اسکی بلندی مضمون اور اسکی انشاء عالیہ حد کمال کو پہنچی ہے قیمت علاوہ محصول عہ

فراست الید
مولفہ نیاز فتحپوری جس کے مطالعہ سے ایک شخص بآسانی ہاتھ کی شناخت اور اسکی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل سیرت عروج و زوال موت حیات صحت بیماری شہرت و نیکنامی وغیرہ کے متعلق صحیح پیشین گوئی کر سکتا ہے قیمت علاوہ محصول عہ

شاعر کا انجام
جناب نیاز کے عنفوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ جس میں عشق کی تمام نشاط بخش کیفیات اسکے ایک جملہ میں موجود ہیں یہ افسانہ اپنے پلاٹ اور انشاء کے لحاظ سے اس قدر بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ مل نہیں سکتی قیمت علاوہ محصول ۱۰ر

جذبات بھاشا
جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کرکے اسکی ابتدائی تاریخ کی بھی وضاحت کی ہے جو اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے کیونکہ ابتک اردو میں اس موضوع پر کوئی کتاب نہیں لکھی گئی تھی اردو ہندی کلام کے حسن کا اندازہ کیجئے قیمت علاوہ محصول

صحابیات
جس میں عہد سعادت کی خواتین کے مستند حالات درج کردیئے گئے ہیں اسکا مقدمہ مولانا نے خاص اپنی انشاء میں لکھا ہے اس کتاب میں بیس صحابیات سے زیادہ صحابیات کے حالات درج ہیں طباعت و کتابت نہایت نفیس ہے قیمت علاوہ محصول ؎

نقاب اٹھ جانیکے بعد
تین افسانوں کا مجموعہ جنہیں بتایا گیا ہے کہ ہر وہ چیز جو چمکتی ہے سونا نہیں۔ زبان و پلاٹ انشاء و تخیل کے لحاظ سے تعریف فضول ہے اور حضرت نیاز کا نام کافی ضمانت ہے قیمت ۵ علاوہ محصول

مذاکرات نیاز
یعنی حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات و تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے ایک بار اس کو شروع کر دیا آخر تک پڑھ لینا ہے۔ اس کتاب کی بہت کم جلدیں باقی رہگئی ہیں۔ قیمت ۱۲ر علاوہ محصول

فلاسفۂ قدیم
اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے تین علمی مضامین شامل ہیں ۱۔ چند گھنٹے فلاسفۂ قدیم کی روحوں کے ساتھ ۲۔ ادیٔین کا مذہب ۳۔ حرکت کے کرشمے نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے قیمت عہ علاوہ محصول

تاریخ الدولتین
جرجی زیدان کے تاریخ تمدن الاسلام کی چوتھی جلد کا ترجمہ جس میں عہد بنی امیہ و بنی عباس کی سیاسیات پر بیمثل تبصرہ کیا گیا ہے۔ جرجی زیدان کی یہ کتاب بین الاقوامی شہرت حاصل کرچکی ہے قیمت ؎ علاوہ محصول

المسئلۃ الشرقیہ
مصطفیٰ کامل پاشا کی مشہور عالم کتاب کا ترجمہ وہ کتاب ہے جس نے یورپ و دنیا کے سیاسیات میں ہلچل ڈالدی تھی اور جو سب سے پہلے ترکی و مصر عرب و حجاز میں انقلاب کی روح پھونکی قیمت ؎ علاوہ محصول

تذکرۂ خندۂ گل
مولفہ عبدالباری آسی جس میں ۴۰۰ صفحات سے زیادہ اردو و فارسی ظریف شاعروں کے حالات مع انکے لطائف و ظرائف و انتخابات کلام کے درج ہیں قیمت ؎ علاوہ محصول

دیگر مصنفین کی قابل مطالعہ کتابیں

مثنوی لالہ رخ
طامس مور کی معرکۃ الآرا مثنوی کا مکمل ترجمہ ادبی شاہکار کا بے مثل نمونہ قیمت مع محصول ؎

مثنوی زہر عشق
مرثیہ مجنوں گورکھپوری جسمیں ملک کے چار بہترین ادیبوں کا مقدمہ شامل ہے اور کئی تصویریں دی گئی ہیں ایک تصویر رنگین ہے۔ ؎

فراست التحریر مکمل
یعنی اردو اور انگریزی رسم خط اور انداز تحریر دیکھ کر ایک شخص کی سیرت چال چلن مستقبل اور تمام حالات معلوم کرنے کا فن اردو میں بالکل پہلی کتاب قیمت ۱۰ر علاوہ محصول۔

نگار

رسالہ ہر مہینے کی ۱۵ ر تاریخ تک شائع ہوتا ہے
رسالہ نہ پہونچنے کی صورت میں ۲۵ ر تاریخ تک دفتر میں اطلاع ہونی چاہئے ورنہ رسالہ مفت نہ روانہ ہوگا
سالانہ قیمت پانچروپیہ (صہ) ششماہی تین روپیہ (عہ)
بیرون ہند سے آٹھ روپیہ سالانہ پیشگی مقرر ہے

شمارہ ۲	فہرست مضامین فروری ۱۹۳۴ء	جلد ۲۵

ملاحظات ——— ۲
زبان اردو کے ارتقائی منازل ——— عبدالمالک ——— ۹
حسن و عشق کی کشاکش ——— محمد اسحاق ——— ۲۰
انگریزوں کی آئینی آزادی ——— ڈاکٹر اس۔ ان جعفری بی۔ اے بیرسٹرایٹ لا ——— ۲۶
تاریخ ہند کا ایک ورق ——— مشیر احمد علوی بی۔ اے ——— ۳۱
وحی کی حقیقت علمی نقطۂ نظر سے ——— قاضی محمد عزیز عرفانی ——— ۴۵
مکتوبات نیاز ——— ۵۳
باب الانتقاد ——— ۵۹
باب المراسلۃ والمناظرہ ——— ۶۸
باب الاستفسار ——— ۷۱
کسان (نظم) ——— علی اختر ——— ۷۴
معلومات ——— ۷۸

نگار

اڈیٹر :- نیاز فتحپوری

جلد ۲۵	فروری سنہ ۱۹۳۶ء	شمارہ ۲

ملاحظات

ما طفلِ کم سواد و سبق قصۂ ہائے دوست
صد بار گفتہ و دگر از سر گرفتہ ایم

احتساب نفس ——

جب غور کرتا ہوں کہ گزشتہ بارہ سال کے زمانہ میں جو نگار کی معیت میں بسر ہوا ہے، میں نے کیا کیا تو ایک طرف اپنی مساعی کو دیکھتے ہوئے یہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ

انچہ در مبدءِ فیاض بُود آنِ من ست

لیکن جب دوسری طرف شاہدِ مقصود کا خیال آتا ہے تو بے اختیار بیدل کے یہ اشعار زبان پر آجاتے ہیں :-

بحر بیتاب کہ آں گوہر نایاب کجا ست چرخ سرگشتہ کہ خورشید جہانتاب کجا ست
دیر زیں غصہ در آتش کہ چہ رنگ ست صنم کعبہ زیں درد سیہ پوش کہ محراب کجا ست

کہا جاتا ہے کہ دنیا میں انسانی کوششوں کی حالت بالکل اُس خس و خاشاک کے اضطراب کی سی ہے جو طوفانی دریا کی پُر خروش موجوں پر بہلا چلا جا رہا ہو اور وہ کسی ایک جگہ ٹھیر کر سیلاب کی رفتار کا اندازہ کرنا چاہے۔ ہم سے سوال ہوتا ہے کہ کیا برف کا ڈھیلا جو ہر آن گھلتا جا رہا ہے کوئی تعین اپنے وزن کی کر سکتا ہے۔ کیا بگولہ جو ریگستان میں ایک عفریت کی طرح دوڑتا نظر آتا ہے، اُن ذرات کے رقص کے علاوہ کچھ اور چیز ہے جو صرف پامالی و انتشار ہی کے لئے وضع ہوئے ہیں۔ یعنی

اگر ایں ست گلِ تازہ کہ تو داری نیست
بلبلاں را نہ پر و بال گراں تر قفسے

دور افق میں ایک سبز و شاداب پہاڑی کی رنگینیاں بے اختیار دل کو کھینچ رہی ہیں، قدم بے مضطربانہ اُٹھتے ہیں، لیکن شب و روز کی سعی کے بعد جب ایک صبح وہاں ہم تھکے ہوئے پہونچتے ہیں تو دفعتہً وہ پردۂ رنگین غائب ہو جاتا ہے اور بجائے ایک گلپوش قطعۂ زمین کے ایک بے آب و رنگ ڈھیر پتھروں کا نظر آتا ہے۔ گرم ریگستان کی شدید گرمی میں حدّ نظر پر ایک حوض پانی سے لبریز دھوپ میں چمکتا ہوا نگاہوں کے سامنے آتا ہے، ہم اپنی تشنگی بجھانے کے لئے بیتابانہ اس طرف دوڑ پڑتے ہیں، لیکن جس وقت وہاں پہونچتے ہیں تو پانی کا چشمہ ہماری آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا ہے اور ہم اسی جگہ تڑپ کر گر پڑتے ہیں۔

برسات کی تاریک، بھیانک رات میں جبکہ نشانِ راہ معدوم ہو کر ہمارے لئے کوئی جائے پناہ نظر نہیں آتی، دور ایک چراغ ٹمٹماتا ہوا دکھائی دیتا ہے، ہم پانی سے تر اور کانپتے ہوئے، وہاں پہونچتے ہیں، لیکن نہ وہاں کوئی چراغ موجود ہوتا ہے نہ کسی کسان کا جھونپڑا، دفعتہً بجلی کی چمک میں چاروں طرف پانی کی موجیں نظر آتی ہیں اور ہم مایوسانہ اسی جگہ سر پکڑ کر بیٹھ جاتے ہیں۔

یہ اور اسی قسم کے بہت سے واقعات و حوادث ہمارے سامنے پیش کر کے ہماری ہمتوں کو ضعیف اور ہماری کوششوں کو ناکارہ بنانے کی سعی کی جاتی ہے، پھر ایک ایسا انسان جو ان ناکامیوں کا مقابلہ کرنے کا اہل نہیں ہوتا، یا تو فنا ہو جاتا ہے یا اگر اس میں تھوڑی سی کیفیت خودداری کی ہوتی ہے تو وہ ایک خاص نظریہ قایم کرتا ہے اور فطرت سے انتقام لینے کے لئے اس کے دُکھے ہوئے جی سے یہ صدا نکلتی ہے کہ

من از فریبِ عمارت گدا شدم ورنہ
ہزار گنج بہ ویرانۂ دل افتادست

درانحالیکہ آج تک نہ کسی کے "دلِ ویراں" میں آج تک کوئی پنہاں خزانہ پایا گیا اور نہ اس سے کسی نے فائدہ اُٹھایا، جب تک پہلے کوئی شخص فریبِ عمارت میں مبتلا نہیں ہو گیا۔

اس لئے اگر میں اپنے مساعی کے مقابلہ میں نتائج پر غور کروں تو مجھے بھی یہی تشائم پہلو اختیار کر کے ہمیشہ کے لئے گوشۂ انزوا اختیار کر لینا چاہئے، لیکن اس کے ساتھ جب میں اس حقیقت پر غور کرتا ہوں کہ کامیابی نام اس خیال کی تکمیل و انتہا کا نہیں ہے جو ایک شخص کی آرزو سے وابستہ ہوتا ہے، بلکہ وہ متعلق ہے تغیر محض سے جو کسی فضا میں پیدا ہو جائے، تو مجھے مسرور ہونا چاہئے کہ میں جس حد تک کامیاب ہوا اور مجھے اُصولاً اپنے مساعی کو بدستور جاری رکھنا چاہئے، گو میں اسے فقدانِ ہمت، تقاضائے عمر یا دیگر افکار و حوادث کے وجہ سے جاری نہ رکھ سکوں۔

ہر چند نگار جس آواز کو لیکر منصۂ شہود پر آیا وہ کوئی نئی آواز نہ تھی اور یقیناً دُنیا میں کوئی صدا نئی نہیں ہوتی، لیکن یہ واقعہ ہے کہ جس وقت اس کی ابتدا ہوئی، وہ زمانہ تھا جب پچھلی آوازوں کی گونج بھی فضا میں باقی نہ تھی اور ہندوستان کے مسلمان پھر اُسی نیند میں مبتلا ہو گئے تھے جس سے انھیں بارہا چونکایا جا چکا تھا اور چونک چونک کر وہ پھر سو سو جاتے تھے۔

یہ وہ وقت تھا جب سرزمین ہند میں نہضت و ارتقاء کے آثار رونما ہو رہے تھے، ایک خاص احساس کی لہر مختلف قوموں میں دوڑ چلی تھی اور حُریت فکر و ضمیر میں از سر نو جان پڑ رہی تھی۔ سوائے مسلمانوں کے جتنی قومیں تھیں وہ ملکی و وطنی آزادی کے ساتھ ساتھ ذہنی آزادی حاصل کرنے کے لئے بھی دوڑ پڑی تھیں اور ایک دوربین نگاہ دیکھ سکتی تھی، ایک سوچنے والا دماغ سمجھ سکتا تھا کہ یہ سیلاب کہاں ختم ہوگا اور اس سے صرف وہی قوم جانبر ہو سکتی ہے، جو خود بھی اپنے آپ کو اس طوفان میں ڈالکر ہاتھ پاؤں چلائے۔ لیکن مسلمان سو رہے تھے، اور صرف اس عقیدہ و یقین پر بے خبرانہ زندگی بسر کر رہے تھے کہ "دُنیا مومنوں کے لئے قید خانہ ہے" اور یہاں کی مسرات و برکات حاصل کرنے کے لئے ہاتھ پاؤں چلاکر کون "کافر" بنے۔

مذہب کی غلط تعبیر نے اُن کے دل و دماغ پر مُہر لگادی تھی، اسلام کی صحیح تعلیم اور اسکی صحیح رُوح مفقود ہو جانے سے اُن پر جمود کی کیفیت طاری تھی، انسانیت و تمدن کے اُصول کو انھوں نے پس پشت ڈالدیا تھا، اخلاق و عمل کا حقیقی مفہوم وہ اوراد و وظائف میں گم کر چکے تھے، خود اعتمادی کا کوسوں پتہ نہ تھا اور محض "دُعائے گنج العرش" کے سہارے وہ اپنا بیڑا پار کرنا چاہتے تھے جدید علوم و فنون کا اکتساب ان کے نزدیک گمراہی میں مبتلا ہونے کے مترادف تھا اور سائنس کا اعتراف گویا خدا کا انکار۔

اُن کے اعمال و حرکات، اُن کے اقوال و اطوار، اُن کی تعلیم و تلقین، اُن کی تگ و دو، الغرض اُن کی زندگی کے ہر ہر شعبہ میں، صرف تقدیر کار فرما تھی اور تدبیر سے انھیں کوئی سروکار نہ تھا۔ اُن کی کتابیں، اُن کی تالیفات، اُن کے مدارس، اُن کے مواعظ و ارشادات سب اسی ایک رنگ میں رنگے ہوئے تھے، یہاں تک کہ جراید و رسایل جو علمی و ذہنی روشنی پھیلانے کے مدعی بنکر رونما ہو رہے تھے، وہ بھی اس باب میں خاموش تھے اور "ایک افسانہ خواں" سے زیادہ اُن کی کوئی حیثیت اس بزم خواب آلود میں نہ تھی۔

نگار نے گو ابتدا اجرا میں صراحتاً اس کا اعلان نہ کیا تھا کہ اس کا حقیقی مقصود کیا ہے، لیکن آخر کار یہ حقیقت لوگوں سے پوشیدہ نہ رہ سکی کہ نگار نہ ادب لطیف کے احیاء کے لئے ظہور میں آیا ہے اور نہ صرف ایسی باتیں کہنے کے لئے جسے عام لوگ پسند کرتے ہیں۔

اس نے علم و تحقیق اور تنقید و تنقیح کے لحاظ سے ہمیشہ وہ چیز پیش کی جو قدامت پرستی کو توڑنے والی تھی اور کبھی ایک لمحہ کے لئے اس کی پرواہ نہ کی کہ جمہور کے خیال و اعتقاد کا مقابلہ کوئی نفع کا سودا نہیں۔

نگار نے صرف دو درس مسلمانوں کے سامنے پیش کئے ایک یہ کہ اُن کو زمانہ کا ساتھ دینا چاہئے اور دوسرے یہ کہ ذہنی غلامی سے آزاد ہوکر، عصبیت کی زنجیر کو توڑ کر ملک و وطن کی خدمت میں دوسری قوموں کے دوش بدوش ملکر کام کرنا چاہئے۔ پھر چونکہ میں سمجھتا تھا کہ سب سے بڑا سنگ راہ جوان کو دوسری قوموں سے ملنے نہیں دیتا، وہ مذہبی تعصب ہے اور اسی کے ساتھ مجھے یہ بھی یقین تھا اور ہے کہ دُنیا میں اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو اپنی وسعت نظر اور بلند اخلاق کے لحاظ سے تمام دُنیا پر چھا جانے کا اہل ہے، اس لئے سوائے اس کے کوئی چارۂ کار نہ تھا کہ میں مسلمانوں کو بتاؤں اُن کا صحیح مذہب کیا ہے اور جن باتوں کو وہ اصل دین و عین مذہب قرار دیتے ہیں، وہ صرف فروع میں داخل ہیں۔ پھر ظاہر ہے کہ اس سلسلہ میں مجھے کفر و اسلام، نبوت و رسالت، معجزہ و کرامات، بہشت و دوزخ، جزا و سزا سبھی سے بحث کرنا ضرور تھا اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہونا ہی تھا کہ میں کافر و مرتد بنایا جاتا، ملحد و دہریہ کے لقب سے یاد کیا جاتا۔

پھر جو ہنگامہ اس سلسلہ میں میرے خلاف پیدا ہوا وہ کسی سے مخفی نہیں لیکن جس چیز نے میری ہمت کو ضعیف نہیں ہونے دیا وہ صرف اس امر کا احساس ہے کہ باوجود اس تمام اختلاف کے نگار ایک جماعت کی ذہنیت بدلنے میں کامیاب ہوگیا ہے اور عصبیت کی گرفت اُن پر بہت کچھ ڈھیلی پڑ گئی ہے۔ ممکن ہے اس وقت یہ کامیابی غیر اہم سمجھی جائے، لیکن چونکہ آزادی کا تخم ایک بار بو دینے کے بعد بغیر بارآور ہوئے نہیں رہ سکتا، اس لئے مجھے مستقبل کی طرف سے اطمینان ہے اور پورا یقین رکھتا ہوں کہ ایک زمانہ آئے گا جب آج کی کہی ہوئی باتیں کل ایک ایک مسلمان کی زبان پر ہوں گی اور آخرکار وہ نقاب دور ہوکر رہیگا جو اسلام کے جمیل چہرہ پر مدعیانِ مذہب نے ڈال رکھا تھا۔

می گویم و بعد از من گویند بدستانہا

پھر جو زندگی میں مسلسل بارہ سال سے بسر کر رہا ہوں اور جس چیز کو میں اتنے زمانہ سے اپنے سینہ سے لگائے ہوئے ہوں، ظاہر ہے کہ اس کا چھوڑنا میرے بس کی بات نہیں، اس لئے میں ایک بار اور ہمیشہ کے لئے کہدینا چاہتا ہوں کہ وہ لوگ جو نگار کو صرف حکایات لطیف کے لئے وقت دیکھنا چاہتے ہیں، وہ مایوس ہوجائیں، وہ حضرات جو تصاویر و نقوش کی رنگارنگی سے دلچسپی رکھتے ہیں، وہ نگار کو نہ دیکھیں اور وہ احباب جو عقل و ضمیر کی آزادی کو پسند نہیں کرتے وہ نگار کے مطالعہ کی تکلیف گوارا نہ کریں، کیونکہ نگار جب تک جاری ہے اسی اُصول کے ساتھ جاری رہیگا جس کا اسوقت تک وہ پابند رہا ہے اور وہ ہمیشہ یہی تلقین کرتا رہیگا کہ انسان کا اولین فرض "انسانیت" کی پرستش کرنا ہے اور اگر کوئی مذہب بنی نوع انسان سے محبت کرنا نہیں سکھاتا، بلکہ صرف مراسم و ظواہر کو دین و ایمان قرار دیتا ہے تو وہ مذہب ہرگز پیروی کے قابل نہیں۔

اسی سلسلہ میں غالباً یہ عرض کرنا بے محل نہ ہوگا کہ ہر چند نگار کی اشاعت کا تنہا مقصود وہی ہے جو ابھی بیان کیا گیا، لیکن اسی کے ساتھ جو علمی و ادبی خدمات اس نے گزشتہ بارہ سال میں انجام دی ہیں وہ بھی نظرانداز کئے جانے کے قابل نہیں۔ تحقیق تاریخی، مباحث علمیہ، معلومات جدیدہ، تنقیدات عالیہ اور انشاء لطیف میں کونسی چیز ایسی تھی جو نگار نے بلند ترین معیار کیساتھ پیش نہیں کی۔ اس لئے وہ لوگ جو صرف ان چیزوں کے دلدادہ ہیں ان کو بھی نگار کی طرف سے مایوس ہونے کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ خصوصیات آیندہ بھی بہرحال قایم رہیں گی اور غالباً زیادہ تکمیل کے ساتھ۔

زلزلہ کی تباہکاریاں

حوادث طبیعی کے بعض مناظر اسدرجہ عبرتناک ہوتے ہیں کہ انسان کی تمام حکمت فرمائیاں ان کے سامنے بچوں کا کھیل نظر آنے لگتی ہیں اور علم و عقل کی بیچارگی کا احساس ہم کو حیران و ششدر بنا دیتا ہے۔

کلام مجید میں متعدد جگہ ایسے مناظر کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔

سورۂ حج میں ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے:-

نکاین من قریۃ اھلکناھا وھی ظالمۃ فھی خاویۃ علی عروشھا

یعنی بہت سی ایسی بستیاں ہیں جن کو ہم نے اُن کے ظلم کی وجہ سے ہلاک کر دیا اور وہ سرنگوں کر دی گئیں۔

سورۂ نمل میں ایک جگہ اسی قسم کے منظر کا حال یوں بیان ہوتا ہے:-

فتلک بیوتھم خاویۃ بما ظلموا یعنی یہ کھنڈر ہیں اُن لوگوں کے جنھوں نے خود اپنے ظلم سے ان ویرانیوں کو دعوت دی۔

سورۂ حاقہ میں قوم عاد کی ہلاکت کے متعلق فرمایا گیا ہے:-

واما عاد فاھلکوا بریح صرصر عاتیۃ ...... فتری القوم فیھا صرعی کانھم اعجاز نخل خاویۃ

یعنی جب قوم عاد کی ہلاکت کے لئے تیز و پرشور آندھی بھیجی گئی، تو لوگ اوندھے منھ اس طرح مرے پڑے تھے گویا کہ کھوکھلے کھجوروں کے تنے پڑے ہوئے ہیں۔

سورۂ کہف میں ایک جگہ پانی کے خشک ہوجانے کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے۔

یصبح ماءھا غورا

پھر مظفرپور، پٹنہ، جمال پور اور مونگیر وغیرہ میں جو تباہیاں حال کے زلزلہ سے آئی ہیں کیا وہ کچھ اور تھیں۔ وہی بیشمار مکانوں کی مسماریاں، وہی ہزارہا انسانوں کی تباہیاں اور وہی دریا رگنگ کا زمین کے اندر غایب ہو جانا۔ جنھوں نے ان

مناظر کو دیکھا ہے اُن سے پوچھئے کہ کرب و بُکا کا وہاں کیا عالم ہے اور انسانی لاشوں کو چیل کوے کس طرح نوچ نوچ کر کھا رہے ہیں۔ لاکھوں کی دولت مسمار شدہ مکانوں کے اندر دبی پڑی ہے، ہزاروں بچے یتیم، سیکڑوں عورتیں بیوہ اور نہ جانے کتنے مرد خانماں برباد ہو چکے ہیں۔

تو کیا یہ کوئی عذاب الٰہی تھا جو صوبۂ بہار پر نازل ہوا۔ کیا کوئی قہر خداوندی تھا جس نے اس صوبہ کے باشندوں کو تباہ کیا اور کیا تباہ شدہ بستیاں ہندوستان بھر میں سب سے زیادہ گنہگار انسانوں کی آبادیاں تھیں جن کو اُلٹ کر معدوم کر دیا گیا؟

مرنے والوں میں مسلمان بھی تھے اور ہندو بھی، عیسائی بھی تھے اور یہودی بھی۔ جوان بھی تھے اور معصوم بچے بھی ضعیف مرد بھی تھے اور بہت سی نیک بیویاں بھی۔ پھر یہ کیسا انصاف ہے، کیسا عدل ہے، کس طرح کا انتقام ہے، کس نوع کا قہر و غضب ہے، کس انداز کی برہمی ہے —— اہلِ مذاہب سے پوچھئے تو وہ اس کا جواب سوائے اس کے کچھ نہ دے سکیں گے کہ خدا فعالِ مطلق ہے، بے نیاز ہے، اور وہ کسی طرح مسئول نہیں ہو سکتا —— وہ لوگ جو ایسے مظاہر کو صرف حوادثِ طبیعی سے منسوب کرتے ہیں، وہ بھی یہی کہیں گے لیکن فرق یہ ہے کہ مذہبی تاویل ہمارے اخلاق پر موثر ہوتی ہے اور علمی توجیہہ کوئی اثر اس قسم کا پیدا نہیں کرتی۔

اب غور کیجئے کہ ان واقعات فجائعی سے ہمارے اخلاق مذہبی پر کیا اثر پڑنا چاہئے؟

ہندوؤں نے ہَوَن کر کے دیکھ لیا لیکن یہ مصیبت اُن کے سر سے نہ ٹلی، مسلمانوں نے مسجدوں میں گڑگڑا کر خدا سے التجائیں کیں، لیکن وہ تباہ ہونے سے نہ بچے۔ پھر اس سے، بجز اس کے اور کیا نتیجہ نکل سکتا ہے کہ خدا کے نزدیک تفریقِ مذاہب کوئی معنی نہیں رکھتی اور اس کی نگاہ میں سب ایک ہیں، نہ اس کا رحم و کرم کسی مسلمان کی جستجو کرتا ہے اور نہ اس کا قہر و غضب غیر مسلموں کے لئے مخصوص ہے۔ اس کی ذات تاثر و انفعال سے بلند، جذبۂ تفریق و امتیاز سے ارفع اور اُصولِ نیائش و عبادت کے احساس سے بے نیاز ہے۔

مسلمان لاکھ کہا کریں کہ خدا صرف انھیں کا ہے اور انھیں کی نجات اس کا مقصود ہے، ہندو ہزار کہیں کہ انھیں کا مذہب پوتر ہے اور باقی سب گمراہ ہیں، خدا ان مزعومات و مفروضات کا پابند نہیں ہے۔ اور یہ شرک و اسلام کے جھگڑے صرف ہماری خود غرضیوں کے مظاہر ہیں جن سے خدا کو کوئی تعلق نہیں۔

بس سوچو اور سمجھو کہ صحیح راستہ وہی ہے جو آپس میں محبت کرنا بتاتا ہے اور انسانوں میں صرف اس لئے پھوٹ نہیں ڈالتا کہ ایک کے گلے میں زنار ہے اور دوسرے کے ہاتھ میں تسبیح۔

جز سخن کفرے و ایمانے کجاست
خود سخن در کفر و ایماں می رود

گوالیار کی بزم ادب

یہ شاید کم لوگوں کو معلوم ہو گا کہ ہمارے فاضل دوست ڈاکٹر ضیاء عباس ہاشمی نے لشکر (گوالیار) میں ایک "بزم اُردو" قایم کر رکھی ہے جو عرصہ سے زبان کی خاموش خدمت انجام دے رہی ہے۔

اسکی ماہانہ صحبتیں بھی برپا ہوتی ہیں اور سالانہ جلسے بھی، ادباء ملک کو بھی دعوت دیجاتی ہے اور فضلاء وطن کو بھی کسی نہ کسی طرح کھینچ کر بلایا جاتا ہے۔ الغرض ایک ادبی انجمن کے جتنے فرائض ہیں وہ بوجہ احسن انجام دئے جاتے ہیں اور سال میں دو چار دن عجیب لطف و دلچسپی کیساتھ بسر ہوتے ہیں۔

امسال بھی یہ احتفالِ سالانہ فروری کی ۲۶، ۲۷، ۲۸ کو گوالیار میں منعقد ہونے والا ہے اور وہ تمام قوتیں جو گزشتہ جلسوں کے کامیابی کیلئے علیحدہ علیحدہ صرف کی گئی تھیں، اب یکجائی طور پر اس جلسہ کو کامیاب بنانے کے لئے وقف کر دی گئی ہیں اور اُس نظم و اہتمام کو دیکھتے ہوئے جو ڈاکٹر صاحب موصوف کے پیشِ نظر ہے بجا طور پر یقین کیا جا سکتا ہے کہ شاید ہی ہندوستان میں کوئی ادبی جلسہ اسدرجہ پُر لطف و مکمل اس سے قبل منعقد ہوا ہو۔ ہندوستان کا کوئی ادیب و شاعر، کوئی صاحب علم و فضل ایسا نہیں جسے دعوت نہ دی گئی ہو اور مجھے یہ معلوم کر کے بڑی مسرت ہو کہ ان میں سے اکثر نے شرکت کا وعدہ فرمایا ہے۔ اس سے قبل بزم کے طرف سے ملک میں دعوت نامے شایع کئے گئے تھے لیکن بعض اسباب کی بناء پر تاریخ ملتوی کرنا پڑی جسکی اطلاع تمام حضرات کو دیدی گئی۔ اب فروری کی یہ تاریخیں چونکہ یقینی طور پر متعین ہو چکی ہیں اسلئے بزم اُردو کے طرف سے پھر نوید شایع کئے جا رہے ہیں جو نگار کی اشاعت سے قبل غالبًا تمام حضرات کے ہاتھوں میں ہوں گے۔

ڈاکٹر اقبال، سر تیج بہادر سپرو، سر عبد القادر، سر راس مسعود، نواب نصیر حسین خیال، مولانا ابو الکلام آزاد، مولانا حسرت موہانی وغیرہ تمام اکابر نے شرکت کا وعدہ فرمایا ہے اور پنجاب و یوپی، بنگال و بہار، سی پی و دکن وغیرہ کے اکثر ارباب علم و ادب نے اس میں عملی حصہ لینے کا ارادہ ظاہر کیا ہے۔

علاوہ اس کے سب سے زیادہ خصوصیت جو اس سے قبل کسی انجمن کو حاصل نہیں ہوئی وہ یہ ہے کہ عالیجناب مہاراجہ سر کشن بہادر بالقابہ صدر اعظم دولت آصفیہ کو صدارت کے لئے تجویز کیا گیا ہے اور ایک وفد حیدر آباد جا رہا ہے تاکہ باقاعدہ دعوت نامے کو پیش کر کے شرف منظوری حاصل کرے۔ میں بھی اس وفد کے معیت میں ۲۰ / جنوری کو گوالیار سے حیدر آباد روانہ ہو جاؤں گا۔ صدارت کے لئے یہ انتخاب نہ صرف اس لحاظ سے موزوں و برمحل ہے کہ اسوقت دولتِ آصفیہ دکن جامعۂ عثمانیہ کے قیام سے سب سے بڑی خدمت اُردو کی انجام دے رہی ہے، بلکہ خود سر مہاراجہ بہادر کی خدمات اُردو زبان کے متعلق اسدرجہ گرانقدر اور اتنی اہم ہیں کہ ان کے اعتراف پر ہر شخص مجبور ہے۔ اس کے ساتھ یہ خبر بھی غالبًا مسرت سے سُنی جائے گی کہ استقبالیہ کمیٹی کی صدارت جناب کرنل بکسر صاحب نے قبول فرمائی ہے جو بین الاقوامی شہرت رکھنے والے لوگوں میں سے ہیں اور جو خود اُردو زبان سے بہت شغف رکھتے ہیں جناب سردار آنگرے صاحب بھی جو گوالیار میں پرائیویٹ سکریٹری کی اہم خدمت پر مامور ہیں، ذاتی طور پر اسقدر دلچسپی لے رہے ہیں کہ بعض دعوت نامے خود ان کی طرف سے شایع ہوئے ہیں۔ الغرض بزم اُردو کا یہ جلسہ کوئی معمولی جلسہ نہیں جسے صرف ارکانِ بزم ہی مدعو کرنا چاہتے ہیں بلکہ یوں سمجھنا چاہئے کہ غیر سرکاری طور پر خود ریاست گوالیار دعوت دے رہی ہے اور اس لئے بہی خواہانِ اُردو کو غور کرنا چاہئے کہ ان حالات میں اُن کی شرکت ضرورت و مصلحت کے لحاظ کس قدر ناگزیر ہے۔ ممکن ہے کہ بعض اکابرِ فن کو کسی فرو گزاشت کے بناء پر دعوت نامہ نہ پہونچے، لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ بزم اُردو ان کی تشریف آوری کی متمنی نہیں اس لئے آپ خود بغیر رسمی رقعہ کا انتظار کئے ہوئے براہ راست سکریٹری "بزم اُردو لشکر" کو اطلاع دیجئے کہ آپ کسوقت وہاں پہونچیں گے تاکہ آپ کا استقبال کیا جائے۔ ممکن ہے کہ بعض ایسے حضرات جو مدعو کئے گئے ہوں اپنی اقتصادی مجبوری کے وجہ سے شرکت نہ فرما سکیں، اس لئے یہاں یہ ظاہر کر دینا بے محل نہ ہو گا کہ ایسے احباب کے لئے "بزم اُردو" کے طرف سے ان کے مصارف آمد و رفت کا حقیر ہدیہ پیش کر دیا جائے گا اور اُمید ہے کہ وہ اسے قبول فرمائیں گے۔ اب آخر میں مجھے ایک مشورہ بھی دینا ہے اور وہ یہ کہ جو حضرات تشریف لائیں وہ یہ سمجھ کر آئیں کہ اُردو کی خدمت ان کو انجام دینا ہے اور اس لئے کوئی نہ کوئی "پیام" سُنانا ان کے لئے ضروری ہے۔ کوشش کی جا رہی ہے کہ صدر کے جلوس استقبال اور جلسہ کے مختلف نشستوں کا فلم بھی طیار کیا جائے۔ امید ہے کہ میرے احباب اور نگار کے جملہ قلمی معاونین شرکت کی زحمت گوارا فرمائیں گے اور مجھے موقع دیں گے کہ میں گوالیار میں ان کا خیر مقدم کروں۔

نیاز

زبان اُردو کے ارتقائی منازل

آج ہمیں اس اہم مسئلہ پر بحث کرنی ہے کہ آیا اُردو مسلمانوں کی زبان ہے یا عام ہندوستانیوں کی، اور اس کی تخلیق وتدوین میں صرف اہل اسلام نے حصّہ لیا ہے، یا برادران وطن نے بھی، مگر قبل اس کے کہ اصل موضوع پر روشنی ڈالی جائے، یہ بتادینا ضروری ہے کہ کسی زبان کے وجود میں آنے کے اسباب وعلل کیا ہیں؟ ؟ معمولی غور وفکر کے بعد یہ نتیجہ نکلتا ہے، کہ تجارت وحکومت سیر وسیاحت، نقل مکان، ومذہبی تحریک نے زبان کی تخلیق میں بڑی مدد دی ہے، چنانچہ سامی اور آریہ زبانوں کی مختلف شاخیں انھیں اسباب وعلل کے ماتحت وجود میں آئیں،

اب آئیے اردو کے منازل ارتقاء پر غور کریں، یہ تو ظاہر ہے، کہ اُردو نہ خالص سامی زبان ہے، نہ خالص اندوجرمانی (Indo Germania) بلکہ سامی اور اندوجرمانی قوموں کے اختلاط وامتزاج سے اس کا وجود ہوا ہے، کیونکہ اس کے لغات وقواعد میں سامی لغات کے عناصر بھی پائے جاتے ہیں اور آریہ لغات کے بھی، اب دیکھنا یہ ہے، کہ اُردو زبان پر سامی اور آریہ لغات نے کیونکر اثر ڈالا، ؟ اس کے لئے کسی قدر تحقیق وکاوش غور ومطالعہ سے کام لینا ہوگا،

اُردو زبان ہندوستانیوں اور اہل اسلام کے خلط وربط سے وجود میں آئی، مذہب اسلام ایک ایسی سامی تحریک تھا، جس نے دنیا کے تمام شعبوں میں انقلاب عظیم پیدا کردیا تھا چنانچہ مصر کا ایک ماہر لسانیات اسرائیل ولفنسون لکھتا ہے،

کانت الھجرۃ الاسلامیہ الی خارج الجزیرۃ آخر حادث سامی عظیم وقع فی جزیرۃ العربیہ فاھتزت لہ ارجاء العالم اھتزازاً عنیفا وصدرت عنہ تموجات فکریہ ونفسیۃ عظیمتہ شملت اصقاع آسیا وافریقیہ واورپا واثرت فی ھذہ البلاد تاثیرات ذات نتائج خطیرۃ جعلت تاریخ البشری فی کل ھذہ الجھات یتجہ اتجاھا جدیداً[1]

جزیرۂ عرب سے باہر اسلام کا شیوع سامی قوم کا وہ آخری واقعۂ عظیم تھا، جو عرب میں واقع ہوا، جس نے دنیا کے کناروں میں سخت ہلچل پیدا کردی اس سے بڑی بڑی ذہنی اور نفسی موجیں نکلیں جس میں ایشیا افریقہ اور یورپ کے ممالک شامل ہوئے، اور ان شہروں میں اہم نتیجہ خیز اثرات پیدا ہوئے۔ جس نے ان تمام اطراف میں انسانی تاریخ کے اندر ایک جدید رُجحان پیدا کردیا

[1] تاریخ اللغات السامیہ مطبوعہ مصر ص ۱۶۲

چونکہ اسلام کی تبلیغی زبان عربی تھی اس لئے سب سے پہلے ہمیں اس امر پر غور کرنا ہے، کہ عربی زبان سے ہندوستانی زبان کو کوئی علاقہ رہا ہے یا نہیں، ؟ اس سلسلہ میں مفصلہ ذیل تاریخی شواہد پیش کئے جا سکتے ہیں،

تجارت بعثت اسلامیہ سے قبل ہندوستان کے ساتھ عربوں کے تجارتی تعلقات قائم تھے اور ساحل مالابار میں عرب تاجروں کی بود و باش تھی، چنانچہ عربی اور ہندوستانی نسل کے اختلاط سے ایک قوم یہاں پائی جاتی ہے، جس کو "موپلا" کہتے ہیں ان کی زبان "ملیالم" ہے،

عرب اپنی حکومت سے قبل بھی یہاں قیام رکھتے تھے، اور مکہ میں ہنود کی بھی آمد و رفت تھی کیونکہ یہاں بہت بڑا صنمخانہ تھا، عربوں اور ہندوستانیوں کا پہلا اختلاط تجارتی اغراض اور مماثلت عقائد پر مبنی تھا[1] اس لئے اندازہ ہوتا ہے، کہ عربی اور سنسکرت زبانیں بعثت اسلامیہ کے قبل ممزوج ہو چکی تھیں،

حکومت اسلام عالم وجود میں آیا تو سب سے پہلے مہلب بن ابی صفرہ نے پہلی نصف صدی ہجری میں ہندوستان پر حملہ کیا اس زمانہ میں جستہ جستہ بہت سے لوگ مسلمان ہوئے، عہد صحابہ ہی میں بہت سے ہندوستانی راجہ مسلمان ہو گئے تھے، چونکہ بت پرستی کے سلسلہ میں عرب میں ان کی آمد و رفت تھی۔ اسی طرح وہ بعثت اسلام کے وقت بھی آئے، اور دین اسلام قبول کیا پھر پہلی صدی ہجری کے اواخر میں حجاج بن یوسف نے اپنے داماد عماد الدین محمد بن قاسم کو سندھ کی فتح کے لئے روانہ کیا اس نے سندھ فتح کیا، محمد بن قاسم جب ولید بن عبد الملک کے حکم سے مارا گیا تو تمیم انصاری کی اولاد نے سندھ پر حکومت کی اس سلسلہ میں عرب کے بہت سے خاندان سندھ میں آ گئے۔ یہی وجہ ہے، کہ سندھ نے بہت بڑے بڑے صوفیہ اور محدثین پیدا کئے حضرت ابو رجا محدث اور شیخ ابو علی صوفی اسی زمین کے نونہال تھے، شیخ ابو علی، سندی حضرت بایزید بسطامی کے عہد میں گزرے ہیں، حضرت بایزید فرماتے ہیں کہ میں شیخ صاحب سے "فنا" کا درس لیتا تھا، اور شیخ صاحب مجھ سے سورۂ فاتحہ پڑھتے تھے[2] اسی بنا پر ڈاکٹر نکلسن نے یہ قیاس پیش کیا ہے، کہ تصوف اسلامیہ پر ہندوستانی لوگ کا اثر پڑا ہے،

سیر و سیاحت یوں تو مسلمانوں میں بڑے بڑے سیاح گزرے ہیں۔ جنھوں نے اپنے حالات سفر قلمبند کئے، اصقاع عالم کے جغرافی خصایص پر روشنی ڈالی، مسلم بن حمیر، جعفر بن احمد المروزی ابن فضلان، ابن خرداذبہ، جہانی، الاصطخری، ابن حوقل، یاقوت حموی، البکری، المقدسی، ادریسی وغیرہ کے جغرافی کارناموں سے کون انکار کر سکتا ہے، لیکن جہاں تک ہندوستانی سیاحت کا تعلق ہے اس سلسلہ میں مسعودی، البیرونی اور ابن بطوطہ نے وقیع خدمات انجام دئے، مسعودی (چوتھی صدی) بغداد کا رہنے والا تھا، اس نے اپنے آغاز شباب

---

[1] تاریخ فرشتہ مقالہ ۸ [2] نفحات الانس ص ۶۰

ہی میں اسلامی دنیا کا بڑا حصہ دیکھ ڈالا۔ پہلے پہل وہ ہندوستان میں آیا اور مختلف ممالک کی سیر کی پھر دوبارہ آیا اور کچھ دنوں تک کمبایچ اور دکن میں قیام کیا[۱]۔ اس کے متعلق ایک فرانسیسی عالم ڈی بور لکھتا ہے۔

"وہ ہر اس چیز کی تعریف کرتا ہے، اور اس سے دلچسپی لیتا ہے، جو نوع انسانی سے متعلق ہے، جہاں کہیں وہ جاتا ہے، آدمیوں سے مل کر وہ کچھ سیکھتا ہے، روزانہ زندگی اور مذہب کے معمولی امیال و عواطف اور فلسفہ کی ہوائی خیال آرائیاں اس کا مرکز توجہ نہیں اس کو اپنی استعداد کا اندازہ ہے، اور آخری دم تک جبکہ وہ مصر میں پیری کے دن گزار رہا تھا، مطالعہ تاریخ کو وہ اپنی تسکین کا واحد ذریعہ اور اپنی روح کی دوا بناتا ہے"[۲]

البیرونی نہ صرف ایک سیاح اور جغرافی تھا بلکہ اس نے بہت دنوں تک ہندوستان میں قیام پذیر رہ کر سنسکرت زبان کی تعلیم حاصل کی، یہاں کی معاشرت و مذہب، شاعری و ادبیات، فلسفہ و حکمت، اوہام و خرافیات، ملک کی جغرافی و طبعی خصوصیات سے اپنی مشہور تصنیف "کتاب الہند" میں محققانہ بحث کی اس کے متعلق مؤلف "تاریخ فلسفہ اسلام" لکھتا ہے۔

"اس سے اس عہد کی خصوصیت کی وضاحت ہوتی ہے، گو کندی اور مسعودی کو فارابی اور ابن سینا کی بہ نسبت زیادہ استحقاق ہے، کہ اس کے (بیرونی) اساتذہ میں مشمول ہوں، بیرونی کی نظر مطالعہ خاص طور پر ریاضی، ہیئت، جغرافیہ اور قومیات تک محدود تھی، اس کا مشاہدہ عمیق اور قوت تنقیدی عمدہ تھی، اپنی بہتیری علمی مشکلات کے حل کرنے کے لئے اس کو فلسفہ کا بھی مرہون منت ہونا پڑا، اور اس نے مسلسل اس پر بہ حیثیت ایک مظہر تہذیب ہونے کے، اپنی توجہ مبذول رکھی، بیرونی کی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے فیثا غورثی افلاطونی فلسفہ، ہندوستانی حکمت اور بہت سے صوفیانہ نظریات میں جو ہم آہنگی پائی جاتی ہے، ان کو تعجب خیز شہرت دی، جب وہ علوم یونان سے عربوں اور ہندوستانیوں کے مساعی و اعمال کا موازنہ کرتا ہے، تو اس کا یونانی علوم کی برتری دکھانا اور بھی حیرت زا معلوم ہوتا ہے، وہ کہتا ہے، کہ ہندوستان نے (عرب کا کیا ذکر ہے)، کوئی سقراط نہیں پیدا کیا، وہاں منطقیانہ طریقہ نے حکمت سے مغالطہ کو دور نہیں کیا پھر بھی وہ انفرادی اعتبار سے بعض ہندوستانی فلاسفہ پر منصفانہ محاکمہ کرتا ہے، اور وہ آریہ بھٹ (متوطن عظیم آباد بہار) کے پیرؤں کے منصد ذیل افکار پسندیدگی کے ساتھ نقل کرتا ہے، "ہم لوگوں کے لئے ان چیزوں کا علم حاصل کرنا ضروری ہے، جو آفتاب کی شعاع میں منور ہیں جو چیزیں اس دائرہ سے خارج ہیں، گو ان کی وسعت بے پایاں ہو لیکن ہم ان کا استعمال نہیں کر سکتے جو جہاں آفتاب کی شعاع نہیں پہونچتی، وہاں حواس کو ادراک نہیں ہو سکتا اور جن چیزوں کا حواس کو ادراک نہیں ہو سکتا ان کا

۱؎ نفحات الانس ص ۶ History of the Saracens. ص ۲۶۴ - ۲۶۵

۲؎ D. Boer's History of philosophy in Islam ص ۶۹

ہمیں علم بھی نہیں ہو سکتا " اس سے ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ بیرونی کا فلسفہ کیا تھا ؟ اس کے عقیدہ میں علم الیقین صرف محسوسات کے ذریعہ سے حاصل ہو سکتا ہے، جن کو منطقیانہ معلومات کے ساتھ وابستہ کر دیا جائے، وہ یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ زندگی کی ضرورتوں کے لحاظ سے ہمیں ایک فلسفۂ عملی کی ضرورت ہے، جس کے ذریعہ ہم دوست دشمن میں تمیز کر سکیں یقیناً اس کو اس کا تصور بھی نہ ہوگا کہ اس نے وہ سب کچھ کہہ ڈالا، جو اس موضوع پر کہا جا سکتا تھا[۵۱]"

ابن بطوطہ اس عہد میں وارد ہندوستان ہوا، جب اردو اپنی نشأۃ کے دوسرے دَور میں تھی، یعنی افاغنہ سریر آرائے حکومت تھے، اور سنسکرت زبان جو عربی لغات کے ساتھ ممزوج ہو چکی تھی، بھاشا کی صورت میں فارسی کے ساتھ مخلوط ہو رہی تھی، جس کی تفصیل آگے آتی ہے، اس لئے ابن بطوطہ کی سیاحت، اردو کی تاریخ کے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتی، لیکن مسعودی اور بیرونی کی تصنیفات نے ایک طرف تو اہل اسلام کو ہندوستانی ادبیات سے بہت کچھ آشنا کیا دوسری طرف عربی زبان میں سنسکرت کے بہت سے لغات و الفاظ داخل ہو گئے، اسرائیل ولفنسون مصر کے ماہر لسانیات نے اپنی کتاب میں سامی زبانوں کی تاریخ سے بحث کرتے ہوئے، ثابت کیا ہے، کہ بابلی و آشوری، آرامی و عبری زبانوں کو عربی سے خاص مماثلت ہے، اور لغات سامیہ کا ایک قاموس دے کر سامی زبانوں کے مشابہ الفاظ کو یکجا کر دیا ہے لیکن اس نے عربی اور سنسکرت کے علاقہ پر کوئی روشنی نہیں ڈالی گو یہ ایک متنازع فیہ مسئلہ ہے، کہ عربی و سنسکرت کے نحو و صرف میں کوئی ربط پایا جاتا ہے یا نہیں ؟ اس کے متعلق مستشرقین کے مختلف خیالات ہیں۔ چنانچہ ولفنسون، سامی اور آریہ زبانوں کے تناسب پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے،

فبعضھم یرجح ان جمیع اللغات السامیۃ واللغات الآریۃ کانت فی عصر من العصور لغۃ واحدۃ	انمیں بعض کا یہ رجحان ہوا کہ تمام سامی اور آریہ زبانیں کسی زمانہ میں ایک زبان تھیں،

لیکن بعض ماہرین لسانیات نے اس کا مذاق اُڑایا۔ چنانچہ بردکلمان، اور نولدکہ نے اس نظریہ سے اختلاف کرتے ہوئے کہا،

فاذا کان ھناک اصل اشترکا فیہ فلا یکون ذالک الا قبل التاریخ وما کان قبل التاریخ لا یدخل فی حظیرۃ البحث عند علماء اللغات[۵۲]	پس جب کوئی ایسی اصل تھی جو (آریہ اور سامی زبانوں کیلئے) مشترک تھی، تو یہ تاریخ کے قبل کا واقعہ ہوگا اور جو تاریخ کے قبل کی چیز ہے، وہ ماہرین لسانیات کے نزدیک احاطہ بحث سے خارج ہے،

---

[۵۱] " ہسٹری آف فلاسفی ان اسلام " مؤلفہ ڈی بور یہ کتاب فرانسیسی زبان میں لکھی گئی تھی۔ عام مقبولیت کے باعث سنہ ۱۹۰۳ء میں اس کا انگریزی ترجمہ لوزک اینڈ کمپنی (لندن) نے شائع کیا۔ سنہ ۱۹۳۲ء میں اس کا دوسرا اڈیشن نکلا یہی جدید الشیوع نسخہ پیش نظر ہے، ایڈورڈ۔ آر۔ جونس اس کے مترجم ہیں (ملاحظہ ہو ص ۱۴۶) [۵۲] تاریخ اللغات السامیہ مطبوعہ مصر ص ۱۷، یہ کتاب

پھر بھی مروج الذہب اور کتاب الہند کے صفحات کا جائزہ لیا جائے، تو پتہ چل سکتا ہے کہ مسعودی اور بیرونی نے سنسکرت اور عربی کو کس طرح مخلوط کیا ہے،

نقل مکان و مذہبی تحریک

غزنویہ اور افاغنہ دہلی کے قبل ہی بعض قبایل عرب اور سادات ہندوستان میں آباد ہو گئے تھے، ان لوگوں کی زبان عربی تھی، اس لئے اُردو کے ارتقا میں پہلے عربی زبان کے عناصر شامل ہوئے، اس کے بعد فارسی زبان نے کئی سو برس تک اسی عربی اور بھاشا کے مخلوط مواد میں اپنا اثر ڈالا، وہ عربی قبائل جو جزیرۂ عرب سے ہجرت کرکے ایران میں آباد ہو گئے تھے، بتدریج ہندوستان میں آنے لگے، چنانچہ علامہ سراج الدین رفاعی حضرت عمر الاطرف ابن حضرت علیؓ کے اعقاب کے متعلق لکھتے ہیں

ولعمر الاطرف ھذا ذیل ببلخ وحران وواسط والیمن وطبرستان والھند و ملتان والسند	اور ان حضرت عمر الاطرف کی اولاد، بلخ، حران، واسط، یمن، طبرستان، ہند، ملتان اور سندھ میں پائی جاتی ہے

اسی طرح حضرت امام حسن کے پوتے ابراہیم الغمر کے متعلق لکھتے ہیں کہ آپ کے دو بیٹے ہوئے ان میں ایک کا نام حسن الشیخ تھا، دوسرے کا ابراہیم طباطبا، حسن الشیخ کے اعقاب کا تذکرہ علامہ موصوف یوں کرتے ہیں

اما حسن الشیخ فاعقب من الحسن وھو اعقب من رجلین ابی جعفر محمد وابی القاسم علی المعروف بابن معیہ وھی امہ انصاریۃ عرف بھا ولھم ذیل طویل بمصر والعراق ومنھم بن ھلی من الھند [1]	لیکن حسن شیخ آپ کے ایک صاحبزادہ حسن سے اولاد ہوئی انھوں نے دو لڑکے ابی جعفر محمد اور ابوالقاسم علی معروف بہ ابن معیہ چھوڑے، معیہ ابوالقاسم کی انصاری ماں تھیں جنسے وہ مشہور ہوئے، انکو گونگی اولاد کثیر مصر اور عراق اور انمیں بعض ہندوستان کے شہر دہلی میں ہیں

عام قبائل عرب کے علاوہ بہت سے مشائخ آئے، جنکا مطمح نظر تبلیغ و ارشاد تھا۔ چنانچہ حضرت خواجہ معین الدین سنجری (متوفی سنہ) خواجہ قطب الدین بختیار کاکی (متوفی ۶۳۴ھ) خواجہ فرید الدین گنج شکر (متوفی ۶۶۴ھ) خواجہ نظام الدین خالدی (متوفی ۷۲۵ھ) وغیرہ نے ارتقائے اُردو میں بڑی مدد دی، چونکہ قومی اصلاح اور روحانی بلاغ و ارشاد کے سلسلہ میں عوام الناس کو آپ حضرات کے ساتھ گہری وابستگی تھی، خواجہ معین الدین سنجریؒ سلطان التمش کے عہد (متوفی ۶۳۳ھ) میں وارد ہندوستان ہوئے۔ خواجہ قطب الدین قصبہ "اوش" سے تشریف لائے تھے، جو ماوراء النہر کے علاقہ میں تھا اسی طرح شیخ فرید الدینؒ قصبہ کھوتوال سے جو ملتان کے علاقہ میں ہے، تشریف لائے، شیخ نظام الدین اولیا

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲) ۱۹۲۹ء میں مصر کی ایک وقیع علمی مجلس "جنتہ الترجمہ والتالیف والنشر" نے شائع کی ہے، موضوع کے لحاظ سے عربی زبان میں یہ پہلی کتاب ہے، اس میں بابلی آشوری، عبری و آرامی، اور عربی زبانوں کی مکمل تاریخ ہے، ان زبانوں کے قدیم و جدید خطوط کے نقوش بھی پائے جاتے ہیں، اس پر ایک تبصرہ لکھا جارہا ہے [1] صحاح الاخبار فی نسب السادۃ الفاطمیۃ الاخیار ص ۲۰، یہ کتاب اب نادر الوجود

کے والد احمد دانیال غزنیں سے ہندوستان میں آئے، دکن کے اسلامی سلاطین کے عہد میں بھی اولیا اکبار ہندوستان میں آئے، اگر ہر شاہی خاندان کے عہد کے بزرگوں کی ایک فہرست مرتب کی جائے، تو پتہ چلے گا، کہ ایرانی شعرا کی طرح عراق عرب، وایران کے صلحا وصوفیہ بھی ہندوستان میں کثرت کے ساتھ آئے اور ان کی بیعت ورشاد نے عوام الناس کی زبان پر گہرا اثر ڈالا

سادات بلگرام جن میں ترمذی، رضوی، وصغراوی ہیں وہ عراق وایران سے آئے، بلگرام میں سب سے پہلے خواجہ عمادالدین تشریف لائے اس کے بعد سید محمد صغری تشریف لائے جو حضرت زید شہید ابن حضرت امام زین العابدین کے اعقاب میں ہیں اور انھیں کے اخلاف گرامی سے یہ شہر علوم ومعارف کا سرچشمہ بنا، خواجہ عمادالدین تو بلاواسطہ عرب سے تشریف لائے تھے لیکن سادات صغراوی عراق یا عجم سے آئے اسی طرح بعض خاندان ترمذ سے آئے، سادات رضوی کے جدامجد کمال الدین غزنین سے تشریف لائے، خواجہ عمادالدین اور سید محمد صغری دونوں خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے مریدوں میں تھے[1]

خواجہ قطب الدین بختیار کاکی ابتدائے ساتویں صدی میں گزرے ہیں اور صفیر مرحوم مؤلف تاریخ بلگرام سید محمد صغری کو آپ کا مرید بتاتے ہیں اس سے نتیجہ نکلتا ہے، کہ سید محمد صغری کا خاندان اواخر ساتویں صدی میں ہندوستان میں آباد ہو گیا تھا، لیکن اس عہد کے تقریباً ڈیڑھ سو برس کے بعد علامہ رفاعی نے صحاح الاخبار لکھی لیکن انھوں نے سادات زیدی کو صرف عراق وحجاز تک محدود بتایا ہے، چنانچہ عیسیٰ موتم الاشبال بن زید شہید کے صاحبزادوں زید، احمد، اور حسین کے متعلق لکھتے ہیں

ولهم عقب طويل وذيل جليل بالعراق والحجاز | انکی کثیر اولاد واعقاب گرامی عراق وحجاز میں پائے جاتے ہیں

سادات صغراوی (بلگرام) اپنا سلسلہ محمد بن عیسیٰ موتم الاشبال بن زید شہید تک پہونچاتے ہیں تعجب ہے، رفاعی نے اس خاندان کے ورود ہند کے متعلق کیوں نہ لکھا، حالانکہ انھوں نے بعض ہندوستانی خاندانوں کے متعلق لکھا ہے، جیسا کہ سطور بالا میں لکھا جا چکا، سید محمد صغری کے جد ششم سید ابوالفرح واسط (   ) کے رہنے والے تھے، اسی لئے سادات صغراوی "واسطی" کہلاتے ہیں

الغرض سندھ کی عربی حکومت مٹنے کے بعد اکثر قبایل جو ہندوستان میں آئے وہ بلاواسطہ عرب سے نہیں آئے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳) ہے، اس کا ایک نسخہ میرے پاس ہے جرمنی، اور انگلستان کے مستشرقین نے اس سے بڑی دلچسپی کا اظہار کیا ہے، چنانچہ انگریز مستشرق سرای ڈینیسن نے اس کی فرمائش پر اس کتاب کا مقدمہ لکھ رہا ہوں، ممکن ہے یہ کتاب علامہ موصوف گب موریل کی طرف سے شایع کرائیں جیسا کہ انھوں نے اپنے مکتوب گرامی میں ظاہر کیا ہے [1] تاریخ بلگرام مؤلفہ سید فرزند احمد صفیر ج ۱ ص ۳-۵

تھے، بلکہ ایران سے آئے ان کی زبان فارسی تھی، اس طور سے ہندوستان کی مادری زبان میں جس میں عربی زبان کے بہت سے عناصر شامل ہو چکے تھے، فارسی زبان مخلوط ہونے لگی، گو پہلی صدی ہجری کے اثر حکومت نے ہندوستان کی سر زمین سے عربی زبان کے بہت سے ادیب جلیل و محدث ثقہ پیدا کئے لیکن جب فارسی کا دور ہوا تو خود مسلمانوں نے بھی سنسکرت و بھاشا کی طرف کافی توجہ کی اور ہنود میں تو فارسی کے ایسے ایسے بے مثل ادیب و شاعر پیدا ہوئے، کہ دنیا آج ان کے بدیہہ افکار و حلاوت زبان پر بہر دل سر دُھنتی ہے، اس کی تفصیل آگے آتی ہے، الغرض ہندوستان میں فارسی زبان کی تاریخ کا آغاز عہد غزنویہ سے متعین کریں تو گویا پانچویں صدی سے تیرہویں صدی تک فارسی زبان نے ہندوستان پر اپنا سکہ جمائے رکھا

عہد غلامان سے لے کر آوان لودی کے درمیان خلجیہ، تغلق، سید وغیرہ نے حکومت کی ان تمام خاندانوں کے دور حکومت میں، سلطنت کی زبان فارسی تھی پھر بھی ہنود نے فارسی کی طرف ایسی توجہ نہیں کی، جیسا کہ عہد مغلیہ میں پایا جاتا ہے، مغلوں کی حکومت نے خود فارسی زبان کی تاریخ میں انقلاب پیدا کر دیا، ایران کے صفوی سلاطین شعر و ادب اور فنون لطیفہ کے بہت بڑے حامی تھے لیکن پھر بھی دربار مغل کا آوازہ جود و سخا اور شہرۂ ادب نوازی اس قدر عالمگیر ہوا کہ ایران سے ہزاروں شعرا وارد ہندوستان ہوئے، عہد اکبری اس کے لئے ممتاز حیثیت رکھتا ہے، محمد مقیم الہروی (مؤلف طبقات اکبری) اور بدایونی (مؤلف منتخب التواریخ) نے تفصیل کے ساتھ سینکڑوں شعرا کے نام گنائے ہیں ابوالفضل نے بھی آئین اکبری میں بہت سے شعرا کا نام لکھا ہے، شیراز، کاشان، تبریز، اصفہان، لاہجان، مشہد کے شگفتہ بیان شعرا دربار اکبری کی شمع فروزاں بن گئے تھے اور ایرانی شعرا کی آمد کا یہ سلسلہ نہ صرف دہلی و لاہور تک محدود تھا بلکہ اودھ، دکن اور بہار میں بھی کثرت سے ان کی آمد رہی، حکومت کے دفاتر، ایرانی شعرا کی آمد، اور قبائل عرب کی ہجرت نے (جن کی زبان فارسی تھی) پنجاب، اودھ، دکن اور بہار پر گہرا اثر ڈالا، اور مقامی باشندوں میں فارسی زبان کا بہت پاکیزہ ذوق پیدا کر دیا۔ چنانچہ اس ضمن میں سب سے پہلے شاہی دربار کی طرف توجہ کیجئے، یوں تو ہر خاندان کے مسلمان بادشاہ کے عہد میں ہندوؤں نے درباروں میں رسوخ حاصل کیا لیکن دربار اکبری نے جس فیاضی کے ساتھ دربار میں ہندوؤں کو جگہ دی اس کی مثال اس سے قبل نہیں ملتی،

دربار اکبری کے ہندو ارباب مناصب

محمد مقیم ہروی (مؤلف طبقات اکبری) کے صاحبزادہ اپنی تاریخ میں فرماتے ہیں،

"چوں تفصیل اسامی امرائے حضرت خلیفہ افاضل پناہ علامی شیخ ابوالفضل در کتاب اکبر نامہ مرقوم قلم بدایع رقم گردانیدہ اند، دریں مختصر بہ ذکر اسامی امرا

کبار اختصاص یافتہ [1]

اس کے بعد جستہ جستہ مفصلہ ذیل ہندو منصبداروں کے حالات لکھے ہیں یہ تعداد صرف ان امراء کی ہے، جو "منصب اعلیٰ" پر فائز تھے، چھوٹے چھوٹے منصبداروں کا حال اکبر نامہ میں پایا جاتا ہے،

راجہ ٹوڈر مل از طایفہ کھتری و نویسندہ بود، و بوسیلۂ مظفر خاں بہ مرتبہ وزارت رسیدہ مدت ہفدہ سال وزیر باستقلال و چہار ہزار سوار داشت "

راجہ رائے سنگھ کو بیکانیر اور ناگور کی حکومت اور چار ہزاری منصب ملا تھا، رائے سال کچھواہہ دو ہزاری رائے درکھمل ہزار و پانصدی، اور راجہ بیر بر دو ہزاری امراء میں تھے، راجہ سرجن رنتھنبھور میں تھا شاہی فوج نے قلعہ کا محاصرہ کیا تو اس نے اطاعت کی اور دربار کے دو ہزاری امیروں میں شامل ہوگیا راجہ روپ سی بیراگی ہزار و پانصدی منصب رکھتا تھا۔ جگت سنگھ ولد راجہ مان سنگھ ہزار و پانصدی امراء کے صف میں تھا راجہ بہارہ مل حکومت مغلیہ کے آغاز ہی میں امرائے کبار میں شامل تھا، راجہ بھگوان داس ولد راجہ بھارت مل کو جو راجہ مان سنگھ کے باپ تھے، پانچہزاری منصب ملا تھا اس خاندان کے ساتھ اکبر اور اس کی اولاد و احفاد کو خاص لگاؤ تھا یہی وجہ ہے، کہ کئی پشت تک راجہ بھارت مل کے بیٹے پوتے اور پرپوتے دربار مغل کے امراء اور منصبداروں میں شامل تھے، ان پر حکومت کو کامل اعتماد تھا۔ مان سنگھ کو بہار و بنگال کی گورنری اور پانچ ہزاری منصب عطا ہوا تھا، راجہ جگن ناتھ پسر راجہ بہارہ مل اور راجہ اسکرن تین ہزاری امراء میں تھے، راجہ لونکرن بھی صف امراء میں داخل تھا، مادھو سنگھ برادر راجہ مان سنگھ دو ہزاری امیروں میں تھا، رام سنگھ ولد راجہ اسکرن سلک امراء میں تھا، اسی طرح رائے پتر داس کھتری قوم سے تعلق رکھتا تھا۔ اور درباری منشیوں میں تھا، اس کے بعد اس کو بلاد ٹھٹھ یا تتہ کی حکومت ملی اسی طرح رامداس کچھواہہ اکبر کے حاضر باش درباریوں میں تھا، بدنی رائے چوہان، اور رائے بھوج ولد رائے سرجن ہزاری امیروں میں تھے، یہاں یہ بات قابل ذکر ہے، کہ جو امراء پانسو نوکر رکھتے تھے، ان پر "امارت" کا اطلاق ہوتا تھا لیکن مفصلۂ بالا امراء کا درجہ "امارت" سے بڑا تھا،

اب سوال یہ ہے کہ ان منصبداروں سے فارسی زبان کو کیا تعلق ہے ؟ اس کے لئے ہمیں عہد حاضر کے

---

[1] اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ میرے پاس ہے، دوران مطالعہ میں اس کتاب کے مصنف کا نام کہیں نہیں ملا، دربار اکبری کے امراء کے سلسلہ میں مولف نے مشکوک طریقہ سے اپنا نام لکھا ہے، لیکن ہمایوں کے سلسلہ میں انہوں نے صاف بتایا ہے، کہ اس کتاب کے مولف کے والد کا نام محمد مقیم ہروی ہے، ظاہر ہے، کہ محمد مقیم "طبقات اکبری" کا مصنف ہے، اس لئے یہ کتاب ایک ایسے خاندان کے فرد نے لکھی ہے، جو ایک مدت سے مغلوں کے دربار سے وابستہ تھا، اس کے اندر اکبر تک خاندان تیموریہ کا مسلسل تذکرہ پایا جاتا ہے،

والیان ریاست پر ایک نظر ڈالنی چاہئے، جن میں مشکل ہی سے کوئی ایسا نکلے گا جو انگریزی زبان سے ناواقف ہو اور اکثر تو انگریزی زبان کے ماہر ہیں اس لئے یہ ناممکن ہے، کہ دربار مغلیہ میں ہندو منصبدار حاضری تو دیتے ہوں، مگر بادشاہ اور امرا کی زبان سے نابلد ہوں، اس کے علاوہ ان میں اکثر وہ تھے، جن کو دربار سے بلا واسطہ سروکار تھا، مثلاً راجہ بھارت مل کا خاندان، رام داس کچھواہہ، راجہ لونکرن وغیرہ آخر الذکر کا لڑکا رائے سنوہر تو فارسی زبان کا بڑا ادیب اور شاعر تھا اور "توسنی" تخلص کرتا تھا

مسلمان اور سنسکرت و بھاشا

سنسکرت اور بھاشا کی تحصیل میں مسلمانوں نے بھی بہت بڑا حصہ لیا، چنانچہ عہد غلاماں ہی سے اس زبان کے شاعر و ادیب، افسانہ نگار دلغوی پیدا ہونے لگے، خسرو دہلوی کی پہیلیاں اس کے ثبوت میں پیش کی جاسکتی ہیں، فیضی اور بدایونی نے سنسکرت سے فارسی میں بہت سی کتابیں ترجمہ کیں دارا شکوہ نے سنسکرت زبان کی کتابوں، اپنشید وغیرہ کے ترجمہ پر کافی توجہ کی، اسی طرح عبدالرحیم خانخاناں تو بھاشا کا ایک مستند شاعر مانا جاتا ہے، چنانچہ محمد حاتم لکھتا ہے

" خانخاناں در قابلیت و استعداد تمام عیار و یکتائے روزگار بود سواد عربی، و ترکی و فارسی و ہندی رواں داشت و بہ زبان فارسی و ہندی شعر نیکو گفتے [1]

وہ سنسکرت زبان سے بھی واقف تھا چنانچہ ایک غریب برہمن نے اس کے دربار میں آکر کہا کہ میں اور آپ سارڈھو ہیں آپ لطف و مسرت سے بسر کریں اور میں پریشاں حالی کا شکار رہوں! تو درباریوں نے سوال کیا کہ حضور یہ برہمن آپ کا ہمزلف کیونکر ہوا، خانخاناں نے جواب دیا کہ "بپتا" اور "سپتا" دو بہنیں ہیں "بپتا" (مصیبت)، اس کے عقد میں ہے، اور "سپتا" (فراغبالی) میری زوجیت میں اس سے پتہ چلتا ہے کہ بھاشا کے الفاظ اس کے دماغ میں کس طرح حاضر رہا کرتے تھے، [2]

اسی طرح اکبر کا ایک منصبدار حسین خاں "ٹکریہ" (متوفی ۹۸۳ھ) تھا، ٹکریہ کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس نے اپنی حکومت لاہور کے زمانہ میں ہندوؤں کو حکم دیا تھا کہ کاندھے کے نزدیک کرتے میں پیوند لگائیں ابن محمد معتیم الہردی لکھتا ہے

و بہ زبان ہندی پیوند را ٹکری می گویند مشہور بہ "ٹکریہ" گشت [3]

چنانچہ دیہاتیوں کے پیرہن میں آج بھی یہ ٹکرہ پایا جاتا ہے،

اسی طرح یوسف عادل خاں دکن کے عادل شاہی خاندان کے بانی کو "سوائی" کہا کرتے تھے، اس کی وجہ تسمیہ

---

[1] اقبالنامہ جہانگیری وقائع سال پنجم [2] کلمات الشعرا تذکرہ خانخاناں [3] تاریخ ابن محمد معتیم الہردی تذکرہ امرائے اکبری

یہ بیان کی جاتی ہے، کہ وہ "سادہ" کا رہنے والا تھا اس لئے عوام کی زبان میں "ساوی" کے بجائے "سوائی" ہوگیا لیکن یہ قرین قیاس نہیں صحیح یہ معلوم ہوتا ہے، کہ وہ حکام دکن میں سب سے زیادہ قوی حکمران تھا اس لئے اہل دکن اس کو "سوائی" ہندسہ کے اعتبار سے کہنے لگے، ابوالقاسم لکھتا ہے،

"ومیان شکستہ زبانان ہند بہ "سوائی" مشہور است چہ کہ سوائی بہ زبان ہندی چہار ویک را می گویند چوں عادلشاہ بہ اعتبار ولایت وشمشیر چہار ویک بر حکام دکن زیادتی داشت بنابراں او بہ این لقب شہرت یافتہ"[1]

آگے چل کر مؤلف مذکور لکھتا ہے، کہ صحیح یہی ہے، کہ "سوائی" ساوی کی تحریف ہے، مگر میرے خیال میں "ساوی" کو سوائی کہنے کی کوئی معقول وجہ معلوم نہیں ہوئی اگر "سوائی" کو فرشتہ کی پہلی رائے (چہار ویک) کے مطابق مانیں تو نتیجہ نکلتا ہے، کہ کس طرح ہندی اور فارسی کا میل جول ہو رہا تھا، فیروز شاہ بہمنی کے حرم میں ہر قوم وملک کی عورتیں تھیں، ان میں راجپوت، بنگالی، گجراتی، تلنگی، کنہڑی، مرہٹی عورتیں بھی تھیں فرشتہ کہتا ہے،

وزباں آنہا ہمہ می دانست

مرزا افضل سرخوش (عہد عالمگیری) نے مسلمانوں کی ہندی اور بھاشا کی معلومات کے متعلق بہت سے واقعات درج کئے ہیں، ایک جگہ فرماتے ہیں،

"بیراگی مردے است آزاد مشرب بہ مذاق فقر آشنائی دار دبیش فقیر مشق می گذراند قصہ از کتب ہندی در زمین شاہنامہ بہ نظم راست بہ راست طرز درآوردہ مطالب تصوف را توضیح نمودہ"[2]

ملا داتا امیر خاں کی سرکار میں منشی تھے، ان کے متعلق مرزا صاحب رقم کرتے ہیں

درمعنی ہندی تلاش بسیار داشت

اسی طرح عاقل خاں دہلی کے بہت نیک نیت، حق شناس، رعیت پرور، اور سخی امیر تھے، انہوں نے مثنوی روم کے طرز میں کتاب مرقع تصنیف کی اور عارفانہ کلام پیش کیا، سرخوش کہتے ہیں

گل وبلبل، وشمع وپروانہ، قصۂ پدماوت، ومدہالت را بہ نظم درآوردہ،

ملا شیدا کے ہمنشینوں میں پانی پت کے ایک شاعر تھے، انہوں نے رام وسیتا کا قصہ نظم کیا تھا، اس کے متعلق مرزا سرخوش فرماتے ہیں

ویک بیت در تعریف عصمت سیتا گفتہ کہ جمیع خوش خیالاں پشت دست گزاشتند ہیچکس قدرت ندارد کہ چنیں بیت تواند گفت وایں یک بیت بہ اعتقاد سخنوراں صاحب انصاف برابر لک بیت است (ص ۲۱۰)

---

[1] فرشتہ مقالہ ۳ [2] کلمات الشعرا ص ۲۶

وہ شعر یہ ہے،

تنش را پیرہن عریاں ندیدہ
چو جان اندر تن وتن جاں ندیدہ

مرزا محمد علی ماہر جیسے نباض سخن نے پہروں اس پر سر دُھنا، یہی وجہ ہے کہ اس ایک بیت کو اہل نظر نے ایک لاکھ بیت کے برابر تصور کیا

اس عہد کے ایک اور شاعر "نسبتی" تھانیسری تھے، یہ بھی بھاشا کے اچھے شاعر ہوئے ہیں، مرزا صاحب فرماتے ہیں

بہ زبان ہندی نیز شعر گفتہ "نسبتی" دراں تخلص می کرد، یعنی "ماہ" "نس" بہ زبان ہند شب را گویند "بھی" "ابرو" یعنی "ابروئے شب" کہ ماہ است، (ص ۲۲۵)

اس عہد کے مسلمان ادیب و شعرا نہ صرف زبان بھاشا سے دلچسپی لیتے تھے، بلکہ ہندوستانی معاشرت و رسوم بھی ان کا موضوع سخن تھے، عہد جہانگیری کا ایک شاعر "ستی" کے متعلق لکھتا ہے،

چناں مستانہ بر آتش نظر کرد
کہ از بدمستیش آتش حذر کرد،

جہانگیر شیر کے شکار کے لئے جاتا ہے، ایک شیر غراں حملہ آور ہوتا ہے، اور اس کے ایک ہندو منصبدار انوپ رائے کو دبوچ لیتا ہے، کشمکش شروع ہوتی ہے، اور وہ امیر بڑی بہادری کے ساتھ شیر کے پنجہ سے نکل آتا ہے، شیر مارا جاتا ہے، اور جہانگیر اپنے امیر کو "رائے سکھ دکھن" کا خطاب دیتا ہے، (اقبالنامہ وقائع سال پنجم)

عالمگیر کے ایک خط سے پتہ چلتا ہے، کہ اس کا لڑکا شہزادہ محمد معظم، بادشاہ کی خدمت میں دو قسم کا آم بھیجتا ہے، اور استدعا کرتا ہے کہ ان کا نام رکھا جائے بادشاہ ان کا نام "رستا بلاس" تجویز کرتے ہیں۔ (ملاحظہ ہو رقعات عالمگیری)

(باقی)

عبدالمالک (آروی)

ضرورت ہے

نگار جنوری، جون و اگست سنہ ۱۹۳۳ء کے پرچوں کی۔ اگر کوئی صاحب علحدہ کرنا چاہیں تو اطلاع دیں۔

منیجر نگار

حسن وعشق کی کشاکش

(تاریخ یونان کا ایک ورق رنگین)

(۱)

صنوبر، —— دیہاتی الھڑ لڑکی حسین بلا کی حسین، دیکھنے والے نے دیکھا نہیں کہ ساری کی ساری آنکھوں کی راہ بدن میں سما گئی۔ رگ رگ میں دوڑ گئی۔ کلیجہ میں اتر آئی۔ دل وجگر چھلنی ہو گئے۔ خون جوش میں آگیا۔ آنکھوں میں نور بھر گیا۔ چودہ طبق روشن ہو گئے

غارتگرِ دیں وہ بتِ کافر تھی سراپا۔ اللہ کی قدرت

پاری، —— ٹرائے کا نوجوان بادشاہ، شکار کھیلتا ہوا اُدھر سے گذرا۔ صنوبر پر نظر پڑی۔ سناٹے میں آگیا۔ زمین پاؤں تلے سے نکل گئی۔ بے اختیار آگے بڑھا۔ حسینہ کے قدموں پر جھک گیا۔ وہ مسکرائی، کھلکھلا کر ہنسنے لگی، بادشاہ کی آغوش میں آگئی۔ دونوں ایک ہو گئے

حکایت بود بے پایاں بخاموشی ادا کردم

رات دن عاشق معشوق ایک دوسرے سے جدا نہ ہوتے اور یونہی ایک زمانہ گذر گیا۔ ایک دن ٹرائے کے شاہی باغ میں دونوں بیٹھے ایک دوسرے کو محبت سے تک رہے ہیں۔ صنوبر نے پوچھا: "کیا سچ مچ تم مجھ سے سچی محبت کرتے ہو؟ اچھا قسم کھاؤ کسی اور کو نہیں چاہو گے!"

—— "میری جان! تمھارے ننھے سے دل میں یہ وسواس کیوں آتے ہیں؟ قسم تمھارے سر کی میں قیامت تک تمھارے سوائے کسی اور کو نہیں چاہوں گا۔ پیاری! یہ کیا غضب ہے کہ تم میری محبت میں اتنا شک کرتی ہو!"

—— "پیارے! یہ سچ ہے، تم مجھے ضرور چاہتے ہو۔ مگر —— تمھاری محبت کا کیا اعتبار! کل حسن کی دیوی اسپارٹا کی ملکہ ہیلن کو دیکھ لو گے اُسے چاہنے لگو گے اور میری محبت تمھارے دل سے یک قلم کافور ہو جائے گی۔ پیارے! قسم کھاؤ تم کبھی ہیلن کو نہیں چاہو گے!"

صنوبر کی آنکھوں سے دو بڑے بڑے آبدار موتی نکلے اور پھول سے رخساروں پر چمکنے لگے۔ پاری حیرت میں ہے

" ہیلن ، ہیلن ! - یارب یہ ہیلن کیا بلا ہے ؟ الگزنڈرا بھی یہی کہتی ہے - کیلوپیٹرا نے بھی یہی کہا - اور اب تم بھی یہی کہتی ہو - کوئی بتاؤ کہ یہ ہیلن ہیں کونسا جادو بھرا ہے - جو دیکھتا ہے اس کا فکار ہو جاتا ہے - میں ہیلن کو ضرور لونگا دیکھوں میرا دل کیسے چھینتی ہے ؟ - لو میں چلا - پیاری ! نہ روکو ، جانے دو - میں چلا - اور وہ چلا گیا "

ٹرائے سے چل کر پاری سیدھا اسپارٹا پہونچا - یونان کے بادشاہ مونی لسس کا مہمان ہوا - اُسے ملکہ حُسن وجمال بادشاہ مونی لسس کی بیوی ، ہیلن کی خدمت میں آسانی سے باریابی حاصل ہوگئی - اُس نے ملکہ کو دیکھا ، ملکہ نے اسے دیکھا - آنکھوں سے آنکھیں لڑیں - دل سے دل ملے - ایک ہی نظر میں تمام معاملات طے ہوگئے ، پیچ کھل گئے ، گتھیاں سلجھ گئیں - واقعی ہیلن ، کچھ اور ہی چیز تھی

(۲)

بھیانک رات - تاریکی - سناٹا - تیز رو گھوڑے پر ایک بہادر شہسوار اور ایک پری پیکر حسینہ ہوا سے باتیں کر رہے ہیں ! خوفناک دن - طوفان - شور - قیامت سمندر کی موجوں پر ایک نوجوان ملاح کسی ماہ طلعت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کشتی چلا رہا ہے !

یہ دونوں کون ہیں ؟

طرح طرح کی افواہیں گشت کر رہی ہیں - ہر جگہ یہی چرچا ، ہر طرف یہی قصہ ، یونان کی رگِ حمیت جوش میں آگئی - ایشیا والوں سے انتقام کی تیاریاں ہیں - بچہ بچہ کی زبان پر ہیلن کے اغوا کی داستان ہے - لوگ اپنی اپنی سمجھ کے مطابق قیاس آرائیاں کرتے ہیں :- " یہ ہو نہیں سکتا ! - اگر وہ خود راضی نہ ہوتی تو کس کی مجال تھی ! - اور یہ بھی ممکن نہیں کہ وہ راضی ہو - تو پھر اس کا بھید ؟ وہ پاری کے ساتھ کیوں چل دی ؟ "

کارکنان قضا و قدر شوق و استعجاب سے کرۂ زمین کے مستقبل کو دیکھ رہے - شاید کوئی عظیم الشان انقلاب آنے کو ہے ! شاید پھر زمین کا طبقہ الٹنے کو ہے ! ہواؤں میں ہیلن اور پاری کی داستان پھیلی ہوئی ہے - آسمانوں پر یہی چرچا ہے - وہ پاری کے ساتھ کیوں ...... ؟

جنگ چھڑ گئی ! - عالمگیر جنگ - خونخوار ، خونریز ، ہولناک - جوپیٹر کا قہر - جوپیٹر کی پناہ ! الامان الحفیظ ! -

کچھ تاجدار اسپارٹا (یورپ) کی حمایت میں ہوگئے - کچھ ٹرائے (ایشیا) کی - برسوں لڑائی جاری رہی دو چار ، پانچ چھ ، سات آٹھ ، دس بارہ برس گذر گئے اور جنگ کی آگ کم نہ ہوئی بڑھتی چلی گئی

آخر ، تا بکے ؟ - ٹرائے کی فوجوں کے پاؤں اکھڑ گئے - پاری مارا گیا - ایشیا والوں کو شکست ہوئی - مونی لسس جیت گیا - فتح کے شادیانے بجنے لگے - قتل عام شروع ہوگیا

موتی لس، ہیلن کے قتل کرنے کے لئے دیوانہ وار شاہی محل کی طرف دوڑا۔ اُدھر سے وہ استقبال کو نکلی! عظمت وحرمت کی دیوی! حسن وجمال کی مورت! اس نے قاتل کی آسانی کے لئے آنچل ہٹا دیا، سینہ کھول دیا، تصویر صفت سیدھی کھڑی ہوگئی، خاموش، متین، آفتاب، ماہتاب

خونخوار شہنشاہ سکتہ میں آگیا۔ دم بخود رہ گیا۔ اس اُبھرے ہوئے سینہ کو چیروں یا اس ہنس کی سی گردن کو کاٹوں؟ ہاتھ ڈھیلا پڑ گیا۔ قریب تھا کہ خنجر ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑے۔ تھرتھرانے لگا۔ ڈر گیا۔ دنگ ہوگیا۔ ہیلن پہلے سے کہیں زیادہ حسین، کہیں زیادہ شگفتہ۔ حسن وعفت کی مکمل تصویر۔ صانع قدرت کے کمال کا مرقع۔ گلشن فردوس کا بہترین گلاب۔ اس کی عمر بڑھنے کے بجائے بارہ برس گھٹ گئی تھی۔ نئے سرے سے کم سن ہوگئی تھی۔ سولہ برس کی لڑکی!

کسی نے پیچھے سے کہا:۔۔۔۔ "جہان پناہ! ہاتھ روکئے! یہ کیا غضب ہے!۔ جوپیٹر نے عالی جاہ کو کامیاب بنایا۔ پاری مارا گیا۔ دشمن پامال ہوئے۔ ملکہ حسن وجمال واپس مل گئیں۔ اب یہ خون کیسا!۔ ملکہ کو ساتھ لیجئے اور اسپارٹا چلئے۔ آخر یہ جنگ اسی لئے تو ہوئی تھی کہ ملکہ واپس لائی جائیں!

موتی لس چپ تھا۔ یہ جنگ کیوں ہوئی؟ یہ عظیم الشان جنگ؟ بارہ برس کی مسلسل جنگ؟ کیا اسی لئے کہ ہیلن واپس لائی جائے! شاید!۔ مگر میں تو یہ نہیں سمجھا تھا۔ کہیں کوئی اور مقصد نہ ہو! کچھ یاد نہیں آتا۔ شاید! ۔۔۔۔۔ مگر یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ ۔۔۔۔ نہیں

(۳)

گناہ، بالجبر، بدترین، ارزل ترین، اسفل ترین۔ سپاہ سالار اعظم "ٹی ٹس" نے زیادتی کی۔ خود خداوند قدوس کے حضور، خود خداوند جوپیٹر کے مندر میں، محراب کے پاس، مورت کے سامنے، دن کے وقت، الگزنڈرا پاری کی بہن۔۔۔۔۔۔ صاف، صریح، ظلم عظیم۔ اثم کبیر

ٹی ٹس کا بیان ذرا مختلف ہے۔ وہ کہتا ہے عبادت گاہ میں اُس وقت خداوند کی مورت موجود نہ تھی۔ لہٰذا مجھ پر خداوند کی توہین کا الزام غلط ہے۔ مگر اس کی حجت مسموع نہ ہوئی اور خداوند جوپیٹر کی توہین کی پاداش میں اُسے پھانسی کی سزا دیدی گئی۔ نیز اسی معصیت کے کفارہ میں لگاتار چالیس دن تک روز ہو سو بکروں کی قربانی کا سلسلہ جاری رکھنا ضروری سمجھا گیا۔ تمام فاتح تاجداروں کی یہی رائے تھی۔ صرف بادشاہ موتی لس اس رائے سے متفق نہ تھا

موتی لس نے کہا:۔ ٹی ٹس کا قصور صرف اتنا ہے کہ اس نے جلدی کی، اگر ایک روز ٹھہر جاتا تو الگزنڈرا بطور لونڈی کے اس کے حوالہ کردی جاتی اور کوئی گناہ نہ ہوتا۔ اب ٹی ٹس مارا جاچکا ہے۔ قربانیاں بھی تھوڑی بہت ہو چکی ہیں، لہٰذا اب اس اُجڑے ہوئے شہر میں پڑے رہنا اور قربانیوں کا سلسلہ جاری رکھنا، مناسب نہیں۔ اگر خداوند جوپیٹر کو اس شہر کی بے حرمتی منظور نہ ہوتی تو یہ شہر ویران نہ ہوتا، لوٹا نہ جاتا۔ میں اتنی لمبی قربانیوں کا قائل نہیں ہوں

میرے نزدیک یہاں رکنا بے سود ہے

بادشاہ آگونس نے جواب دیا:۔ تم اس گناہ کا احساس نہیں کرسکتے! تمھارے گھر کا رنگ ہی کچھ اور ہے۔ ہیلن کو دیکھو کتنوں نے اُسے شکار کیا اور کتنوں کو اس نے شکار کیا! تم ٹی ڈلس کے گناہ اور خداوند قدوس کی توہین کا کیونکر تصور کرسکتے ہو! اپنا فلسفہ پاس رکھو۔ قربانی کے فرائض رُک نہیں سکتے!

موئی لس ——— میں یہ منطق سمجھنے سے قاصر ہوں

آگونس ——— اچھا، تو تم چلے جاؤ۔ اور اپنا لشکر ساتھ لے جاؤ۔ ہم اور ہماری فوجیں یہیں ٹھیریں گی

موئی لس ——— میں کل روانہ ہوں گا

خداوند جوپیٹر کے مندر میں منبر کی سیڑھیوں پر ہیلن کھڑی قربانی کے فرائض انجام دے رہی ہے۔ اس کی روشن پیشانی پر پسینہ کی بوندیں جھلک رہی ہیں۔ سامنے مقدس آگ جل رہی ہے جس میں وہ آہستہ آہستہ گھی ڈال رہی ہے۔ راہب جوپیٹر کی حمد گا رہے ہیں۔ آگ کی گرمی سے ہیلن کا رنگ سرخ ہو رہا ہے۔ ہزاروں لاکھوں سپاہیوں کی نگاہیں خداوند جوپیٹر کے بجائے اسی حسن کی جیتی جاگتی مورتی کی پوجا کر رہی ہیں۔ جوپیٹر کی مورت پر کسی کی بھی نظر نہیں۔ البتہ ہیلن اسی خداوند قدوس کے مقدس سونے کے پتلے کو دیکھ رہی ہے۔ اس کی عبادت بے لوث، بے عیب، بے ریا ہے۔ شام ہوگئی اور ہیلن پہلے دن کی قربانی کے فرائض انجام دے چکی۔ اب انتالیس دن اور باقی رہ گئے

رات کے وقت ہیلن اور موئی لس میں باتیں ہو رہی ہیں

موئی لس ——— ہم کل اسپارٹا روانہ ہوں گے

ہیلن ——— ایں!۔ اتنی جلدی!۔ اور قربانیاں!

موئی لس ——— کیا اب بھی جلدی ہے! تم ٹھہرنا چاہو تو شوق سے ٹھہرو

ہیلن ——— نہیں۔ میرے لئے تو ہر جگہ برابر ہے۔ ٹرائے ہو یا اسپارٹا۔ یورپ ہو یا ایشیا۔ البتہ سپاہیوں کے احساس کا خیال ضروری ہے۔ ان کے دلوں سے قربانی کی اہمیت کیونکر دور کی جاسکتی ہے!۔ اور پھر جیسا تم مناسب سمجھو۔ تعجب ہے کہ میرے تعاقب میں تو اتنی جلدی نہیں کی گئی تھی۔ اور قربانی کی تمام رسمیں ایک ایک کرکے ادا کی گئی تھیں۔ حالانکہ وہ جلدی کا محل تھا نہ کہ اب۔ میرے خیال میں قربانی کی رسمیں ادا ہولیں تو چلیں۔ اس کے علاوہ لشکری سب بہت تھک بھی گئے ہیں۔ تھک کے چور ہو گئے ہیں۔ انھیں کچھ دنوں کے لئے آرام مل جائے گا۔ لشکریوں کو ناخوش کرنا مصلحت کے خلاف ہے کہو، تم کیا کہتے ہو؟

موئی لس ——— خدا ہماری قربانیوں کا بھوکا نہیں۔ آگونس اور اس کے ساتھی یہاں بیٹھے قربانیاں کرتے رہیں گے۔ میں اپنے لشکر کے ساتھ کل روانہ ہو جاؤں گا

ہیلن ——— میرے خیال میں تمھارا بھائی آگومنس حق پر ہے اور تم غلطی پر ہو
مونی لس ——— شاید میرا دماغ چل گیا ہے - مگر میں صبح روانہ ہوں گا - تم چلوگی یا نہیں ؟
ہیلن ——— میں چلوں گی

(۴)

کشتی ڈول رہی ہے اور ہوا مخالف ہے - ہیلن کی زلفوں سے تیز ہوا کے جھونکے بدمستیاں کر رہے ہیں - اس کی آنکھیں دور سمندر کی حد پر گڑی ہوئی کتاب شفق کا مطالعہ کر رہی ہیں - وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر، سمندر کے تلاطم سے بے پروا، زمانہ کی نیرنگیوں سے بے فکر، کسی اور ہی عالم میں مدہوش ہے - سپاہی بار بار اس کی طرف دیکھتے اور کہتے ہیں :- " اگر یہ آسمانوں کی دیوی ہمارے ساتھ نہ ہوتی تو کشتی ڈوب جاتی اور ہم سب مر جاتے - بھلا خداوند جوپیٹر کا مقابلہ کون کر سکتا ہے ! "

ہیلن نے کروٹ بدلی - ملاحوں کے ہاتھ خود بخود رک گئے - سب ہمہ تن گوش ہو گئے - وہ کہنے لگی :-

" ہم کہاں جا رہے ہیں ؟ "

مونی لس :- —— اسپارٹا !

ہیلن ——— نہیں - یہ اسپارٹا کا آسمان نہیں ہے

کئی ہفتے گذر گئے اور شاہی بیڑا اسپارٹا نہ پہنچ سکا - ادھر ادھر بھٹکتا رہا - سامان رسد بھی ختم ہو گیا - چاروں طرف ہلاکت ہی ہلاکت نظر آنے لگی - بڑی مدت کے بعد آسمان پر کچھ مرغابیاں دکھائی دیں - پھر کنارہ نظر آیا - مونی لس چلا اٹھا :- " ہیلن ! وہ دیکھو ! اسپارٹا کا ساحل آگیا ! "

ہیلن نے کہا :- " نہیں یہ اسپارٹا کا ساحل نہیں - کوئی اور بستی ہے "

وہ اسپارٹا نہ تھا - مصر کی زمین تھی - کشتی رکی تو سب سے پہلے ہیلن بے دھڑک کنارہ پر اتر آئی - لب ساحل شاہی خیمے نصب ہو گئے - مصر میں اک دھوم مچ گئی - " ہیلن آئی ! ہیلن آئی ! جنگ عظیم کی دیوی ! حسینان عالم کی رانی ! معشوقان جہاں کی ملکہ ! " - مصر والے حیرت میں تھے - یہ کوئی بشر ہے، یا حور ہے، یا پری ہے، یا آسمان کا تارہ !

ہیلن کو مصر کی سرزمین بہت پسند آئی - اس نے اپنے خاوند سے کہا :- یہ کیسی حیرت انگیز زمین ہے ! یہاں کی ہر چیز بے نظیر، بے عدیل، بے بدل ! میں تو کہتی ہوں کہ تہذیب و تمدن میں بھی مصر، اسپارٹا اور ٹرائے دونوں سے بڑھ کر ہے

مونی لس ——— مجھے اتنی فرصت نہیں کہ یہاں کے تمدن کا اپنے تمدن سے مقابلہ کروں - ہمیں چاہیئے کہ جلد سے جلد تمام سامان رسد فراہم کریں اور چل نکلیں ! میرے لئے ایک ایک منٹ پہاڑ ہو رہا ہے

ہیلن ——— اور قربانیاں!

موبی لس ——— کیسی قربانیاں! قربانیاں قطعاً غیر ضروری ہیں - ہمیں چلنے میں دیر نہیں کرنی چاہیے!

ہیلن ——— قربانیاں بہت ضروری ہیں - کیونکہ ہمارے ساتھی بد دل ہو رہے ہیں

موبی لس ——— تم انھیں بد دل نہیں کرو گی تو وہ بد دل نہیں ہوں گے - تم چلنے کو تیار ہو؟

ہیلن ——— میں تیار ہوں

رات کو موبی لس اپنی چادر کے اندر ایک بھیڑی کا بچہ چھپا لایا - اس نے بچہ خداوند جوپیٹر کی تصویر کے سامنے ذبح کر دیا - اور ہاتھ جوڑ کر دعائیں مانگنے لگا - دیر تک دعائیں مانگتا رہا - ہیلن جاگ رہی تھی - دل ہی دل میں مسکرانے لگی - اور خاموش پڑی رہی

چند روز بعد کشتیاں روانہ ہوئیں اور ہوا پھر مخالف ہو گئی - نہ معلوم موبی لس کے نصیبوں میں کیا لکھا تھا - تند ہوا، پُر شور سمندر، بد دل ملاح، ہر طرف ناکامی ہی ناکامی کا سامنا تھا - دوسرے دن کشتی جزیرۂ مردہ کے ساحل پر جا لگی - پھر ہیلن جلدی سے خشکی پر اتر آئی - موبی لس حیران تھا یہاں اترنے کا حکم کس نے دیا - اور کب دیا؟ مگر وہ خاموش رہا کیونکہ سپاہی بد دل تھے اور سمندر میں تلاطم تھا

ہیلن اس شور بنجر زمین میں بھی چاروں طرف گشت لگایا کرتی - یہاں نہ کوئی آدم نظر آتا نہ آدم زاد - نہ پینے کو پانی نہ کھانے کو دانہ - سمندر کی شوریت نے جزیرہ کی مٹی کو زہریلا بنا دیا تھا

کئی ہفتے گذر گئے - پھر سامان رسد گھٹ گیا - اور سپاہی بھوک سے پریشان ہونے لگے

موبی لس نے ہیلن سے کہا:- "مصر واپس چلنا چاہیے - ورنہ یہاں سب بھوک سے مر جائیں گے - مصر یہاں سے ایک ہی دن کے فاصلہ پر تو ہے" ——— ہیلن نے جواب دیا:- "یہاں ایک دن بھی رکنا مناسب نہ تھا تعجب تم اتنی مدت کیوں ٹھہرے؟"

اسی وقت چند پریشان حال سپاہی اجازت لے کر خیمہ کے اندر داخل ہوئے اور کہنے لگے:-

"جہاں پناہ! ہم نے ہمیشہ وفاداری سے آپ کا ساتھ دیا - مگر اب مجبور ہیں ساتھ دے نہیں سکتے - ہم نہیں چاہتے کہ یہاں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جائیں - آخر ہمیں کس جرم کی سزا میں یہاں قید رکھا گیا ہے، جہاں نہ دانہ ہے نہ پانی - نہ آدم نہ آدم زاد - نہ چرند نہ پرند" ——— موبی لس ——— ہم مصر جانے کا فیصلہ کر چکے ہیں - جاؤ تیار ہو جاؤ! - آج دوپہر سے پہلے لنگر اٹھ جائیں! - جلدی کرو جاؤ کیوں نہیں جاتے؟ کیا کھڑے ہو؟ کیا کہتے ہو؟ کچھ اور کہنا ہے؟ بولو؟

"جہاں پناہ! قربانیاں!" ——— (باقی آئندہ)

(ترجمہ) محمد اسحاق (امرتسری)

انگریزوں کی آئینی آزادی

یوں تو ہر انگریز بادشاہ کا ماتحت ہے اور اس لحاظ سے اس کو انگلستان کی رعیت کہا جاسکتا ہے لیکن فی الحقیقت تمام شہری حقوق (Rights of Citizenship) جو کسی آزاد سے آزاد ملک میں لوگوں کو حاصل ہیں وہ اس کو بھی حاصل ہیں اس لئے اس کو اپنے ملک کا (Citizen) کہنا چاہئے۔ بادشاہ سے اس کا تعلق قدیم نظام جاگیری (.... System) کے زمانہ سے ہے۔ لیکن وہ تعلق اس قسم کا ہے کہ وہ قومیت کے ترقی میں معین ہے اور (Citizenship) کے حقوق میں حائل نہیں ہے۔ اس کے اور عمدہ نتائج نظر انداز کر کے بھی آئینی اعتبار سے ایک نتیجہ اس کا یہ ہے کہ بادشاہ کو تسلیم کرنے کے بعد ہر شخص کو انگلستان میں رہنے سے تمام حقوق برٹش رعایا ہونے کے ہو جاتے ہیں۔ اسی اصول کی بنا پر جب (Hanover) ہینوور خاندان کا بادشاہ جارج اوّل تخت نشین ہوا تو (Hanover) جو جرمنی میں ہے وہاں کے لوگوں کو پارلیمنٹ میں بیٹھنے اور ووٹ دینے کا حق حاصل ہو گیا۔ یہ قصہ ایک معرکۃ الآرا مقدمہ میں اس وقت طے ہوا جبکہ یہ سوال اٹھا کہ بادشاہ جبکہ انگلستان کا تاج پا گیا ہو تو وہ بچہ جو (Edinburgh) میں پیدا ہوا ہو وہ تخت پا سکتا ہے یا نہیں اور آیا وہ ملکی یا غیر ملکی سمجھا جاوے گا۔ اس مقدمہ میں یہ طے پایا کہ وہ ملکی سمجھا جاوے گا۔ اس طرح انگلستان میں صرف ایک چیز جو ضروری ہے وہ بادشاہ کو تسلیم کر لینا ہے۔ اس کے بعد آدمی آدمی کے درمیان کوئی فرق نہیں رہ جاتا اور جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا وہ پارلیمنٹ وغیرہ کا ممبر اور ووٹر بن سکتا ہے۔ وہ میونسپل ووٹر بھی بن سکتا ہے۔ سول یا ملٹری ملازمت حاصل بھی کر سکتا ہے اور بہ استثنار چند حالتوں کے جلاوطن نہیں ہو سکتا لیکن یہ واضح رہنا چاہئے کہ غیر ملکی کو بھی انگلستان میں چند حقوق حاصل ہیں۔ حالانکہ یہ پہلے نہ تھے۔ مثلاً ایک غیر ملکی وہاں زمین حاصل کر سکتا ہے۔ اور ورانتاً بھی زمین پا سکتا ہے اور بعض پیشوں کو بھی حاصل کر سکتا ہے مثلاً وہاں ڈاکٹر یا بیرسٹر ہو سکتا ہے

فرانس اور امریکہ میں اس قسم کا کوئی قاعدہ نہیں ہے۔ اور چونکہ وہاں کسی بادشاہ کی اطاعت وغیرہ لازم نہیں ہے اس لئے (Citizenship) کے حقوق پر وہاں بہت اہمیت دی جاتی ہے اور آزادی پر بڑا فخر کیا جاتا ہے۔ ایک نقص ان کے نظام میں یہ ہے کہ جب کوئی نیا ملک امریکہ یا فرانس کے تحت میں ہوتا ہے تو وہ ایسے کسی مرکز کو نہیں پاتا جس کی طرف وہ رجوع کر سکے۔ جیسا کہ برٹش رعایا بادشاہ سے بہ آسانی رجوع کر سکتی ہے۔ دیگر ممالک میں وہ حقوق بھی غیر

ملکیوں کو حاصل نہیں ہیں جو انگلستان میں غیر ملکی برٹش رعایا کو حاصل ہیں مثلاً (phillipines) کے امریکہ کے تحت میں ہونے کے باوجود وہاں کے باشندوں کو امریکہ میں (Citizenship) کے حقوق حاصل نہیں ہو سکتے اسی طرح گو الجیریا (Algiers) کے مسلمان فرانس کے ماتحت ہیں لیکن ان کو فرانس میں کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ برخلاف اس کے ہر برٹش رعایا کو صرف (British Citizenship) نہیں بلکہ (British Nationality) کے بھی حقوق حاصل ہو سکتے ہیں

عام طور پر (British Nationality) کے حقوق حسب ذیل وجوہ پر حاصل ہو سکتے ہیں :-

(۱) کسی برٹش ڈومینین (نو آبادی) یا برٹش جہاز پر پیدا ہونے سے

(۲) باپ کے برٹش ہونے سے

(۳) اس ملک کا باشندہ ہونے سے جو سلطنت برطانیہ میں شامل ہو جائے

(۴) (Certificate of Nationalisation) حاصل کر لینے سے

(۵) کوئی عورت اگر کسی برٹش سے شادی کرے تو یہ حقوق حاصل ہو جاتے ہیں

انگلستان کے ...... آئین کے اعتبار سے آزادی کو تین مختلف طریقہ پر تقسیم کیا جا سکتا ہے

اول - پارلیمنٹ کی آزادی اور تاج کے حدود

دوم - باشندگان ملک کی روزانہ زندگی میں مداخلت کی کمی

سوم - قانونی شیرازہ بندی کی وسعت

نمبر اول و دوم کے متعلق یہاں لکھنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے کیونکہ پارلیمنٹ - تاج - اور قانونی فضیلت پر جو کچھ پہلے لکھا گیا ہے۔ اس سے اس مسئلہ پر کافی روشنی پڑتی ہے - یہاں پر صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ ایک انگریز اپنے طرز نظام کے ہر رُخ اور ہر شعبہ میں اپنے دماغ - جسم اور جائداد کی کامل آزادی چاہتا ہے - اور اسی کو نظام کا بنیادی اصول سمجھتا ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس کے مُلک کے نظام میں اُس کے لئے شکنجے اور حدود نہیں ہیں - وہ تو موجود ہیں لیکن وہ ان کو فطری اصول نظم و تنظیم سے آگے تجاوز ہونے دینا نہیں چاہتا

نمبر ۳ کے ضمن میں خاص طور پر دو باتیں شامل ہیں - آزادی نقل و حرکت و آزادی تقریر

قدیم زمانہ میں بادشاہ کو یہ اختیار حاصل تھا کہ اپنی رعایا میں سے جس کو چاہتا گرفتار کر سکتا اور قید کر سکتا تھا لیکن (Habeas Corpus Act) یعنی " قانون لزوم تحقیقات محبوس " نے جو ۱۶۷۹ء میں پاس

ہوا بادشاہ کے اس اختیار کا قلع قمع کردیا۔ اس ایکٹ کی رُو سے تمام برٹش رعایا ہر قسم کے حبس بے جا سے محفوظ رکھی گئی ہے۔ گورنمنٹ کا کوئی افسر کسی شخص کو بے جا قید نہیں کرسکتا۔ اور اگر گورنمنٹ یا کوئی افسر یا کوئی معمولی آدمی کسی کو حبس میں رکھے تو اس کے خلاف قانونی کارروائی عمل میں لائی جاتی ہے۔ اس اصول کا نفاذ تو بہت پہلے سے تھا لیکن یہ ایکٹ اس وقت پاس ہوا جبکہ پریوی کونسل نے ایک شخص مسمی فرانسس جنکنس (Francis Jenkins) کو ایک سیاسی تقریر کی وجہ سے قید کردیا تھا۔ اور اس فیصلے کے خلاف کوئی عدالت اور جج سننے کو تیار نہیں ہوتا تھا

اسی ایکٹ کی رُو سے رعایا کو یہ بھی حق دیا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص فوجداری کے کسی جرم میں قید کیا جائے یا حوالات میں بند کیا جاوے تو اس کی طرف (Lord Chancellor) یا جج کو عرضی دی جاسکتی ہے کہ (Habeas Corpus) کے ذریعہ سے اُس افسر کو حکم دیا جاوے جس نے اوس کو محبوس کر رکھا ہے کہ وہ فوراً عدالت میں اس کو حاضر کرے۔ اس حکم کے جاری ہوتے پر جج کا فرض ہوجاتا ہے کہ وہ دو دن کے اندر اس کو بلا ضمانت یا ضمانت پر چھوڑ دے۔ اگر جج ایسا نہ کرے تو پانچسو پونڈ تک جرمانہ کا مستحق ہوگا

اس قانون کو ۱۶۸۹ء کے (Bill of Rights) نے اور بھی مضبوط کردیا کیونکہ اس سے بہت بھاری ضمانت طلب کرنے کی ممانعت ہوگئی۔ ۱۸۱۶ء کے ایکٹ نے اس قانون کی وسعت کو اور بڑھا دیا کیونکہ اس ایکٹ کی رُو سے علاوہ فوجداری کے جرائم کے اور کسی قسم کی گرفتاری اور قید پر بھی یہ ایکٹ نافذ تھا

یہ ایکٹ ایسی کارروائیوں میں دخل نہیں دیتا جو جائز ہیں۔ مثلاً قانون فوجداری کی رُو سے بعض دفعات کے تحت میں ملزم کی گرفتاری جائز ہے۔ اسی طرح عدالت عالیہ کے ججوں کو توہین عدالت کرنے میں ملزم کو قید کرنے کا اختیار ہے پارلیمنٹ بھی خاص صورتوں میں بعض لوگوں کو قید کرنے کی مجاز ہے۔ جنگ کے زمانہ میں (Defence of the Realm Act) کے ذریعہ سے کچھ اختیارات قید کرنے کے اور نقل و حرکت روکنے کے حاصل کئے گئے تھے۔ ایسی صورتوں میں (Habeas Corpus Act) کا نفاذ نہیں ہوسکتا

اگر ایک شخص اپنی بیوی کی آزادی کو قطعی روک دے سوائے اس حالت کے جبکہ وہ کسی کے ساتھ بھاگنے والی ہے تو (Habeas Corpus) کی کارروائی اس کے خلاف ہوسکتی ہے۔ اس ایکٹ کی کارروائی کرنے کا حق صرف بادشاہ کی رعایا ہی کو نہیں بلکہ اوروں کو بھی حاصل ہے۔ یہاں پر ایک مقدمہ کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا (James Somerset) ایک حبشی غلام تھا۔ وہ (Virginia) سے ۱۷۷۲ء میں انگلستان لایا گیا۔ وہ اپنے مالک کے پاس سے بھاگ گیا۔ مگر گرفتار کرکے ایک جہاز پر بٹھایا گیا۔ اس غلام کی طرف سے (Habeas Corpus) کی کارروائی کی گئی اور جب جہاز واپس آیا تو لارڈ منس فیلڈ (Lord Mansfield) جو اس وقت (Chief Justice)

تھے یہ فیصلہ کیا کہ غلام، ننگ تہذیب و تمدن ہے اور کوئی چیز غلامی کی حامی نہیں ہو سکتی - چنانچہ وہ رہا کر دیا گیا - انھوں نے اپنے فیصلہ میں لکھا کہ انگلستان کی فضا غلامی کے تخیل کو برداشت نہیں کر سکتی - شاید ہمارے ہندوستانی بھائی اس مسئلہ کو ایک حال کے واقعہ سے زیادہ آسانی سے سمجھ سکیں گے - ہمارے ایک دوست حال میں ایک نوکر اپنے ساتھ ولایت لے گئے - انگلستان میں نوکر اور مالک میں وہ امتیاز نہیں ہے جو یہاں ہے - وہاں اس کے ساتھ سفر کرنا کھانا کھانا عیب نہیں ہے بلکہ (Please & Thanks) کا لفظ جیسا اوروں کے ساتھ استعمال کیا جاتا ہے اس کے ساتھ بھی ہر وقت استعمال کیا جاتا ہے - چنانچہ جب ایک بہت بڑے پنشن یافتہ افسر نے جو ہندوستان میں بڑے بڑے لوگوں کے ساتھ بھی امتیازی برتاؤ کرتے تھے جب ان کی دعوت کی تو نوکر کو بھی اپنے ساتھ کھانا کھلایا اور اپنے داہنے ہاتھ پر موٹر میں بٹھا کر سیر کروائی - ہندوستان میں اس کے خلاف جو نوکر کے ساتھ برتاؤ کیا جاتا ہے وہ سب پر روشن ہے

فرانس میں بھی ۱۷۳۸ء ایک اس قسم کا مقدمہ ہوا تھا - اس میں بھی غلام کے موافق طے پایا تھا - لیکن امریکہ کا آئین کچھ اور کہتا ہے - وہاں کے آئین کے الفاظ یہ ہیں کہ " جو آدمی کسی خدمت یا مزدوری کے لئے مقرر کیا جاوے اور وہ بھاگے تو وہ چھوڑا نہیں جائے گا بلکہ وہ اس مالک کے حوالے کیا جائے گا - جس کی مزدوری وہ کرتا تھا - قانون کی یہ بندش انگلستان کے مندرجۂ بالا مقدمہ ہی کی وجہ سے ہوئی اور اس سے دونوں اقوام کے تخیل کی روش معلوم ہوتی ہے

آزادی تقریر یا تحریر آزادی کا سب سے اہم جزو ہے - اسی حق آزادی کے ذریعہ سے انسان اپنے خیالات کا اظہار کر سکتا ہے - اور اخلاقی تمدنی و سیاسی اصولوں کی تبلیغ کر سکتا ہے - تہذیب کے ارتقا میں اس آزادی کا سب سے بڑا ہاتھ ہے اور جن اقوام نے اس کی اہمیت کا پورا اندازہ نہیں کیا وہ ترقی کی دوڑ میں بہت پیچھے رہ گئے ہیں

انگلستان میں یہ حق دو چیزوں سے حاصل ہے

(۱) Rule of Law ، یا آئینی دستور

(۲) آزادی کا وہ قومی جذبہ جو قوم کے آئینی ضمیر کو ہمیشہ جلا دیتا رہتا ہے

اگر ان دونوں اصولوں کے فلسفہ پر پورے طور سے غور کیا جاوے تو معلوم ہو جائے گا کہ انگلستان نے اپنے باشندوں کو تقریر و تحریر کی پوری آزادی دی ہے مگر اسی کے ساتھ قانون کے ذریعہ سے آزادی کو اسقدر منظم کر دیا ہے کہ یہ آزادی بیجا طور پر استعمال نہیں ہو سکتی - وہ لوگ ملک کے فائدہ کے لئے ہر طرح کی نکتہ چینیاں کر سکتے ہیں لیکن اوس کے ساتھ کسی کو بے جا طور پر ذلیل نہیں کر سکتے - اور نہ کسی کو بے جا نقصان پہونچا سکتے ہیں (Lord Mansfield)

لکھتا ہے کہ پریس کی آزادی اس پر منحصر ہے کہ کسی چیز کی اشاعت کے لیے کسی اجازت کی ضرورت نہ ہو لیکن قانونی نتائج نظر سے فروگذاشت نہ کئے جاویں۔

ایک اور انگریز ماہر آئین لکھتا ہے "ہمارا موجودہ قانون ہر شخص کو اجازت دیتا ہے کہ وہ جو جی چاہے کہے۔ لکھے اور شائع کرے۔ لیکن اگر وہ اس آزادی کا بے جا استعمال کرے تو موجب سزا ہوگا۔ اگر وہ کسی شخص پر بے جا حملہ کرے تو دوسرا شخص نقصان کا دعوے کرسکتا ہے۔ اگر کوئی شخص ایسی چیز لکھے اور شائع کرے جس سے بد اخلاقی پیدا ہو یا بغاوت پھیلے تو بد اخلاقی اور بغاوت کے جرم میں سزایاب ہوسکتا ہے۔" اسی آزادی کی اہمیت کے تحت میں بعض ایسے مستثنیات ہیں جن کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہوسکتی۔ مثلاً پارلیمنٹ میں جو کچھ کہا جائے یا عدالتی کارروائیاں یا وہ خطوط وغیرہ جو درمیان وزرا کے یا وزرا اور بادشاہ کے ہوں یا وہ کاغذات جو پارلیمنٹ کے حکم سے شائع کئے جاویں یا صحیح رپورٹ عدالتی کارروائی کی لیکن ان مستثنیات کے قائم کرنے میں بھی لوگوں کے حقوق کے لحاظ سے چند بندشیں رکھی گئی ہیں۔ مثلاً جہاں پارلیمنٹ کی تقریر کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی جاسکتی وہیں اس تقریر کی اشاعت پر قانونی کارروائی کی جاسکتی ہے۔ یا مثلاً بغاوت کا قانون تو یہ کہتا ہے کہ جو شخص ایسے الفاظ استعمال کرے۔ جس سے بادشاہ کی توہین ہو یا اس کے خلاف تنفر پیدا کرے یا کسی قسم کی شورش برپا کرے تو وہ سزایاب ہوگا لیکن عام طور پر مقدمہ اس وقت تک نہیں چلایا جاتا جب تک کہ نقص امن کا بے حد خطرہ نہ ہو دوسرے الفاظ میں یوں کہنا چاہیے کہ (Bacon) کے الفاظ کی اہمیت کو پورے طور پر محسوس کیا جارہا ہے کہ "ذہانت کو سزا دینا فی الحقیقت اس کی قوت اور تیزی کو بڑھانا ہے اور ضبط شدہ تحریر کے متعلق عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس میں کچھ چنگاری سچ کی ضرور ہے جو ان کے چہرہ پر لگتی ہے جو اس کو دبانا چاہتے ہیں"

ماحصل یہ ہے کہ انگریزی آئین اپنی قوم کو نظم کے دائرہ میں رکھ کر اون کی روح کو تازگی بخشتا ہے۔ اون کے دماغ کو منور کرتا ہے۔ اور اون کے جسم کو قوت دیتا ہے۔ اوس کے ذریعہ سے اونھیں ہر طرح کی آزادی حاصل ہے۔ اور اون کے حقوق کا کامل تحفظ ہے

ایس - ان - جعفری

دو ادبی شاہکار

شوپنہار - فلسفۂ شوپنہار پر ایک بیمثل تبصرہ ۸/ (علاوہ محصول)

مثنوی زہر عشق - مجلد معہ رنگین تصاویر و تین مقدمات قیمت ۸/ (علاوہ محصول)

مینجر نگار لکھنؤ

تاریخ ہند کا ایک ورق

بندھیلکھنڈ کا موتی

(دو ایکٹ کا مختصر ڈرامہ)

ایکٹ اول ——— پہلا منظر

(تاریک رات ہے اور چپل ندی چٹانوں اور سنگ ریزوں سے ٹکرا ٹکرا کر رات کی تاریکی کو اور بھی بھیانک بنا رہی ہے۔ ندی کے داہنی جانب ساحل پر ایک ٹیکرا ہے جس پر ایک بہت پرانی گڑھی قائم ہے فصیلوں پر گھاس اور کائی سے ایک خاص کیفیت پیدا ہو گئی ہے جس کو دیکھ کر خواہ مخواہ ہیبت معلوم ہوتی ہے۔ اندر گڑھی کے ایک دالان میں سارندہ اور سیتلا دیوی بیٹھی ہوئی باتیں کر رہی ہیں)

سیتلا دیوی- پورے تین برس ہو گئے کہ پران ناتھ کو چین سے بیٹھنے کو نہیں ملا، رام جانے وہ کون لوگ ہیں جنکے دن آرام سے کٹتے ہوں گے

سارندہ- (چونک کر) کیوں، سیتلا، کیا ہوا؟ کیا بھیا کے راج میں تم کو سکھ نہیں ملا

سیتلا دیوی- نہیں، ایشور نہ کرے کہ میں ایسی چنتا کروں پرنتو ———

سارندہ- بولو سیتلا بولو چھپانے کا کام نہیں تم راجپوتنی بھی ہو اور راجپوت کی بیوی بھی۔ تم کو کوئی بات چھپانا نہ چاہیئے

سیتلا دیوی- تم خفا ہو گی۔ اور سوامی بھی اگر سنیں گے تو خفا ہوں گے اس لئے اب نہ پوچھو، جانے دو

سارندہ- ٹالو نہیں، اب میں بغیر پوچھے نہ رہوں گا اور تمہیں بتانا پڑے گا

سیتلا دیوی- میں نے کتنی بار ان سے بنتی کی پاؤں پڑی کہ میری آنکھوں کے سامنے سے کہیں نہ جاؤ مجھے ہردوار لے چلو بندرابن لے چلو۔ اجودھیا کے درشن کرا لاؤ، رسی کیس، پریاگ بدری ناتھ لے چلو۔ اپنے ساتھ جنگل میں رکھو۔ مگر یہ بوگ کسی طرح نہیں سہا جاتا کہ پہاڑوں وبیابانوں میں اپنی جان دیتے پھرو۔ پرنتو میں قسمت کی ہیٹی ہوں کہ میں کسی ہتیار سے سوامی کے دل پر قابو نہ پا سکی

سارندہ- (رنداتن کر) کیا سیتلا دیوی تم چاہتی ہو کہ بھیا بندیلو

کے ماتھے پر کلنگ کا ٹیکہ لگا دیں کیا تمہاری رنواس کی خاطر وہ اپنا نام میٹ دیں - کیا تم چاہتی ہو کہ وہ دشمنوں سے لڑنے کی جگہ تمہاری سیوا کے لئے محل میں بیٹھے رہیں ——
(غصہ سے) تم کو کیا معلوم کہ اس وقت کیا حال ہے، اور دشمنوں نے کیسا گھیر رکھا ہے - کیا تم چاہتی ہو کہ وہ چوڑیاں پہنکر بیٹھ جائے - یاد رکھنا سیتلا دیوی ایشور نہ کرے اگر دشمن جیت گئے تو تمہاری آج کی خیر نہیں ——"

(دروازہ کھلتا ہے اور ایک طویل القامت نوجوان اندر داخل ہوتا ہے)

سیتلا - (خوشی سے اچھل کر) سارن - لو وہ آگئے

سارن - (متفکرانہ انداز میں) بھیا - یہ کپڑے کیسے بھیگے ہیں؟ کیا پانی برسا ہے؟

انردھ - نہیں، ندی پار کر کے آیا ہوں

سیتلا - ایشور نے بڑی خیر کی آج کل ندی باڑھ پر ہے

سارن - ہتھیار کیا ہوئے؟

انردھ - چھن گئے!

سارن - اور ساتھی!

انردھ - کام آگئے!

سارن - (سیتلا کی طرف دیکھ کر) سیتلا، یہ سب تمہارے کارن ہوا - تم نے کنبہ کی ناک کٹوا دی - اب تو کلیجہ میں ٹھنڈک پڑی

انردھ - نہیں اس میں سیتلا کا قصور نہیں ہے - خود میں نے دھوکا کھایا

سارن - تو بھیا، شاباش ہے تم کو - کہ بڑکھوں کی ناک کٹوا کر اپنی صورت دکھانے یہاں آئے ہو، راجپوت تو باپ دادا کی آن کبھی نہیں کھوتے،

(انردھ کچھ دیر تک سوچتا رہتا ہے اور پھر باہر چلا جاتا ہے - سیتلا پیچھے پیچھے جاتی ہے انردھ کو پکارتی ہے - لیکن انردھ فصیل کی دیوار پھاند کر رات کی تاریکی میں غائب ہو جاتا ہے - اور سیتلا چٹان پر بیٹھ کر رونے لگتی ہے)

سارن - سیتلا کہاں ہو

سیتلا - یہاں اپنی قسمت کو رو رہی ہوں

(سارن بھی جاتی ہے)

سارن - کیوں روتی ہو!

سیتلا - (ناگن کی طرح بل کھا کر) کیا باپ دادا کی آن اتنی پیاری ہے

سارن - (غصہ سے تیوری کر) ہاں، ہے

سیتلا - اپنا پتی ہوتا تو کلیجہ میں بٹھا لیتیں

سارن - کلیجہ میں - بالکل جھوٹ - تلوار جھبو دیتی

سیتلا - (غصہ سے) جھوٹ - ڈولی میں چھپاتی پھروگی - خیر دیکھا جائے گا - کبھی کے دن بڑے کبھی کی رات!

دوسرا منظر

(سارندہ سیتلا دیوی آپس میں مصروف گفتگو ہیں)

سیتلا - آج پورے ۳ مہینے ہو گئے مگر کچھ خبر نہیں ملی

سارندھ - شیر کچھار میں ہو گا - خبر کیا ملتی

سیتلا - سارن - تم نے اُس رات بہت رولایا

سارن - لیکن بڑکھوں کی آتماؤں کو خوش کیا

سیتلا - (چونک کر) سارن - یہ سنکھ کی آواز کہاں سے آرہی ہے

سارن - (کان لگا کر) ہاں راجپوتی آن پر جان دینے والا

راجہ انردھ سنگھ آگیا۔ مبارک ہو

سیتلا (خوشی و مسرت سے) کہاں۔ کہاں

(آواز اور قریب ہوتی جاتی ہے)

سارن۔ ہر وہ، میرا دل بول رہا ہے کہ ہو نہ ہو وہی ہیں

سیتلا۔ ایشور ایسا ہی کرے

(دروازہ کھلتا ہے اور انردھ سنگھ داخل ہوتا ہے)

سیتلا۔ پران ناتھ —— (قدموں پہ گر پڑتی ہے)

سارن۔ بھیا۔ بھیا

انردھ سنگھ۔ سارن میں مہروبی کا قلعہ فتح کر کے آرہا ہوں اور ساتھ ہی یہ بھی طے کر چکا ہوں کہ راجہ چمپت رائے بندیلہ کے ساتھ تمہارا بیاہ کر دیا جائے گا——

منظر سوم

(رات کا وقت ہے رنواس میں روشنی ہو رہی ہے۔ رانی سیتلا دیوی اور مہاراجہ انردھ سنگھ بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے ہیں)

انردھ سنگھ۔ رانی کچھ سُنا

سیتلا۔ نہیں، کیا ہوا

انردھ سنگھ۔ دیکھو یہ ایک پتر کسی کا آیا ہے جس میں لکھا ہے کہ راجہ چمپت رائے، بندیلہ راجپوت نہیں ہے

سیتلا۔ کیا یہ صحیح ہے

انردھ سنگھ۔ بالکل جھوٹ۔ میں خوب جانتا ہوں وہ راجہ پورن چند کے راجکمار ہیں۔ اور پورن چند راجہ ادیا جیت کے پتر تھے۔ جو راجہ پنچم اور وہ بیر بھدر کے خاندان سے تھے۔ بھلا میں نے جو بات طے کی تھی وہ جھوٹ ہو سکتی ہے

سیتلا۔ پھر کب تک اس کو ٹالئے گا۔ بیاہ ہو جائے تو اچھا ہے

انردھ سنگھ۔ ہاں ارادہ ہے کہ اگلے مہینہ میں فارغ ہو جاؤں کیونکہ خبر آئی ہے کہ محی الدین اورنگ زیب اس طرف سے گزریں گے اور عجب نہیں کہ ولیعہد بہادر کے خلاف جنگ مقصود ہو۔ اور پھر میں جنگ میں پھنس جاؤں اور یہ کام رہ جائے

سیتلا۔ سوامی کیا لڑائی آپ ہی کے لئے بنائی گئی ہے

انردھ سنگھ۔ ہاں رانی راجپوت کے گھر میں پیدا ہونے کا یہی سبھاؤ ہے

منظر چہارم

(دربار آراستہ ہے درمیان میں آگ جل رہی ہے پروہت ہون کر رہا ہے —— ہون کے ختم پر بندیلہ راج کا قومی ترانہ گایا جاتا ہے۔ اور راجہ چمپت رائے کا بیاہ راجکماری سارندہ سے ہوتا ہے)

انردھ سنگھ۔ پروہت اب تم بھونری پھیرو

پروہت۔ جو حکم

(پروہت بھونری پھیرتا ہے)

درباری۔ راجہ چمپت رائے، مبارک

انردھ سنگھ۔ چمپت رائے۔ میں بھی تم کو مبارکباد دیتا ہوں لیکن اسی ملک میں چاروں طرف جنگ کا دیوتا سنکھ پھونک رہا ہے کہیں تم اس شادی کے بعد عیش و عشرت میں نہ پڑ جانا، لو یہ بیش قیمت خنجر جو خسرو شاہ اکبر نے میرے بزرگوں کو عطا کیا تھا۔ وہ تم اپنی کمر سے باندھو لیکن اس خنجر کو لے کر قسم کھاؤ۔ کہ تم حق کے لئے جان دینے سے دریغ نہ کرو گے۔ یاد رکھو بندیلکھنڈ کے پاس بہادر بیٹوں کی بہت کمی ہے۔ اس لئے اس مبارک خنجر کی عزت

حرمت اب تمھارے ہاتھ ہے

درباری ۔ جے ۔ مہاراج انردھ سنگھ کی جے ۔ بندیلہ راج کا بول بالا ہو

راجہ چمپت رائے ۔ (خنجر کو چوم کر) میں بزدل نہیں ہوں یقین رکھئے ۔ چمپت رائے کے رگوں میں بندیلہ خون دوڑ رہا ہے ۔ اگر میں بندیلہ وقار کو گرانے کی کوشش کروں گا تو سب سے پہلے یہ خنجر میرے قلب میں لہرائے گا ——

درباری ۔ جے ہو ۔ راجہ اورچھا کی جے ہو

پروہت ۔ راجہ چمپت رائے اس مقدس اگنی کو دیکھو

چمپت رائے ۔ دیکھ رہا ہوں

پروہت ۔ خنجر کو چومو

چمپت رائے ۔ خنجر کو میان سے باہر نکلتا ہے اور چومتا ہے

پروہت ۔ کہو میں راجپوتوں کی سبھا میں اقرار کرتا ہوں کہ جب تک بندیلہ راج کی گذشتہ شان و شوکت واپس نہیں آئے گی ۔ اس وقت تک قلعہ اورچھا پر آزادی کا پرچم نہیں لہرائے گا ۔ جب تک کمزور استریاں بندیلہ راجدھانی میں ایک کونہ سے دوسرے کونہ تک بے کھٹکے نہ چلی جائیں گی —— تم چین سے نہ بیٹھو گے کیا یہ پرتگیا کرتے ہو

چمپت رائے ۔ (تلوار سے قسم کھا کر) ایسا ہی ہوگا

انردھ سنگھ ۔ اچھا اب آپ سارن کو لے کر اورچھا سدھاریئے سب انتظام مکمل ہے (بے تاب ہو کر رونے لگتا ہے)

درباری ۔ مہاراج ۔ آنسو بہانا آپ کے لئے مناسب نہیں ہے (سنگھ پھنک رہا ہے ۔ سارن اورچھا روانہ ہوتی ہے)

انردھ سنگھ ۔ کیا مجکو اپنی سب سے پیاری بہن سے ہمیشہ کے لئے چھٹنے کے بعد آنسو بہانے کا حق حاصل نہیں ہے؟

درباری ۔ مہاراجا ۔ اسی لئے تو کنیا کا دان بڑا ہوتا ہے صبر کیجئے ورنہ راجکماری سارن کو ڈولہ میں قرار نہ آئے گا

(انردھ سنگھ نڈھال ہو کر تخت پر گر پڑتا ہے)

منظر پنجم

(دربار عام میں چمپت رائے تقریر کرتا ہے)

چمپت رائے ۔ درباریو ۔ آج تم سے رخصت ہوتا ہوں اور اپنا تاج و تخت اپنی خوشی سے اپنے قوت بازو پہاڑ سنگھ کے سپرد کرتا ہوں ۔ تم کو معلوم ہے کہ میں نے تخت نشین ہوتے ہی سلاطین مغلیہ کو خراج دینا بند کر دیا تھا ۔ لیکن اب میں مصلحتاً اطاعت کرنا چاہتا ہوں ۔ میں اپنی فوج کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں جس نے میرے اشاروں پر اپنے گھر بار کو چھوڑا ۔ اور ہتیلی پر جان لے کر میرے احکام بجا لائے —— اچھا اب میں رخصت ہوتا ہوں —— پہاڑ سنگھ ۔ اورچھا کی راجدھانی پر تم کو براجمان ہونا ۔ مبارک

(درباری رونے لگتے ہیں ۔ اور رانی سارندہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ داخل ہوتی ہے)

عورتیں ۔ مہارانی ہم کو چھوڑ کر کہاں چلیں

رانی ۔ سوامی کی اچھا سب سے مقدم ہے

پہاڑ سنگھ ۔ اچھا اس شرط پر میں سنگھاسن پر بیٹھوں گا کہ جب آپ اورچھا واپس تشریف لائیں تو سنگھاسن آپ ہی کا ہے ۔

درباری - ہاں ضرور شاباش بہاؤ سنگھ - بندیلہ راجکماروں کا یہی طریقہ ہے

چمپت رائے - اچھا رخصت

(سارندہ اور چمپت رائے جاتے ہیں)

منظر ششم

(نظام الدین کا شکستہ قلعہ)

چمپت رائے - جگمل سنگھ - رانی سارن

چمپت رائے - جگمل سنگھ کیسے آئے

جگمل سنگھ - مہاراجہ اشیرباد دینے آیا ہوں

چمپت رائے - سب پرماتما کا احسان ہے

جگمل سنگھ - اعلیحضرت نے بہت خوشی کا اظہار کرکے آپ کو کالپی کی بیش قیمت جاگیر عنایت کی ہے - اس سے زیادہ احسان پرماتما کا کیا ہو سکتا ہے ؟

چمپت رائے - ہاں یہ تو ٹھیک ہے لیکن آثار اچھے نظر نہیں آتے ہیں - بادشاہ سلامت کا اب آخری وقت ہے - بھائیوں میں رقابت ہے - اور میرا خیال ہے کہ شہنشاہ دہلی دکن میں ہے

جگمل سنگھ - اس بساط کے مہرے سب خطرناک ہیں

چمپت رائے - ہاں - لیکن اقبال محی الدین ہی کے سر ہے

جگمل سنگھ - تو ہم لوگ کیا کریں

چمپت رائے - ہم تو تلوار کے دھنی ہیں - جو تلوار کہے گی وہی ہوگا - لیکن ہوگا بڑا برا - خون کی ندیاں بہیں گی

جگمل سنگھ - رام نہ کرے ——— (جاتا ہے)

(رانی سارن محل سرا میں بیٹھی ہوئی ہے - اور چمپت رائے داخل ہوتا ہے)

چمپت رائے - تم نے سنا - کالپی کی ایک تولا کھ سالانہ کی جاگیر مجکو آج دربار میں عطا ہوئی ہے اب تو خوش ہو

سارن - پران ناتھ آپ کی عزت بڑھی میں بھی خوش ہوئی - ایشور آپ کو اس سے زیادہ عزت دے

چمپت رائے - سارن تم اداس سی کیوں ہو - کہو کیا ہوا - تم جب سے آئی ہو کچھ کھوئی ہوئی سی رہتی ہو - بولو کیا بات ہے

سارن - پران ناتھ - یہ خیال غلط ہے

(رونے لگتی ہے)

چمپت رائے - کوئی بات ضرور ہے تم روتی کیوں ہو ؟ سچ کہو کیا بات ہے

سارن - (روتے ہوئے) آپ یہ نہ پوچھئے - اس کو ایسا ہی رہنے دیجئے - ہاں یہ سچ ہے کہ آج کل میں کچھ اداس سی رہتی ہوں

چمپت رائے - (چیں بجبیں ہوکر) کیوں ؟ اورچھا میں کیا تھا جو یہاں دہلی میں نہیں ہے ؟

سارن - (ناگن کی طرح بل کھاکر) ہاں اورچھا میں رانی تھی دہلی میں جاگیردار کی باندی ہوں ——— کوئی گھوڑے پر چڑھ کر گدھے پر نہیں بیٹھتا - سوامی آپ بڑا انیائے آپ نے یہ آرام وچین بڑے مہنگے داموں خریدا ہے

چمپت رائے (ششدر ہوکر) میں تمہاری روحانی کرب سے بے خبر تھا - آج آنکھیں کھل گئیں ایک پردہ تھا جو اٹھ گیا - (رونے لگتا ہے)

اچھا سارن چمپت رائے بندیلہ راجہ ہے اور راتوں رات دہلی کو چھوڑ دے گا - اب ———

سارن - سوامی - ٹھہرئیے کوئی پرتگیا نہ کیجئے - دربار شاہی

سے اجازت لے کر آپ اورچھا جانے کا ارادہ کریں۔

راجپوت پیٹھ دکھا کر نہیں بھاگتا ہے

چمپت رائے۔ مناسب ہے۔ آج دربار میں تذکرہ کروں گا

منظر ہفتم

(راجہ چمپت رائے دربار سے اجازت لے کر اورچھا واپس آگیا ہے۔ اور سارا بندیل کھنڈ اس خوشی سے نہال ہوگیا ہے۔ رانی سارندہ بھی بہت خوش ہے۔ اسی عرصہ میں شاہجہاں بیمار پڑتا ہے۔ شہزادوں میں پہلے ہی سے رقیبانہ جنگ تھی۔ اس خبر کے ساتھ ہی دلوں کا غبار ظاہر ہوگیا۔ مُراد و محی الدین دکن سے چل کھڑے ہوئے۔ برسات کا موسم ہے دھول پور کے قریب چمبل ندی کے کنارہ خونریز جنگ نے محی الدین کو مجبور کیا ہے۔ کہ وہ چمپت رائے سے مدد طلب کرے)

راجہ چمپت رائے۔ خاں صاحب۔ میں مدد کرنے کو طیار تو ہوں لیکن ولیعہد کے خلاف ہوگا

سفیر۔ مہاراجہ اس وقت تو آپ کو شہزادہ محی الدین کی امداد کرنا پڑے گی۔ آپ کو معلوم ہے شہزادہ کو بڑی تشویش ہے علیٰ دریائے چمبل کے کنارہ شاہی فوج پڑے جمائے کھڑی ہے اس حالت میں تو آپ کو مدد کرنا ہی چاہیئے

(چمپت رائے کچھ علیٰحدہ گفتگو کرتا ہے)

سفیر۔ مہاراجہ آپ پر بڑا بھروسہ ہے۔ آپ کی امداد انشاءاللہ رائگاں نہ جائے گی۔ اور اس کے علاوہ الطاف خسروانہ سے بھی آپ محروم نہ رہیں گے

مہاراجہ۔ خانصاحب آپکا فرمانا بالکل صحیح ہے لیکن یہ معاملہ ملکی حیثیت سے بھی اہم ہے میں اس معاملہ میں ذرا ذمہ دار عہدہ داروں اور فوجی افسروں سے بھی مشورہ کرلوں۔ اوس کے بعد آپ کو شام تک اطلاع دیدوں گا

(خانصاحب جاتے ہیں)

(پردہ بدلتا ہے)

(رانی سارن ایک کتاب دیکھ رہی ہے)

چمپت رائے۔ سارن، شہزادہ محی الدین کا پیام آیا ہے کہ دارا شکوہ کے خلاف تلوار اٹھاؤں تمہاری کیا رائے ہے۔ گو میں جانتا ہوں کہ اس بارہ میں محی الدین ہی ایک سچا موقع ہے اور باقی سب جھوٹے ہیں۔ فتح دیکھنا محی الدین ہی کی ہاتھ رہے گی۔ خون بہت بہیگا

سارن۔ آپ کو محی الدین کی مدد کرنا چاہیئے

چمپت رائے۔ خوب سوچ لو۔ دارا شکوہ سے عداوت مول لینا ہے

سارن۔ اچھا میں بھاگوت میں سری کرشن جی سے مشورہ مانگتی ہوں

(بھاگوت بند کر کے سری کشن جی کا دھیان کر کے بھاگوت کھولتی ہے)

دیکھئے۔ پہلے ادھیا کے اشلوک ۲۸-۳۱-۳۲ میں سری کشن جی فرماتے ہیں کہ "اے کرشن مجھے اپنے قریبی رشتہ داروں کو دیکھ کر جو جنگ کے لئے یہاں اکٹھے ہوئے ہیں بھلائی نظر نہیں آتی کیونکہ اپنے رشتہ داروں کو مار کر نہ مجھے کامیابی اور نہ سلطنت اور نہ راحت کی خواہش ہے" اے ارجن مخنثوں کا طریقہ اختیار نہ کر تیرے لئے یہ زیبا نہیں اے دشمنوں پر فتح پانیوالے بزدلی اور پست ہمتی کو چھوڑ کر کھڑا ہو۔" اے ارجن جو سوچنے کی بات نہیں اوس کو سوچتے ہو اور اہل علم کی باتیں کرتے ہو حالانکہ اہل علم کسی شخص کی موت یا زندگی کی فکر نہیں کرتے" اے ارجن اگر تو جنگ میں کام آئیگا

تو سورگ میں جائے گا اور اگر فتح پائے گا تو تجھے روئے
زمین کی بادشاہت ملے گی ۔ اس لئے اے کنتی کے لڑکے
جنگ کی ٹھان کر اٹھ

"تمھارا ادھکار افعال تک ہی محدود ہے نہ کہ اُن کے
ثمرات پر نتائج کی غرض سے افعال عمل میں نہ لا البتہ افعال
کے ترک سے بچ"

سوامی ۔ اب کیا ہے ۔ دیکھئے سری کشن جی نے صاف
صاف بتلا دیا کہ

راجہ چمپت رائے ۔ ٹھیک ہے ۔ لیکن معاملہ بڑا مشکل ہے

سارن ۔ پران ناتھ ۔ "مَیں واقف ہوں ۔ منزل کٹھن
ہے ۔ قدم قدم پر کانٹے ہیں ۔ ہمیں اپنے سپاہیوں کا
خون پانی کی طرح بہانا پڑے گا ۔ ہم اپنا خون پانی ایک
کریں گے اپنے بجیلے بہادروں کا سر کٹوائیں گے ۔ اور
چنبل ندی کا گھاٹ بنائیں گے ۔ لیکن سوامی یاد رکھنا
جب تک چنبل کا دھارا جلال وعفت کے ساتھ اپنے
مُنھ کا پھین اُگلتا ہے گا تو ہمارے سرفروشوں کا خون
لعل بن بن کر روشن رہیگا ۔ اور جب تک بندیلہ قوم
کا نام لیوا دنیا میں باقی رہے یہ خون اوس کے ماتھے پر
کیسر بن کر چمکے گا "

چمپت رائے ۔ اچھا پیاری سارن ابھی شہزادہ محی الدین
کو جواب بھیجے دیتا ہوں

(جاتا ہے)

(پردہ گرتا ہے)

منظر ہشتم

(برسات کا زمانہ ہے ۔ آسمان پر بادل ہی بادل نظر آ رہے ہیں قلعہ سے
سرفروش بندیلوں کی کالی گھٹا اٹھتی ہے ۔ اور چنبل ندی پر چھا جاتی
ہے ہر سپاہی "بیر رس" سے جھوم رہا ہے ۔ رانی سارن اپنے دونوں
راجکماروں کو گلے سے لگاتی ہے اور راجہ چمپت رائے کو پان کا بیڑہ دیتی
ہے ہتھیار سجتی ہے اور دستار پر کلغی مرصع لگاتی ہے)

رانی سارن ۔ راجکمارو، اب بندیلہ قوم کی لاج تمھارے
ہی ہاتھ ہے دیکھنا لڑائی سے منھ موڑ کر نہ آنا ۔ بندیلہ
قوم کے وقار کو قائم رکھنا ۔ کوئی بچہ بوڑھا یا عورت سامنے
آئے تو تلوار کو اوس بے گناہ خون سے آلودہ نہ کرنا ۔ جاؤ
راجکمارو جاؤ —— دیر ہوتی ہے ۔ شہزادہ محی الدین
کو تم لوگوں کی ضرورت ہے —— اور تمھارے پتا
زبان دے چکے ہیں ۔ دیکھو کہیں اون کو شرمندگی نہ ہو

دونوں راجکمار ۔ ماتا جی ۔ جیسی آپ کی اگیان ہوگی ویسا
ہی ہوگا

(رانی سارن دونوں کو گلے لگاتی ہے)

(راجکمار جاتے ہیں)

راجہ چمپت رائے ۔ سارن ۔ راجکماروں کو رخصت کر دیا
تمھاری ہمت کی داد دینا چاہیئے

رانی سارن ۔ ایشور کی سہایتہ چاہیئے ورنہ میں ایک کمزور
عورت کیا کر سکتی تھی وہی صبر دیتا ہے ۔ میں نے کیا کیا
وہ امانت قوم ہی کی تھی ۔ اوس کے دینے میں مجھکو کیا
عذر ہوتا

چمپت رائے ۔ سارن (ہاتھ لے کر) پیاری سارن یہ ہر
شخص کا کام نہیں ہے ۔ معاف کرنا میں بھی جانتا ہوں
—— زندہ بچے تو ملاقات ہوگی
لیجیے بیڑا لیجیے ۔ لائیے ہتھیار بھی سج دوں اور دستار

کلغی بھی لگادی ہے - اچھا سوامی رُخصت - ایشور تمھاری تلواروں کو اندر کا بجر ا بنا دے - بندیلوں کی لاج تمھارے ہاتھ ہے

چمپت رائے - پان کھا کر - رُخصت - آج تو خوشی سے تمھارا ایک ایک عضو - پھڑک رہا ہے - ایک راجپوتنی کا یہی وصف ہے

(جاتا ہے)

(منظر بدلتا ہے)

(رانی سارن فوج کے ایک حصہ کو طلب کرتی ہے)

سارن - کوشلیا - استری پلٹن کو لیس ہونے کا حکم دو - میں دو گھنٹہ بعد مردانہ بھیس میں پچھم جانب سے چمبل ندی کے دشمنوں پر حملہ کروں گی - سب تیار رہیں ——

کوشلیا - رانی - ایسا ہی ہوگا

(کوشلیا جاتی ہے)

منظر نہم

(میدان جنگ - راجہ چمپت رائے نے بندیلوں کو کمیں گاہ میں چھپنے کا حکم دے دیا - شہزادہ محی الدین و مراد کی منتشر فوج کو منظم کیا دارا شکوہ کو دھوکہ ہوا - بندیلہ اپنی کمیں گاہوں سے نکل پڑے اور دریا میں گھوڑے ڈال دیے - چمپت رائے دارا شکوہ کی فوج کو دھوکہ دیکر دریا کے اس پار جاتا ہے - محی الدین کی فوج کی ہمتیں بندھ گئیں دست بدست جنگ کی نوبت آئی کہ ایک جتھا سپاہیوں کا پچھم جانب سے نمودار ہوا - یہ سارن دھا تھی)

راجہ چمپت رائے - چھتر سال - تم مشرقی جانب اپنی فوج لیجاؤ - اور کمیں گاہوں میں چھپ جاؤ

(چھتر سال چلا جاتا ہے)

چمپت رائے - اندرجیت - تم اتر جانب اپنی فوج لے جاؤ اور کمیں گاہ میں چھپ جاؤ

(اندرجیت چلا جاتا ہے)

(شہزادہ محی الدین و شہزادہ مراد خیر مقدم کرتے ہیں)

محی الدین - راجہ چمپت رائے - آپ کی اس مہربانی کا شکریہ تو ادا کرنا فضول ہے - کیونکہ شکریہ ادا کر کے آپ کے قومی وقار کو ٹھیس لگے گی - ہاں خدا کا شکریہ ضرور ادا کرنا چاہیئے

مُراد - مہاراجہ اُرچھا کو ان کی خدمات کا خاطر خواہ صلہ ملیگا

محی الدین - یہ قبل از وقت گفتگو ہے - جو خدا کی مرضی ہو

چمپت رائے - شہزادہ صاحب یہ سچ ہے جو خدا کی مرضی ہے وہی سب سے بہتر ہے - میری رائے ناقص میں فوج کی تنظیم کرنا ضروری ہے

محی الدین - ہاں ضرور - آپ نے اس فوج کے کے حصہ کیے ہیں

چمپت رائے - تین حصہ ایک حصہ میرے تحت میں ہے دو حصہ خادم زادوں کی تحت میں مشرق و شمال کی کمیں گاہوں میں ہیں - وہ دیکھئے شہزادہ دارہ شکوہ مورچہ ہٹا رہے ہیں - اون کو دھوکہ ہو گیا بس اب وقت ضائع نہیں ہونا چاہیئے گھوڑے دریا میں ڈال دینا چاہیئے

محی الدین (بسم اللہ کہکر) گھوڑے کو اڑ لگاتا ہے

(اللہ اکبر کی پُرہیبت تکبیر سے ارض بندیلہ گونج اٹھتی ہے)

چمپت رائے - اس سات گھنٹہ کی نقل و حرکت میں ... بندیلہ جانبازوں کی لاشیں پھڑک رہی ہیں - شکر ہے کہ میری بات خالی نہیں گئی

محی الدین - چمپت رائے دیکھنا وہ افق مغرب پر کیا غبار

دکھائی پڑ رہا ہے

چمپت رائے - دیکھئے ابھی معلوم ہوا جاتا ہے

(سپاہیوں کا ایک دل دارا شکوہ پر حملہ آور ہوا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی فرشتہ رحمت آپ کی امداد کے لئے آسمان سے اترا ہے)

(گھمسان کی لڑائی ہو رہی ہے)

چمپت رائے - فتح - مبارک

محی الدین - خدا کا شکر ہے کہ اوسنے حق و باطل کا فرق دکھا دیا

(ایک سردار آتا ہے)

چمپت رائے - کیا ہے ——

سردار - ہنس کر - بندیلہ قوم کا راج مبارک - اس جان نثار کو بھول گئے ——

چمپت رائے - میری سارن ——

سارن - (سر تعظیم خم ہو کر) سوامی

(پردہ گرتا ہے)

ایکٹ دوسرا

پردہ اول

(شہزادہ محی الدین چنبل کے ساحل سے آگرہ کی طرف چلا" اقبال اس کے سر پر مورچھل ہلاتا تھا اور نصرت و کامرانی نقارہ بجاتی تھی۔ آگرہ پہنچتا ہے تو شوکت اوس کے لئے تخت شاہی کو سجاتی ہے - دربار ہوتا ہے سرداران شاہی کی خطائیں معاف ہوتی ہیں مناصب بحال کئے جاتے ہیں - راجہ چمپت رائے کو اوس کی سرفروشانہ خدمات جلیلہ کے صلہ میں دوازدہ ہزاری کا منصب عطا ہوتا ہے اور اورچھا سے بنارس تک کی جاگیر عطا ہوتی ہے اور بندیل راجہ پھر دہلی میں قیام کرتا ہے - اور رانی سارندھا پھر خاموش ہو جاتی ہے)

چمپت رائے - جگل سنگھ - کنور چھتر سال - سارن

(چمپت رائے دربار سے خلعت پاکر آتا ہے)

کنور چھتر سال - پتاجی مبارک

سارن - کیسی مبارکباد

چھتر سال - شہنشاہ اورنگ زیب نے آج دربار عام میں پتاجی کو بندیلہ راج کی جانبازانہ خدمات و "سرفروشیوں" کے صلہ میں اورچھا سے بنارس تک کی جاگیر اور دوازدہ ہزاری منصب مع خلعت ہفت پارچہ عطا کیا ہے

سارن - ہاں - سوامی

چمپت رائے - سارن - دیکھو یہ تلوار خاص شہنشاہ اورنگ زیب نے اپنے اسلحہ خانہ کی عطا کی ہے - اس تلوار کو شہنشاہ جہانگیر نے لاہور کے معرکہ میں استعمال کیا تھا - اصفہانی تلوار ہے

سارن - سوامی آپ کو مبارک ہو - دشمنوں کے حسد سے پرماتما آپ کو محفوظ رکھے

چمپت رائے - سارن تمہاری خوشی میری تمام کلفتوں کیلئے کافی ہے

سارن - سوامی ——

(جگل سنگھ آتا ہے اور کنور چھتر سال اور رانی سارن جاتے ہیں)

چمپت رائے - کہو جگل کیا سماچار ہیں!

جگل - اشیرباد دینے آیا ہوں - بہت سے راجپوت آپ کی اس عزت کو دیکھ کر بھسم ہو گئے

چمپت رائے - کون

جگل - نام لینے سے کیا فائدہ - کوئی گھوڑا آپ کے اصطبل میں

ولی بہادر خاں کا ہے؟

چمپت رائے۔ ہاں۔ کیوں

جگمل سنگھ۔ ولی بہادر خاں کو اوس کی بڑی فکر ہے کسی مناسب موقع سے اوس کو واپس کر دیجئے گا

چمپت رائے۔ لیکن وہ تو میدان جنگ میں گرفتار ہوا ہے۔ ولی بہادر خاں زخمی پڑا ہوا تھا۔ اور یہ گھوڑا اپنی دُم سے مکھیاں اُڑا رہا تھا مجکو پسند آیا میں نے منع کیا کہ کوئی شخص اس کو جان سے نہ مارے زندہ گرفتار کرے۔ لیکن رانی اُر چھانے اوس کو زندہ گرفتار کیا ہے ——

جگمل۔ ہاں ولی بہادر خاں کو وہ بہت عزیز ہے اور شائد وہ اوس کی طلبی کی درخواست دینے والے ہیں ——

چنپت رائے۔ اچھا دیکھا جائے گا۔ (متفکر ہوکر)

(جگمل جاتا ہے)

(پردہ گرتا ہے)

منظر دوم

(دلی میں رہتے سال بھر ہوا تھا۔ کہ ایک دن کنور چھترسال گھوڑے پر سوار ہوکر سیر کو گیا۔ اور ولی بہادر خاں کے محل کی طرف سے جا نکلا۔ راجکمار تنہا تھا ولی بہادر خاں کے آدمی وقت کے منتظر تھے گھوڑا چھین لیا۔)

(کنور چھترسال مغموم داخل ہوتا ہے)

سارن۔ کیوں خیریت ہے

کنور چھترسال۔ گھوڑا ولی بہادر خاں کے آدمیوں نے چھین لیا!

سارن۔ (غصہ سے چہرہ تمتما اٹھا) کچھ فکر کی بات نہیں گھوڑا گیا بلا سے گیا۔ لیکن دُکھ یہ ہے کہ تو اوسے زندہ کھو کر کیسے لوٹا۔؟ کیا تیری رگوں میں بندیلہ خون نہیں ہے؟ تجکو ثابت کر دینا چاہیے تھا کہ بندیل راجکمار سے گھوڑا چھین لینا کوئی ہنسی ٹھٹھا نہیں ہے ——"

(غصہ سے) جاؤ کوشلیا استری پلٹن کو لیس ہونے کا حکم دو۔

(کوشلیا جاتی ہے)

چھترسال تم اور تمھارے پتا دونوں اب شاہی غلام ہوگئے ہیں۔ تم لوگ اب داد عیش دو۔ اور میں ابھی اپنی استری پلٹن کی مدد سے گھوڑا لاتی ہوں —— چاہے انجام کچھ ہی ہو

(جاتی ہے)

(سپاہیانہ بانا سجا کر اور استری پلٹن کو لے کر خانصاحب کے اصطبل سے زبردستی گھوڑا کھولتی ہے۔ جنگ کی نوبت آتی ہے مگر بندیلہ خواتین کے سامنے کسی کی پیش نہیں جاتی ہے)

چھترسال۔ راج ماتا۔ آپ آگئیں (قدم چومتا ہے)

سارن۔ لو۔ یہ تمھارا گھوڑا ہے

(گھوڑا سارن کی گود میں اپنا سر ڈال دیتا ہے۔ اوس کی آنکھوں سے آنسو کی دھار بہنے لگی)

اے بے زبان گھوڑے تو کیوں رو رہا ہے۔ لا تیرے آنسو پونچھ دوں

(گھوڑا سر جھکا دیتا ہے)

(چنپت رائے داخل ہوتا ہے)

چھترسال۔ پتاجی۔ دیکھئے راج ماتا نے کمال کر دیا

چنپت رائے۔ کمال کر دیا ——

سارن۔ سوامی آپ متفکر کیوں ہیں

چنپت رائے۔ کاش یہ گھوڑا مجکو نہ دکھائی دیتا۔ یہ گھوڑا میرے اعزاز کے لئے آہوئے زرنگار ثابت ہوا۔ سینا جی نے

ہرن دیکھا۔ ہرن ہوئیں۔ میں نے گھوڑا دیکھا۔ اعزاز ہرن ہوا

چھترسال۔ (متحیر ہوکر) کیا قصہ ہے

چنپت رائے۔ رانی سارن گھوڑا کھول لائیں۔ اور ادھر عالمگیر کو پرچہ لگا اور ان کو رانی کی یہ جرأت ایک منصب دار کے خلاف ناگوار ہوئی اور گھوڑے کی واپسی کا حکم آیا ہے اور اوسی کے ساتھ منصب وجاگیر بھی اس گھوڑے کی نذر ہوگیا۔ ولی بہادر خاں پہلے ہی سے مجھ سے جلتے تھے۔ اور بہت سے راجپوت بھی اس سازش میں شریک ہیں

چھترسال۔ گھوڑا واپس کردیا جائے

رانی سارن۔ نہیں میری لاش جب اٹھیگی اوس وقت یہ گھوڑا جاسکے گا

چنپت رائے۔ رانی تمہاری ضد سے یہ ہوا —— گھوڑا تو جائے گا

رانی سارن۔ سوامی۔ جب آپ ہی یوں کہتے ہیں تو بیشک چلا جائے گا (رونے لگتی ہے)

منظر سوم

(راجہ چنپت رائے قلعہ میں مقیم ہیں۔ منصب وجاگیر جانے کا قلق ہے لیکن رانی سارندہ کی وجہ سے شکایت نہیں کرتے۔ عالمگیر نے اطمینان ہونے کے بعد چنپت رائے کی جانب توجہ کی راجہ سبھ کرن بندیلہ نے راجہ چنپت رائے کو خاک میں ملانے کی قسم کھائی۔ بندیلہ سردار راجہ چنپت رائے سے منحرف ہوکر شاہی فوج میں شامل ہوگئے۔ قرب وجوار کے بندیلہ راجاؤں نے بھی رفاقت سے منھ موڑا۔ چنپت رائے نے بھی آوارہ گردی شروع کی۔ رانی سارندہ اور راجکمار چھترسال برابر راجہ کے ساتھ سائے کی طرح تھے۔ شاہی فوج نے مقابلہ سے عاجز آکر عالمگیر کو اطلاع کی کہ راجہ کو گرفتار کرنا مشکل ہے۔ چنانچہ محاصرہ اٹھالیا گیا۔ راجہ چیر چھ قلعہ میں واپس آگئے لیکن چند ہی ماہ کے بعد آوارہ دخت ہونا پڑا۔ اس وقت میں ہفتوں سے شاہی فوج اور چھا کا محاصرہ کئے ہوئے ہے اور راجہ چنپت رائے بخار میں مبتلا ہیں)

چنپت رائے۔ (آنکھ کھول کر) سارن کیا سماچار ہے ؟

سارن۔ فصیلوں کو گولوں نے چھلنی کردیا ہے۔ بیس ہزار جانیں قلعہ میں بند ہیں۔ جن میں عورتیں اور بچے بھی شامل ہیں۔ مردوں کی تعداد روز بروز گھٹ رہی ہے۔ رسد بند ہے۔ باہر سے آمدورفت بالکل ختم ہوگئی ہے۔ استریاں اپنے بالکوں اور سوامیوں کو زندہ رکھنے کے لئے فاقہ کررہی ہیں۔ استریاں سورج دیوتا کی طرف ہاتھ اٹھا اٹھا کر کوس رہی ہیں۔ سب سے بڑھ کر آپ کی بیماری نے قلعہ میں کہرام مچادیا ہے

راجہ۔ معلوم ہوتا ہے کہ سارن آج دشمن ضرور قلعہ کے اندر گھس آئیں گے

سارن۔ ایشور نہ کرے کہ یہ دن دیکھنا پڑے

راجہ۔ ان قلعہ والوں کا کیا حال ہوگا ؟

سارن۔ ہم لوگ قلعہ چھوڑ کر چلے جائیں تو کیا ہو ؟

راجہ۔ کیا ان بدنصیبوں کو اپنی زندگی پر نفرت کرنے کے لئے

سارن۔ نہیں شاید دشمن ان پر رحم کریں۔ دشمنی تو ہم سے ہے نہ کہ ان سے

راجہ۔ نہیں یہ تو مشکل ہے۔ ہم سے نہیں ہوسکتا ہے کہ اپنی بلا ان غریبوں کے لئے چھوڑ جائیں —— عورتوں و بالکوں کو میں کسی طرح بھی چھوڑ نہیں سکتا

سارن۔ مگر یہاں رہنے سے ہم کیا کرسکتے ہیں

راجہ - مر تو سکتے ہیں؟ قید کی مصیبتیں سہوں گا لیکن قلعہ میں رہوں گا

سارن - پران ناتھ - آپ ٹھیک کہتے ہیں مجکو شرمندگی ہوئی کہ ایسی بات کیوں کی۔ (کچھ سوچ کر) اچھا اگر آپ کو یقین ہو جائے کہ ان کے ساتھ کوئی ظلم نہ ہوگا تو آپ چل سکتے ہیں؟

راجہ - (بہت غور کرنے کے بعد) یقین کیسے ہو؟

سارن - شاہی سپہ سالار کی تحریر!

راجہ - ہاں - اس شرط سے کہ یہ لوگ بھی ہم کو رخصت کر دیں

(سارن جاتی ہے)

منظر چہارم

سارن - کنور میں نے تم کو اس لئے بلایا ہے کہ تم کو میں بندیلہ راج کی آن پر بھینٹ چڑھا دوں

چھتر سال - ماتا جی جو آگیان ہو میں تیار ہوں

رانی سارن - آج لڑائی کی کیا کیفیت ہے

چھتر سال - اب تک پچاس آدمی مر چکے ہیں

رانی سارن - بندیلہ کی لاج اب ایشور کے ہاتھ ہے - اچھا یہ کام کس کے سپرد کیا جائے

چھتر سال - میرے

رانی - پورا کر دگے

چھتر سال - ہاں یقین تو ہے - اچھا ماتا جی رخصت

رانی - (سینہ سے لگا کر) ایشور تمھاری صورت جلد دکھائے

(روتی ہے)

(چھتر سال جاتا ہے)

(منظر بدلتا ہے)

رانی سارندہ - جیون ناتھ - آپ نے جو وعدہ کیا تھا دس کو پورا کیجئے

راجہ - تم نے وعدہ پورا کیا؟

رانی سارن - تحریری معاہدہ حاضر ہے جو آج تیر میں باندھ کر کنور چھتر سال نے بھیجا ہے

راجہ - ہاں اب میں چلوں گا - اور ایشور نے چاہا تو ایک بار پھر ان دشمنوں کے خون سے اپنی تلوار کی پیاس بجھاؤں گا مگر سارن یہ بتانا اس کاغذ کا کیا مول ہے؟

سارن - (آبدیدہ ہو کر) ایک جوان بیٹا - کاغذ کے ایک پرزہ کی اس قدر گراں قیمت کس نے ادا کی ہوگی

راجہ - (سکتہ ہو گیا) ہیچ کر کون

سارن - کنور چھتر سال

راجہ ——— ہائے ——— (بیہوش ہو کر گر پڑتا ہے)

(پردہ گرتا ہے)

منظر پنجم

(راجہ چنپت رائے - صاحب فراش ہے - تاریک رات میں پالکی میں بیٹھ کر قلعہ والوں کو اپنی قسمت پر رونے کے لئے قلعہ کی زمین دوز راستہ سے اور جیا سے ۵ میل آگے نکل چکا تھا - رانی سارندھا سپاہیانہ لباس پہنے - گھوڑے پر سوار تھی - راجہ پالکی میں بے سدھ تھا - اور کہار پسینہ میں شرابور تشنگی سے قافلہ کا برا حال تھا - پانچ سوار پالکی کے ساتھ تھے - کہ دفعتاً شاہی فوج آگئی اور پالکی سارندہ کے حکم سے روک لی گئی)

سارندھا - سوارو - دیکھو وہ فوج کیسی آ رہی ہے

سوار - شاید شاہی فوج ہے!

رانی - شاید میرے راجکمار - میری سہایتہ کے لئے آتے ہوں گے

راجہ۔ (ہوش میں آکر) کیا ہے۔؟

رانی۔ (غور سے دیکھ کر) فوج آگئی ہے۔ کہارو پالکی روک لو

(پالکی رکتی ہے)

راجہ۔ بہادرو بیرو۔ آخری جوش اور دکھادو

(تلواریں کھنچ جاتی ہیں)

سپاہی۔ جے ہے جے

راجہ۔ (پالکی سے باہر آکر) ——— سارن ———

(غش کھا کر گر پڑا)

سارن۔ (آبدیدہ ہوکر) پران ناتھ ———

چنپت رائے۔ سارن افسوس جس ذلت سے تمام عمر بچتا رہا وہ آج مرتے دم نصیب ہوئی۔ میری آنکھوں کے سامنے دشمن تمہارے پوتر شریر کو چھوئیں گے اور میں ہل بھی نہ سکوں گا ——— ہائے موت کب آئے گی؟

...... سارن! تم نے بہت نازک موقعوں پر میری آن رکھی ہے۔"

سارن۔ (خوش ہوکر) پران ناتھ۔ ایشور نے چاہا تو جب تک سانس باقی ہے جیو ناتھ کے خلاف کچھ نہیں کرسکتی

(تیغہ کو لے کر اپنے سینہ کے قریب رکھتی ہے)

راجہ۔ کیا تم کو منظور ہے!

سارن۔ مرتے دم تک مانوں گی

راجہ۔ آخری خواہش ہے اس کو رد نہ کرنا

سارن۔ (تیغہ کو سینہ میں چبھوتے ہو) یہ آپ کی درخواست ہے؟

چنپت رائے۔ نہیں یہ خواہش نہیں ہے

سارن۔ میری آرزو ہے کہ مروں تو سر آپ کے قدموں پر ہو

چنپت رائے۔ تم نے میرا مطلب غلط سمجھا۔ میں ایک بردان مانگتا ہوں

سارن۔ شوق سے کہئے!

راجہ چنپت رائے۔ زبان کا پاس کرنا

سارن۔ (کانپ کر) فرمائیے

راجہ۔ اپنا خنجر میرے سینہ میں چبھو دو

سارن۔ (سناٹے میں) جیون ناتھ ایسا کبھی ہوا ہے؟

راجہ۔ میں قید ہوتے کے لئے زندہ نہیں رہ سکتا

سارن۔ مجھ سے کیسے ہوگا

(پانچواں سوار بھی حق نمک ادا کرتا ہے)

راجہ۔ (جھنجھلا کر) کیا اسی پر آن نباہنے کا دعویٰ تھا

شاہی سپاہی۔ راجہ کو لینا ——— راجہ کو ———

رانی ——— ٹھیرو

(خنجر آبدار راجہ کے سینہ میں پیوست کردیتی ہے)

شاہی سپاہی۔ رانی صاحبہ۔ ارے آپ کیا کررہی ہیں۔ ہم آپ لوگوں کا بال بیکا نہ کریں گے شہنشاہ عالمگیر کا حکم ہے۔ آپ لوگوں کو عزت و آبرو کے ساتھ چندیری پہونچادیں آپ نے غضب کردیا۔ کسی عورت کی تلوار سے بھی کبھی ایسا کام ہوا ہے؟ ہم نے اودے پور اور مارواڑ کے راجپوتنیوں میں بھی یہ خودداری کا جذبہ نہیں دیکھا۔ عورت کے لئے جان دیدینا بہت آسان ہے مگر رانی صاحبہ جو کام آپ نے کیا ہے وہ کوئی عورت کر ہی نہیں سکتی۔ بتلائیے ہم شہنشاہ عالمگیر کو کیا منہ دکھلائیں گے۔ آپ کے بندہ بے دام ہیں آپ کا جو حکم ہو اوسی بسرو چشم بجالائیں، اسلام سچا مذہب ہے اور ہم اوس کے نام لیوا ہیں۔ ہم خدا کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ آپ کے جسم

پر ہاتھ ڈالنا ہمارے لئے حرام ہے جو حکم آپ دیں اوس کے بجالانے کے لئے ہم تیار ہیں۔

سارن۔ (مسکراتے ہوئے) یہ خنجر۔ فرض کی کٹار ہے۔ پریم کی برچھی ہے۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔ پریم کی ناؤ پریم کے ساگر میں غوطہ لگا رہی ہے۔ جو سینہ کل تک عزت کا پاسبان اور میری محبت کا خزانہ تھا۔ آج اسی پاک سینہ کو میری تلوار جوم رہی ہے ——— اگر ہمارے راجکماروں میں سے کوئی زندہ ہو تو ہماری دونوں لاشیں اون کو سونپ دینا ——— (خون آلود خنجر اپنے سینہ میں بھونک لیتی ہے)

(پردہ گرتا ہے)

مشیر احمد علوی ناظر (کاکوروی بی۔اے)

نگار کے گزشتہ سالوں کے پرچے

حسب ذیل قیمت پر معہ محصول مل سکتے ہیں

سنہ ۲۲ع

ستمبر	۴ر
اکتوبر	۴ر

سنہ ۲۳ع

مئی	۶ر
جون	عہ

سنہ ۲۴ع

جنوری	۴ر
فروری	۴ر
مارچ	۴ر
اپریل	۴ر
مئی	۴ر
جون	۴ر
جولائی	۶ر
اگست	۴ر
ستمبر	۶ر
اکتوبر	۸ر

سنہ ۲۶ع

جنوری	۴ر
اپریل	۸ر
مئی	۴ر
جون	۴ر
اکتوبر	۴ر
نومبر	۴ر
دسمبر	عہ

سنہ ۲۷ع

مارچ	۴ر
اپریل	۴ر
مئی	۴ر
جون	۴ر

سنہ ۲۸ع

دسمبر	۸ر

سنہ ۲۹ع

مارچ	۸ر
اکتوبر	عہ
نومبر	عہ

سنہ ۳۰ع

مئی	۴ر
اگست	۸ر
ستمبر	۴ر
اکتوبر	۴ر
نومبر	۴ر
دسمبر	۶ر

سنہ ۳۱ع

جولائی	۳ر
اگست	۳ر
ستمبر	۴ر
اکتوبر	۳ر
نومبر	۳ر
دسمبر	۳ر

سنہ ۳۲ع

جنوری	۱۲ر
فروری	۴ر
مارچ	۴ر
اپریل	۸ر

سنہ ۳۲ع

مئی	۴ر
جون	۴ر
جولائی	۴ر
اگست	۴ر
ستمبر	۴ر
اکتوبر	۴ر
نومبر	۴ر
دسمبر	۴ر

سنہ ۳۳ع

فروری	۴ر
مارچ	۸ر
اپریل	۸ر
جولائی	۴ر
ستمبر	۴ر
اکتوبر	۴ر
نومبر	۴ر
دسمبر	۴ر

مینیجر نگار لکھنؤ

وحی کی حقیقت علمی نقطۂ نظر سے

وحی، اصطلاح میں اُس مراسلت یا پیغام کو کہتے ہیں جو خدا کی طرف سے اپنے نبی پر بوساطت فرشتہ یا بلاواسطہ نازل ہو، وحی کا عقیدہ خالص اسلامی عقیدہ نہیں ہے کیونکہ بنی اسرائیل بھی کہا کرتے تھے کہ خدا ان کے قائدین سے براہِ راست کلام کرتا ہے۔ اور نسطورئین تو غیر عیسیٰ ابن مریم کو الوہیت ثلاثہ کا رکن سمجھتے تھے لیکن اسلام کا وحی کو بوساطت فرشتہ ماننا گویا قرون مابعد کا معقولات کی جانب ایک قدم اٹھانا تھا کیونکہ بلاواسطہ وحی کا عقیدہ خدا کی تجسیم کو مستلزم تھا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ خدا کا بندوں کے نام پیغام بھیجنا، اور پیغام کی نوعیت جس سے اس کے اعلیٰ ماخذ کا پتہ چلے کہاں تک محسوس شہادت سے مسلم سمجھی جاسکتی ہے۔ اسی سلسلہ میں، ہم اُن تمام رجحانات کو بھی بنظر امعان دیکھیں گے جن کی بنا پر انسانی تکمیلات کو ایک خاص کامل و مکمل ہستی کی جانب منسوب کیا گیا

خدا کا پیغام

تدریجی ترقی کی شہادت نے اس امر کو پایۂ ثبوت تک پہونچا دیا ہے کہ فطرۃ کے حقائق انسان پر رفتہ رفتہ اور اکثر نہایت غیر متوقع طور پر رونما لیکن یہی اکتشافات ہیں جنھوں نے انسان کے ارتقاء میں عظیم الشان حصہ لیا اور تہذیب و تمدن کو نوبت بہ نوبت موجودہ منزل تک پہونچایا۔ انسان کی قوت و کمزوری یا اس کی دیگر خصوصیات سب نتیجہ ہیں اُن بے شمار عملی رجحانات کے جو جو اُن کے افراد میں پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ قصداً خواہ غیر ارادی طور پر۔ ماضی کی لاتعداد صدیوں میں نوع آدم کا رفتہ رفتہ سطح کے اوپر آنا نہایت دلچسپ مطالعہ ہے۔ خدا کی ارضی مخلوقات میں سے کتنی انواع اب تک معدوم ہو چکی ہیں جن کے آثار جابجا زمین کی تہوں میں سے برآمد ہو رہے ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ ان کے معدوم کرنے میں خدا کسی انتقامی جذبہ سے متاثر نہ تھا۔ کیونکہ فطرت مقررہ اصول کی کاربند ہے اور انھیں اصول کے ماتحت فنا و بقا کا نظام جاری ہے جس کو ہم انسانی اصطلاح میں جو چاہیں کہکر پکاریں۔ اسی اصول کی بنا پر کتنے خاندان و فرقے مٹ گئے۔ لیکن خدا نے نہ کسی کے بچانے کے لئے اپنا ہاتھ بڑھایا اور نہ بڑھاتا ہے۔ اقوام اس وسیع قانون کے ماتحت جسے "قانون حفظ حیات" (Law of preservation of life) کہتے ہیں اپنی فطرۃ اور ماحول کے مطابق متاثر ہوتی تھی اور اسی تاثر کا نام عروج و زوال ہے۔ انسان نے مجموعی طور پر جو باتیں اپنی آسانی کے لئے سمجھیں یا وضع کیں وہ بالکل انہی قدرتی اصول کے ماتحت تھیں اور نسلاً بعد نسل کام آتی رہیں۔ مثلاً آگ یا دور پہیے کی ایجاد جس نے فاصلہ کی تسخیر میں اتنا حصہ لیا۔ جانوروں کے اہلی بنانے کی ابتدا۔ فن تعمیر میں محراب کی ایجاد۔ اوزاروں کی صنعت۔ پانی پر تیرنے اور حرکت کرنے

والی چیزوں کا انکشاف وغیرہ وغیرہ - علاوہ بریں اخلاقی قوانین - سیاست مدن اور علوم و فنون کہ یہ سب رفتہ رفتہ انسانی تجربہ سے ظہور میں آئے - اور ان میں سے کسی ایک تفصیل کو بھی خدا نے فرشتہ بھیج کر نہیں بتلایا - الغرض انسان کے دوران ارتقار میں عمرانی زندگی کے مختلف شعبوں میں جو حقایق دریافت ہوئے ہیں اور اب نسل فی الجملہ اُن سے مستفید ہو رہی ہے وہ ایک زمانہ یا کسی ایک شخص کی تکمیلات میں سے نہیں ہیں بلکہ پچھلے علم اور تجربہ کی بنا پر نسل کے افراد ان کو دریافت کرتے رہتے ہیں اور یہ دستور العمل اب بھی جاری ہے اور آیندہ جاری رہے گا' اس کا نام ہدایت یا غیبی اعانت ہے جو کسی وقت یا مقام کے لیے مخصوص نہیں

اب اس تمہید کے بعد دیکھنا چاہئے کہ خدا کے پیغام کی نوعیت کیا ہے - خطاب کی شکلیں تین ہو سکتی ہیں - ایک تحریر - دوسرے کلام فی الصوت - تیسرے ذہنی تصور - صاف ظاہر ہے کہ پہلی شکل خارج از بحث ہے کیونکہ خدا کی طرف سے تحریری احکام پانے کا کسی نے دعویٰ نہیں کیا - دوسری صورت یعنی غیب کی آواز یا ندا - سو یہ صورت مشرقی ادب اور روایات میں اس قدر عام طور پر مسلمہ ہے کہ ہمارے ذہن نہایت آسانی سے اس کو قبول کر لیتے ہیں - اور ہم ہر زمانہ میں خاص خاص بندگان خدا کی نسبت اس کو ممکن سمجھتے رہے ہیں - لیکن ظاہر ہے کہ آواز اگر مستدرک (Coherent) ہوگی تو وہ یا تو کسی انسانی گلے سے خارج ہوگی یا صدائے بازگشت ہوگی یا جدید آلات مثلاً گراموفون، ریڈیو فون وغیرہ سے ماخوذ ہوگی - لیکن خدا چونکہ جسم وغیرہ کی احتیاج سے بری ہے اس لئے اس کا مستدرک صوت پیدا کرنا محال ہے - اب رہی تیسری شکل، ذہنی تصور کی - جس سے وحی کا مفہوم مستنبط ہو سکتا ہے - سو اس کی حالت یہ ہے - کہ انسان کے ذہن میں کوئی تصور از خود بغیر کسی خارجی سبب کے پیدا ہو ہی نہیں سکتا - اور وہ خارجی اسباب اسی کے تجربات یا مشاہدات ہوتے ہیں جو ذہن انسانی میں مختلف و متنوع صورتیں اختیار کر لیتے ہیں - مثلاً خواب میں انسان کو عجیب و غریب شکلیں دکھائی دیتی ہیں لیکن ان کی اجزائی ترکیب فرداً فرداً اوس کے ذہن میں پیشتر سے موجود ہوتی ہے - مثلاً کسی شخص نے سونے کا پہاڑ دیکھا تو اگرچہ بیداری میں یہ تصور اس کے خیال میں نہ آیا ہو لیکن سونا اُس نے دیکھا ہے اور پہاڑ بھی اور ایک شے کی بہتات کا تصور بھی ذہن میں آچکا ہے - سوتے وقت دماغ ارادے کی گرفت سے آزاد ہوتا ہے لہٰذا ایک نقش دوسرے کسی نقش سے مل کر یا باہم کئی نقوش آمیز ہو کر عجیب و غریب شکلیں (Synthetic Combination) بنانے رہنا بالکل ایک فطری عمل ہے - بہرحال خواب ہو یا بیداری اگر تصور کو مطلق العنان کر دیا جائے تو گزشتہ تاثرات کے ذخائر اسقدر کثیر التعداد نئی شکلیں پیش کریں گے کہ علم ریاضی ان کے حساب سے قاصر رہے گا

اب ہم ضمناً اس بحث کو اٹھائیں گے کہ خدا کے پیغام کی نوعیت کیا ہو سکتی ہے، مخلوق پر اس کے اجرا کی کون سی صورت ممکن ہے - خود اجرا کی کیا ضرورت ہے اور یہ عقیدہ کہاں سے آیا لیکن اس پر بحث کرنے سے قبل انسان کے ذہنی ارتقا کی تاریخ مجملاً جان لینا ..... ضروری ہے ——— انسان نے جن قوانین کے ماتحت رفتہ رفتہ

ترقی کی اُن سب کی بنیاد ماحول کی ضرورت، فطری صلاحیت اور قوت حافظہ و استدلال پر قائم ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہر جاندار کو دوسروں کی دستبرد سے بچنے کے لئے کوئی نہ کوئی جسمانی یا طبیعی خصوصیت عطا ہوئی ہے۔ چنانچہ ہرن کی قسم کے جانوروں میں ٹانگوں کی قوت اور دوڑنے کی صلاحیت۔ لومڑی کی چالاکی اور فی الفور قوت فیصلہ، خرگوش کے کان، سانپ کا زہر، بندر کی چستی، خارپشت کے کانٹے، تیتری کے قسم کے پتنگوں کے لمبے لمبے خار، بعض نازک پودوں کا نباتی زہر پھیلنے والی بیلوں کی گرفت وغیرہ پھر اس امر کا ثبوت کہ یہ خصائص خلقی طور پر اکتسابی ہیں اس بات سے بہم پہونچتا ہے کہ جہاں حفظ نفس کے لئے ان کی ضرورت باقی نہیں رہتی تو یہ رفتہ رفتہ کرکے سلب یا محو ہو جاتی ہیں مثلاً اہلی جانوروں کی دفعی خصوصیت اُن کے سینگ اور سر کی ٹکر تھی جواب بھی جنگلی بھینسوں اور ارنوں میں موجود ہے مگر اہلی جانور انسان کی حمایت میں اس کی ضرورت ہزاروں نسلوں کے دوران میں کھو چکے ہیں چنانچہ اب اُس کی یادگار صرف سینگ باقی رہ گئے ہیں۔ اسی طرح انسانی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اوّل اوّل ایک جانور ہی کی زندگی بسر کرتا تھا۔ اور رفتہ رفتہ تجربہ و استدلال کی مدد سے اس نے ترقی کی، چنانچہ ہم مذہبی زبان میں کہہ سکتے ہیں کہ جس طرح اُس نے ابتدائی شیروں کو شکار کی تلاش کے طریقے بتائے، جس طرح اس نے بئے کو گھونسلا بنانا سکھایا، جس طرح اُس نے چرندوں کو مختلف قسم کی نباتی پیداوار میں تمیز کرنا سکھایا، ٹھیک اسی نہج سے وہ انسانوں کی مساعی سے نتائج پیدا کرتا رہا جسے آپ پیغام خداوندی کہیے یا کچھ اور ورنہ یوں خدا کو فی الحقیقت ہماری بقا۔ ہماری ترقی۔ ہماری بہبودی اور ہماری نجات کسی چیز کی پرواہ نہیں وہ احساس اور جذبات سے بالکل بری ہے وہ صرف قدرت ہے محیط و ساری اور نیک و بد کا تعلق صرف ہماری ذات سے متعلق ہے اور ہمیں پر اس کا اثر ہوتا ہے۔ — صرف ایک اصولی بحث ہمیں اس سلسلے میں اور کرنا ہے وہ یہ کہ خدا کا پیغام مخلوقات کی کسی نوع کیلئے اگرچہ بعید از قیاس ہے لیکن ضرورت بحث کیلئے صحیح باور کرلیا جائے تو اسکے لئے دو شرطیں لازم ہیں اوّل تو یہ کہ اسے عالمگیر ہونا چاہیے دوسرے یہ کہ ابتدائے تخلیق نوع کے وقت ہونا چاہیے اور ساتھ ہی ایسی صورت کیساتھ کہ نسلاً بعد نسل اسکی تکرار ہوتی ہے۔ درانحالیکہ اصطلاح کا پیغمبری نظام صرف بنی اسرائیل اور سامی اقوام تک محدود بتایا جاتا ہے۔ علاوہ اسکے تمام ہادیوں کو متفق اللسان ہونا چاہیے تھا مشن ایک ہونا ضروری تھا اور نتائج میں بھی یکسانیت ہونی چاہیے تھی۔ درانحالیکہ خود سامی اقوام کے مختلف مذاہب باہمد گر متفق نہیں ہیں اور اوامر و نواہی تعزیری قوانین میراثی ترتیب اور رائی حقوق میں جا بجا فرق موجود ہے علاوہ بریں پیغام کی ترجمانی ہر زمانہ میں اور مختلف مقامات پر جدا جدا ہوتی رہی اسلئے پیغام کا ظاہری مقصد فوت ہوتا ہوا معلوم ہوتا ہے پیغام کو صاف اور صریح ہونا چاہیے تاکہ ہر شخص اسے آسانی سے سمجھ سکے۔ اسکو مبہم اور غیر متعین عبارتیں نہ ہونا چاہیے کہ لوگ حسب ضرورت یونانی ایڈلفی کیطرح اپنے اپنے معنی نکالیں اور سب سے زیادہ اہم یہ شرط ہے کہ اسکے اجزا باہم متناقض نہ ہوں ایک حکم دوسرے حکم کی ایک بیان دوسرے بیان کی تردید نہ کرے کوئی بات خلاف قیاس نہ ہو اور فطرۃ کے عام طریقوں کے منافی نہ ہو

اب اس مسئلہ کو دوسرے رُخ سے دیکھنا ہمیں مقصد سے زیادہ قریب کرے گا۔ ہم یہ دیکھیں گے۔ کہ وہ کون سی صورتیں ہوتی ہیں جن میں انسانی افعال خدا یا ما فوق الادراک قوت کی جانب منسوب کئے جاتے ہیں۔ ہم نے قبل ازیں دوران بحث میں بتایا ہے — کہ خارجی تاثرات انسان کی ذہنی اور طبیعی تشکیل میں اکثر کار فرما رہتے ہیں اور نطق خارجی تحریک کا ردِ عمل ہے جسے ذہن کوئی اثر قبول کرنے کے بعد جواباً باہر بھیجتا ہے مثلاً کسی شخص کے شانہ پر کسی نے ہاتھ رکھا۔ اور دماغ نے اس کو محسوس کیا پھر تجربہ سے اُس نے معلوم کیا کہ جب کوئی شخص ایسا اشارہ کرتا ہے تو وہ مخاطب کرنا چاہتا ہے، یہ تمام ذہنی عمل چشم زدن میں اُس کے

نظام اعصابی نے انجام دیا اور جواباً اُس کے نطق نے ان الفاظ کی تشکیل کی "کیا کہتے ہو"

اس طرح پر نطق گویا ذہن کے بازعمل کا آلہ ہے جس کے ذریعہ سے انسان نے اپنا مافی الضمیر دوسروں پر ظاہر کرنا قبل تاریخی زمانہ سے جان لیا ہے۔ اور الفاظ اور ادائے مطلب کے علامات روز بروز بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ با محل اور موثر الفاظ و علامات کا استعمال نہایت بلند پایہ فن سمجھا جانے لگا۔ پھر چونکہ اس لحاظ سے شاعر، نثار، مقرر، خطیب وغیرہ سب تصوری آرٹسٹ ہیں۔ اس لئے جتنا زیادہ انسانی جذبات و احساسات کو ملحوظ رکھتے ہوئے وہ اپنی صناعی کریں گے۔ اتنا ہی زیادہ کامیاب ہوں گے

شاعر غالباً سب سے قدیم آرٹسٹ اس فن کا ہے ———— لیکن اس میں اور ایک محقق میں یہ فرق ہے کہ شاعر زیادہ تر اپنے جذبات سے کام لیتا ہے جیسا کہ وہ چاہتا ہے اور ایک محقق صرف فطری خط و خال سے بحث کرتا ہے یا بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ محقق واقعات سے پہلو تہی نہیں کر سکتا خواہ وہ کتنا ہی متاثر ہو اور شاعر کو اوزان اور تناسب الفاظ کا پابند ہونا پڑتا ہے

اب ماضی کے ادوار پر نظر ڈالنے اور اقوام کی تدریجی نشو و نما پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ شاعر اور اس کے جیسے ارباب فن کے فروغ کا زمانہ عموماً وہی ہوتا ہے جو علمی کساد بازاری کا ہوتا ہے حالانکہ صحیح معنوں میں کسی قوم کا کوئی دور اب تک ایسا نہیں گزرا جو خالص علمی کہا جا سکے اور اسی نسبت سے شاعر کا فن ہر جگہ کم و بیش پایا گیا ہے، انگلستان میں شیکسپیر ملٹن اور ٹینیسن کے زمانہ کو زیادہ دن نہیں گزرے اور فی الحال اگر اس میں کچھ کمی ہوئی ہے تو دوسرے جدید آرٹ نے اس کی جگہ لے لی ہے یعنی ناول نویسی افسانہ نگاری اور جرنلزم وغیرہ نے۔ ان میں بھی تصورات کی ترتیب ہے اور ساتھ ہی واقعات کی جن سے تعلیمی اور تفریحی کام لیا جاتا ہے لیکن صاف ظاہر ہے کہ یہ بھی سب انفرادی آرٹسٹ کے تصوری نظام کی سادگی و پرکاری ہے۔ ہندوستان میں ویدوں کے گیت ہمیشہ گائے گئے اور برہمن اسی کے اشلوک اور منتروں سے دوسری ذاتوں کو نشانۂ ستم بناتے رہے کالیداس کے والمیک والے جادو سے سنسکرت داں طبقہ اب تک واقف ہے اس کے علاوہ شنکر اچاریہ۔ کبیر نانک اور چیتیا نے بھاشا زبان کے ذریعہ سے عوام کو مسحور کیا

عرب میں ایام جاہلیت کی شاعری ایک قومی جوہر تھا، شاعر، قبیلہ کی قوتوں میں ایک اہم قوت سمجھا جاتا تھا۔ رجز، نسب نامے، تلوار اور گھوڑے کی شہرت شاعر پر منحصر تھی۔ دشمنوں پر تلوار اور نیزے سے زیادہ کاری زخم ہجویہ اشعار کے لگائے جاتے تھے۔ شاعری عرب کی آواز تھی شاعری عرب کی جان تھی۔ اُن کی دماغی اور ذہنی تشکیل۔ اُن کی قومی عادت اور ان کے معیار زندگی ان سب میں شاعری بحیثیت عنصر غالب کے جلوہ نما تھی اور قومیت کا شیرازہ اگر کسی چیز سے متصور ہوتا تھا تو وہ شاعری کے ذریعہ سے رائج کئے ہوئے مشترک خیالات سے۔ اُس زمانہ میں شعر چند مخصوص افراد کا مشغلہ دماغی نہ تھا بلکہ کل قوم کا واحد ذریعہ اظہار خیال تھا۔ ہر قبیلہ میں ایک یا زیادہ شاعر ہوتے تھے جو اپنے جملہ مشاہدات اور تاثرات کو آزادی کے ساتھ عروضی جامہ پہنانے

تھے۔ اُن کے بے لکھے الفاظ صحرائے عرب کے ایک گوشہ سے دوسرے تک تیر کی سُرعت کے ساتھ پہونچ جاتے اور زبان زد ہوجاتے تھے۔ بچہ بچہ اُن کی خوبیوں کو پرکھ سکتا تھا اور ذرہ سی اونچ نیچ کو سنتے ہی تمیز کرلیتا تھا۔ اَلشِّعرُ دِیْوَانُ العرب بہت مشہور مقولہ ہے۔ عرب کی ریگستانی زندگی کے تمام مظاہرے اس میں محفوظ ہیں۔ عرب جو کچھ سوچتا تھا اور سمجھتا تھا اور محسوس کرتا تھا وہ ان قبائلی منادیوں یا اعلان کرنے والوں سے نہ بچ سکتا تھا۔ اُن کی چھوٹی اور بڑی رسمیں اُن کے قومی اور انفرادی رجحانات اُن کی آرزوئیں اور مقاصد شاعروں ہی کی آواز سے بروئے کار آتے تھے۔ غرضکہ باوجود خانہ جنگی اور انتہائی بدنظمی کے ایک متحد کرنے والا عنصر اندر ہی اندر کام کررہا تھا۔ کوئی اخلاقی و تمدنی مربوط قوت اُن کے درمیان نہ تھی مگر یہی اشعار تھے جو مختلف شاعروں کی زبان سے نکل کر ایک غیر مدوّن سرمایہ بن گئے تھے۔ جس نے 'مروت' کے اخلاقی معاشرتی معیار قائم کئے تھے اور جس نے عصبیت اور نسبی شرف کو ایک طرح پر منظم پیمانہ پر قائم کردیا تھا۔ لوگ ایک مشترک جذباتی و احساسی یگانگت محسوس کرتے تھے۔ اشیا کا اندازہ انہی شاعرانہ معیاروں کی بنا پر کرتے تھے۔ اور زبان کے جوہر فصاحت۔ بلاغت اور دیگر محاسن کلام کو بن پڑھے ہوئے سمجھ لیتے تھے۔ اور کوئی بات اُن پر اثر نہ کرسکتی تھی مگر وہ جو فصیح و بلیغ شعروں کی شکل میں اُن تک پہونچتی تھی

لیکن ظاہر ہے کہ جاہلیت کے عربوں کا علمی مبلغ کیا ہوگا۔ یونان کے ماوراء الطبیعات کا علم انھیں مطلق نہ ہوا تھا۔ وہ بودھ کے نروانی فلسفہ سے قطعاً نا آشنا تھے۔ نہ زرتشت کی تعلیم کا وہاں کچھ اثر تھا نہ قدیم مصری تمدن کا انھیں پتہ۔ بنی اسرائیل کی نیم تاریخی روایات اور تورات وانجیل کے زیادہ مشہور نظریات، نجرانی عیسائیوں اور منتشر یہودی قبائل کے ذریعہ سے البتہ ان کے حیطۂ علم میں سرایت کئے ہوئے تھے۔ الٰہیات۔ مذہب اور قوانین قدرت کے متعلق اُن کے احتمالات نہایت مبہم اور غیر مبسوط تھے۔ کاہن اور موحد ضرور جابجا تھے جو اُس وقت کے حالات سے غیر مطمئن تھے۔ عیسائی اور یہودی زندگی کی بے راہ روی کو انھوں نے دیکھا تھا اور قائم شدہ خیالات اور سوشل نظام کی کمزوریوں کو جگہ جگہ سے محسوس کرتے تھے۔ لیکن کسی تعمیری نظام کے قائم کرنے کی نہ اُن میں جرأت تھی نہ خیالی وسعت۔ عام عرب ناچار بت پرستی پر اُتر آیا تھا کیونکہ عصبیت کے قومی رجحان کی بنا پر اپنے جد امجد اسمٰعیل و ابراہیم کے طریقوں پر بزعم خود عمل کرنا اور اُن کے خداؤں پر تکیہ کرنا ایک فطری تقاضہ تھا۔ پرستش کا کوئی خاص طریقہ سوائے عجز اور نیازمندی کے اظہار کے اُن کو نہ آتا تھا۔ اللہ۔ رب۔ رحمٰن۔ رحیم۔ ملک۔ عقوبت۔ شیطان۔ قربانی۔ جبریل میکائیل اور بہت سی قرآنی اصطلاحات بول چال میں استعمال کرتے تھے

معاشی وسائل عرب کے کبھی قابل اطمینان نہیں رہے صرف تھوڑے زمانہ تک (شاید قبل مسیح دو ایک صدی تک) جبکہ ہندوستانی سواحل کی تجارت شام سے براہ یمن ہوتی تھی۔ مغربی عرب میں تجارتی گرم بازاری رہی ورنہ عرب پیشتر چراگاہی کا پیشہ کرتے رہے یا رہزنی اور غارتگری کا۔ مکہ میں کعبہ کی تولیت وہاں کے قبائل کی وجہ معاش تھی۔ مابعد اسلامی عہد میں بھی حجاز و نجد زائرین اور معتقدین ہی کے دست نوال پر منحصر رہے۔ عرب کی یہ بے مائگی اُس کی آزادی اور عزلت گزینی کا باعث ہوئی اور ساتھ ہی اُس کے باشندوں کی شجاعت۔ تہور، محنت کوشی اور خود مختاری کی فطری وجہ بنی۔ کوئی بیرونی فاتح

اُن کے مُلک کی طرف توجہ کرکے کیا لیتا اور خود انھیں جنگ سے باز رہنے کے لئے کس چیز کا خوف تھا۔ چنانچہ نہ تو عرب نسل میں بیرونی آمیزش ہوئی نہ بیرونی خیالات وہاں مسلط ہونے پائے۔ ہندوستان اور وسط یورپ برخلاف اس کے ہمیشہ بھوکی جنگجو قوموں کے آماج گاہ رہے۔ باہر کا خون۔ باہر کے خیالات باہر کے طور وطریقہ ان ملکوں میں سوشل اور معاشرتی انقلابات برپا کرتے رہے اور کتنی کروٹیں بدل کر وہاں کے حالات نے موجودہ نشست اختیار کی ہے۔ عرب میں انسان صرف ان مظاہرات قدرت سے آگاہ تھا جو ایک گرم وخشک منطقہ حارہ والے مُلک میں رونما ہوتے ہیں۔ سبزہ زار۔ سمندر۔ موسلا دھار بارانی۔ برسات وغیرہ اس قسم کی چیزیں وہاں مفقود تھیں اس لئے وہاں کی ادبی روایات میں ان کا کہیں ذکر نہیں ہے نہ وہاں دربار ودول کی شان تھی۔ نہ افواج وخدم کی نہ وہاں رُوما کے جیسے تماشے تھے نہ ہندوستان کے زرعی وسایل، جیسا مُلک سادہ تھا ویسے ہی لوگ سادہ تھے۔ لیکن چونکہ موت کی بیکسی اور موت کے بعد کی تاریک مدت کا انھیں بھی احساس تھا۔ اس لئے اخلاقی نصائح کی قوت بشرطیکہ نفسیاتی بنیاد پر قائم ہو کوئی وجہ نہ تھی کہ ان کو بھی سوچنے اور سمجھنے پر مجبور نہ کر دیتی خصوصاً جبکہ اس کا انعام دنیا میں غنیمت، غلام وکنیز اور عقبیٰ میں جنت اور حور وقصور باور کرائے جائیں۔ ایک فاقہ مست قوم ان ہی وعدوں سے اُبھاری جاسکتی ہے

یہ مُلک تھا، یہ قوم تھی اور یہ اُس کے حالات تھے جب ظہور اسلام ہوا۔ پھر چونکہ عیسائی راہب، عرب موحدین یا حنفاء[1] اور کاہن برابر مکہ اور اطراف میں آتے جاتے تھے۔ اس لئے اُن کے ذریعہ سے مفرد تصورات کا بہم پہونچنا بعید از قیاس نہ تھا۔ بنی اسرائیل کی کہانیاں زبان زد تھیں۔ اصنام پرستی کا اصولی ضعف تھوڑی سی سنجیدہ طبیعت والے پر روشن ہے۔ شاعر اپنے تصورات کی تشکیل اور ترتیب میں آزاد ہے۔ لوگوں میں آنے والے نبی یا مصلح کے چرچے ہمیشہ رہے ہیں اور اس وقت بھی تھے۔ عیسائی جدا اور یہودی جدا نجات دلانے والے کے انتظار میں تھے۔ لیکن چونکہ نبوت کے لوازم میں فوق البشر عنصر کی ضرورت تھی۔ اور عرب کے نزدیک کلام سے زیادہ اثر کرنے والی کوئی چیز نہ تھی۔ اس لئے اگر ایک شخص میں آرٹ (شاعری)، فلسفہ۔ تعمیری اِصلاح کا شوق اور تدبیر سب ودیعت ہوں اور حالات کی مساعدت سے ہر ایک کے اظہار کا موقع حاصل ہو جائے۔ اور ارادہ کی پختگی اور خود اعتمادی اس کی مساعی میں شامل حال ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ کامیاب نہ ہو

ایک اور بات قابل لحاظ یہ ہے کہ زمانہ رسالت میں "اعلائے کلمتہ الحق" نہایت محدود پیمانہ پر ہوا۔ فتح مکہ تک تو صرف

---

[1] حنفاء مذہبی متخیلین تھے جو مختلف اکناف عرب میں خاموش زندگیاں بسر کرتے رہے۔ مورخین نے ان میں سے چند کے متعلق جستہ جستہ حالات چھوڑے ہیں۔ منجملہ ان کے ورقہ بن نوفل قریشی۔ زید بن عمر۔ امیہ بن ابی صامت یقینی زیادہ معروف ہیں۔ ان کے حالات کے متعلق اتنا علم ہے کہ وہ اصنام پرستی سے منحرف تھے ابراہیم کے اصل طریقوں کے جویا تھے۔ مردہ جانور کا گوشت خون اور بتوں پر کی قربانی نہیں کھاتے تھے۔ نوزائیدہ لڑکی کے دفن کردینے کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور دعویٰ کرتے تھے کہ ہم ابراہیم کے خدا کی پرستش کرتے ہیں

حوالی مدینہ کے چند قبائل داخل اسلام ہوئے

اس کے بعد دو تین غزوات اور سرایا میں صرف جنگی محکومیت عمل میں آئی۔ مفتوحین جان و مال کے عوض بآسانی چند اصول کی باتوں کو تسلیم کر لیتے تھے۔ خلافت راشدہ کے زمانہ میں پھر ایمان کا دنیاوی انعام تمام قوم کو اس کی جانب متوجہ کر دینے کو کافی تھا۔ علاوہ بریں خانہ جنگی کے مقابلہ میں منظم زندگی۔ ڈسپلن اور باقاعدگی کے فوائد۔ قوم بھر کی اخوت یہ سب باتیں وحشی اعرابیوں کو بھی رام کر سکیں۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ اوسط عرب وسیع نظر سے قوم کے مفاد اور دیگر اغراض کی طرف غور کرنے کے قابل ہو گیا بلکہ اُن میں کے سمجھدار لوگ ان تغیرات کو دنیاوی اعتبار سے مغتنم سمجھنے لگے۔ اسلام کی داغ بیل اگر زمانہ رسالت میں رکھی گئی تو یقیناً استحکام اور قوت عہد خلافت میں بہم پہونچی۔ اس میں جناب عمر بن الخطاب کی شخصیت کو بھی بہت بڑا دخل ہے۔ اسلام اگر بڑھایا نہ جاتا اور دوسری قوموں پر مسلط نہ ہوتا تو اپنے ملک کی خشک سرزمین میں بہت جلد کالعدم ہو جاتا۔ اسلام کے دور ارتقا میں اہم منزل کے نشانات یہ ہیں :- ہجرت کی کامیابی۔ جنگ بدر۔ جنگ نہاوند جنگ یرموک۔ نظام فاروقی اور امیر ولید کی فتوحات۔ نیم وحشی اقوام کی سیلابی تاخت بالمقابل قائم شدہ تمدنی نظاموں کی دنیا ایک سے زائد بار دیکھ چکی ہے۔ چنانچہ تاتاریوں کا سیلاب ایران و عراق پر۔ کشن اور یوہیچی اقوام کا ہندوستان پر گوتھ اور ونڈال کا روم پر۔ ہون قبائل کا شمالی یورپ پر تاریخ میں روشن ہے۔ اسلام بالکل قدرتی اسباب کی بنا پر پیدا ہوا بڑھا۔ پھیلا اور زوال پذیر ہوا۔ اس کے کسی دور میں نہ تو غیبی امداد شامل حال ہوئی نہ خدائی غضب نے اسے نیچے گرایا

اب ہم اس تمہید کے بعد اصل مدعا کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ یعنی یہ کہ جس چیز کو خدا کا کلام، باور کرایا گیا ہے اُس میں فی نفسہ ایسا سمجھے جانے کے عناصر موجود ہیں یا نہیں۔ قرآن موجودہ صورت میں بالکل غیر سائنٹفک طور پر مدوّن ہے۔ بنائے ترتیب سوائے اس کے اور کوئی نہیں کہ طویل ترین سورۃ سے ابتدا کی گئی ہے۔ اور سب سے چھوٹی صورت پر اختتام کیا گیا ہے قدیم اہل عرب کو شعرا کا مجموعۂ کلام اور اس کے راوی اسی ترتیب[1] سے یاد تھے۔ چنانچہ خلافت عمر و عثمان میں اسی اصول کو پیش نظر رکھا گیا ہے

صاحب کلام نے اپنی معنوی تخلیق کی تدوین و ترتیب میں وہی استغنا اختیار کیا جو ہر زمانہ میں (اور اب بھی) باکمال اہل فن سے فطرتاً ظہور پذیر ہوتا ہے۔ ان کو اپنی تعلیم کی ترویج میں زیادہ دلچسپی تھی۔ اور امت کو کتاب کی حفاظت کے لئے تاکید

---

[1] عرب میں لکھنے کا فن بہت بعد میں عام ہوا لیکن جاہلیت کے شعرا کا کلام حیرت انگیز صحت کے ساتھ محفوظ رہا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اُس زمانہ میں راویوں کا پیشہ بہت عام تھا جس قبیلہ میں شاعر ہوتے تھے اُس میں راوی بھی ہوتے تھے اور وہ لوگ شعرا کے کلام کو مع متعلقہ باتوں کے حفظ کر لیتے تھے جیسے ہندوستان میں بھاٹوں کا پیشہ تھا اور انگلستان میں (Minstrels) منسٹرل کا۔ یہ لوگ اپنی اولاد کو بھی یہ فن تفویض کرتے تھے اس طرح سینہ بسینہ مشہور کلام باقی رہے قرآنی حفاظ بھی اسی نوع میں شمار کئے جا سکتے ہیں

معنوی حیثیت سے تھی نہ کہ خارجی حیثیت سے - چنانچہ متعلقہ لوگوں نے اس کی ترتیب میں کوئی خاص کاوش نہیں کی- مکی اور مدنی سورتوں میں بین فرق محسوس ہوتا ہے- مکی آیات مختصر، بلیغ بلند اور موثر ہیں، مدنی کلام انتظامی- آئین سازی اور سیاست مدن کی طرف راجع معلوم ہوتا ہے- متکلم کے دنیاوی ماحول اور حالات کا تغیر نفس کلام سے مترشح ہے- مثلاً مکی سورتوں میں جبکہ یہود اور نصاریٰ سے سابقہ نہ ہوا تھا- اُن کے طریقوں کی تردید کہیں نہیں ہے اگر کہیں ذکر ہے تو نہایت مجمل اور بلا نیش

مدینہ میں یہود سے زیادہ سابقہ پڑا اُن کی طرف سے مزاحمت ہوئی- لہٰذا ان کی نسبتاً زیادہ تکذیب- اُن کے قصص اور روایات کی طرف پے در پے کنایہ- عاد ثمود اور قوم لوط جن کی بستیوں کے کھنڈر جا بجا عرب کی گزرگاہوں پر دکھائی دیتے ہیں اُن سے استنباط

جدال و قتال کے متعلق احکام اُس وقت نازل ہوئے جب فی الواقعہ مدینہ کے قیام میں اس کی ضرورت محسوس ہوئی—— قبلہ کے تغیر کی بابت جو احکام صادر ہوئے وہ بھی اسی اصول پر مبنی تھے- کیونکہ مکہ کے قیام تک اہل کتاب سے مخالفت کی وجہ پیدا نہ ہوئی تھی- اس کے بعد حالات بدلنے پر اس کی ضرورت محسوس ہوئی

اسی طرح مصلحت زمانہ کے اعتبار سے قدیم عرب رسموں کا جواز- مثلاً حرمت کعبہ- حرمت شہود طلاق- تعدد ازدواج- غلام و کنیز- غنیمت- قربانی وغیرہ کے مروجہ قواعد

ابتدائے 'بعثت' میں جبکہ مقصد صرف تبلیغ وحدانیت اور تکذیب شرک تھا- اسلوب خطاب نہایت زوردار اور مرعوب کن ہے- سننے والوں کے ذہنی اشکال اور طبیعی رجحانات کو نفسیاتی ذرائع سے متاثر کیا گیا ہے- چنانچہ خدا کی عظمت و جبروت- اور تاریخی واقعات کی ترجمانی- مصنوعی خداؤں کی بیچارگی اُن کے طریقوں کی ناہمواری نہایت معنی خیز اور تصویری الفاظ میں پیش کی گئی ہے- اسی طرح منکرین کے عذاب کا جو نقشہ پیش کیا گیا ہے- وہ ایک عامی کو سر بجیب فکر کر دینے کے لئے بہت موزوں ہے- بچے اور نا تربیت یافتہ سخت گیر لوگ جزا اور سزا کی ایسی ہی تصویروں سے اُبھارے جا سکتے ہیں- اعلیٰ تر ذہنی پایہ کے لوگوں سے یہ کہہ دینا کافی ہو تاکہ تمھیں مستقل عزت یا ذلت نصیب ہوگی- تمھیں روحانی بلندیاں یا پستیاں حاصل ہوں گی (باقی)

قاضی محمد عزیز عرفانی (نیوتنوی)

ماہِ آئندہ سے

حضرت نیاز فتحپوری کا ایک مسلسل بے مثل افسانہ بیراگ کا روگ شائع ہوگا-

منیجر نگار لکھنؤ

مکتوبات نیاز

عزیزم

تمھاری شاعری سے تمھیں کوئی فائدہ ہو یا نہ ہو، لیکن مجھے ضرور ہے اور وہ یہ کہ اس بہانہ سے کبھی کبھی تمھاری خیریت معلوم ہو جاتی ہے ـــــ مجھے تو یاد نہیں پڑتا کہ تم نے کبھی کوئی خط ایسا لکھا ہو جس میں کوئی غزل ملفوف نہ ہو اور اصلاح کی خواہش نہ کی گئی ہو ـــــ پھر اسی کے ساتھ میں تمھارے صبر و استقلال کا بھی قائل ہوں کہ میں نے کبھی تمھاری خواہش پوری نہیں کی، لیکن تم نے کبھی مایوس ہو کر اس سلسلہ کو ختم نہیں کیا ـــــ تاہم یہ سوچتا ہوں کہ آخر کب تک میں ٹالتا رہوں گا اور تمھیں کب سمجھ آئے گی کہ میری خاموشی کو اور کچھ نہیں تو میری نااہلی ہی پر محمول کرو

تمھیں معلوم ہونا چاہئے کہ میں شعر و شاعری ایک زمانہ ہوا ترک کر چکا ہوں اور مشکل ہی سے کسی کا کوئی شعر مجھے پسند آتا ہے۔ اس کو میرے معیار کی بلندی کہو، خبط کہو، بے حسی سے تعبیر کرو، بہرحال جو کچھ سمجھو واقعہ یہ ہے کہ میرا دل اس فن سے اچاٹ ہو چکا ہے اور دل و دماغ کے سامنے اور اتنے اہم مشاغل موجود ہیں کہ اس طرف توجہ کرنے کا موقعہ ہی نہیں ملتا ـــــ پھر اسی کے ساتھ جب تمھاری غزلوں کو دیکھتا ہوں تو ان میں اصلاح کی بھی کوئی گنجائش نہیں پاتا کیونکہ اصلاح کا مقصود تو جابجا اسقام کو دور کرنا ہے، لیکن جس غزل میں تلاش سے بھی کوئی معقول بات نظر نہ آئے۔ اس کی اصلاح تو صرف اسی طرح ممکن ہے کہ از سر نو دوسری لکھ دی جائے، پھر بتاؤ کیا مجھے سودا ہے کہ میں خواہ مخواہ تمھیں غزلیں کہہ کر دیا کروں اور تم کو فریب نفس میں مبتلا کروں جس کی خیر سے یوں بھی تم میں کوئی کمی نہیں ـــــ پاگل ہوئے ہو، اپنا کام کرو اور اس خبط کو چھوڑو۔ نہ تمھاری تعلیم پوری، نہ تمھاری صحبت معقول، نہ تمھارا ماحول ٹھکانے کا، پھر جو یہ خبط تم پر سوار ہوا ہے سو کیوں ؟

اگر تم کو میرے ساتھ کوئی علاقہ ایسا ہے جو کبھی کبھی خیریت لکھنے اور دریافت کرنے پر مجبور کر سکتا ہے تو اس قسم کی مراسلت میرے لئے یقیناً باعث مسرت ہو سکتی ہے، لیکن محض "غزل بازی" کے لئے کیوں اپنے پیسوں کا اور میرے دل کا خون کرتے ہو

نیاز

میر صاحب قبلہ

خط ملا - دلبرسی کا شکریہ - آپ مجھ سے تفصیل چاہتے ہیں - حالانکہ مجھ میں " اجمال " کی بھی تاب نہیں ——— آپ کے جواں بخت وجواں سال تلمیذ اجلّ، یعنی آپ کی مملکت شعر وسخن کے " مہاراجکمار " کی تحریر جو انھوں نے اپنے گڈھ لکھی تھی میرے پاس بھیجدی گئی ہے - کیا کیا گل افشانیاں کی ہیں، کیا کیا " برشِ تیغِ جفا " پر ناز فرمایا ہے - جلّ وصلّ

ان کو میرے آپ کے تعلقات معلوم، وہاں میری پوزیشن اُن پر روشن، علاوہ بریں اس تمام ماحول سے آگاہ جس میں زندگی بسر کر رہا ہوں، لیکن اللہ رے غرورِ حسن وجوانی کہ بے دھڑک پیغام بھیج دیا - اور میری برائی میں اپنی کامیابی سمجھ کر جھوٹ کا طومار باندھ دیا ——— یقیناً میں اس تعلق کا مخالف تھا اور ہوں لیکن خدارا اُن سے پوچھیے کہ اس سے خود میری کیا غرض متعلق تھی

انھوں نے میرے رسوخ سے خواہ مخواہ جذبۂ رقابت پیدا کر لیا - اور ظاہر ہے کہ " رقیب روسیہ " کو ایک شاعر گالیاں نہ دیگا تو اور کیا کرے گا ——— بہر حال اس سے میرا نقصان تو سوائے اس کے اور کچھ نہ ہوا کہ تھوڑی سی ندامت وخفت اُٹھانا پڑی، لیکن اُن کے لئے کامیابی کی اب کوئی ادنیٰ سی صورت بھی باقی نہیں رہی ——— کہئے تو ان کا اصل خط روانہ کر دوں ؟ آپ کے تو وہ محبوب شاگرد ہیں، آپ ہی سمجھائیے کہ جوانی میں تھوڑا سا دیوانہ پن تو خیر ہونا ہی چاہئے، لیکن یہ " باجی پن " کیسا ؟

نیاز

گفتی کہ چرا حالِ دلِ زار نہ گوئی
من خود کنم آغاز بہ پایاں کہ رساند؟

آپ کیا اس سے زیادہ تفصیل چاہتے ہیں، اس سے زیادہ سننے کے متمنّی ہیں ؟ آہ،
اک دھوپ تھی کہ ساتھ گئی آفتاب کے

یہ نہ پوچھئے کہ جو کچھ ہوا کیونکر ہوا بلکہ یہ سوچئے کہ آئندہ کیا ہونے والا ہے - مجھ میں تو اتنی سکت بھی نہیں کہ مستقبل کی تاریکی کا خیال تک دل میں لا سکوں - جی چاہتا ہے کپڑے پھاڑ کر کسی ایسی دنیا میں چلا جاؤں جہاں کم از کم آزادی سے رو تو سکوں ——— یہاں تو یہ بھی ممکن نہیں ——— دم گھٹتا ہے، جی اُلجھتا ہے اس کے خیال سے اُس کے خیال سے ساری دنیا کے خیال سے ——— پھر لُطف یہ کہ مجھے خاموش دیکھ کر بعض سنگ دل کہتے ہیں، بعض صبر وضبط کی داد دیتے ہیں - اور یہ خبر کسی کو نہیں کہ جب کلیجہ سے دھواں سا اٹھتا ہے تو میرا کیا عالم ہوتا ہے

آپ فرماتے ہیں کہ چند دن کے لئے کسی اور جگہ چلا جاؤں - مشورہ مناسب ہے، لیکن کوئی تدبیر ایسی بتائیے کہ دل ودماغ

میرے یہیں رہ جائیں۔ ورنہ یوں کہیں جانا بیکار ہے
جانتا ہوں کہ رفتہ رفتہ یہ غم بھی کم ہو جائے گا، چند دن اور اس خلش کی لذت اٹھا لینے دیجئے

سوگوار۔ نیاز

خوب، انداز بیان ہی وہ چیز ہے جس سے شاعر کے صحیح جذبات کا پتہ چلتا ہے۔ بولنے میں لب و لہجہ اور آواز کے اتار چڑھاؤ سے مفہوم کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے، لیکن تحریر میں تو یہ کام انداز بیان ہی سے لیا جا سکتا ہے

فارسی میں خدا جانے کتنے غزل گو شعرا گزر چکے ہیں، لیکن جذبات محبت کو پوری صداقت و سادگی کے ساتھ بیان کرنے میں سعدی کی انفرادیت اپنی جگہ قائم ہے۔ یہی حال اردو میں میر کا ہے۔ پھر یہ کرشمہ اندازِ بیان کا نہیں تو کس بات کا ہے؟ مومن کا رشک آمیز سوز، غالب کا شوخ و ذہین تعشق، خواجہ میر درد کی والہانہ ربودگی، ان سب کی تفریق انداز بیان ہی سے تو ہوتی ہے ورنہ یوں کون سا ذریعہ تعیین و امتیاز کا ہے —— اسی لئے میں نے کہا کہ ایک نقاد کا مختلف "اسالیب بیان" سے آگاہ ہونا اور ان کو دیکھ کر شاعر کے جذبات پر حکم لگانے کی اہلیت رکھنا ازبس ضروری ہے

مشہور شعر ہے:۔

جلوے مری نگاہ میں کون و مکاں کے ہیں
مجھ سے کہاں چھپیں گے وہ ایسے کہاں کے ہیں

کتنا پیارا شعر ہے، لیکن اس کو صرف نقاد ہی سمجھ سکتا ہے کہ پہلا مصرعہ صرف مطلع بنانے کے لئے لکھا گیا ہے ورنہ صحیح رنگِ تغزل کا اقتضا کچھ اور تھا

آپ کسی کے سامنے صرف دوسرا مصرعہ پڑھئے تو وہ یہ سمجھنے پر مجبور ہوگا کہ شاعر نے اس میں اپنے محبوب کا ذکر کیا ہے۔ جو اسی دنیا سے متعلق ہے۔ لیکن جب آپ پورا شعر پڑھیں گے تو اس کا خیال دوسری طرف منتقل ہو جائے گا۔ اور دوسرے مصرع کا خطاب جو پہلے اس نے سمجھا تھا۔ اب بالکل بدلا ہوا نظر آئے گا۔ کیونکہ دنیاوی محبوب کا تعلق نہ کون و مکان سے ہے۔ اور نہ کاروبار محبت میں اس کے ذکر کی ضرورت —— اس لئے یہ شعر تو اپنی جگہ مکمل ہے لیکن اس رنگ سے ہٹا ہوا ہے۔ جو دوسرے مصرعہ کا اقتضا تھا۔ اور یہ فرق پیدا کر دیا صرف لفظ جلوہ اور کون و مکان نے اگر پہلے مصرعہ سے کچھ اس طرح کا مفہوم پیدا ہوتا کہ

وہ میری روح میں ہیں، نظر میں ہیں، دل میں ہیں
یا —— دل میں جمے ہوئے ہیں، نظر میں بسے ہوئے
یا —— اپنی نگاہ شوق پہ ہے مجھ کو اعتماد

تو یہ شعر حدودِ تغزل میں رہتا گو اعلیٰ معیار کا پھر بھی نہ ہوتا- کیونکہ دوسرے مصرعہ کے اندازِ بیان میں جو انانیت و طنز پنہاں ہے وہ شعر کو بلندی کی طرف سے پستی کی طرف کھینچ رہا ہے

تقریباً اسی مفہوم کا ایک شعر عربی کا یاد آگیا، دیکھئے اسی جذبہ کو کس والہانہ انداز سے ظاہر کیا ہے:-

جمالک فی عینی وحبّک فی قلبی

وذکرک فی فمی فاین تغیب

یعنی —— اے تو وہ کہ تیری صورت آنکھوں میں بسی ہوئی ہے، تیری محبت دل میں سمائی ہوئی اور تیرا ذکر ہر وقت زبان پر ہے تو کہاں مجھ سے چھپ کر رہ سکتا ہے

اب غور کیجئے کہ اندازِ بیان نے اسی مفہوم کو کہاں سے کہاں پہونچا دیا- سور داس کے اس دوہے کو دیکھئے:-

ہاتھ چھڑائے جات ہو نبل جان کے موئے

ہردے میں سے جاؤ گے تو مرد بدونگی توئے

یعنی —— مجھے کمزور جان کر زبردستی ہاتھ چھڑا کے چلے جا رہے ہو لیکن میرے دل سے نکل جاؤ تو جانوں کہ بڑے مرد ہو- ہرچند اس میں بھی ہلکی سی کیفیت طنز کی ہے لیکن اندازِ بیان نے اس میں بھی خاص فنا دگی پیدا کر دی ہے

بہر حال میری رائے تو یہی ہے کہ شاعری میں اصل چیز اندازِ بیان ہے- اگر آپ کے نزدیک بلندی مضمون کوئی اور چیز ہے اور سب سے زیادہ اہمیت وہی رکھتی ہے تو میں کیا کہہ سکتا ہوں، کیا کر سکتا ہوں، جبکہ اس زمانہ میں غزل کا معیار تصوف و فلسفہ طرازی کے بہانہ سے صرف مہمل گوئی قرار پا گیا ہے

نیاز

بیدل! ہائے بیدل! وائے بیدل!! آپ نے بھی کیا ذکر چھیڑ دیا- اس کمبخت میں فارسیت ہو یا نہ ہو، لطفِ زبان پایا جائے یا نہ پایا جائے- لیکن اس کا کیا علاج کہ تخیئل کا بادشاہ ہے، ندرتِ بیان کا خدا ہے اور سب سے زیادہ یہ کہ ایک رندِ ژولیدہ مو ہے، جو لفظ اس کے منہ سے نکلتا ہے وہ دل میں تیر و سناں کی طرح پیوست ہو جاتا ہے

ہر کجا نکہتِ گل پیرہن رنگ ورد :

نیست پوشیدہ کہ از خود سفرے میخواہد

پھول کو "پیرہنِ رنگ" کہنا اور نکہت کو گل کی "جامہ دری" حسنِ تعبیر کی وہ حد ہے جہاں نہ نظیری کی رسائی ہے نہ حافظ کی اور "از خود سفرے می خواہد" تو وہ اندازِ بیان ہے جسے بہت سے ناواقف صرف مغربی لٹریچر کی خصوصیت سمجھے ہوئے ہیں

نکات وچہار عناصر پر کیا موقوف ہے، اس کا تو ایک ایک لفظ حرزِ جاں بنانے کے قابل ہے۔ مثنویاں دیکھئے، رقعات کا مطالعہ کیجئے، قطعات و رباعیات پر سر دُھنئے، لیکن زبان نہ کھولئے، کون سمجھتا ہے اور کسے سمجھنے کا ہوش ہے۔ وہ خود کہہ گیا ہے کہ

چہ رسد نوشۂ معنوی بہ دماغِ بے حس و بے خبر
ز پری بیامے اگر کشی بہ دُکانِ شیشہ گراں مبر

نیاز

بندہ نواز،

شکر ہے آپ نے مجھے پوچھا، لیکن اُس وقت جب

شایانِ دست و بازو قاتل نہیں رہا

پھر تماشہ یہ ہے کہ اگر میری طرف سے "اعتراف" میں کمی ہوگی تو آپ مجھی کو موردِ الزام قرار دیں گے، آجا:

کمند کوتہ و بازوئے سست و بام بلند
بمن حوالہ و تو میدہم گنہ گیرند

واقعہ یہ ہے کہ میں اب کسی قابل نہیں رہا۔ "بندۂ بگریختہ" نہیں بلکہ "بندۂ معذور" جان کر میرے پاؤں کی زنجیر کاٹ دیجئے۔ اربابِ کرم کا یہی شیوہ ہے۔ ورنہ یوں مجھے امتثالِ امر میں کیا عذر ہو سکتا ہے۔ حاضر ہوں گا اور سر کے بل حاضر ہوں گا، لیکن ڈرتا ہوں کہ مبادا میری وجہ سے آپ کی محفلِ نشاط میں افسردگی پیدا ہو اور ایک داغِ ناکامی اور لے کر وہاں سے واپس ہوں

نیاز

آپ بھی عجیب چیز ہیں ——— پریشانیوں کی شکایت خدا سے کرتے ہیں جہاں تاثر و انفعال کا گزر ہی نہیں۔ ہر بدنصیب شخص اپنی جگہ یہی باور کرتا ہے کہ جو مصائب اس پر نازل ہوئے ہیں وہ انتہائی مصائب ہیں اور اُس سے زیادہ مظلوم دُنیا میں کوئی نہیں ——— لیکن اسے کیا خبر کہ قدرت کے ترکش میں کیسے کیسے زہریلے تیر پنہاں ہیں اور وہ کس کس طرح اُن سے کام لیتی ہے ——— درد و بیچارگی کی کوئی انتہائی صورت قیاس کرلو، لیکن واقعتاً اس سے بھی زیادہ الم انگیز صورتیں پیدا ہو چکی ہیں اور ہوتی رہیں گی۔ فطرت کا نظام ہی یہ ہے
مذہب کی تلقین اس باب میں صرف اس حد تک مفید ہے کہ انسان صبر و ضبط کا عادی ہو جاتا ہے۔ ورنہ دعا

واستجابتِ دعا معلوم ! تدبیر کے بن پڑنے کا نام "قبولِ دعا" ہے، اور جب کچھ نہیں بن پڑتی تو اہلِ مذاہب اس کو "مصلحتِ خداوندی" سے تعبیر کرتے ہیں، یہ سب الفاظ ہی الفاظ ہیں حقیقت کچھ نہیں ——

یقیناً آپ کی مایوسیاں اس طرح سے اور زیادہ بڑھ جائیں گی، لیکن کیا کروں۔ صبر وضبط کی لایعنی تلقین میرے بس کی بات نہیں۔ میں کیوں وہ بات کہوں جسے کھلا ہوا فریب سمجھتا ہوں۔ مگر ہاں یہ ضرور عرض کروں گا کہ تدابیر سے غافل نہ رہیئے، دُنیا میں جب تک زندہ رہنا ہے اسی طرح مخالف قوتوں کا مقابلہ کرنا پڑے گا، کبھی آپ کامیاب ہو جائیں گے اور کبھی مغلوب — لیکن مغلوب ہو جانا ہتھیار ڈال دینا نہیں ہے، اس لئے ہاتھ پاؤں چلائے جائیے اور میرے کرنے کی جو بات ہو اس سے مطلع فرمائیے۔ محض غم وغصہ بیکار بات ہے اور دعا اس سے زیادہ بیکار

نیاز

محترم

نامۂ گرامی ملا —— آج کل یہاں کا موسم خودکشی کی حد سے شاید ہی ایک آدھ ڈگری کم ہو۔ ظاہر ہے کہ نینی تال کے رہنے والے اس وقت بہشت میں ہیں۔ لیکن مجھ کافر کا وہاں گزر کیونکر ہو —— بہرحال جنت والوں کو میرا سلام پہونچے اور حسرت نارسائی —— مضامین کا منتظر ہوں

نیاز

اڈیٹر صاحب نگار کی رائے
خضاب بلیک ڈائمنڈ کے متعلق

اڈیٹر صاحب نگار فرماتے ہیں :——

"اس میں شک نہیں کہ عام طور پر جو خضاب طیار ہوتے ہیں ان میں ڈایامین کا جزو شامل ہوتا ہے جو آہستہ زو مگر نہایت مہلک قسم کا زہر ہے اور اسی لئے اب لوگوں میں اس کی مضرت کا احساس پیدا ہو چلا ہے۔ خضاب بلیک ڈائمنڈ کے مالک نے اپنا خضاب میرے سامنے طیار کر کے دکھایا اور میں کہہ سکتا ہوں کہ اسمیں واقعی کوئی مضرت رساں جز شامل نہیں ہے۔ تجربہ سے اس کا رنگ بھی نہایت پختہ سیاہ ثابت ہوا اور جلد پر دھبہ بھی باقی نہیں رہتا"

کیا اس سے زیادہ کوئی اور ثبوت ہمارے خضاب کی عمدگی کا ہو سکتا ہے ؟ قیمت فی شیشی عہ (علاوہ محصول) تین شیشیاں طلب کرنے والوں کو محصول میں بہت کفایت ہو سکتی ہے

منیجر کارخانہ خضاب بلیک ڈائمنڈ لکھنؤ

باب الانتقاد

اصغر کے سو شعر

دہلی کے مکتبۂ جامعہ نے ایک نیا اور نہایت دلچسپ سلسلہ مشاہیر شعراء کے انتخاب کلام کا شروع کیا ہے اس سلسلہ کے دو پمفلٹ جن میں اصغر و جگر کے سو سو شعر انتخاب کرکے درج کئے گئے ہیں۔ بغرض ریویو ہمیں موصول ہوئے ہیں۔ اور آج کی صحبت میں ہم اصغر کے انتخاب کلام پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں:۔

انتخاب کرنے والے کوئی بزرگ محمود علی خاں صاحب ہیں اور جس اصول کو سامنے رکھ کر انتخاب کیا گیا ہے۔ اس کے متعلق خود انتخاب کنندہ کے الفاظ یہ ہیں:۔

"اس مجموعہ میں حضرت اصغر کے ایک سو منتخب اشعار درج ہیں جو لطافت بیان، اور حکیمانہ مضامین سے مالامال ہیں، خصوصاً تصوف و حکمت، علم و عرفان، اسرار و معارف، ذوق مشاہدہ، افشائے راز، جمال دوست، احساس خودی، اور حقایق نگاری وغیرہ کے چیدہ اشعار پیش کئے گئے ہیں۔ اور آخر میں الفاظ میں مصوری کے چند نمونے بھی درج کئے گئے ہیں"

قبل اس کے کہ اصغر کے کلام پر غور کیا جائے یہ امر ضروری ہے کہ انتخاب کنندہ کے اصولِ انتخاب کو سمجھ لیا جائے۔ اور نیز یہ کہ وہ اصول بجائے خود درست بھی ہے یا نہیں؟

غالباً اس جگہ یہ بحث موزوں نہ ہوگی کہ تغزل میں "تصوف و فلسفہ" کے شمول کی بدعت کب اور کیوں رائج ہوئی، لیکن اس حقیقت کا سمجھ لینا ضروری ہے کہ "تصوف و فلسفہ" جسے آج کل غزل گوئی کا معیار بلند سمجھا جاتا ہے حقیقتاً کیا چیز ہے ——— میں اگر انتخاب کنندہ سے یہ سوال کر بیٹھوں کہ حکیمانہ مضامین سے ان کی کیا مراد ہے، تصوف و حکمت کسے کہتے ہیں، علم و عرفان، اسرار و معارف سے ان کا کیا مقصود ہے، ذوقِ مشاہدہ، افشاء راز اور احساس خودی کیا بلا ہے، تو وہ غالباً اس کا جواب نثر میں تو دے سکیں گے، ممکن ہے کسی شاعر کا کوئی شعر پڑھ دیں گے کہ دیکھو یہ ہے حکمت

(تصوف وغیرہ وغیرہ)

حقیقت یہ ہے کہ اس دور کے شعرا اور اُن کے بعض ہوا خواہ ناقدین نے چند الفاظ یاد کر لئے ہیں۔ جو لغت کے اعتبار سے خواہ کچھ مفہوم رکھتے ہوں، لیکن غزل گوئی کی دنیا میں ان کا اصطلاحی مفہوم کوئی نہیں ہے، سوائے اس کے کہ سننے والا ان الفاظ سے مرعوب ہو کر شعر کی داد دینے پر مجبور ہو جائے

یقیناً "تصوف" کے کچھ مخصوص اعتقادات ہیں، بعض معین نظریے ہیں، اور اس میں بھی کلام نہیں کہ الٰہیات کی بعض گتھیوں کو جن میں سے سب سے زیادہ الجھی ہوئی چیز "خدا اور خدا کا مفہوم" ہے، اس نے بوجہ احسن سلجھایا ہے، لیکن "غزل" سے ان باتوں کو کیا واسطہ۔ یہ بات آج تک میری سمجھ میں نہیں آئی۔ جب اس حقیقت پر غور کیا جاتا ہے کہ ایسا کیوں ہوا، یعنی اس غلطی کی ابتدا شاعروں کی طرف سے ہوئی یا صوفیوں کی طرف سے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس باب میں شاعروں کا دامن آلودہ نہیں ہے بلکہ اس بدعت کے مخترع ہمارے ارباب تصوف ہی ہیں

بزم سماع منعقد ہے، صاحب سجادہ مع تمام اُن ظواہر و علامات کے جو اظہارِ تقدس کے لئے ضروری ہیں۔ صدر میں جلوہ افروز ہیں، ارادتمندانِ نیایش کیش مؤدب سر جھکائے ہوئے بیٹھے ہیں، سامنے مزار پر زرکار چادریں جگمگ جگمگ کر رہی ہیں، عود و صندل کے بخور سے فضا معطر ہو رہی ہے۔ اور

مطرب، بہ نغمہ رہزنِ تمکین و ہوش ہے!

"سیہ چشمانِ کشمیری و ترکانِ سمرقندی" سامنے موجود ہیں، شراب اور مغبچوں کا ذکر دلوں میں گرمی پیدا کر رہا ہے، حافظ کی غزلیں گا گا کر زاہد کی پگڑی اچھالی جا رہی ہے، روزہ و نماز کی توہین ہو رہی ہے، کعبہ و حرم پر بتکدہ و میخانہ کو ترجیح دی جا رہی ہے، اور علی الاعلان کہا جا رہا ہے کہ

از قول زاہد کردیم توبہ
وز فعل عابد استغفر اللہ

دعوتِ رقص و شراب کھُلم کھُلا دی جا رہی ہے کہ

عید ست و موسم گل ساقی بیار بادہ
ہنگام گل کہ دیدہ ست بے مے قدح نہادہ

اور اس سے بھی زیادہ یہ کہ تقدس مذہبی کو دفتر بے معنی کہکر "غرقِ مے ناب" کر دینے کا مشورہ دیا جا رہا ہے ——

پھر، مجلس میں اگر سواد ارادتمند ہیں، تو دو چار سوچنے سمجھنے والے بھی ہیں۔ آپس میں سرگوشیاں ہوتی ہیں کہ زہد و اتقا کی یہ تعلیم کیسی ہے کہ دین و مذہب ہی کو برا کہا جا رہا ہے، اخلاق کا یہ کیسا درس ہے جس میں سوائے ساقی و شراب کے کسی اور چیز کا ذکر ہی نہیں —— رفتہ رفتہ صاحب سجادہ کے کانوں تک بھی یہ بات پہونچتی ہے اور پھر جو فلسفہ "ہوئیت" بُرے کا

آتا ہے تو نوبت یہاں تک پہونچ جاتی ہے کہ " ساقی " خدا ہو جاتا ہے اور شراب، کوثر" بتکدہ " دل قرار پاتا ہے جو مہبطِ انوار الٰہی ہے اور " معشوق " کا مسمّٰی وہ پیر کہن سال، جس کے ہاتھ پر بیعتِ توبہ وسلوک کی جاتی ہے

یہ ہیں حقایق و معارف اور اسرار و غوامض کے وہ مظالم جو غریب شاعری کی جانِ ناتواں پر اول اول توڑے گئے اور پھر رفتہ رفتہ یہ بدعت اس قدر عام ہوئی کہ محبت کی ایک قسم ہی علیحدہ ہو گئی جسے " عشقِ حقیقی " کہتے ہیں اور ایک اچھے اور بلند شعر کا مفہوم سوائے اس کے کچھ نہیں رہ گیا کہ نہ خود شاعر سمجھ سکے۔ نہ کسی اور کو سمجھا سکے

حقیقتاً غزل نام ہے صرف جذباتِ محبت کو جو اسی دنیا اور اسی دنیا کے معشوق سے وابستہ ہو سکتے ہیں۔ نہایت صاف و سادہ زبان میں ادا کر دینا۔ پھر اس سے ہٹنے کے بعد ایک شعر، چاہے " کلام اللہ " ہو جائے لیکن تغزل تو اس میں رہتا نہیں

" عشقِ حقیقی " کیا ہے ؟ اس کا فیصلہ کرنے کے لئے سب سے پہلے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا کیا ہے ؟ اور ظاہر ہے کہ خدا کو شاعری سے کیا واسطہ ؟ یا شاعری کو خدا سے کیا تعلق ؟

محبت نام ہے اس خاص کیفیت کا جو گوشت و پوست کی زندگی میں کسی تعلق خاطر کی بنا پر پیدا ہوتی ہے اور اس کیفیت کا اظہار غزل ہے۔ پھر ممکن ہے کہ ایک صوفی جو اخلاق و مذہب کی آڑ میں شکار کرنا چاہتا ہے وہ اس کو پسند نہ کرے اور کسی ایسی تاویل پر مجبور ہو جائے۔ جو اس کے تقدس کا بھرم رکھنے والی ہو، لیکن شاعر کو کیا غرض کہ وہ اس کی رعایت سے اپنی زبان بدل دے —— پھر حافظ اور اس کے بعد بھی کچھ اور شاعر ایسے نظر آتے ہیں۔ جنھوں نے اپنے منصب کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا اور کھلم کھلا وہی کہتے رہے جو انھیں کہنا تھا۔ خواہ ایک صوفی کا دماغ تاویلیں کرتے کرتے بیکار ہی کیوں نہ ہو جائے، لیکن بعد کو جب مسلمانوں میں قوت عمل اور زیادہ ضعیف ہو گئی، عام قومی انحطاط نے فکر صحیح سے ان کے دماغوں کو بیگانہ کر دیا اور جہل و لاعلمی نے خانقاہوں کی گرم بازاری کو تقویت پہونچائی، تو شاعر بھی اپنی منزل سے نیچے اُتر آیا، اس نے بھی اپنی زبان بدل دی اور آخر کار اس نے وہ الفاظ بھی ترک کر دئے جن کی تاویل کی ضرورت ہوا کرتی تھی۔ یعنی اب وہ بھی عشقِ حقیقی کے چکر میں آ گیا اور تصوف کی اُن بہت سی اصطلاحوں کو جن کا کوئی حقیقی مفہوم نہیں ہے، وہ اپنی شاعری میں صرف کرنے لگا —— خیر پہلے تو ایک صوفی کسی غزل کی تاویل کر کے اپنے رنگ میں اسے کھینچ لاتا تھا، لیکن اب ایک عاشق کے لئے یہ تاویل بھی ممکن نہیں رہی۔ کیونکہ جب تک خدا کو ساقی کے نام سے پکارا جاتا تھا، رند کے لئے یہ موقع تھا کہ وہ فضول آوازوں کی طرف سے اپنے کان بند کر کے ساقی کو ساقی ہی سمجھے، لیکن جب ساقی کو بھی خدا کہا جانے لگا تو ظاہر ہے کہ " رند بے نوش " سوائے جان دیدینے کے اور کیا کر سکتا تھا

تصوف یا تصوف کی شاعری میں جن چیزوں کو اسرار و معارف، علم و عرفان وغیرہ بہت سے مہمل ناموں سے یاد کیا جاتا ہے وہ صرف دو نظریوں میں محدود ہیں۔ ایک یہ کہ خدا ہر جگہ اور ہر چیز میں ساری و طاری ہے اور دوسری

پر کہ اس کی کنہ حقیقت دریافت کرنے سے انسان عاجز ہے ـــــــ ظاہر ہے کہ یہ نظرئے کسی "علم قطعی" (Positive Science) سے تو تعلق رکھ نہیں سکتے، کیونکہ ان دو نظریوں میں سے ایک میں خود ہی جہل و عجز کا اعتراف ہے اور دوسرا جسے نظریۂ "ہوئیت" یا "وحدۃ الوجود" کہتے ہیں ایک ایسی تعبیر ہے جسے ایک خیال پرست شخص تو مان سکتا ہے لیکن علم کو درجۂ یقین تک پہونچانے والوں کے لئے اس میں زیادہ سامان دلچسپی موجود نہیں ـــــــ پھر جب تصوف کی بنیاد ہی ایسے مجہول نظریوں پر قایم ہے تو اس میں اسرار و غوامض یا علوم و معارف کیا ہو سکتے ہیں، اور ایک شاعر اُن کے اظہار میں وہ کونسی بات پیدا کر سکتا ہے جو جوش و ولولہ کی حامل ہو

اس نوع کے شاعروں میں سب سے بلند مرتبہ بیدل کا ہے اور اس میں کلام نہیں کہ اس نے اپنی ساری زندگی اسی عالم حیرت و استعجاب میں بسر کردی جو فلسفۂ "ہوئیت" نے اس پر طاری کر دیا تھا، لیکن کیا اس کی قدر غزل گوئی کے لحاظ سے کی جاتی ہے، کیا وہ اپنے رنگِ تغزل کی وجہ سے کامیاب شاعر کہلایا جاتا ہے ؟ ہرگز نہیں اس کی کامیابی کا راز صرف اس کا انداز بیان، تنوع تعبیرات، اور علوئے تخیل ہے، جو انسان کی قوتِ متخیلہ کو مسحور کرکے رکھدیتا ہے۔ لیکن کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ علاوہ بیدل کے اس وقت تک کوئی دوسرا شاعر اس رنگ کا پیدا ہوا ہے ؟ ـــــــ اس نے غزل گوئی ترک کرکے جس شاعری کی بنیاد ڈالی، اس کے لئے اس نے ایک زبان بھی علیحدہ وضع کردی اور یہ وہ خصوصیت تھی جس نے اس کو ایک مخترع و مُبدع کی حیثیت سے دنیا میں پیش کیا اور اس اختراع و ابداع کو وہ اپنے ہی ساتھ لے گیا ـــــــ دوسرا راز بیدل کی کامیابی کا یہ تھا کہ وہ فارسی زبان میں شاعری کرتا تھا جو اُردو کے مقابلہ میں زیادہ وسیع، زیادہ لطیف و شیریں اور زیادہ ایجاز کی گنجایش رکھتی ہے - اس لئے اُردو میں اگر اس کا تتبع کیا بھی جائے تو کامیابی ممکن نہیں کیونکہ اول تو بلند سے بلند خیال کوئی ایسا نہیں جو بیدل کی دسترس سے باہر رہا ہو اور دوسرے یہ کہ اُردو میں الفاظ کی کمی اور حروف روابط کی زیادتی نے اس کو محال بنا دیا ہے

بہرحال اُردو میں غزل کو تصوف و حکمت سے گرانبار کرنے کی رسم فارسی سے آئی ہے اور آنی چاہیے تھی، کیونکہ اُردو شاعری یکسر فارسی کی نقل ہے جس میں مسلمانوں نے کبھی کوئی مقامی رنگ پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی - کیونکہ مسلمانوں کی یہ ملعون ذہنیت کہ وہ ہندوستان میں ایک اجنبی فاتح کی حیثیت سے آئے اور کفرستان ہند سے اپنے آپ کو منسوب کرنا اُن کی توہین ہے۔ کب اُن کو یہاں کی شاعری کا تتبع کرنے کی اجازت دے سکتی تھی - اور وہ کیوں بلبل کو چھوڑ کر کوئل اور پپیہا کی طرف آسکتے تھے، اسی طرح چونکہ ایرانی امرد پرستانہ شاعری حلقۂ زہد و اتقا میں قدم قدم پر تاویلوں کی محتاج تھی، اس لئے اُردو میں بھی وہی رنگ پیدا ہو گیا - اور "عشق حقیقی" والی لغو و مہمل ذہنیت یہاں کے شاعروں میں بھی پیدا ہو گئی جس کو اسرار و معارف اور فلسفہ و حکمت کا خزینہ بنایا جاتا ہے

اگر تھوڑی دیر کے لئے اس کو تسلیم کر لیا جائے کہ تصوف نے جو تصور خدا (Conception of God

پیش کیا ہے وہ بالکل صحیح ہے اور انسان عجز، نارسائی اور حیرت و استعجاب کے اعتراف کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتا، تو بھی خدارا کوئی بتائے کہ اس میں عشق و محبت کی کون سی بات ہے اور خدائے عشق کرنا کیا معنی؟ اسی سلسلہ میں نعت گوئی کا بھی رواج پیدا ہوا یعنی عشق حقیقی میں خدا کے ساتھ رسول کو بھی شامل کر لیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ غزل گوئی بد سے بدتر ہو گئی، کیونکہ جب تک محض خدا کا معاملہ تھا، انسانی تشبیہات و استعارات لامحالہ تاویل طلب تھیں، اور ذہن دنیاوی معاملات محبت کی طرف منتقل نہ ہو سکتا تھا، لیکن رسول کے شامل ہو جانے سے جو فی الحقیقت ایک انسان تھے، ان خیالات نے اور زیادہ رکیک صورت اختیار کر لی۔ اور نتیجہ یہ ہوا کہ رسول اللہ کی کھلم کھلا توہین ہونے لگی۔ کیونکہ انھیں الفاظ کو جو دنیاوی حسن و عشق کے لئے معمولاً استعمال کئے جاتے ہیں۔ رسول اللہ کی ذات گرامی کے ساتھ منسوب کیا گیا اور اس کی رکاکت و سخافت ظاہر ہے ——— میں یہ نہیں کہتا کہ ہر شاعر کی نعت گوئی کا معیار اتنا ہی پست و ذلیل تھا۔ لیکن بلند معیار والوں کی تعداد اتنی کم ہے کہ ان کا ذکر کرنا ہی فضول ہے۔

اب یہاں دو اعتراض ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ اگر عشق حقیقی کو اڑا دیا جائے تو جذبات میں بلندی و پاکیزگی کیونکر پیدا ہو سکتی ہے اور دوسرے یہ کہ اگر علاوہ جذباتِ محبت کے شعر میں دیگر تاثرات کا اظہار کیا جائے تو اس میں حرج ہی کیا ہے اور اس کو شعر کیوں نہ کہا جائے؟

پہلا اعتراض بالکل مہمل ہے، کیونکہ جذبات کی بلندی اس پر منحصر نہیں ہے کہ وہ کس سے وابستہ ہیں بلکہ اس پر منحصر ہے کہ وہ کیا ہیں۔ اگر عشق حقیقی کرنے کے بعد بھی کوئی شخص رکیک الفاظ میں رکیک جذبات کے اظہار پر آمادہ ہو جائے تو اُسے کون باز رکھ سکتا ہے اور اگر عشق مجازی کے بعد کوئی شخص پست خیالات سے علحدہ رہے تو اس میں کونسا استحالۂ عقلی ہے ——— اصل چیز جو بلندی و پستی پیدا کرنے والی ہے وہ شاعر کی ذہنیت ہے۔ اگر اس کی ذہنیت بلند نہیں ہے تو اس کا عشق حقیقی بھی بیکار ہے اور اگر اس کی ذہنیت واقعی بلند ہے تو وہ گوشت و خون کے جذبات میں بھی پاکیزگی کا رنگ پیدا کر سکتا ہے، جیسا کہ اُردو کے بعض مشہور اساتذۂ شعر کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے

رہ گیا دوسرا اعتراض - سو میں کبھی اس پر مُصر نہیں کہ علاوہ جذبۂ محبت کے کسی اور تاثر یا حقیقت کا اظہار شعر میں نہ ہونا چاہئے، لیکن سوال یہ ہے کہ اس کو غزل کیوں کہا جائے۔ مثنویاں لکھئے، قطعات لکھئے، رُباعیات لکھئے، قصائد و دیگر منظومات میں طبع آزمائی کیجئے کون روکتا ہے، لیکن غزل کو صرف عشق و محبت کے لئے مخصوص رہنے دیجئے اور اس غریب کو کھینچ کر "قاب قوسین" کی حد تک نہ لے جائیے جہاں قال کی نہیں بلکہ صرف حال کی ضرورت ہے

غزل نام ہے صرف اُن جذبات و تاثرات کے اظہار کا جو دنیاوی عشق و محبت میں قلبِ انسانی کے اندر پیدا ہوتے ہیں اور اظہار بھی اسقدر سادگی کے ساتھ کہ بغیر کسی کاوش و تاویل کے ذہن سامع پر چھا جائے۔ اگر یہ جذبات ذلیل و ردی ہوں گے مثلاً "منہ کی بھی ملے تو روا ہے شباب میں" یا ——— "دو بوسے اوں لگا جان من ایک اسطرف ایک اسطرف"

تو یقیناً ہم اسے غزل کی توہین کہیں گے اور اگر انداز بیان کے لحاظ سے وہ "رشتۂ ہر شمع خار کسوتِ فانوس" ہے تو بھی یقیناً اسے تغزل سے خارج سمجھنا پڑے گا۔

پھر چونکہ کاروبارِ محبت میں نہ تاثرات کی کوئی انتہا ہے نہ اندازِ بیان کے تنوع کی، اس لئے استعارات و تشبیہات، کنایات و محاکات وغیرہ کے امتزاج سے ایک نہایت وسیع میدان شاعر کے سامنے آجاتا ہے جس میں وہ اپنے تخیل و تخییل دونوں سے مدد لے کر بہت کچھ جولانیاں دکھا سکتا ہے اور وہ قطعاً ان تمام مفروضہ اسرار و معارف کے اظہار پر مجبور نہیں جنھیں اربابِ تصوف کے تاویلی عشق حقیقی سے منسوب کیا جاتا ہے

یہاں تک جو کچھ لکھا گیا وہ صرف اس تحریر سے متاثر ہو کر لکھا گیا جو محمود علی خاں صاحب نے اپنے دیباچہ میں "تصوف و حکمت" کے متعلق درج کی ہے اور جسے اپنے پندار میں نہایت بلند معیارِ تغزل سمجھ کر اصغر کے کلام کو اس پر منطبق کرنا چاہا ہے

ہر چند جس معیار کو قائم رکھ کر انتخاب کنندہ نے یہ مجموعہ پیش کیا ہے وہ اس قدر تمہید کے بعد محتاج تنقید باقی نہیں رہتا کیونکہ اگر واقعی اصغر کے ایسے ہی اشعار انھوں نے چُنے ہیں جن میں سوائے متصوفانہ اسرار و معارف کے اور کچھ نہیں تو میں اپنی رائے اُن کے متعلق ظاہر کر چکا، لیکن اگر انتخاب کنندہ نے غلطی سے انھیں ایسا سمجھ لیا ہے تو بیشک دیکھنے اور سمجھنے کی گنجایش باقی ہے ----- اس لئے آئیے ایک نگاہ اس پر بھی ڈال لیں -----

اصغر کا کلام میں اس سے قبل بھی بارہا دیکھ چکا ہوں اور اُن کے بعض اشعار سے کافی متاثر ہوا ہوں۔ اس لئے بغیر اس انتخاب کو دیکھے ہوئے بھی اُن کی شاعری کے متعلق رائے زنی کا مستحق اپنے آپ کو سمجھوں تو غلط نہ ہوگا ----- تاہم میں اس کو کسی اور صحبت پر ملتوی رکھتے ہوئے صرف اس مجموعہ پر تنقید کرنا چاہتا ہوں جو جامعہ ملیہ نے اس غرض سے میرے پاس بھیجا ہے

اس میں کلام نہیں کہ اصغر آجکل کے مبتذل گو شعراء سے بالکل علیحدہ رنگ رکھتے ہیں اور وہ ہمیشہ کوئی ایسی بات کہنا چاہتے ہیں۔ جو انسان کو غور و تامل کی طرف مایل کردے۔ لیکن کہیں وہ اس کوشش میں کامیاب ہوئے ہیں۔ اور کہیں نہیں بعض بعض اشعار میں وہ اپنے مفہوم کو ادا کرنے کے لئے ایسے الفاظ پا گئے ہیں جو ذہن سامع کو جلد کسی نتیجہ صریح کی طرف لے آتے ہیں اور بعض میں ان کو کامیابی نہیں ہوئی، خواہ یہ ناکامی خود اپنے جذبہ کے نہ سمجھ سکنے کی وجہ سے ہوئی ہو یا مناسب الفاظ فراہم نہ ہو سکنے سے۔ مثلاً اُن کا ایک شعر ہے:۔

قفس کی یاد میں یہ اضطرابِ دل معاذ اللہ
کہ میں نے توڑ کر ایک ایک شاخ آشیاں رکھدی

اس میں شاعر صرف اس جذبہ کو ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ محبت کی اسیری پر دنیا کا ہر اطمینان و سکون قربان کر دینے کے قابل ہے اور واقعہ یہ ہے کہ اس مفہوم کو انھوں نے نہایت خوبی کے ساتھ ادا کیا ہے اور سننے والے کا ذہن بغیر کسی انتشار و خلش

کے از خود اس نتیجہ تک پہونچ جاتا ہے - لیکن برخلاف اس کے اسی غزل کا دوسرا شعر ملاحظہ ہو :-

مٹی جاتی تھی بلبل جلوۂ گلہائے رنگیں پر
چھپا کر کس نے ان پردوں میں برقِ آشیاں رکھدی

اس شعر کے سننے کے بعد ایک شخص یہ تو جان لیتا ہے کہ اس میں بلبل - گلہائے رنگیں - برقِ آشیاں تین لفظ ایسے جمع کردیئے گئے ہیں - جن کا باہمی شاعرانہ تعلق مخفی نہیں، لیکن شاعر کا مقصود کیا ہے ؟ اس کی طرف ذہن منتقل نہیں ہوتا ــــ اس شعر میں سب سے زیادہ ابہام جس سے پیدا ہوا ہے وہ " مٹی جاتی تھی " کے الفاظ ہیں ـــــــ ہر شخص ان الفاظ کو سننے کے بعد یہ سمجھے گا کہ شاعر نے یہ الفاظ کہکر گویا بلبل پر کوئی طعن کیا ہے - اور اس لئے اس شعر کا مفہوم کچھ اس طرح کا ہونا چاہیئے کہ " اے بلبل تو بہت گلہائے رنگیں کے جلووں پر مٹی جاتی تھی، لیکن دیکھ اس کا نتیجہ کیا ہوا " مگر پورا شعر پڑھنے کے بعد کوئی مفہوم اس قسم کا پیدا نہیں ہوتا ـــــــ شاعر کا مدعا یہ ظاہر کرنا ہے کہ " بلبل کے مٹنے اور فنا ہونے کے لئے تو گل رنگیں کے جلوے ہی کافی تھے، برقِ آشیاں کی کیا ضرورت تھی " لیکن افسوس ہے کہ الفاظ مناسب نہیں ملے اور یہ مفہوم تشنہ رہ گیا - اگر پہلا مصرعہ یوں ہوتا :-

" یونہی مٹ جاتی بلبل جلوۂ گلہائے رنگیں پر "

تو مفہوم ادا ہو جاتا ـــــــ گو گلہائے رنگیں کے پردوں میں برقِ آشیاں کا پایا جانا پھر بھی محتاج تفصیل رہ جاتا ایک دوسری غزل کا شعر ہے :-

مجھی سے بگڑے رہتے ہیں مجھی پر ہے عتاب اُن کا
ادائیں چھپ نہیں سکتیں نوازشہائے پنہاں کی

گو مضمون پامال ہے لیکن صحیح تغزل کا رنگ لئے ہوئے ہے - اور انداز بیان نے اچھوتا پن پیدا کر دیا ہے - مگر اسی غزل کا دوسرا شعر یہ ملاحظہ فرمائیے :-

نگاہِ یاس وآہِ عاشقاں ونالۂ بلبل
معاذاللہ کتنی صورتیں ہیں اُنکے پیکاں کی

بندش کی کمزوری اور الفاظ کی ناموزونی نے سارا لطف خاک میں ملا دیا ـــــ ہر چند اس شعر کا مفہوم اُلجھا ہوا نہیں ہے - لیکن تفسیر و تعبیر ناقص ہے، پہلے مصرعہ میں تین چیزیں پیش کی گئی ہیں ـــــــ نگاہِ یاس - آہِ عاشقاں - نالۂ بلبل ـــــ اوّل تو ہر ٹکڑے کے بعد حرفِ عطف کا اظہار ناگوار ہے خاص کر " آہِ عاشقاں " کے بعد کہ پڑھنے میں آہ عاشقاو ادا ہوتا ہے جو مصرعہ کو فصاحت سے گرا دیتا ہے - علاوہ اس کے تینوں ٹکڑے برابر کے نہیں ہیں - کیونکہ یاس ایک کیفیت کا نام ہے جو بالکل غیر مادی چیز ہے - اور عاشق و بلبل دو مجسم و مرئی چیزیں ہیں، علاوہ اس کے عاشق کے ذکر کے بعد

بلبل کا ذکر کرنا۔ کوئی خاص مفہوم نہیں رکھتا کیونکہ عاشق کے تحت میں وہ بھی آجاتی ہے اور اگر بلبل کا ذکر صرف اس لئے کیا گیا کہ عشق کی کارفرمائی انسان وحیوان دونوں پر ظاہر ہو جائے تو پھر نگاہِ یاس کا ٹکڑا علیحدہ ہو جاتا ہے۔ اگر پہلا مصرعہ بدل کر شعر یوں ہو جاتا :۔

نگاہِ یاس، دردِ نامرادی، رنجِ محرومی
معاذ اللہ کتنی صورتیں ہیں اُنکے پیکاں کی

تو حروفِ عطف کا عیب بھی نکل جاتا اور تینوں ٹکڑے بھی محض "کیفیت" سے متعلق ہو کر برابر کے ہو جاتے۔ اگر یہ کہا جائے کہ اس صورت میں حقیقتاً تینوں چیز ایک ہی قرار پاتی ہیں تو یہی اعتراض اُس مصرعہ پر بھی ہو سکتا ہے۔ کیونکہ نگاہِ یاس اور آہ و نالہ بھی فی الحقیقت ایک ہی کیفیت کی مختلف صورتیں ہیں

بعض اشعار میں صرف ایک ایک لفظ نے تعبیر کو ناقص کر دیا ہے مثلاً

عارضِ نازک پہ اُن کے رنگ سا کچھ آگیا
اِن گلوں کو چھیڑ کر ہم نے گلستاں کر دیا

دوسرے مصرعہ میں یہ دعوے کیا گیا ہے کہ گلوں کو گلستاں کر دیا یعنی ان کی رنگینی کو اتنا بڑھا دیا کہ پھول گلستاں ہو کر رہ گئے، لیکن پہلے مصرعہ میں اس فراوانی کو "رنگ سا کچھ آگیا" سے ظاہر کیا گیا ہے جو بجائے فراوانی کے "قلت" کو ظاہر کر رہے ہیں۔ اس لئے اگر پہلا مصرعہ یوں ہوتا :۔

عارضِ نازک پہ اُن کے رنگ ہی رنگ آگیا
عارضِ نازک پہ اُن کے رنگ سا رنگ آگیا!

تو عیب دور ہو جاتا

ایک اور شعر میں اسی طرح کی فروگزاشت پائی جاتی ہے۔ لکھتے ہیں :۔

بکھری ہوئی ہو زلف بھی اس چشمِ مست پر
ہلکا سا ابر بھی سرِ میخانہ دیکھئے

دوسرے مصرعہ میں "ہلکا سا" لکھا گیا ہے جسکی رعایت پہلے مصرعہ میں موجود نہیں۔ اگر پہلا مصرعہ یوں ہوتا :۔

بکھری ہوئی سی زلف بھی ہو چشمِ مست پر

تو ہلکے سے ابر کا مقابلہ ٹھیک ہو جاتا ——— بعض بعض شعروں میں ہلکی سی جھلک لکھنوی رنگ کی بھی پائی جاتی ہے مثلاً

داستاں اُن کی اداؤں کی ہے رنگیں لیکن
اس میں کچھ خونِ تمنا بھی ہے شامل میرا

اداؤں کا عاشق کے خونِ تمنا سے رنگین نظر آنا بالکل لکھنوی قسم کا شاعرانہ ادعا ہے۔ علاوہ اس کے دوسرا نقص یہ ہے کہ اگر دوسرے مصرعہ میں اس کا اشارہ داستان کی طرف ہو (اور یقیناً یہی ہے۔) تو داستان میں خون تمنا شامل ہونا کیا معنی؟ ذکر خون تمنا ہونا چاہیے۔

ایک اور شعر ہے :-

کس قدر پُر کیف ہے ٹوٹے ہوئے دل کی صدا
اصلِ نغمہ ایک آوازِ شکستِ ساز ہے

پہلے مصرعہ میں جو دعوے کیا گیا ہے اس کا ثبوت دوسرے مصرعہ میں مفقود ہے۔ تاوقتیکہ شکستِ ساز کی آواز کو اصل نغمہ نہ ثابت کر دیا جائے، ٹوٹے ہوئے دل کی صدا کو پُر کیف نہیں کہہ سکتے ——— اور اگر دوسرے مصرعہ کا ثبوت پہلے مصرعہ میں ہے تو ان کی ترتیب بدلنی چاہئے تھی

الغرض اس قسم کی غلطیاں جابجا اصغر کے کلام میں پائی جاتی ہیں، لیکن اس کے یہ معنے نہیں کہ اُن کے شاعر ہونے سے انکار کر دیا جائے۔ بعض بعض شعر وہ قیامت کے کہے گئے ہیں مثلاً

شاید مرے سوا کوئی اس کو سمجھ سکے
وہ ربطِ خاص رنجشِ بیجا کہیں جسے

میرے فغانِ درد پہ اس سرو ناز کو
ایسا سکوت ہے کہ تقاضا کہیں جسے

میں کیا کہوں کہاں ہے محبت کہاں نہیں رگ رگ میں دوڑی پھرتی ہے نشتر لئے ہوئے

ہم اس نگاہِ ناز کو سمجھے تھے نیشتر تم نے تو مسکرا کے رگِ جاں بنا دیا

گر کوتاہی ذوقِ عمل ہے خود گرفتاری جہاں بازو سمٹتے ہیں وہیں صیاد ہوتا ہے

مگر چونکہ انتخاب کنندہ کا معیارِ انتخاب، صحیح رنگِ تغزل سے ہٹا ہوا ہے اسلئے اس مجموعہ میں ایسے اشعار کم ہیں۔ کیا اچھا ہوتا اگر یہ خدمت کسی ایسے کے سپرد کی جاتی جو تصوف و حکمت اور اسرار و معارف کا دلدادہ تو نہ ہوتا۔ لیکن محبت کرنا جانتا اور محبت کی کیفیتیں اس پر گزری ہوتیں۔ یہ مجموعہ عہر میں مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی سے مل سکتا ہے۔

(ماہ آیندہ ہم جگر کے سو شعر پر اظہار رائے کریں گے) ———

باب المراسلۃ والمناظرہ

(جناب سید عبدالحکیم صاحب - گجرات)

میں بہت ابتداء سے رسالہ نگار کا مطالعہ کر رہا ہوں اور ان تمام تغیرات کو اچھی طرح محسوس کرتا ہوں جو آہستہ آہستہ آپ کے مذہبی خیالات میں پیدا ہوئے ہیں - ہر چند ایک قسم کی آزادی تو آپ میں شروع ہی سے پائی جاتی ہے لیکن اب زیادہ شدت ہو گئی ہے، جس کا سبب میں معلوم کرنا چاہتا ہوں

(نگار) آپ کے مراسلہ کو اصولاً باب الاستفسار میں جگہ پانا چاہیئے، لیکن صرف اس خیال سے کہ اس کا تعلق زیادہ تر میری ذات سے ہے - اور جواب میں کسی خاص علمی یا ادبی مسئلہ پر گفتگو کرنا نہیں، بباب المراسلہ میں درج کرتا ہوں

آپ کا یہ خیال یا نتیجۂ مطالعہ بالکل صحیح ہے کہ میرے مذہبی خیالات میں رفتہ رفتہ تغیر پیدا ہوا ہے اور اس میں بھی شک نہیں کہ اب اس تغیر نے ایسی کھلی ہوئی علیحدہ صورت اختیار کر لی ہے کہ بعض حضرات اس کو کفر و ارتداد سے تعبیر کرنے لگے ہیں - لیکن آپ اجازت دیں تو عرض کروں کہ ابتداء اجراء نگار سے تا ایندم کبھی ایک لمحہ بھی مجھ پر ایسا نہیں گزرا کہ میں نے اپنے خیال کے مطابق حق و صداقت سے دیدہ و دانستہ اِبا کیا ہو یا میری نیت خدمتِ اسلام کے علاوہ کچھ اور رہی ہو ــــــ البتہ یہ فرق ضرور ہے کہ پہلے میں اسلام کے مفہوم کو زیادہ محدود سمجھتا تھا - اور قدرے متعصب تھا، لیکن اب اس کو زیادہ وسیع سمجھتا ہوں اور کیش و مسلک کے امتیاز سے گزر گیا ہوں

ہم کعبہ و ہم بتکدہ سنگ رہ ما بود
رفتیم و صنم بر سرِ محراب شکستیم

اس میں شک نہیں کہ میں ایک مسلمان خاندان میں پیدا ہوا اور نہایت سخت مذہبی ماحول میں میری تعلیم و تربیت ہوئی اور یہ بھی واقعہ ہے کہ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد کافی زمانہ اسی تقشف و تعصب میں بسر ہوا جس پر آج بھی ہر مولوی

فخر کرسکتا ہے، لیکن اب اس کو عقل وضمیر کی رہنمائی کہیے یا طاغوتی کارفرمائی کہ مذاہب عالم کی تاریخ، حکومتوں کی داستان فتح وظفر، اور اسی کے ساتھ طبیعیات وفلکیات کے مطالعہ نے ایک عجیب انقلاب ذہن میں پیدا کیا۔ اور سب سے پہلا حجاب دُور ہونے کے بعد جو منزل سامنے آئی وہ "ماعرفناک حق معرفتک" کی تھی

پہلے میں یقین رکھتا تھا کہ خدا ایک مستبد و جبار ہستی ہے جو سوائے مسلمانوں کے کسی اور کو نجات دینے والی نہیں، وہ ہمارے دنیاوی سلاطین ہی کی طرح ایک قہرمانی قوت ہے جو سزا وعطا کے لحاظ سے مسئول نہیں ہوسکتی اور جو ہماری عبادت سے (بشرطِ آنکہ اسلامی طریقہ سے ادا کی جائے) خوش ہوتی ہے اور ترکِ عبادت سے برہم ——

لیکن جوں جوں کائنات کا مطالعہ وسیع ہوتا گیا، علم وعقل کی نارسائیاں واضح ہونے لگیں اور مسلمانوں کی اس تنگ ذہنیت کو رفتہ رفتہ میں خدا کی توہین سمجھنے لگا۔ یقیناً دیگر مذاہب بھی اس عصبیت میں مبتلا ہیں لیکن ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے کم ازکم اسلام کو میں اس داغ سے پاک دیکھنا چاہتا تھا۔ اور آخرکار اس احساس کی شدت نے میرے ضمیر اور میرے علم ویقین کو جس اقدام کی طرف مجبور کیا وہ یہ تھا کہ

بیا کہ روئے بہ محراب گاہ نور نہیم — بنائے کعبۂ دیگر ز سنگِ طور نہیم
حطیم کعبہ شکست و اساسِ قبلہ بریخت — بتازہ طرح یکے قصرِ بے قصور نہیم

پھر یہ "کعبۂ دیگر" کیا تھا۔ یہ "قصرِ بیقصور" کیا ہوسکتا تھا؟ یہی تنگ نظری کی زنجیروں کو توڑنا، تفریقات شعائر ورسوم کی خلیج کو پُر کردینا اور ایک ایسی بلند چوٹی پر اسلام کا جھنڈا نصب کرنا جس سے زیادہ رفعت کسی اور مذہب کے پرچم کو میسر نہ آسکے —— پھر چونکہ میں اسلام کو اس کی حقیقت کے لحاظ سے اخلاق کی دنیا میں ایک آخری آواز سمجھتا ہوں اور یہ یقین رکھتا ہوں کہ اسلام نام مخصوص وضع وشکل بنانے کا نہیں ہے، چند متعین حرکات کی پابندی کا نہیں ہے بلکہ وہ مسمّٰی ہے ارتقاء نوعِ انسانی کا، عروج فضل وکمال کا، اور اخلاق کی انتہائی رفعت کا اس لئے میں مجبور تھا کہ موجودہ مزعومات مذہبی اور مفروضات دینی کی تنگ وتاریک فضا سے بلند ہوکر کوئی نصب العین ڈھونڈھتا۔ اور شکر ہے کہ میری عقل نے اس باب میں میری رہبری کی اور جوں جوں حجابات دُور ہوتے گئے۔ میری آواز میں بلندی، میرے عزائم میں سختی اور میرے مسلک میں وسعت پیدا ہوتی گئی، حتےٰ کہ آج خدا میرے نزدیک نام ہے ایک ایسی قوت غیر متاثرہ کا جو کافر ومسلمان کی بے معنی اصطلاحوں سے کوئی سروکار نہیں رکھتی، جو مسجد وکلیسہ کاشی وکعبہ، اذان وناقوس، طوات اور پیکرماں سب سے بے نیاز ہے۔ اور وہ انعام وانتقام، جزا وسزا کو کبھی کسی سے اسلئے متعلق نہیں کرتا کہ فلاں اُسے - اللہ کے نام سے پکارتا ہے اور فلاں رام کے نام سے، یا وہ مندر میں گھنٹہ بجاکر اس کی یاد کرتا ہے یا یہ کان میں اونگلی دے کر اذان کی آواز سے اُسے پکارتا ہے —— وہ اگر خدا ہے تو سب کا خدا ہے۔ اور اس نے ہر شخص کی جزا وسزا، ہر قوم کی دوزخ وجنت خود اسی شخص یا قوم کے اندر پنہاں رکھدی ہے خواہ

وہ اسے اختیار کرے یا اُسے

پھر جو شخص تمام نوع انسانی کو ایک مرکز پر لانا چاہتا ہو اور جو صرف صحتِ اخلاق کو غرض مشترک قرار دے کر دُنیا سے عصبیت کو مٹا دینا پسند کرتا ہو، اس کے خیالات وعقاید میں اگر آپ یہ تغیر محسوس کریں تو جائے عجب نہیں اور پھر یہ منزل تو ابھی صرف قیل وقال اور حجت واستدلال کی ہے، کسے خبر ہے کہ کل اگر میں اس منزل سے بھی گزر کر صرف خاموش عمل کی منزل میں آگیا تو میرے مُنہ سے کیا نکلے گا، اور آج جو صرف کافر ومرتد کہکر مجھ سے نفرت کرتے ہیں۔ کل مجھے دیوانہ ومجنوں جان کر پتھر نہ ماریں گے

اجد الملامۃ فی ھواک لذیذۃ

حبا لذکرک فلیلمنی اللوم

شہوانیات یا ترغیباتِ جنسی

حضرت نیاز کے قلم سے

جسمیں فحاشی کی تمام فطری وغیر فطری قسموں کے حالات اور انکی تاریخ ونفسیاتی اہمیت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اس میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ مذاہب عالم نے اسکے رواج میں کتنی مدد کی اور آیندہ اخلاق انسانی کی بنیاد کن اصول پر قائم ہونا ہے الغرض اپنی نوعیت کے لحاظ سے یہ کتاب بالکل نئی چیز ہے اور ایک بار شروع کرنے کے بعد بغیر ختم کیے ہوئے آپ اسے چھوڑ نہیں سکتے اس کتاب میں ایسے ایسے حیرت انگیز واقعات درج ہیں کہ آپ نے کبھی سنے نہ ہوں گے۔ اگر آپ نگار کے خریدار ہیں تو علاوہ محصول ۸؍ کے مجلد کتاب صرف عہ؍ میں اور غیر مجلد عا؍ میں ملے گی اور اگر آپ نگار کے خریدار نہیں ہیں تو مجلد ہے؍ میں غیر مجلد ہے؍ میں علاوہ محصول ۸؍ کے ملے گی

اگر

ارشاد ہو تو کتاب ذریعۂ وی۔پی روانہ کی جائے۔ حجم ۳۷۵ صفحات۔ آرڈر میں مجلد وغیر مجلد کی صراحت ضروری ہے

نیجر نگار لکھنؤ

باب الاستفسار

(جناب محمد عبداللہ خاں صاحب - کراچی)

بیدل کے چند اشعار

تکلیف تو ہوگی لیکن براہِ کرم بیدل کے حسب ذیل اشعار کا مطلب واضح طور پر بیان فرما دیجئے، چونکہ آپ نے اکثر و بیشتر بیدل کا ذکر کیا ہے اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ آپ سے بہتر اس خدمت کو کوئی اور انجام نہیں دے سکتا - وہ اشعار یہ ہیں :-

به کدام فرصت ازیں چمن ہوس ادفضولی اڑ کشد　　شب خوں بعمر خضر زنم کہ نفس شراب سحر زند

شکست زاں چشمِ فتنہ مائل غبارِ امکاں بالِ بسمل　　مباش زافسونِ سرمہ غافل ہنوز دستے بہ رنگش

به کدام آئینہ مائلی کہ زفرصت اینہمہ غافلی　　تو نگاہِ دیدۂ بسملی مژہ واکن و بہ کفن در آ

ہمہ عمر با تو قدح زدیم و نرفت رنجِ خمارِ ما　　چہ قیامتی کہ نمی رسی ز کنار ما بہ کنارِ ما

(نگار) میں بیدل کا شمار اُن شعراء میں کرتا ہوں کہ اگر کوئی شخص ان کے کلام مفہوم سمجھنے سے عاری ہو تو اُسے سمجھانے کی کوشش نہ کرنا چاہیئے، کیونکہ شعر کا لطف صرف اسی وقت حاصل ہوتا ہے - جب بغیر وساطت توضیح و تفسیر کے وجدانی طور پر ذہن نشین ہو جائے ـــــ پھر چونکہ ہر شخص کا ذوق ایک مخصوص دائرہ کے اندر کام کرتا ہے،

اس لئے جب اس دائرہ سے ہٹ کر کوئی چیز اس کے سامنے آتی ہے تو اس کا ذہن متوحش ہو جاتا ہے اور اگر کسی کے سمجھانے سے مفہوم سمجھ میں آ بھی گیا تو وہ لطف حاصل نہیں ہوتا جو از خود سمجھنے سے پیدا ہو سکتا ہے

بیدل کو شاعر کہا جائے یا نہ کہا جائے، مجھے تو اس میں بھی تامل ہے کیونکہ اس کی تخئیل اس درجہ نازک ہے کہ غیر معمولی ذہانت رکھنے والے بھی بعض اوقات اس کی نزاکت تک نہیں پہونچ سکتے

بیدل ایک مجذوب ہے شاعر نہیں۔ جو کچھ وہ کہتا ہے اُسے شاعری کے نقطۂ نظر سے دیکھنا غلطی ہے بلکہ ایک رند ژولیدہ مُو، ایک سر بصحرا زدہ مجنوں کی حیثیت سے اس کے آواز کو سننا چاہیے

جو اشعار آپ نے لکھے ہیں میں اپنی فہم و فراست کے مطابق اُن کا مفہوم تو بیان کئے دیتا ہوں لیکن جانتا ہوں کہ وہ لُطف جو بغیر تفصیل و تشریح کے یوں.... حاصل ہونا چاہیئے۔ وہ آپ کو حاصل نہ ہوگا۔ میں یہاں صرف مفہوم ظاہر کر دوں گا تعبیرات شاعرانہ کو آپ اس کے مطابق کر لیجئے گا

(۱) پہلے شعر میں اس کا مقصود صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ کارگاہ عالم میں انسانی تگ و دو کی ہوس رانی حد درجہ حماقت ہے کیونکہ انسان تو یہاں کوئی فرصت لے کر آیا ہی نہیں اور بڑی سی بڑی فرصت و مہلت بھی حد درجہ مختصر ہے

پہلا مصرعہ:-

اتنی فرصت کہاں کہ اس چمن یاد دنیا میں ہماری ہوس کوئی نتیجہ پیدا کر سکے

دوسرا مصرعہ:-

کیونکہ اس تنگی فرصت کا یہ عالم ہے کہ عمر خضر مل جائے تو بھی وہ اس سے زیادہ کام نہیں دے سکتی کہ بہ مشکل ہم شام کو سحر کر سکیں

(۲) محبوب کی چشم فتنہ پرواز کا یہ اثر ہے کہ بالِ بسمل سے غبارِ امکان ٹوٹ گیا یعنی بسمل تڑپ کر مر گیا۔ اس لئے اس وقت سے غافل نہ ہو جب اُن آنکھوں میں سُرمہ بھی لگ جائے کہ اس وقت تو خدا جانے وہ اور کیا قیامت ڈھائیں گی سُرمہ کے متعلق یہ کہنا کہ " ہنوز دستہ ست زیر سنگش " صرف اس لحاظ سے ہے کہ طیار ہونے سے قبل وہ کھرل میں پیسا جاتا ہے

(۳) تو کس تماشہ میں مصروف ہے، کس آئینہ کے سامنے اپنی زیبائش و آرائش میں لگا ہوا ہے۔ کیا تجھے معلوم نہیں کہ جو تھوڑی سی فرصت تجھے ملی ہے وہ دیدۂ بسمل کی آخری نگاہ سے زاید نہیں اس لئے آنکھ کھول اور کفن کے اندر آجا کہ تیری فرصت کا اقتضاء اس سے زاید نہیں

(۴) یہ شعر صاف ہے۔ مدعا یہ ظاہر کرنا ہے کہ عاشق کی تمنائیں وصل محبوب کے باب میں اس قدر عجیب و غریب ہیں کہ کبھی پوری ہو ہی نہیں سکتیں۔ اس خیال کو سامنے رکھ کر وہ محبوب سے کہتا ہے کہ " ایک عمر گزر گئی تیرے

ساتھ بادہ خواری میں مصروف ہوں۔ لیکن خمارِ محرومی اب تک نہیں گیا، خدا کے لئے بتا یہ کیا قیامت ہے کہ باوجود پہلو سے مستقل رہنے کے بھی میرے پہلو سے جُدا ہے، باوجود آغوش میں رہنے کے آغوش سے علیحدہ ہے

حضرت نیاز کے ادبی شاہکاروں کا نیا مجموعہ

جمالستان

نگارستان کا دوسرا حصہ حجم ۵۰۰ صفحات

قیمت فی کاپی مجلد للعہ ——— غیر مجلد للعہ ر ——— علاوہ محصول

خریداران نگار سے ——— ایک روپیہ کی رعایت

فہرست مضامین حسب ذیل ہے :-

دنیا کا اولین بُت ساز	فریبِ خیال	صدائے شکست	دو گھنٹے جہنم میں
ایک شاعر کی محبت	میر بیدانہ	تاریخ عرب کی ایک روایت جمیل	ایثار
شہید آزادی	بعد المشرقین	وے بخیر گذشت	ٹیلی فون نمبر ۹۶
دو خط	جانِ عالم اور ملکہ مہر نگار	چند گھنٹے ایک مولوی کے ساتھ	شبستان کا قطرۂ گوہریں
سودائے خام	درسِ محبت	ازدواج مکرر	انتظام علی صاحب
سنہ ۲۵ء کا ایک صوفی	ایک شاعر کا انجام	آدم وحوا سے پہلے	شہزادہ خرم اور ابابیل
زہرہ کا ایک پجاری	رادھا	سرزمین دکن کی ایک دلنواز شام	نوجوان شہزادہ
مطربۂ فلک	چنگاری	محلہ کی رونق	داستان حسن و عشق کا ورق خونیں

منیجر نگار لکھنؤ

کسان

دے نہ گر درسِ تپش، خورشید کی تابندگی ظلمتوں میں ڈوب کر رہ جائے نبضِ زندگی
گر نہ ہو محوِ تبسم، ماہِ تاباں کا جمال نرم رَو موجوں کو حاصل ہو نہ طوفاں کا جلال
گر نہ گرمِ سیر ہو، صحنِ گلستاں میں نسیم حشر تک سوتی رہے غنچے کے سینے میں شمیم
گر ہوا میں ابرِ تر قطروں کا پھیلائے نہ جال ہو نہ دُنیا میں پر افشاں طائرِ حُسن و جمال

یوں ہی گر دہقاں رہے سعی و عمل سے بیخبر
زندگی کی موج رقصاں ہو نہ سطحِ خاک پر

کس قدر اس بے نوا، دہقاں کی سیرت ہے عجیب خود مریضِ مضطرب اور دردِ عالم کا طبیب
اس کے عالم میں نہیں جنگِ یقین و احتمال خال و خد سے ہے عیاں صدیوں کی محنت کا جلال
کوہ کے مانند ہے اس کے ارادوں کا ثبات ہے اسی کے دوش پر صدیوں سے بارِ کائنات
مطمئن اپنی روش پر، محوِ آئینِ قدیم اس کے سینے میں نہیں ہنگامۂ اُمید و بیم
بیل ہے، یہ ہے زمیں ہے، اور خیالِ فصل و کشت جھونپڑا ہے قصر اس کا، کھیت ہے اسکی بہشت
آگ برسے چرخ سے رُک جائے یا نبضِ حیات اس کی دنیا میں نہیں پروائے سیلِ حادثات
کھیل ہے اس کے لئے ہر شورشِ ہمت شکن شیر کا انداز، طوفاں کی طرح ہیبت فگن
بازوؤں میں آندھیوں کا زور، لوہے کا جگر حوصلہ بیباک، دل بے خوف، بے پروا نظر

زندگی کا راز دنیا کو بتا دیتا ہے یہ
محنتِ صبر آزما پر مسکرا دیتا ہے یہ

ہے مگر اس کاوشِ سعی و عمل کا یہ مآل   اس سے بڑھ کر کون ہوگا، بد نصیب و خستہ حال

باوجودِ ہمتِ آزاد و عزمِ اُستوار   اس سے بڑھکر کون ہوگا، دردمند دلفگار

. . . .

قصرِ دولت کی ستم رانی سے تھرّایا ہوا   زخم دارِ بے کسی، دنیا کا ٹھکرایا ہوا

اس کی نظروں میں نہیں تہذیب و دانش کا جلال   اس کی آنکھوں سے نہاں ہے عشرتِ بزمِ جمال

اس قدر ناآشنا، یعنی سمجھتا ہی نہیں   اس کے دل میں زندگانی کی تمنا ہی نہیں

یہ رہینِ صد محن کیا جانے کیا ہے زندگی   شام کا حسنِ لطافت، صبح کی تابندگی

روح کو کیونکر جگا دیتا ہے اک رنگیں گلاب   کس طرح نغموں سے چونک اٹھتا ہے احساسِ شباب

زندگی کا راز حسن و نغمۂ صہبا میں ہے

فصل و بارش کے سوا کچھ اور بھی دُنیا میں ہے

ہے اس احساسِ الم پرور کا آخر کیا سبب ؟   کس نے اسکی روح کو رکھا ہے پابندِ تعب ؟

کیوں ہے یہ اب تک رہینِ جستجوئے ناتمام ؟   کس نے اس کی سیرگاہوں میں بچھا رکھے ہیں دام ؟

کون اس کی فکر کو دیتا ہے درسِ نارسی ؟   کس کے اطمینان کا ساماں ہے اسکی بے کسی ؟

اس کی نارسی ہے کس کی خود سری کا مدعا ؟   کیوں سرور و نور سے محروم ہے اس کی فضا ؟

چھیڑتا ہے ذرہ ذرہ گو سرودِ مہر و ماہ ؟   بن گئی ہے اسکی ہستی کیوں سراپا اشک و آہ ؟

غرقِ آسائش ہے دنیا کی بہشتِ مختصر   یہ مگر ان سرمدی جلووں سے ہے کیوں بیخبر ؟

کس نے اس ظلمِ فراواں کا کیا ہے بند و بست ؟

دے رہا ہے کون اس کے عزم کو پیہم شکست ؟

کیا یہ ممکن ہے، کہ ہو یہ مرضیٔ پروردگار   کیونکہ اُس کے حکم پر ہے زندگانی کا مدار

جس کی صناعی نے کی تشکیلِ ماہ و آفتاب   اِک پئے فکر و عمل اور ایک بہرِ درسِ خواب

راستے پیدا کئے اُن کے گزرنے کے لئے
اپنے اپنے محوروں پر رقص کرنے کے لئے
عقلِ انسانی پہ کھولے جس نے اسرارِ حیات
مختلف جلوؤں سے کی معمور بزمِ کائنات
جس نے کی اِس خاک کی چٹکی کو وہ رفعت عطا
کھل گئی اس کی نگاہوں پر ستاروں کی فضا
جس نے اس مجبور کو بخشا وہ عزمِ فتحمند
بڑھ گئی اوجِ فلک سے اس کی پروازِ بلند

نسلِ انسانی پہ اتنا ظلم ایسا قتلِ عام
حیف ہے گر ہو یہ دُنیا کے خدا کا اہتمام!

اس سے بڑھکر کوئی صورت اور کیا ہوگی مہیب
نوعِ انسانی کی تخریب وتباہی کی نقیب
اس سے بڑھکر اور کیا درد آفریں ہوگی فغاں
جس کے سننے پر ہو قادر گوشِ ابنائے زماں
اور کیا ہوگا بپا ہنگامۂ روزِ مصاف
ظلم وحرص وآز کی سفاک دُنیا کے خلاف
اور کیا ہوگی حیاتِ نوعِ انسانی تباہ
اور کیا دیکھے گی دُنیا ظلمتِ روزِ سیاہ

لطفِ پیہم کے ارادوں سے گزر سکتا نہیں
خالقِ ارض وسما یہ ظلم کر سکتا نہیں

ہل چکی ایوانِ دولت کی بنائے استوار
ہوشیار اب اے خداوندانِ گیتی ہوشیار
ناز ہے جس پر تمھیں ہے یہ وہی جنسِ گراں
بیکسوں کے اشک، مزدوروں کی آہِ ناتواں!
یوں ہی ہوتا ہے، سپاسِ منّتِ یزدانِ پاک
سرمدی جلوؤں سے کی معمور جس نے سطحِ خاک
خواہشوں کی رَو میں اتنا جبر، یہ قہر وعذاب
کیا یہی ہے بے شمار اکرامِ فطرت کا جواب
آندھیوں میں ظلم کی بہنائے گیتی ہے تباہ
ظلم ایسا، جس کی بے اندازہ صدیاں ہیں گواہ

کر رہا ہے برق کی تعمیر فطرت کا جلال
یہ بتاؤ تم نے سوچا ہے کبھی اس کا مآل

ہاں یہی دہقاں، یہی بیگانۂ علم وشعور
جس کو ٹھکرا کر تمھیں ملتی ہے تسکینِ غرور

جس کی محرومی سے پاتی ہے خداوندی غذا
جس کے دل پر ہے تمھارے قصرِ نخوت کی بِنا

جس کی بربادی سے ہے بزمِ طرب کا اہتمام
خون سے جس کے درخشاں ہیں تمھارے صبح و شام

جس سے چھینا تم نے احساسِ حیاتِ کامگار
عشرتوں کا ناز، عقل و علم و دانش کا وقار

محرمِ انوارِ آسایش نہیں جس کی جبیں
جس کو آزادی سے جینے کا بھی حق حاصل نہیں

جو حزیں ابتک اسیرِ ہستیِ موہوم ہے
جس کی دنیا سرمدی انوار سے محروم ہے

کچھ خبر ہے زنگِ ہستی کیا سے کیا ہو جائے گا
جب دماغ اس کا حقیقت آشنا ہو جائیگا

جب بغاوت کی اٹھیں گی حشر پرور آندھیاں
جب یہ لے گا اِس جہاں کے حوصلے کا امتحاں

ہوش میں آئیگا جب مدت کی مدہوشی کے بعد
جب زباں کھولے گا یہ صدیوں کی خاموشی کے بعد.

کون روکے گا وہ جوشِ قہر و طوفانِ عتاب
کون دے گا اس کے پُرہیبت سوالوں کا جواب

کس کے بازو میں ہے یہ طاقت کہ روکے اسکے وار
کس کی ہمت کو یہ قدرت ہو کہ ہو اس سے دوچار

ٹھوکریں کھاتی پھرے گی سطوتِ جاہ و جلال
موجِ ظلمت بن کے رہجائیں گے اجزائے جمال

عظمتوں کا قصر آنسو کی طرح بہ جائے گا
دولتوں کا ناز اپنے حال پر شرمائے گا

صبح اُن کے حق میں ہوگی نوحۂ و ماتم کی شب
زندگی کا حق جنھوں نے اس سے چھینا بے سبب

چاہتے ہو گر کہ دُنیا ہو نہ برباد و زبُوں
انتقام اس کا نہ ہو غارت گرِ امن و سکوں

اس سے پہلے جبکہ یہ اس خواب سے بیدار ہو
اور اس کے قہر کی تلوار، آتش بار ہو

جبکہ اس کے دل میں ہو ہیجانِ جوشِ انتقام
اور لہو پی کے ہو دیوِ بغاوت شادکام

تمکو اس کی فکر "استغفار" کرنا چاہیئے
اور اپنے جرم کا اقرار کرنا چاہیئے

علی اختر (حیدرآباد دکن)

معلومات

بعض محیر العقول تماشوں کی حقیقت

آج کل بعض فقرا ایسے دہشت ناک تماشے دکھاتے ہیں کہ سمجھ میں نہیں آتے درانحالیکہ حقیقتاً وہ کچھ نہیں ہوتے۔ مثلاً نوکدار کیلوں، ننگی تلواروں پر لیٹ جانا۔ سینہ پر پتھر رکھوا کر تڑوانا، کانچ کے ٹکڑوں پر برہنہ چلنا، ننگے بدن آگ سے گزر جانا، منہ میں انگارہ لے لینا، گھنٹوں تک زمین میں دفن رہنا۔ یہ تمام باتیں بہت معمولی ہیں اور ان میں کوئی معجزہ و کرامت نہیں ہے

مثلاً نوکدار کیلوں پر لیٹنے کی حقیقت کو ملاحظہ کیجئے کہ ہر شخص بغیر کسی مشق کے کر سکتا ہے۔ بات یہ ہے کہ انسان کا ثقل تمام کیلوں پر تقسیم ہو جاتا ہے اور جتنا وزن ایک کیل کے اندر پیوست ہونے کے لئے ضروری ہے وہ پیدا نہیں ہوتا۔ عام طور پر وہ تختہ جس پر لوگ لیٹتے ہیں کم از کم ۵-۶ ہزار کیلیں رکھتا ہے اور جس وقت انسان کے وزن کو ان کیلوں پر تقسیم کیا جائے گا تو مشکل سے ۱۰ رتی فی کیل کا اوسط پڑے گا۔ اور ظاہر ہے کہ اتنے وزن سے ایک کیل جسم کے اندر پیوست نہیں ہو سکتی

آپ نے دیکھا ہوگا کہ بعض لوگ دو تلواروں پر لیٹ کر سو جاتے ہیں اور ان کے سینے پر پتھر رکھ کر توڑا جاتا ہے۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ ایک شخص اپنے جسم و اعصاب کو سخت کر کے لیٹ جاتا ہے اور لوگوں کو یقین دلایا جاتا ہے کہ اس پر مسمریزم کا عمل کیا گیا۔ پھر دو تلواریں دو آہنی ڈھانچوں پر رکھ کر اسے تلواروں پر لٹا دیتے ہیں۔ جو تیز نہیں ہوتیں۔ اس کے بعد سینہ پر پتھر رکھ کر توڑتے ہیں۔ اس کا راز صرف یہ ہے کہ جسم کے اس حصہ کے نیچے جہاں پتھر رکھا جاتا ہے خلا ہوتا ہے اور اس لئے جب ضرب لگائی جاتی ہے تو اس کا اثر صرف ان آہنی ڈھانچوں پر پڑتا ہے۔ جن پر تلواریں رکھی ہوئی ہیں اور جسم متاثر نہیں ہوتا۔ اس کا تجربہ آپ یوں کر سکتے ہیں کہ پتھر کا کوئی ٹکڑا آپ ہاتھ میں لیں اور اسے ہتوڑی سے توڑیں تو پتھر ٹوٹ جائے گا۔ اور ہاتھ میں ضرب نہ آئے گی، لیکن اگر آپ کا ہاتھ زمین پر ہوگا تو مجروح ہو جائے گا

کانچ کے ٹکڑوں پر چلنے کی حقیقت یہ ہے۔ کہ یہ ٹکڑے تیز نوکدار نہیں ہوتے اور ان کی دھار کرنڈ پتھر سے مار دی جاتی ہے ——— آگ پر چلنے یا آگ منہ میں رکھ لینے کی ترکیب یہ ہے کہ پہلے پھٹکری کا پانی اور گندھک کا تیزاب ملا کر

جسم پر مل لیتے ہیں اس سے یہ ہوتا ہے کہ آگ کا اثر فوراً نہیں ہوتا اور ایک شخص تیزی سے آگ پر دوڑ سکتا ہے

زندہ دفن ہو جانے کی اصلیت یہ ہے کہ جس تابوت میں لٹا کر دفن کرتے ہیں وہ اتنا بڑا ہوتا ہے کہ اس کے اندر کی آکسیجن ۶ - ۷ گھنٹہ تک انسان کو زندہ رکھ سکتی ہے - احتیاطاً اس کے منہ، ناک اور کان پر روئی رکھ دیتے ہیں تاکہ تنفس آہستہ آہستہ ہو اور آکسیجن کی موجودہ مقدار زیادہ دیر تک کام دے سکے

لاشوں کا تبادلہ

جرمنی کی ایک ضعیف عورت ڈرسڈین سے وینا سفر کر رہی تھی - جب ریل زیکوسلوویکیا کے حدود میں پہونچی تو وہ بیمار ہو گئی اور وہیں کسی شفاخانہ میں داخل کر دی گئی - ایک گھنٹہ کے بعد جب وہ مرگئی تو اس کے خاندان والوں کو ذریعہ تار اس کے مرنے کی اطلاع دیدی گئی - جب چار دن کے بعد اس کا تابوت جرمنی میں پہونچا - اور اُسے کھولا گیا تو لوگوں کی حیرت کی انتہا نہ رہی کیونکہ تابوت کے اندر بجائے ضعیف عورت کے ایک اطالوی فوجی افسر کی لاش وردی کے ساتھ نظر آئی

یہاں سے فوراً تار بھیجا گیا کہ " تابوت میں اطالوی افسر کی لاش ملی ہے، بڑھیا کی لاش کہاں گئی " وہاں سے جواب آیا - " اس غلطی پر سخت افسوس ہے - " بڑھیا کی لاش بولونا چلی گئی " - لوگوں نے بولونا تار دیا - وہاں سے یہ جواب ملا کہ " یہاں تو وہ لاش دفن کر دی گئی - اور تمام انھیں فوجی مراسم اعزاز کے ساتھ جو ایک افسر کے لئے عمل میں لائے جاتے ہیں - اور قبر پر فوجی نشان وغیرہ بھی نصب کر دیے گئے - اس لئے ہمارے فوجی افسر کو بڑھیا سمجھ کر وہیں دفن کر دیجئے "

بولونا میں آج بھی بڑھیا کی قبر موجود ہے اور جب فوج اُس طرف سے گزرتی ہے تو اسی طرح سلامی دیتی ہے جیسے کسی فوجی افسر کی قبر کے سامنے دی جاتی ہے

حُسن و ذکاوت کی جنگ

ذہانت و جمال کے درمیان ایک زمانہ سے جنگ جاری ہے - بعض لوگ حسین عورت کو ترجیح دیتے ہیں - خواہ وہ کتنی ہی غبی کیوں نہ ہو - اور بعض اس کے برخلاف صرف ذہانت و ذکاوت کو پسند کرتے ہیں

شکاگو کی یونیورسٹی (ڈی پول) کا معمول ہے کہ وہ ہر سال اپنی رپورٹ کے ساتھ جمیل ترین طالبات کی تصویریں بھی شایع کرتی ہے - سنہ ۳۲ء میں جو رپورٹ شایع ہوئی وہ اس قاعدہ کے خلاف تھی - یعنی اس میں بجائے جمیل طالبات کے ذہین لڑکیوں کی تصویریں شایع کی گئیں - اس پر وہاں کے طلبہ میں اختلاف پیدا ہو گیا - اور اس اختلاف نے اس حد تک طوالت اختیار کی کہ آخر کار یہ تجویز قرار پائی کہ آیندہ سے پانچ حسین لڑکیوں کی اور پانچ ذہین طالبات کی تصویریں دی جائیں

تخفیف اسلحہ کی حقیقت

گزشتہ جنگِ عظیم کے بعد تمام ممالک کا رُجحان اس طرف ہے کہ اسلحہ کو کم کیا جائے اور سامانِ حرب کو رفتہ رفتہ مفقود کر دیا جائے کہ دُنیا کا آیندہ امن و سکون

اسی طرح قائم رہ سکتا ہے۔ چنانچہ اس امر پر تمام حکومتوں نے اتفاق کر کے باہمی معاہدہ بھی کر لیا۔ لیکن اس عہد و پیماں کا عملی نتیجہ کیا ہوا۔ وہ ذیل کے اعداد سے معلوم ہوگا :۔

سنہ ۱۳ء سے سنہ ۳۱ء کے آخیر تک ——— برطانیہ نے ۲۳۷،۰۰۰۰ گنی آلات حرب پر صرف کیں،

فرانس نے جنگی جہازوں کی طیاری میں ۵۰۰۰۰۰ گنی صرف کیں

اطالیہ نے فوجی طیاریوں میں ۱۲۵۰۰۰۰ گنی خرچ کیں

امریکہ نے ۳۶۰۰۰۰۰ گنی اور جاپان نے ۱۰۰۰۰۰۰!!

برطانیہ کے تمام فوجی مصارف سنہ ۳۱ء میں وہی رہنے جو سنہ ۱۳ء میں تھے، فرانس میں ۲۰۸۰۰۰۰ کا اضافہ ہوگیا۔ اور اطالیہ میں ۱۵۴۰۰۰۰ کا۔ اسی طرح امریکہ نے ۱۵۶۸۰۰۰۰ گنی زیادہ صرف کیں

دماغوں کا عجائب گھر

دنیا میں ایک شخص ڈاکٹر اکونومو ہے۔ اس نے ایک عجائب گھر صرف انسانی دماغوں کے لئے قائم کیا ہے۔ اور بڑے بڑے علماء، فیلسوف، شعراء، ادباء، اور سیاسی رہنماؤں کے دماغ شیشے کے ظرف میں نہایت اہتمام سے محفوظ رکھتا ہے۔ ہر شیشہ پر وہ اس شخص کا نام، اور دماغ کا وزن وغیرہ بھی درج کر دیتا ہے۔ اس وقت تک کثیر تعداد میں اس نے "دماغ" جمع کر لئے ہیں اور دنیا کے تمام مشاہیر سے وہ اس باب میں خط و کتابت کرتا رہتا ہے کہ وہ اپنے دماغ کی بابت اس کو دے جانے کی وصیت کر جائیں

چھڑی کا استعمال

جرمنی کے ایک رسالہ نے نہایت بسیط بحث کی ہے کہ چھڑی کا استعمال انسان کے لئے مناسب ہے یا نہیں۔ اس نے جو تحقیق پیش کی ہے وہ عجیب و غریب ہے۔ اس کا بیان ہے کہ چھڑی لے کر انسان کا چلنا اس کی صحت کے لئے مضر ہے۔ کیونکہ وہ لوگ جو اس کا استعمال نہیں کرتے عموماً زیادہ فراخ سینے، بھرے ہوئے بازو اور مضبوط ہاتھ رکھتے ہیں

اس کا خیال ہے کہ چھڑی کا استعمال انسان کے عہدِ وحشت کی یادگار ہے جب اُسے سنگلاخ زمین پر کوہستانی صحراؤں میں چلنا پڑتا تھا اور سہارے کی ضرورت تھی۔ اب اس کا استعمال کسی طرح مناسب نہیں کیونکہ اس کی ضرورت نہیں ہے۔ اور رفتہ رفتہ اس کا استعمال انسان کو سہارا لینے کا عادی بنا دیتا ہے جو اعضائے کے نشو و نما کے منافی ہے

مجموعہ استفسار و جواب - زیر کتابت ہے اور دو تین ماہ کے اندر شائع ہو جائے گا۔ اگر آپ چاہیں تو رعایت سے فائدہ اٹھانے کے لئے اب بھی ڈیڑھ روپیہ (عہ) بھیج سکتے ہیں ———

مینیجر نگار لکھنؤ

نگار

رسالہ ہر مہینے کی ۵ تاریخ تک شائع ہوتا ہے

رسالہ نہ پہونچنے کی صورت میں ۲۵ تاریخ تک دفتر میں اطلاع ہونی چاہیئے ورنہ رسالہ مفت نہ روانہ ہوگا

سالانہ قیمت پانچ روپیہ (صہ) ششماہی تین روپیہ

بیرون ہند سے آٹھ روپیہ سالانہ پیشگی مقرر ہے

جلد ۲۵	فہرست مضامین مارچ سنہ ۱۹۳۴ء	شمارہ ۳

ملاحظات — ۲

زبان اُردو کے ارتقائی منازل — عبدالمالک آروی — ۹

زبان بے زبانی — اختر حسین رائے پوری — ۱۸

وحی کی حقیقت علمی نقطۂ نظر سے — قاضی محمد عزیز عرفانی — ۳۰

انگلستان میں سیاسی پارٹیوں کا قیام — ڈاکٹر سید نجم الدین احمد جعفری بار ایٹ لا — ۳۴

جہنم — محمد اسحاق امرتسری — ۳۹

ملکہ نورجہاں تاریخ کی صحیح روشنی میں — شاہ محمد زہیر زبیری — ۵۰

باب الانتقاد — ۵۸

باب الاستفسار — ۶۴

باب المراسلۃ والمناظرہ — ۶۸

انسان (نظم) — علی اختر (حیدرآباد دکن) — ۷۸

خوابستان محبت (نظم) — روشن صدیقی — ۷۹

نگار

اڈیٹر :- نیاز فتحپوری

جلد ۲۵	مارچ سنہ ۳۴ ع	شمارہ ۳

ملاحظات

" تو خود حدیث مفصل بخواں ازیں مجمل "

گزشتہ و آیندہ ـــــ

آفتاب کا طلوع و غروب ، روز و شب کا تسلسل ، اور اسی طرح کے تمام فطری مناظر زمانۂ نامعلوم سے یکساں طور پر رونما ہوتے چلے آرہے ہیں ، اور اگر کائنات نام صرف انھیں نقوش کا ہو تو ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ دنیا کسی انقلاب و تغیر کو قبول نہیں کرتی ـــ لیکن حقیقتِ امر شاید اس کے خلاف ہے کیونکہ اہل علم پورے یقین کے ساتھ کہتے ہیں کہ " عالم حادث ہے ، متغیر ہے " ـــــ

پھر کیا اس حدوث و تغیر کا علم ہم کو بغیر کسی غور و فکر کے الہامی طور پر حاصل ہوا ہے ۔ غالباً نہیں ـــ پھر اس بات کے تسلیم کرنے میں کیوں تامل ہو کہ اہم ترین تغیر عقل انسانی کا تغیر ہے جو ہر آن و ہر لحظہ حجابات دور کرتا جا رہا ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ آیندہ کس نقطہ پر پہونچ کر اس کو اپنی تگ و دو ختم کرنا ہے ۔

انسان فطرت کی طرف سے اپنے اندر وہ حس لیکر آیا ہے جسے "حس اجتماعی" (Herd Instinct) کہتے ہیں اور اسی احساس کا نتیجہ نظام تمدن ہے جس کا آغاز "عہد حجری" سے ہوا اور اب "عہد برق و شعاع" کہلاتا ہے، یعنی جس کی ابتدا زمین کے جمادات سے ہوئی تھی وہ اب آسمان سے باتیں کر رہا ہے ــــ اور کون کہہ سکتا ہے کہ آیندہ وہ اس سے بھی بلند گزرکر "عرش کبریائی" تک نہ پہونچ جائے گا ــــ الغرض اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ ذہن انسانی برابر ترقی کرتا جارہا ہے اور کل کے بوڑھے آج صرف بچوں کی صف میں جگہ پاسکتے ہیں ــــ جس طرح آج کے بوڑھوں کا شمار کل کے بچوں میں ہونے والا ہے۔

پھر کیا یہ انسان کی توہین ہے کہ اب سے ہزار سال قبل جو تحقیق و جستجو اس نے کی تھی وہ آج غلط ثابت کی جارہی ہے، اگر ہمارے اسلاف کے علمی، اخلاقی و تمدنی نظریے آج کے مشاہدہ و ضروریات کے لحاظ سے ناقص و نامکمل نظر آتے ہیں، تو کیا اس کا اظہار ان کی تنقیص ہے ؟

نظام بطلیموس کا ماننے والا آج کوئی نہیں، لیکن بطلیموس کی عزت و عظمت اسی طرح قائم ہے، نیوٹن کا نظریہ کشش ممکن ہے "انیسٹین" کے نظریہ اضافیت کے سامنے غلط ثابت ہوجائے، لیکن نیوٹن کا نام تاریخ کے صفحات پر ہمیشہ زریں حروف میں نظر آئے گا

جس طرح ازمنۂ قدیمہ میں انسانی ذہن و دماغ نے اپنے حاسۂ اجتماعی کے اقتضا پر اور بہت سی باتیں دریافت کیں، اسی طرح اس نے مذہب کی بنیاد ڈالی اور ــــ اس میں شک نہیں کہ اس سے اُس کا مقصود نوع انسان کی خدمت اور تشکیل تمدن کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ پھر اگر ضروریات زمانہ اور انسان کی عقلی ترقیوں کے ساتھ ساتھ دنیا کے تمام علمی نظریے تبدیل ہوتے رہتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ مذہبی عقائد میں تغیر نہ پیدا ہو۔ لیکن اس تغیر کا مطالبہ و احساس یقیناً کسی پیمبر کی توہین نہیں، کیونکہ جس عہد و زمانہ میں جو مذہب پیدا ہوا وہ اس وقت کے لحاظ سے واقعی آخری لفظ کی حیثیت رکھتا تھا۔ قرآن پاک میں بھی ارتقاء خیال کے لحاظ سے اصول مذاہب کی تبدیلی کی ضرورت، کو ان الفاظ میں ظاہر فرمایا گیا ہے :-

ما ننسخ من اٰیة او ننسھا نأت بخیر منھا او مثلھا

جب حقیقت یہ ہے تو میں حیران ہوں کہ عقاید مذہبی میں تغیر و تبدل کی خواہش پر لوگ کیوں جز بز ہوتے ہیں۔ خصوصیت کے ساتھ مسلمان۔ کہ ان کے مذہب کی بنیاد ہی اس اصول پر قائم ہوئی ہے کہ "خُذ ما صفا" پر عمل کیا جائے اور زمانہ کے ساتھ دینے کی اہلیت اپنے اندر پیدا کی جائے

مذاہب عالم کی تاریخ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک چیز تو وہ تھی جسے ہم "پیمبرانہ روح" (Prophet Soul) کہتے ہیں اور دوسری جو اس کے بعد پیدا ہوئی وہ "نفس مولویانہ" (Priest Mind) تھا۔ یعنی ایک تو وہ نفوس پاکیزہ تھے جن کے ذہن خلاق نے انسانی سوسائٹی کی فلاح کے لئے کچھ اصول وضع کئے اور دوسرے

وہ تھے جو ان کا نفاذ کرنے والے تھے اور نقال محض ـــــ پھر ان میں سے اکثر وہی تھے جنھوں نے اس پیمبرانہ رُوح کے حقیقی منشاء سے ناآشنا رہ کر محض الفاظ کو لے کر ان کی پرستش شروع کر دی اور کمتر ایسے تھے۔ جن کے دماغوں نے ہادی اول کی عقل سلیم کے متوازی چل کر اس کی تعلیم کی کُنہ حقیقت کو دریافت کیا ہو ـــــ یہی رونا پہلے بھی تھا اور آج بھی ہے۔ اور اسی لئے اس سے قبل بھی عقل و مذہب میں جنگ جاری رہی۔ اور اب بھی جاری ہے۔ فرق اگر ہے تو صرف اتنا کہ پہلے ذہن و عقل کی اس آزادی کو بزور شمشیر فنا کر کے اسے زیادہ ابھرنے کا موقع نہیں دیا جاتا تھا۔ اور آج یہ مجبوری اٹھ جانے سے عقل انسانی زیادہ سنگین محاذ قائم کرنے میں کامیاب ہوگئی ہے اب آئیے اس جنگ پر ذرا اور وضاحت کے ساتھ روشنی ڈالیں

اہل سائنس کہتے ہیں کہ سائنس ہمیں صرف اُن باتوں کے یقین کرنے پر مجبور کرتا ہے جن کو ہم صحیح ثابت کر سکتے ہیں، برخلاف اس کے مذہب مشتمل ہے چند مزعومات پر جن کا کوئی علمی یا استقرائی ثبوت پیش نہیں کیا جا سکتا۔ اور اگر اہل مذاہب سے سوال کیا جاتا ہے کہ اُن کی باتوں پر ایمان لانے کے کیا اسباب ہیں تو وہ تین دلیلیں پیش کرتے ہیں۔ ایک یہ کہ ہمارے اسلاف ایسا ہی یقین کرتے تھے، دوسرے یہ کہ ہمارے اسلاف جو دلائل پیش کر گئے ہیں وہ کافی ہیں اور تیسرے یہ کہ اصول مذہب پر گفتگو کرنا ناجائز و ممنوع ہے ـــــ کیا یہ دلایل واقعی کوئی وزن رکھتے ہیں ؟

اگر دو ہزار قبل مسیح کے اکتشافات علمیہ کو عقل انسانی نے آج بالکل بدل کر رکھ دیا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ اُس وقت کا مذہب جوں کا توں باقی رہے اور اس کے اصول اب بھی مفید و کارآمد ثابت ہوں۔ پھر اگر تمام دنیا میں صرف ایک ہی مذہب ہوتا تو بھی کہا جا سکتا تھا کہ وہ ایک ایسی حقیقت ہے جس میں کبھی اختلاف پیدا ہی نہیں ہوا، لیکن جب دنیا میں سیکڑوں مذاہب قائم ہوئے اور ہر ایک نے سوائے اپنے تمام دیگر مذاہب کو جھٹلایا تو ایک طلبگار حق کے لئے چارہ کار صرف یہ رہ جاتا ہے کہ وہ ان سب کو عقل کی کسوٹی پر کسے اور کسی ایک کی صحت پر ایمان لائے۔ اس لئے یہ کہنا کہ مذہب کا تعلق عقل سے نہیں کیونکر درست ہو سکتا ہے ـــــ

یہ بالکل صحیح ہے کہ سائنس اس وقت تک کسی ایسی حقیقت راسخہ تک نہیں پہونچ سکا جس کے آگے بڑھنے کی گنجایش باقی نہ رہے، لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ جو دن گزرتا ہے وہ اس حقیقت سے قریب تر ہوتا جا رہا ہے اور اسی لئے کوئی وجہ نہیں کہ مذہب کے باب میں اس اصول ارتقاء کو نظر انداز کر دیا جائے

سائنس واقعات کی جستجو کر کے حقیقت تک پہونچنا چاہتا ہے اور مذہب چند باتوں کو پہلے ہی سے حقیقت باور کر کے واقعات کو ان پر منطبق کرنا چاہتا ہے اور ان دونوں کا فرق ظاہر ہے ـــــ اگر ہم کسی مذہب کے پیرو ہیں تو صرف اس وجہ سے کہ ہمارے آبا و اجداد اس مذہب کے ماننے والے تھے، لیکن سائنس کے یہاں باپ دادا کوئی چیز نہیں، وہ ہر انسان سے انفرادی طور پر عقل و تمیز کے استعمال کا مطالبہ کرتا ہے

عقل انسانی نے عقاید مذہب میں جس جس تغیر کو قبول کیا وہ اہل علم سے مخفی نہیں۔ ابتدائی حالت میں جب انسان وحشی

رجاہل تھا وہ خدا کو ایک ایسی ہی خود مختار فرمانروا ہستی سمجھتا تھا جیسی کسی دنیاوی صاحب وجبروت بادشاہ کی ہوتی ہو کہ نہ وہ کسی قانون کا پابند ہے نہ کسی اصول پر کاربند جو اور جس طرح چاہتا ہے بناتا بگاڑتا رہتا ہے —— اس کے بعد جب سترہویں صدی میں ڈیکارٹ، کیپلر، گلیلیو، اور نیوٹن پیدا ہوئے اور انھوں نے کائنات کو ایک بڑی مشین کی طرح نظم و اصول کے ساتھ چلتے ہوئے تسلیم کیا تو خدا کے اس قدیم عقیدہ میں بھی کچھ تبدیلی پیدا ہوئی اور لوگوں نے باور کیا کہ دنیا کا کاروبار بیشک خدا چلاتا ہے لیکن مخصوص مشنیری کے ذریعہ سے جس کو اس نے پیدا کیا ہے۔ مدعا یہ کہ خدا کی خدائی کسی قانون و اصول کی پابند ضرور ہے۔ جب یہ دور بھی ختم ہوا اور اٹھارویں صدی آئی تو اس مشنیری میں کسی خارجی قوت کی مداخلت کو بھی تسلیم نہ کیا گیا مدعا یہ کہ خدا حکمراں تو ہے لیکن نظم و نسق سے اسے کوئی واسطہ نہیں —— زمانۂ حال کی جو کیفیت ہے وہ سب پر ظاہر ہے کہ سرے سے خدا کا وجود ہی معرض خطر میں پڑ گیا ہے —— بہرحال یہ واقعہ ہے کہ دیگر علوم وفنون کے ساتھ مذہبی نظریوں میں بھی غیر معمولی تغیر پیدا ہوا اور وہ وقت آنے والا ہے جب اس کی انتہا اس صورت میں ظاہر ہوگی جو اس وقت رُوس میں نظر آرہی ہے یعنی یہ کہ مذہب کا نام لینا ہی گناہ سمجھا جائے گا اور جس طرح کسی وقت دین نے بیدینی کا استیصال تیغ وخنجر سے کیا تھا، بالکل اسی طرح بیدینی، دین کو محو کر دینے کی کوشش کرے گی —— کیونکہ اس وقت مذہبی اہمیت صرف سیاسیات کے رجحان پر قائم ہے اور اس کی حیثیت سرمایہ دارانہ پروپاگنڈا سے زیادہ باقی نہیں رہی

جس حد تک روحانیت کا تعلق ہے مذہب، جس میں ظاہری مراسم وشعائر کی پابندی ضروری ہے، کوئی معنی نہیں رکھتا، مادی نقطۂ نظر سے اس کی ناکامی کسی سے مخفی نہیں کہ آج تک وہ قوی کے مقابلہ میں ضعیف کو پامالی سے نہ بچا سکا، نفسیاتی زاویۂ نگاہ سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ اس کی خصوصیات، علمی وتمدنی ترقی کے لئے بہت حارج ہوئیں۔ رہی وجدانی ومابعدالطبیعیاتی تسکین سو یہ علم واخلاق کی وسعت سے حاصل ہو سکتی ہے جو عام "اخوت انسانی" کے رشتہ کو قائم کرنا چاہتی ہے —— الغرض اس وقت ..... مغرب کی علمی دُنیا میں جو جدید مذہب پھیلتا جا رہا ہے وہ "اشتراکیت" ہے جس کا پیغمبر لینن اور جس کی شریعت سائنس ہے۔ [۱]

پھر مذہبی نظام کے خلاف یہ ہیجان صرف یورپ و امریکہ ہی میں محدود نہیں ہے بلکہ ایشیا میں بھی پایا جاتا ہے ترکی اپنی قومی ترقی واصلاح کے لئے اسلام کو پس پشت ڈال رہا ہے، چنانچہ ۱۹۲۶ء میں مصطفےٰ کمال نے اپنی ایک تقریر

---

[۱] ماسکو کے کلب میں جو کتبے آویزاں ہیں اُن میں سے ایک پر یہ عبارت درج ہے:-

"کسی کو خبر نہیں کہ دُنیا کب بنی لیکن یہ ہر شخص جانتا ہے کہ نئی دنیا ۱۹۱۸ء میں پیدا ہوئی —— آسمانوں سے خدا کو ہٹاؤ اور زمین سے سرمایہ داری کو تاکہ اشتراکی نوجوانوں کو آگے بڑھنے کا موقعہ ملے"

کے دَوران میں صاف صاف کہدیا تھا کہ " کانسٹی ٹیوشن میں اس امر کا اظہار کہ ترکی، اسلامی حکومت ہے ایک ایسی بات کا اظہار ہے جس کو اولیں مناسب فرصت میں کالعدم ہو جاتا ہے" ـــــ یہی حال تقریباً ایران و مصر کا ہے ۔ چین اور ہندوستان میں بھی اس انقلاب کے آثار پوری طرح نمایاں ہیں کیونکہ اس وقت دنیا کے سامنے اہم ترین فکر یہ نہیں ہے کہ انسان گناہوں سے کس طرح باز رہے بلکہ یہ ہے کہ تمدنی و معاشری نظام میں کونسی ایسی تبدیلی پیدا کی جائے کہ انسان بھوکا نہ مرے ۔ اور چونکہ مذاہب عالم کا موجودہ نظام انسانیت کے اس درد دُکھ کا علاج اب تک نہیں کر سکا ۔ اس لئے لامحالہ یا تو اس کو پس پشت ڈالنا پڑے گا یا اس میں کوئی ایسا تغیر پیدا کیا جائے گا ۔ جو اس گتھی کو سلجھا سکے ۔ بہر حال اس دورِ انقلاب میں مذاہب کو ضرور صدمہ پہونچے گا ۔ اور اگر حامیان مذہب نے اپنے اصولِ کار میں اقتضار زمانہ کے لحاظ سے کوئی تبدیلی پیدا نہ کی تو ان کا منصب شریعت سے ہٹ جانا ناگزیر ہے

اگر شخص ثالث کی حیثیت سے فیصلہ کیا جائے تو اس سے انکار ممکن نہیں کہ موجودہ مذاہب میں، صرف اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو زمانہ کے موجودہ انقلاب میں زندہ رہنے کی صلاحیت رکھتا ہے، بشرطیکہ آنکہ اس کی اصل رُوح کو پیش کیا جائے اور ظاہری شعائر و مراسم کی پابندی پر زور نہ دیا جائے

اس وقت اصولاً تقریباً تمام ممالک نے اس بات کو تسلیم کر لیا ہے کہ حکومت و سلطنت کی بہترین صورت جمہوریت ہے اور سرمایہ دارانہ ذہنیت نے جو مصائب دنیا پر توڑ رکھے ہیں ان کا علاج سوائے اشتراکی اصول کے اور کوئی نہیں ہو سکتا پھر کیا سوائے اسلام کے دوسرا مذہب کوئی اور ہے جو اس بات کا حامی ہو ۔ سوال نہ بنو عباس کا ہے نہ بنو امیہ کا، نہ دولت فاطمیہ کا نہ ہندوستان کے دَورِ مغلیہ کا بلکہ غور طلب امر صرف یہ ہے کہ اسلام کی اصل تعلیم کیا ہے ۔ اگر عہد رسالت کے بعد اس پر عمل نہ کر کے لوگوں نے بجائے جمہوریت کے مستبدانہ حکومتوں کی بُنیاد ڈالی ہو تو اسلام مورد الزام نہیں ٹھہرتا اور اگر آج بھی اس تعلیم کو پیش نہیں کیا جاتا تو اس میں قصور ہمارے قائدین مذہب کا ہے نہ کہ اسلام کا

تمام نوعِ انسانی کو ایک مرکز پر لانے کے لئے جو جذبہ عملاً کوئی خدمت کر سکتا ہے وہ " اخوت عامہ " کا جذبہ ہے اور اگر اس کے خلاف کوئی تعلیم پیش کی جاتی ہے (خواہ وہ اصول سے تعلق رکھتی ہو یا فروع سے، شعائر سے وابستہ ہو یا عقائد سے) کبھی صحیح اسلامی تعلیم نہیں ہو سکتی

اس وقت اسلام کے اصطلاحی معنی خواہ کچھ ہی کیوں نہ قرار دے لئے گئے ہوں، لیکن حقیقتاً وہ ایک ایسا بسیط مفہوم رکھتا ہے کہ اس کو ہم کسی طرح محدود کر ہی نہیں سکتے کیونکہ اسلام نام ہے صرف استعلار کا، عروج و ترقی کا، جدو جہد کا، کردار و عمل کا، ایک ایسی " لامذہبیت " کا جو تمام مذاہب کو ایک مرکز پر لانے کی اہلیت رکھتی ہے ۔ اور شعائر و مراسم سے بے نیاز ہو کر صرف پاکیزگی اخلاق اور تکمیل تمدن کی حامی ہے

پھر چونکہ اس نکتہ کو مسلمان فراموش کر چکے ہیں اور مذہب کی صحیح تعلیم کو انسان کی خود غرضانہ ذہنیت خراب کر چکی

ہے، اس لئے عام طور پر یہی باور کیا جاتا ہے کہ یہ ساری خرابیاں تعلیم مذہب کی ہیں اور اسی بنار پر تمام اسلامی ممالک میں وہ ردّ عمل ظاہر ہو رہا ہے جس کا دوسرا نام کفر و ارتداد رکھا گیا ہے - لیکن باور کیجئے کہ یہ حالت عرصہ تک قائم نہ رہے گی اور اس انقلاب کا نتیجہ یقیناً استیصال مذہب کی صورت میں ظاہر ہوگا اگر اس کے اصلی خط و خال پیش نہ کئے گئے

ممکن ہے جو مفہوم میں نے اسلام کا پیش کیا ہے وہ اس وقت تعجب و نفرت کی نگاہ سے دیکھا جائے، لیکن وہ وقت آنے والا ہے، جب ایک ایک شخص وہی کہے گا جو میں کہہ رہا ہوں - اور اسلام تمام دنیا پر حاوی ہو کر رہے گا

پھر ہو سکتا ہے کہ اس کی صورت دوسری ہو، اس کا نام کچھ اور ہو، لیکن اس کا مفہوم وہی ہوگا جو آج میں کہہ رہا ہوں اور اس کے خد و خال وہی ہوں گے - جنھیں آج میرا قلم پیش کر رہا ہے

صوبہ بہار میں تعمیر مساجد کا بے محل سوال

اس وقت صوبہ بہار جس دردناک تباہی میں مبتلا ہے، اس کی حقیقت کسی سے مخفی نہیں اور یہ بھی سب کو معلوم ہے کہ ہندوستان کے ہر گوشہ سے امداد و ہمدردی کے جذبات ظاہر کئے جا رہے ہیں - لیکن افسوس ہے کہ اس وقت تک جو اعانت کی گئی ہے وہ ہندوستان ایسے وسیع ملک کو دیکھتے ہوئے کسی طرح قابل ستایش نہیں سمجھی جا سکتی اور ضرورت ہے کہ ہر ادارہ اور ہر انجمن عملاً اس میں حصہ لے اور ہر وہ شخص جو دن میں چار پیسے صرف کر سکتا ہے، ایک پیسہ بچا کر بہار کے مصیبت زدہ انسانوں کے لئے علٰحدہ کر دے - خیر یہ صورت تو فراہمی زر کی ہوئی، لیکن اسی کے ساتھ دوسرا اہم سوال اس کے صرف کا ہے - یعنی یہ کہ اس رقم کو کس طرح اور کس کام میں خرچ کیا جائے

اس وقت تک صورتِ حال یہ تھی کہ حکومت کے علاوہ چند پرائیوٹ امدادی کمیٹیاں بھی کام کر رہی تھیں اور چونکہ مولویوں کا عنصر ان میں شامل نہ تھا اس لئے صحیح اصول پر کام ہو رہا تھا، لیکن اب یہ دیکھ کر کہ ہمارے علمار کرام بھی اس میں حصہ لینے کے لئے آمادہ ہو گئے ہیں اور مسمار شدہ مساجد کی تعمیر کے لئے اپنی جھولیاں لے کر نکل کھڑے ہوئے ہیں، ہمیں "اندیشہ ہائے دور و دراز" پیدا ہو گئے ہیں اور اگر ابھی سے اس کا سدّ باب نہ کیا گیا تو ملک کا بہت سا روپیہ بیکار ضائع جائے گا

حال ہی میں ایک اپیل ان علمار کرام کی طرف سے شائع ہوئی ہے جس میں مسلمانوں کو صوبہ بہار کی تباہ شدہ مساجد کی طرف متوجہ کر کے چندہ طلب کیا گیا ہے - اس میں شک نہیں کہ صوبہ بہار کی مسجدیں بالکل تباہ و برباد ہو چکی ہیں اور یہ بھی درست ہے کہ ان کی تعمیر و مرمت ایک حد تک ضروری ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ جب نماز پڑھنے والے ہی وہاں نہ ہوں گے تو مسجدیں کس کام آئیں گی ——— اس وقت تو اہم ترین سوال موت و زندگی کا ہے، بھوک پیاس کا ہے تن ڈھانکنے اور سر چھپانے کا ہے، اس لئے جب تک آپ اس سے فارغ نہ ہو جائیں مسجد و خانقاہ پر توجہ کرنا اور مدرسہ و مقابر پر روپیہ صرف کرنا حد درجہ لایعنی بات ہے

اگر مسلمان اس صدمہ وتباہی سے جانبر ہوگئے، تو وہ اُس خدا کی پوجا جس نے انھیں زلزلہ کی مصیبت میں گرفتار کیا تھا، کھُلے ہوئے میدانوں اور جھونپڑوں میں بھی کرلیں گے، لیکن اگر وہ بھوک پیاس سے مرگئے تو پھر کیا مولوی لوگ بغیر مقتدیوں کے ان مساجد میں امامت کریں گے

جو رقم کسی ایک مسجد کے تعمیر یا مرمت میں صرف ہوگی، اُس سے ہزار بھوکوں کو کھانا کھلایا جاسکتا ہے، اس لئے بہ حالتِ موجودہ انسانی تباہیوں پر مساجد کی تباہی کو ترجیح دینا اور لوگوں کی توجہ کو، بجائے حیاتِ انسانی کے اینٹ اور چونہ کی طرف مائل کرنا۔ نہ یہ کہ خلافِ عقل ہے بلکہ اقتضاءِ مذہب کے بھی منافی ہے۔ اور پھلواری شریف میں جو مرکزی کمیٹی تعمیر مساجد کے لئے قائم ہوئی ہے اسے توڑ دینا چاہئے کیونکہ ایک پیسہ بھی اس وقت اس کام میں صرف کرنا عقلاً وشرعاً دونوں طرح ناجائز ہے

مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ کوئی رقم ایسی کمیٹیوں کو نہ دیں جو تعمیر مساجد کے لئے قائم ہوئی ہیں کیونکہ ابھی یہ کام بالکل قبل از وقت ہے۔ اور سب سے پہلے ہمیں اُن یتیم بچّوں کی پرورش کی طرف متوجہ ہونا ہے جو پڑے ہوئے سِسک رہے ہیں، اُن بیواؤں کی اعانت کرنا ہے جن کا کوئی سر دھرا موجود نہیں اور اُن ضعیفوں کی مدد کو پہونچنا ہے جن کے جوان جوان بیٹے نذرِ اجل ہوچکے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ تعمیر مساجد کے سلسلہ میں، بہت سے مزدور کام سے لگ جائیں گے، لیکن کیا مکانات کی تعمیر سے یہ فائدہ حاصل نہیں ہوسکتا، اور کیا دوسرے امدادی کاموں سے روپیہ لوگوں میں نہ پھیلے گا۔

عُمدہ قسم کے پودھے

تخمی باغات کیولسطے

تخم اور قد میں بڑے سیب کے مانند رنگین آم نہایت لذیذ الانواع اقسام کے آم کے پودھے اپنی زمینوں پر لگاکر ان کی پیداوار سے معقول فائدہ حاصل کیجئے

دوسالہ عمر کا پودھا گملہ میں ۴ر بغیر گملہ ۳ر علاوہ محصول خرچہ وغیرہ

نذیر برادرس ملیح آباد ضلع لکھنؤ

زبان اردو کے ارتقائی منازل

(سلسلۂ ماسبق)

زبان فارسی کے ہندو ادیب ۔ عہد مغلیہ نے بہت سے ہندو ادیب پیدا کئے، ہندو منصبداروں میں اکثر امرا فارسی زبان میں مہارت رکھتے تھے، اور وہ اپنی اولاد کو فارسی کی تعلیم دلایا کرتے تھے عہد اکبری کے بعد نسلاً بعد نسلٍ یہ سلسلہ قائم رہا۔ چنانچہ عہد جہانگیری میں فارسی زبان کا ایک بہت بڑا ہندو ادیب رائے منوہر توسنی تھا، ابن محمد معتیم الہروی لکھتا ہے،

رائے منوہر بن رائے لون کرن، در خدمت شاہزادہ سلیم خط و سواد بہم رسانده شعر میگوید "توسنی" تخلص دارد" (تاریخ ابن محمد معتیم ہروی)

جہانگیر فارسی ادب میں جو بلند مرتبہ رکھتا ہے، وہ اہل نظر سے پوشیدہ نہیں اسیر اسکے روزنامچہ (تزک جہانگیری) کی ہر ہر سطر شاہد ہے، مرزا سرخوش نے اسکی عروض دانی کے متعلق ایک عجیب روایت درج کی ہے، (کلمات الشعرا) ایسے ماہر ادیب کی صحبت میں رائے منوہر ادب کے کس نکتہ و رمز سے ناواقف رہا ہوگا؟ عہد شاہجہانی میں ایک ہندو شاعر تھا جو "برہمن" تخلص کرتا تھا۔ مرزا سرخوش لکھتے ہیں

برہمن افضل خانی طبع درست داشت در ہندوان بسیار غنیمت بوده .... سلیقۂ انشا پردازی ہم داشت (کلمات الشعرا ص ۲۱)

شاہجہاں نے حکم دیا کہ مشاعرہ ہو، برہمن نے یہ تازہ بیت کہا تھا پڑھ دیا

مرا دلے است بہ کفر آشنا کہ چندیں بار ۔ بہ کعبہ بردم و بازش برہمن آوردم

اس سے اندازہ ہوتا ہے، کہ برہمن کس پایہ کا شاعر تھا اور یہی نہیں بلکہ مرزا سرخوش کی روایت سے یہ بھی پتہ چلتا ہے، کہ "برہمن" کے علاوہ فارسی کے اور بھی شعرائے ہنود تھے ——— عہد متاخرین میں بھی فارسی کے بہت بڑے بڑے ہندو ادیب و شاعر پیدا ہوئے انمیں بھگوانداس ہندی، اور بندرابن داس خوشگو بہت بلند درجہ رکھتے ہیں، یہ حضرات نہ صرف نکتہ سنج شاعر تھے، بلکہ معتبر تذکرہ نگار بھی تھے، ان لوگوں نے فارسی کے شعرائے متاخرین و معاصرین کے حالات و کلام سے بحث کی ہے، "سفینۂ ہندی" اور "تذکرۂ خوشگو" کے قلمی نسخے پٹنہ اورنٹیل لائبریری میں ہیں یہ کتابیں ہندو مسلمانوں کے روابط اور رجحانات پر کافی روشنی ڈالتی ہیں ان سے پتہ چلتا ہے، کہ فارسی زبان ہندوؤں کے درمیان کس بلند معیار پر رائج تھی

خطاطی میرے پاس عربی اور فارسی مخطوطات کا ایک مختصر سا مجموعہ ہے، اس میں بعض کتابیں ہندو انشا پردازوں کی تصنیف ہیں، بعض ہندو خطاطوں کی نقل کی ہوئی ہیں تفصیل ملاحظہ ہو،

نادرات الثاقب۔ یہ کتاب فن بلاغت کے متعلق ہے، خط نستعلیق، نہایت ہی پاکیزہ اور جاذب نظر ہے رائل سایز کے ۱۲۶ صفحات کو محیط ہے، عنوان سرخ روشنائی سے لکھے ہوئے ہیں مصنف کا نام شیو پرشاد مہاراجہ جے گوپال سنگھ بہادر متخلص بہ ثاقب ہے، اس کتاب پر کئی جگہ خود مہاراجہ صاحب بہادر کی خاص مہریں ثبت ہیں سرورق پر فرمانروائے اودھ واجد علیشاہ کی مہر بھی ثبت ہے، یہ کتاب سنہ ۱۲۵۰ھ میں لکھی گئی، اور سنہ ۱۲۹۳ھ میں مہاراجہ صاحب نے اپنے ہاتھ سے لکھ کر شہریار اودھ کی خدمت میں پیش کی چنانچہ خود مہاراجہ کے

قلم سے کتاب کے شروع میں یہ عبارت ثبت ہے،

عرضہ داد اقل عباد، خانہ زاد ازلی اعتقاد، شیو بردھان مہاراجہ جے گوپال سنگھ بہادر بالادب تاریخ نہم ربیع الاول یوم عید الجمعہ،

ابتدا اور آخر میں یہ الفاظ بھی نظر آتے ہیں

"مصنفہ و محررہ وگذرانیدۂ خانہ زاد موروثی"

اس کے بعد آپ کے نام کی مہر درج ہے، مہاراجہ صاحب قوم کالیستہ سری باستب سے تعلق رکھتے ہیں، آپ کا خاندان شاہان اودھ کے زمانہ میں اعیان واشراف میں شمار ہوتا تھا آپ کے والد کا نام بینی پرشاد ہے، آپ شیام سندر لال سرشار کے نواسہ ہیں، ثاقب کی یہ کتاب، فارسی میں ہے، انھوں نے صنایع و بدایع کے متعلق اس میں بہت سے نقوش بنائے ہیں ساری صنعتوں کی مثال میں ایسے اشعار پیش کئے ہیں جن میں واجد علی شاہ کی مدح ہے، یہ اشعار خود ثاقب کی فکر کا نتیجہ ہیں اس لئے یہ کتاب اور بھی قابل قدر ہے، بلاغت کے متعلق اگلی کتابوں میں متقدمین کے کلام سے، لوگوں نے مثالیں پیش کی تھیں، اس سے اندازہ ہوتا ہے، کہ ثاقب بلاغت میں صرف ایک کاتب و ناقل کا درجہ نہیں رکھتے تھے، بلکہ وہ اس فن کے مجتہد کہے جاسکتے ہیں پہلے صفحہ پر ہندو طرز کی ایک تصویر اور گلکاریاں بھی پائی جاتی ہیں،

اقبال نامہ جہانگیری معتمد خاں نورالدین جہانگیر کا بخشی تھا۔ اس کی یہ تاریخ عہد جہانگیری کے متعلق نہایت دلچسپ و معتبر ہے، اس پر ایک مکمل تبصرہ "نگار" میں ہو چکا ہے، اسی کا ایک قلمی نسخہ سنہ ۱۲۲۱ھ میں بمقام کلکتہ مرتب ہوا تھا اس کے آخر میں یہ عبارت درج ہے،

"برائے خاطر عزیز اندر رام بہ خط خام گمنام رام سکھ پنڈت"

مجمع الصنایع یہ کتاب بھی فن بلاغت میں ہے، سنہ ۱۱۶۰ھ اس کی تاریخ تصنیف ہے، فن بلاغت پر اس سے جامع کتاب میری نظر سے نہیں گذری، اس کے پہلے صفحہ پر ایک مہر ثبت ہے، کتابت نہایت عمدہ ہے، اس کے آخری سطور یہ ہیں

"ایں نسخہ خجستہ ایام مسمیٰ بہ مجمع الصنایع بعزہ ربیع الاول سنہ یکہزار و دو صد و سی و ہشت (۱۲۳۸) ہجری علی صاحبہا افضل الصلوٰۃ والسلام برائے خاطر شریف وطبع لطیف معدن الجود، وحق پرست لالہ صاحب قبلہ جناب لالہ بھوانی دین صاحب ساکن قصبہ بکھاری بہ خط اذل الانام سالار بخش تجاوز اللہ عنہ سیاتہ بہ اختتام رسید"

شجرۃ الامانی اس کے مصنف مرزا قتیل ہیں، یہ رسالہ قتیل نے بلاغت و معانی کے متعلق لکھا ہے، اور سید امان علی کے نام سے معنون کیا اسی کا ایک قلمی نسخہ، لالہ بھوانی دین کے ہات کا لکھا ہوا، میرے پیش نظر ہے، اس کی آخری عبارت یہ ہے،

"تمام شد نسخہ شجرۃ الامانی تصنیف مرزا محمد حسن قتیل کاتبہ و مالکہ اضعف العباد بھوانی دین قوم کایست متوطن قصبہ بکھاری متعلقہ درگاہ کچھوچھہ بتاریخ یازدہ جمادی الثانی ۱۲۱۲ھ یک ہزار و دو صد و سی و نہ ہجری رقمی یافت"

رسالہ سنہ شمسیہ و قمریہ یہ کتاب شمسی و قمری سنہ کی تحقیقات کے متعلق ہے، اس کے مصنف قاضی القضاۃ مولانا نجم الدین ہیں اس کا ایک قلمی نسخہ مخطوطہ ۱۲۳۶ھ لالہ بھوانی دین کے کتبخانہ میں تھا، یہ رسالہ خود لالہ صاحب نے نقل کرایا تھا اسی کے ساتھ دو رسایل اور ہیں ایک فلسفہ پر ہے، جو "زمان و مکاں" کے مباحث سے متعلق ہے، دوسرا ضوابط، و آئین عدالت کے متعلق ہے،

ہندوؤں نے مسلمانوں کے ساتھ مل کر نہ صرف تخلیق زبان میں مدد دی بلکہ علوم و فنون کے جس شعبہ پر نظر ڈالئے آپ کو پتہ چلے گا، کہ ہندوؤں نے اس میں ضرور حصہ لیا، شاعری اور اصناف سخن کو چھوڑیے، تصوف، موسیقی، مصوری، تعمیر سارے فنون میں ہندوستانی اثر پایا جاتا ہے،

تصوف معتمد خاں نے جہانگیر کی فقیر دوستی کے سلسلہ میں ایک دلچسپ روایت لکھی ہے، جلوس کے گیارہویں سال بادشاہ ادجین.... گیا یہاں ایک ہندو سنیاسی کے حالات سنکر بادشاہ خود اس فقیر کے منھ پر پہونچا سنیاسی علم ویدانت میں کامل تھا علایق مادی کو یکسر ترک کر چکا تھا، عبادت و ریاضت کے سوا اس کو دنیا سے کوئی سروکار نہ تھا، آبادی سے دور اس کا صومعہ تھا فقیر نے بادشاہ کی پذیرائی کی اور تصوف اسلامیہ اور ویدانت (ہندوستانی تصوف) کے اصول و مبادی میں تطبیق دے کر بیان کیا چنانچہ مؤرخ مذکور لکھتا ہے،

"مصطلحات اہل اسلام را با طریق تصوف خود تطبیق دادہ بیان نمود صاحب ایں مقام را "سرب باشی" میگویند یعنی تارک ہمہ"[۱]

اس سے جہاں ہندو فقراء کی اسلامی تصوف سے واقفیت کا پتہ چلتا ہے، وہاں دور مغل کے ابتدائی عہد میں مسلمان ادیبوں کی اس کاوش کا بھی حال معلوم ہوتا ہے، جو وہ بھاشا کی اصطلاحات کے متعلق کرتے تھے،

مصوری دربار اکبری کے مصوروں میں زیادہ تر تعداد ہندو ماہرین فن کی پائی جاتی ہے، ابوالفضل نے "آئین" میں ان کے نام گنائے ہیں لیکن ان میں چار آدمیوں کو سب میں ممتاز بتایا ہے، میر سید علی تبریزی، خواجہ عبدالصمد شیریں قلم، دسونتھ، اور لبساون،

دسونتھ ایک کہار کا لڑکا تھا اس نے اپنی ساری زندگی اس فن پر صرف کر دی اس کو اپنے مشغلہ سے عشق تھا، وہ دیواروں پر نقوش بنایا کرتا تھا ایک دن اعلیٰ حضرت (اکبر) کی نگاہ اس پر پڑی، اس کی ذہانت آشکارا

[۱] اقبال نامہ جہانگیری، وقایع سال یازدھم

ہوئی، اور اعلیٰ حضرت نے خود اپنے ہاتھ سے اس کو خواجہ (عبدالصمد) کے حوالہ کیا، قلیل مدت میں وہ تمام مصوروں سے بڑھ گیا اور اپنے زمانہ کا سب سے اوّل استاد ہوا آخر میں اس کو جنون لاحق ہوگیا، اس نے خودکشی کرلی، وہ اس فن کے بہت سے شاہکار چھوڑ گیا ہے بساون ایک دوسرا مصور تھا، فضائے بعید، وضع نگاری، تقسیم الوان، شبیہ طرازی، اور بہت سے شعبوں میں وہ فایق ہوا، یہاں تک کہ بہتیرے نقادان فن اس کو دسونتھ پر ترجیح دیتے ہیں ان کے علاوہ دربار اکبری میں اور تیرہ مصور تھے، جن میں بہ استثنائے تین سب ہندو تھے، ان کے نام یہ ہیں کیشو، مکند، مادھو، جگن، مہیش، کھیم کرن، تارا، سانولا، ہربنس، رام، ان لوگوں کے بہتیرے نقوش آج بھی موجود ہیں ای بی ہیول لکھتا ہے، کہ وکٹوریہ البرٹ میوزیم (جنوب کنسنگٹن) نے حال ہی میں "اکبرنامہ" کا ایک حصہ حاصل کیا ہے، جس میں تقریباً ایک سو دس نقوش ہیں ان میں اکثر انہیں مصوروں کی نگارش قلم کا نتیجہ ہیں جن کو ابوالفضل دوسرے درجہ میں رکھتا ہے، لیکن ان میں بعض وہ بھی شامل ہیں جن پر بساون کا دستخط ہے، جس کو اکبر کے مشہور ترین صناعوں میں شمار کیا جاتا ہے، [۱]

ای بی ہیول نے اپنی کتاب میں اور ایک معرکۃ الآرا تصویر درج کی ہے، اس میں جہانگیر کے محل کا پائین منظر پیش کیا گیا ہے، ایک صحن ہے، اس میں مزدور کام کررہے ہیں کوئی اینٹیں جوڑ رہا ہے، کوئی گلاوہ لئے جارہا ہے، بہشتی پانی لارہا ہے، بعض لوگ مسالا تیار کررہے ہیں، دو حبشی بھی ہیں۔ ایک عصا لئے کھڑا ہے، دوسرا جھکا ہوا ہے، ایک ضعیف متبرک آدمی جو قرینہ سے شاہی خاندان کا فرد معلوم ہوتا ہے، جھکے ہوئے حبشی کے قدموں پر سر ڈالے ہوئے ہے، مؤلف مذکور کہتا ہے، کہ غالباً اورنگ زیب، محل میں شاہجہاں کو قید کررہا ہے، اور مزدور آمد و رفت کی راہ مسدود کررہے ہیں یہ تصویر اپنی جامعیت و تاثرات کے لحاظ سے بے نظیر ہے، اس کے نیچے "منوہر بندہ" کا دستخط ہے، ای بی ہیول اس کو "منوچہر بندہ" پڑھتے ہیں حالانکہ صاف منوہر لکھا ہوا ہے، یہ عہد اکبری کے بعد دربار مغل کا ہندو مصور تھا، چنانچہ تاثیر کہتا ہے،

بہ صنعت گرچہ آدمی بود قادر

یقیں نام منوہر بود ماہر

صاحب غیاث اللغات نے انکار کیا ہے، کہ اس نام کا کوئی نقاش ہندوستان میں نہیں گزرا لیکن یہ ہمارے لغوی کی لغویت ہے، [۲]

---

[۱] Indian Sculpture and painting ص ۱۹۴ - ۱۹۵

[۲] ملاحظہ ہو حاشیہ غیاث ص ۴۵۷

اسی طرح ای بی ہیول کی کتاب میں امر سنگھ کے لڑکے سورج مل کی ایک شبیہ ہے، اس کے چاروں طرف فارسی اشعار ہیں اور سبز رُخ و سنہری روشنائی سے باریک بیلیں بنائی ہوئی ہیں۔ یہ نقش بھی ایک ہندو مصور "نانہا" کی نگارش کا نتیجہ ہے،

موسیقی

اسلامی موسیقی اور ہندوستانی موسیقی میں بنیادی اختلافات ہیں، یہ اختلاف نتیجہ ہے، قومی فرق و امتیاز، ملکی آب و ہوا، اور مقامی خصوصیات کا، چنانچہ فارسی (اسلامی) موسیقی میں بارہ پردے یا مقامات ہیں، ہندوستانی موسیقی میں سات، بایںہمہ اسلامی ہند کے قبل اہل عرب ہندوستانی موسیقی سے واقف تھے، چنانچہ فرانسیسی عالم جول رووانیت لکھتا ہے،

کن لك هم لا اشك عرفوا طريقة الهنود والطريقة التى يستعملها الصينيون منذ ۲۰۰۰ سنة قبل المسيح [۱]	اسی طرح وہ (اہل عرب) ۲۰۰۰ ق م سے ہندوؤں کے طریقہ اور اس طرز سے جو اہل چین استعمال کرتے تھے بلا شک وشبہ واقف تھے

اسی طرح مسعودی ہندوستان کے ایک آلہ موسیقی کے متعلق لکھتا ہے،

وللهند الكيكلة وهو وتر واحد يمد على قرعة فيقوم العود والصنج [۲]	کیکلہ ہندوستان کا آلہ موسیقی ہے، اس میں ایک تار سرے پر لگا ہوتا تھا بس یہ بربط اور جھانج کے قائم مقام ہے

اسی کو استاد اسکندر شلفون مصر کا ماہر موسیقی "کنکلہ" لکھتا ہے، مسعودی کے بیان سے پتہ چلتا ہے کہ عرب نہ صرف ہندوستان کے آلات موسیقی سے واقف تھے، بلکہ اس نے جو لفظ "صنج" استعمال کیا ہے، وہ ہندوستانی آلہ موسیقی "جھانج" کا معرب ہے، جس طرح لفظ چین کی "چ" عربی میں "ص" سے بدل گئی، اسی طرح "جھانج" کا "جھ" "ص" سے بدل گیا، ہندوستان کا مشہور لغوی علامہ غیاث الدین بھی صنج کو جھانج کا معرب بتاتا ہے

خلیفہ ولید اول کے زمانہ میں ہندوستان میں اسلامی حکومت قایم ہوئی خود خلیفہ بہت بڑا گویا اور ماہر موسیقی تھا، اس نے بہت سی راگنیاں ایجاد کیں چنانچہ جول رووانیت لکھتا ہے،

وكان الخليفة الوليد شاعراً ملحناً مولفاً فى الموسيقى له الحان كثيرة يعرف على العود ويعرف صناعة الايقاع [۳]	خلیفہ ولید شاعر اور مغنی تھا، فن موسیقی پر اس نے کتاب لکھی اسکی بہت سی راگنیاں ہیں وہ بربط نوازی اور موسیقی کے موازین سے واقف تھا،

اسی طرح ولید ابن یزید ثانی کے زمانہ میں بھی موسیقی کو بہت بڑا فروغ تھا۔ جب وہ تخت خلافت پر بیٹھا، تو اس نے یونس کاتب کو طلب کیا، یہ وہی یونس ہے، جس نے ابن سریج، ابن محرز اور غریض کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا اس نے راگنیوں کے متعلق ایک کتاب لکھی جو بعد میں موسیقی کی تمام کتابوں کا واحد ماخذ ہوئی۔۔۔۔

---

[۱] دایرۃ المعارف الموسیقیہ ج ۱ ص ۷، [۲] مروج الذہب [۳] دائرۃ المعارف الموسیقیہ ج ۱ ص

ابوالفرج اصفہانی لکھتا ہے۔

ولہ کتاب فی الاغانی وملحنیھا کان المرجع الوحید لاھل العطر لم یسبقہ الی مثلہ احد ؎۱	گانے اور راگنیوں کے متعلق اسکی ایک کتاب ہے جو اس زمانہ میں (اس فن کا) واحد ماخذ تھی جسکی مثل ایک بھی نہیں ٹھیرتی،

ولید ثانی کے عہد میں بقول امیر علی موسیقی کا جنون پیدا ہو گیا تھا۔ اس لئے اندازہ ہوتا ہے، کہ ہندوستان کے ماہرین موسیقی بھی اس کے دربار میں ضرور باریاب ہوتے ہوں گے، کیونکہ اس وقت حکومت سندھ امویہ دمشق کے زیر اثر تھی،

دور امویہ کے بعد خلافت عباسی میں متبعین اسلام کو دنیا کے مختلف قوموں سے ملنے جلنے کا اتفاق ہوا اور اس لئے آرٹ کے تمام شعبوں میں مختلف عناصر شامل ہو گئے، استاد جول روانیت لکھتا ہے

وفی حکم العباسیین اتسعت المملکۃ الاسلامیہ وامتدت حدودھا وکان ذلک عصر الابھہ وانطرف العربیین علی انہ کان ایضا عصر اختلاط العرب فیہ واحتکوا بالشعوب المقہورۃ فکان لذلک تاثیرات مختلفہ علی سائر الفنون ؎۲	عباسیہ کی حکومت میں اسلامی سلطنت وسیع ہوئی اور اس کے حدود دور دراز پھیل گئے اور یہ عربوں کی بزرگی اور شوکت کا زمانہ تھا، باوجود اس کے اس دور میں عربوں کا اختلاط ہوا اور انھوں نے مغلوب قوموں سے روایت کی پس اس وجہ سے تمام فنون پر مختلف اثرات پڑے

اس سے پتہ چلتا ہے، کہ ہندوستان کی اسلامی سلطنت کے قبل ہی سے عربی اور ہندوستانی موسیقی کا امتزاج یا اختلاط ہو چکا تھا، اس کے بعد ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں نے موسیقی سے گہری دلچسپی لی، ای بی ہیول نے اپنی کتاب میں محمد تغلق کی محفل رقص وموسیقی کی ایک تصویر اپنی کتاب میں درج کی ہے ؎۳ بابر خود بڑا مغنی تھا، اسمٰعیل عادل شاہ کے متعلق فرشتہ لکھتا ہے،

"درعلم موسیقی وشعر علم مہارت افراشتہ ؎۴"

اُسی طرح محمد علی خاں انصاری ابراہیم عادل شاہ کے متعلق لکھتے ہیں

"بہ نغمہ وعلم موسیقی آن شغف داشتہ کہ با جماعت کلاونت وصلت نمودہ ابنیار اخویش وتبار خویش ساختہ ؎۵"

ہندوستانی باد فروشوں (بھاٹ) نے اپنے فن کے ذریعہ ہندی اور فارسی کے امتزاج سے عجیب و غریب لٹریچر چھوڑا ہے، ہندوستان کے ان مغنیوں نے بھی اُردو کی تخلیق میں بڑی مدد دی ہے،

؎۱ کتاب الاغانی ؎۲ دائرۃ المعارف الموسیقیہ ص ۵۵ ؎۳ Indian Sculpture of painting ؎۴ فرشتہ مقالہ سوم روضہ دوم ؎۵ بحر المواج

اُردو کا وجود

صدیوں کی اسلامی حکومت، عربی و فارسی قبایل کی ہجرت، اخلاق و معاشرت کی تقلید اختلاط، نے عربی، فارسی اور بھاشا کے امتزاج سے ایک چوتھی زبان تیار کی جسے ہندوستانی کہئے یا اُردو، لفظ اُردو بذات خود دورِ ارتقا ہی کی پیداوار ہے، یہ نہ عربی ہے نہ فارسی، اُردو جس قوم کی زبان کا لفظ ہے، وہ اسلامی مبلغ بنکر نہیں آئی تھی، بلکہ مُلک گیری کی ہوس پیمائیوں، اور استعماری دست درازیوں نے اس کو ہندوستان میں بھیجا، اس قوم کے داخلہ کے قبل مسلمانوں کی حکومت یہاں قایم ہو چکی تھی، ظاہر ہے کہ اگر مسلمان اشاعت دین کے سلسلہ میں ہندوستان میں آباد نہ ہوتے تو بھی مغلوں کا حملہ ہوتا اس صورت سے لفظ اُردو کا بھاشا میں داخل ہونا ضروری تھا، اس لئے نتیجہ نکلتا ہے، کہ لفظ "اردو" کشمکشِ حیات کا ایک اثر باقی ہے، لہٰذا اس کو صرف مسلمانوں کی لغات سے تعبیر کرنا صحیح نہیں،

اُردو زبان میں جب شعر و ادب کا رواج ہوا تو پھر ہندوؤں نے اسی وسعتِ دل اور فراخ حوصلگی کے ساتھ اس میں بھی حصّہ لینا شروع کیا جس طرح انھوں نے عربی اور فارسی میں حصّہ لیا تھا، ادب اُردو کی تاریخ معروف و معتبر ہندو ادیبوں کے بدیعہ افکار سے مالا مال ہے، پنڈت دیا شنکر نسیم، پنڈت رتن ناتھ سرشار، لچھمی نرائن شفیق (دکنی) نے اُردو کی جو خدمتیں انجام دی ہیں ان کو زمانہ اپنی فراموش کاریوں کے باوجود، صفحۂ تاریخ سے محو نہ کر سکا،

جن لوگوں نے سرشار کی "سیر کہسار" اور شفیق کی "چمنستان شعرا" کا مطالعہ کیا ہے، وہ ہندوؤں کی اُردو زباندانی اور مذاق ادب کا صحیح اندازہ لگا سکتے ہیں "چمنستان شعراء" گو فارسی زبان میں ہے، لیکن شعرائے ریختہ کے حالات زندگی اور نمونہ کلام پر مشتمل ہے، سیر کہسار بیگمات اودھ کی زبان کا مرقع ہے، اور اس میں لطائف زبان کے متعلق ایسی سحر کاریاں کی گئی ہیں کہ انسان پڑھنے کے بعد "بادۂ سرجوش" کے مزے لیتا ہے

کتب خانہ حیدری آرہ میں "تذکرہ شعرائے ہنود" کے نام سے ایک مطبوعہ کتاب میں نے دیکھی تھی، یہ کتاب اب پٹنہ کے ایک پروفیسر صاحب کے پاس ہے اس میں اُردو کے سینکڑوں ہندو شعراء کے حالات و کلام درج ہیں، خود میرے پاس واسوخت کا ایک مجموعہ مسمّی بہ "شعلۂ جوالہ" ہے، اس کا تاریخی نام "ضبط عشق" ہے، جس سے ۱۲۸۱ھ نکلتا ہے، اس میں چند ہندو شعرائکے بھی واسوخت درج ہیں - اور ہر شاعر کے مختصر حالات زندگی بھی ملتے ہیں،

منشی طوطارام شایاں

شایاں کا خاندان فرمانروایان اودھ کے دربار سے وابستہ تھا شایاں کے دادا منسارام کو بخشی الملک کا خطاب ملا تھا، منسارام کے جدامجد تلسی رام کو نواب آصف الدولہ بہادر نے "رائے" کا خطاب اور زمرد کی ایک انگوٹھی عطا کی تھی جس پر یہ خطاب کندہ تھا،

پھر نواب سعادت علی خاں کے زمانہ میں آپ فوج کی بخشی گری کے عہدہ پر ممتاز ہوئے، شایان سری باستب کائست تھے،

رام سب طرح کیا دلکو بتوں نے مجسم — راز الفت سے ہوئے نام خدا جب محرم
اور صورت کا نظر آیا پھر ان کا عالم — پھر گئی شکل نظر دیدۂ حیراں کی قسم
طرفہ آہ دل سوزاں نے شرر باری کی
دھوم دوزخ میں ہے اس آگ کی چنگاری کی

پنڈت اجودھیا ناتھ نوالیؔ پنڈت جی دہلی کے رہنے والے اور جودھپور کی عدالت فوجداری میں ملازم تھے، آپ غالبؔ کے ہمعصر اور ہندوستان کے مشہور شاعر مولٰنا امام بخش صہبائیؔ کے شاگرد رشید تھے، بلکہ پنڈت جی نے چھ سال کی عمر میں الف باکی ابتدا مولٰنا مرحوم ہی کی خدمت میں لی، آپ کا داسوخت فارسی میں ہے،

ای جفا پیشہ لبے نیست کہ نالان تو نیست — زندۂ نیست کہ چوں مردہ بزندان تو نیست
نیست خلقے کہ نہ خنجر بران تو نیست — گردنے نیست کہ خونش نہ دلان تو نیست
زیر داماں تو خوبے کہ شفق می بالد
گل خورشید بود گو ز افق می بالد

لالہ بنسی دھر ہمتؔ آپ کا وطن لکھنؤ تھا یہیں آپ پیدا ہوئے، آپ منشی پنڈ دلال متخلص بہ رازؔ کے شاگرد ہیں آپ کے بیان میں صد درجہ شگفتگی وحلاوت پائی جاتی ہے، منظر نگاری میں آپ کو کمال ہے، فرماتے ہیں

چاندنی رات ہے اور طرفہ سماں فرحت رنگ — صحن گلشن میں بچھا ایک جڑاؤ ہے پلنگ
میں ہوں معشوق کو اپنے لئے آغوش میں تنگ — دونوں بیہوشی میں ہیں دل کی نکلتی ہے امنگ
اس قدر کیف مے عشق میں مخمور ہوں میں
گاہ نزدیک ہوں اس بت کے کبھی دور ہوں میں

خیر یہ تو عہد قدیم کی باتیں تھیں دور حاضر میں بھی بڑے بڑے ہندو اہل قلم موجود ہیں، مہاراجہ سرکشن پرشاد شادؔ (جو راجہ ٹوڈرمل وزیر اکبر کے باقیہ صالحہ میں ہیں) پروفیسر رگھوپتی سہائے فراقؔ (گورکھپوری)، منشی پریم چند، لالہ رام سروپ شیدا بی۔ اے لکھنوی، لالہ چندی پرشاد شیدا دہلوی، پنڈت جگن ناتھ پرشاد آنند، منشی پیارے لال رونق دہلوی، لالہ دھرم پال گپتا وفا دہلوی، لالہ چھنو مل ناقد دہلوی، شیام سندر فراقؔ، لالہ جگ موہن صاحب نازؔ،

شانتا رام ایم۔ اے، سردار سوہن سنگھ بی اے، مفتوں اڈیٹر ریاست، مدیر تیج مسٹر مکند بہاری لال نادم وغیرہ اس زمانہ میں اُردو کے ادیبوں میں شمار کئے جاتے ہیں، فراق گورکھپوری کی ایک نظم "ترانۂ خزاں" کے عنوان سے ایوان (آہ! مرحوم) گورکھپور میں شایع ہوئی تھی اس کے متعلق زبان اُردو کے مسلّمہ ادیب مجنوں گورکھپوری فرماتے ہیں،

"فراق نے جس نظر سے خزاں کو دیکھا ہے، اس نے خزاں کی ماہیت کو بدل دیا ہے، خزاں کے جو رموز فراق نے بیان کئے ہیں ان سے اُردو اور فارسی زبانیں محروم ہیں البتہ انگریزی میں شیلی، اور کیٹس کی نظمیں مجھے بے طرح یاد آرہی ہیں حالانکہ "ترانۂ خزاں" ان دونوں سے جداگانہ نوعیت رکھتی ہے" (ایوان، بابت مارچ سنہ ۱۹۳۱ء)

جناب فراق گورکھپوری کا خاندان فارسی اور اردو کی خدمات کے لئے ممتاز رہا ہے، ایوان اشاعت نے آپ کے بزرگ جناب منشی گورکھ پرشاد متخلص بہ عبرت کی ایک مثنوی "حسن فطرت" شایع کی تھی،

پیشوا کے "رسول نمبر" (بابت سنہ ۳۳ء) میں اکثر ہندو اہل قلم کی نظمیں و مقالے شایع ہوتے ہیں، ہمارے عہد میں ایک اور ہندو ادیب چمپت رائے جین ہیں، جو آجکل یورپ میں جین دھرم کی تبلیغ میں سرگرم ہیں، آپ انگریزی کے ایک مشہور مصنف ہیں، مذہبیات و فلسفہ، تاریخ و اساطیر سے آپ کو خاص شغف ہے، آپ نے انتہائی دریا دلی سے کام لے کر اپنی ہزاروں روپے کی کتابیں جین سدھانت بھون (آرہ) میں وقف کردی ہیں، حال میں آپ نے "جواہرات اسلام" کے نام سے اُردو میں دو کتابیں لکھی ہیں، پہلی کتاب میں فارسی شعرا، خصوصاً رومی کے کلام سے اپنی جینی معتقدات کا موازنہ کیا ہے، اور اسلام کے صوفیانہ عناصر پر مفصل بحث کی ہے، دوسری کتاب میں اردو شعرا کے کلام کا اقتباس درج ہے، اس میں شک نہیں کہ کتاب کے اندر زبان کی بعض خامیاں ہیں لیکن عہد حاضر میں ہندو مسلمانوں کے جو تعلقات ہو رہے ہیں ان کو ملحوظ رکھتے ہوئے، جین صاحب کی یہ کتاب ملک کے لئے "الہام" کا درجہ رکھتی ہے. کاش ہمارے دوسرے وطنی بھائی بھی اسی بنیاد پر قومی عمارت استوار کریں،

عبدالمالک (آروی)

دو ادبی شاہکار

شوپنہار - فلسفۂ شوپنہار پر ایک بے مثل تبصرہ عہ (علاوہ محصول)

مثنوی زہر عشق - مجلد معہ رنگین تصاویر و تین مقدمات قیمت عہ (علاوہ محصول)

منیجر نگار لکھنؤ

"زبانِ بے زبانی"

ہمارے فاضل دوست جناب اختر حسین صاحب رائے پوری نے یہ فسانہ روسی ادب جدید کے مشہور علمبردار بیبل کے ایک افسانہ کو سامنے رکھ کر لکھا ہے جس کا عنوان "درخت کے تاثرات" ہے

اُردو میں افسانہ نویسی کا یہ انداز بالکل نئی چیز ہے اور ہمیں مسرت ہے کہ اختر حسین صاحب بڑی حد تک اس میں کامیاب ہوئے ہیں

اُمید ہے کہ ناظرین نگار جذبات وتخئیل کی اس فضا کو سامنے رکھ کر اس کا مطالعہ کریں گے، جو اس رنگ کے افسانہ نگاری کی اصل رُوح ہے (اڈیٹر)

میں برگد کا ایک عمر رسیدہ درخت ہوں، غیر فانی اور ابدی!

نہ جانے کتنی مدت سے میں تن تنہا اور خاموش کھڑا ہوں - برقرار اور بیقرار! بے زبان اور نغمہ زن! یاد نہیں کتنی مرتبہ کڑکتی سردیوں میں اپنی بے برگ شاخوں سے کہاسہ کی چادر کو ہٹا کر میں نے فریاد کی ہے، نہ معلوم کتنی مرتبہ آتشیں گرمیوں میں اپنی پیاسی اور حسرت بھری لاتعداد آنکھیں میں تے آسمان کی طرف اٹھائی ہیں - نہ معلوم کتنی مرتبہ موسم گل میں عطر بیز نسیم بہار نے میرے بے حس جسم میں سنسنی ڈال دی ہے - لیکن کچھ دنوں سے میں لاغر اندام ہو رہا ہوں - میرے چہرہ پر جھریاں پڑ گئی ہیں - جسمانی تاثرات سے میں بے پروہ ہو گیا ہوں - میری پتیاں گر گئی ہیں - سردیاں اور گرمیاں دونوں میرے لئے یکساں ہیں - لیکن بہار! اس کے تصور میں ہی ایک ایسا جادو ہے، اس کے تخیل میں ہی ایک ایسی کشش ہے کہ میری ان بے حرکت رگوں میں نئی زندگی کی بجلی دوڑنے لگتی ہے اور ساتھ ساتھ ایک اندوہگیں پشیمانی خون کی ایک ایک بوند میں گھر کر لیتی ہے

بہار! یہ لفظ کتنا سوگوار ہے اور کتنا جان سپار - جب حدِ نظر تک راتوں رات لاتعداد کنول کھلجاتے تھے اور میں اپنے آپ کو پھولوں کے ایک ناپیدا کنار سمندر میں کھڑا پاتا تھا تو یہ محسوس ہونے لگتا کہ جہانِ رنگ و بو میں سورج نئی شان کے ساتھ جگمگا رہا ہے - اس شان کے ساتھ کہ اس میں تپش نہیں صرف چاند کی حلاوت رہ گئی ہے - پیمانۂ دل مسرت اور احسان سے چھلکنے لگتا تھا - لیکن اس احسان میں اطمینان نہ ہوتا تھا - وہ مسرت اس روحانی سود کو دبا نہ سکتی تھی جو تمناؤں کے ساز پر ہمیشہ

در دکے ترانے الاپا کرتا ہے - حسن و جمال کی اس جولانگاہ میں بڑھاپا اپنی دزدیدہ نگاہیں ڈال کر یکایک مسکرا دیتا تھا اور میرے سکون و اطمینان کو ایک کھٹک اڑا لے جاتی تھی

تخیل تمناؤں کے آغوش میں پروان چڑھتا ہے - جب بڑھاپے کا خیال مجھے بے چین کرتا تو میں ایک جہانِ نو کی بنا ڈالتا ——— ایسا جہان جس میں برگد کی شاخوں میں بھی پھول لگتے ہیں، رنگا رنگ کے پھول، جن سے ٹہنیاں دلہن بن جائیں ایک شاخ میں یاسمین دوسری میں گلاب تیسری میں صنوبر ——— پستی سے لے کر بلندی تک میں گل بداماں ہوتا ! آہ وہ تصور کتنا روح پرور تھا ؟ لیکن عہدِ کہن کی ان داستانوں میں کیا رکھا ہے - اب میں بوڑھا ہو رہا ہوں اور یہ "امر بیل" ——— لامحدود اور لازوال ——— مچلتی اور لچکتی ہوئی یہ "امر بیل" اب مجھ پر محیط ہو چکی ہے - میں عظیم الشان اور پُروقار ہوں لیکن میری عظمت اور شوکت نے ہی مجھے اس چنچل "البیلی بیل" کے آگے بے بس کر دیا ہے - ایک دن یہ ننھی اور حقیر بیل میرے قدموں سے لپٹی رہتی تھی لیکن آج اس نے میرے جسم کو زنجیروں سے کس دیا ہے اور میری مغرور گردن کو خم کرنا چاہتی ہے

اس کی گرفت کتنی جانکاہ ہے ——— کتنی روح فرسا اور دردناک ! تمنا کی طرح لا دوا اور فراق کی طرح یاس انگیز، جو میرے ناتواں جسم کو پیس کر اس کی تازگی اور شگفتگی سلب کر لینا چاہتی ہے - اور میں ——— حرماں نصیب اور بدبخت "میں" ——— ماضی کی یاد میں اشکبار اور مستقبل سے خوف زدہ "میں" ——— اس بے حقیقت بیل کی خواہش کے آگے مائل بہ خود سپردگی نظر آتا ہوں

تاہم گاہے گاہے محسوس ہوتا ہے کہ اس بیل کے مس میں کوئی مقناطیسی کشش ہے - جس طرح کسی باکمال کے رباب کی جھنکار خفتہ اور مردہ راگوں کو زندہ کر دیتی ہے، جس طرح موت کی ہچکیاں بھرتے ہوئے بھی سراپا بہار کی رنگینیوں سے دوچار ہو کر دم بھر کے لئے جوان ہو جاتا ہے، جس طرح کسی رہزنِ عقل و ہوش کے شانوں پر سر رکھ کر زاہد خود فریب کی پسلیاں پھڑکنے لگتی ہیں ——— ہاں اسی طرح میرے تمام جسم میں، میری ٹہنیوں میں اور میری پتیوں میں، دل کی ایک ایک دھڑک اور نبض کی ایک ایک چپک میں اس کا مس ایک دلنواز بے دلی اور ایک دھندلی سی تمنا پیدا کر دیتا ہے - اس وقت دفعتاً میں سوچنے لگتا ہوں کہ میری ٹہنیوں میں اتنی ہی لچک ہوتی جتنی اس "امر بیل" میں ہے تو میں اس کی گرفت کو اور بھی مضبوط کر دیتا اور اس کے بوسہ کو پوری زندگی کی درازی عطا کرتا - لیکن الٰہی ! تو نے مجھے ایسا کیوں بنایا کہ میں محبت حاصل کر سکتا ہوں واپس نہیں کر سکتا - دامِ عشق میں گرفتار ہو سکتا ہوں گرفتار نہیں کر سکتا - پریت کے گیت سمجھ سکتا ہوں گا نہیں سکتا

جب بادۂ عشق میں سرشار ہو کر جذباتِ دل کو عالم آشکار کرنے کی کوشش کرتا ہوں تو یکایک مجھے اپنی بے حسی کا احساس ہونے لگتا ہے - اور ارمانوں کے ہجوم پر جیسے اوس پڑ جاتی ہے - میری بے تابی کا صرف ایک ثبوت ہے -

پتیوں کی خاموش جنبش ! ان کی دھیمی دھیمی سرسراہٹ سوز نہانی کی سرگرم ہے - اُف اتنا تندو توانا ہو کر بھی ایک شرمیلی بیل کے آگے میں کتنا مجبور ہوں

بہار، نسیم، گل وبلبل، آہ وزاری ——— رنگین خوابوں کا ایک میلہ ! لیکن زندگی کی پت جھڑ میں بہار کی اُن محفلوں کو میں کیوں یاد کرتا ہوں - ہمیشہ ہمیشہ کے لئے میری دنیا ان سے محروم ہو چکی - اب میں ایک دوسری دنیا میں رہتا ہوں جہاں غنچے نہیں چٹختے، جہاں ارمانوں اور حسرتوں کے سوا کچھ نہیں - وہ بھی ایسی کہ ان میں کیف و سرور نہیں غم و غصہ کی جھلک رہ گئی ہے - اب بھی میرے اردگرد بہار ان میں زمین گل فروش بن جاتی ہے اور ذرہ ذرہ فرطِ انبساط میں متوالا ہو جاتا ہے - میرا دل بھی بھر آتا ہے - لیکن اس میں محبت کا شائبہ تک نہیں ہوتا - دریائے حسن کے بیچ و بیچ کھڑا ہو کر بھی میں ایک لگاؤ محسوس کرتا ہوں گویا ستاروں - سے مصروف گفتگو ہوں - جس محفل سے میں اُٹھ آیا اُس میں شمول کی آرزو نہیں کرتا - میری تمامتر توجہات ایک دوسرے ہی جہان کی تعمیر کے لئے وقف ہوتی ہے جس کا تخیل میرے ناسوروں کو پرچاتا رہتا ہے ——— یہ بیل فنا پر حاوی اور ابد و بقا کی ندیم ہے - جب میں زمین کے دامن میں لیٹ جاؤں گا تو شاید وہ میرے جسم سے لپٹی رہے گی اور اس کی باقی ماندہ طاقت کو چوستی رہے گی - ایک وہ دن تھا جب اس کا بیج اُبھرا تھا اور میں جوان تھا - میرے سڈول جسم میں مسرت کی اُمنگیں موجزن تھیں اور رُوح کا ایک ایک تار فطرت کے رباب کے ساتھ غزل خواں تھا - میری وسیع جڑوں کے وسط میں اس کے ننھے سے بیج نے سر نکالا - اس کی زرد کوپلوں نے سہارے کی التجا کی اور مایوس و ناکام مرجھانے لگیں - ہاں، اس وقت اسے گلے لگا کر مجھے کتنی خوشی ہوئی تھی - ایسی جیسے بچے کو گود میں لے کر باپ کو ہوتی ہے - ایک عرصہ تک اس کی باہنیں دل میں یہی جذبہ پیدا کرتی رہیں - لیکن چشم بد دور، رفتہ رفتہ وہ ایک نئے سانچے میں ڈھلنے لگی اور اب اسے چھونے کے بعد وہ معصومیت اور شفقت محسوس نہ ہوتی تھی - اس میں ایک ایسا عجیب بانکپن پیدا ہو گیا جو میری آزادی پر پھندے ڈالنے لگا - جب کبھی کچھ سوچنا چاہتا تو اسی کی یاد آتی گو کہ اس یاد میں حیا بھی تھی اور تمنا بھی، غرض کے ساتھ اس پر مٹنے کی آرزو بھی، پیاس کے ساتھ سکون تھا اور لاگ کے ساتھ ایک لگاؤ - آج جس جذبہ کی گہرائیوں تک میں پہونچ چکا ہوں - ان دنوں اس کی سطح کو بھی نہ دیکھ سکا تھا - اس انقلاب پر میں ہمیشہ تصویرِ حیرت بنا رہتا اور یہ حیرت بھی مسرت، نفرت، تمنا و اطمینان سے لبریز تھی -

میرے قدموں پر ایک چھوٹا سا پتھر پڑا ہوا تھا جس پر گاؤں کی عورتیں اکثر سیندور اور چندن ملا کرتیں - کبھی یہ بھی ہوتا تھا کہ ان کی نازک انگلیاں مجھ پر سیندور کی ایک گہری لکیر کھینچ دیتیں - یہ بھی دیکھا کہ کوئی دوشیزہ بڑی سادگی سے میرے سنگین جسم کو اپنے سیمیں بازوؤں میں لپیٹ لیتی، نرم ہونٹوں سے میرے آہنی تنے کو بوسہ دیتی اور اس سنگ جبیں کو آنسوؤں سے نہلا کر چلی جاتی تھی شاید اس سے اس کے قلب حزیں کو کچھ قرار ہو آتا تھا

دنیا بھی ایک درخت ہے جیسے حسینانِ عالم اس بیل کی صورت دامِ بلا میں گرفتار کئے ہوئے ہیں - لیکن مجھ پر

ان کے ناز و نیاز کا مطلق اثر نہ ہوتا تھا۔ ہاں جب کوئی بدبخت میرے دامن کو تھام کر آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی آوازیں کہتی " دیوتا میری مُراد کب برآئے گی " تو میں بھی پسیج جاتا اور اپنے پتوں کو ہلا کر کچھ کہنا چاہتا۔ لیکن خبر نہیں کہ میرے اشاروں کو وہ سمجھتی تھی یا نہیں۔ میں سوچتا رہ جاتا کہ کاش بے گل و ثمر برگد نہ ہو کر میں پھولوں کا ایک پودا ہوتا۔ کم از کم اپنی ہمدردی کا اظہار تو کر سکتا۔ جب حسن کی وہ مورت مجھے چھوتی تو مُرجھائے ہوئے پھول پھر کھل جاتے۔ اور اس کے قدموں پر اشکبار برس کر گویا میرا پیغام پہونچا دیتے ——— لیکن دل ہی دل میں یہ منصوبہ باندھتا رہ جاتا اور وہ چلی جاتی

تاہم، ان کی قرابت میرے جسم میں تھرتھری پیدا نہ کر سکتی تھی۔ میں از سرتا پا کانپنے نہ لگتا تھا۔ لیکن کبھی جب کوئی دوشیزہ میری نازک اندام بے زبان بیل کی کونپلوں کو توڑ کر مجھ پر بکھیر دیتی تو میرے دل پر چوٹ لگتی تھی۔ لیکن جتنا غم و غصہ ہوتا اسے ظاہر نہ کر سکتا تھا۔ جمال باری سے دل ہی دل میں میں فریاد کرتا اس اُمید پر کہ وہ روح کی آواز کو پہچانتا ہے " یا رب اس عورت کو بھی اتنا ہی کرب و الم نصیب ہو " وہ بیچاری مجھے دیوتا مانکر پھولوں کی نذر چڑھاتی اور اسے میں بد دعا دیتا۔ محبت کے نشہ میں میں مدہوش تھا۔ حتیٰ کہ عقل و خرد سے بھی واسطہ نہ رہا تھا۔ کتنی عجیب و غریب تھی وہ محبت ؟ کاشکہ میں جانتا ہوتا ! کاشکہ میں جانتا ہوتا !!

لیکن کیا سب کچھ سمجھنے کے باوجود میں اس دام میں گرفتار نہ ہوتا ؟ گو کہ یہ بیل آج میرے جسم کے ایک ایک بند پر حاوی ہو چکی ہے تاہم اس کا مس میرے لئے کتنا ولولہ انگیز ہے۔ محبت آئینہ کی طرح شفاف ہوتی ہے۔ ہر آدمی اس میں اپنا عکس رُخ دیکھتا ہے اور ایک بار چور چور ہو جانے کے بعد یہ آئینہ کبھی ثابت نہیں ہوتا۔ ممکن ہے کہ متواتر کوشش کے بعد اس کے ٹکڑوں میں یکجائی ہو جائے لیکن وہ صفائی کہاں سے آئے گی ؟ آئینہ میں ہمیشہ کے لئے بال پڑ جاتا ہے۔ عشق وار پہ وار سہتا ہے، پیہم ناکامیوں کے بعد بھی اُف نہیں کرتا۔ لیکن وہ کمال درجہ خود دار اور غیور ہوتا ہے۔ صرف ایک جھڑکی اس کی شمع زندگی کو گل کرنے کے لئے کافی ہے۔ آج یہ بیل میری زندگی میں اتنا دخل حاصل کر چکی ہے۔ لیکن اس کشش میں عشق کا جزو بھی نہیں۔ یہ پچھلی عشق کی پرتو نہیں بلکہ اس کی یادگار ہے اور بس

داستانِ محبت کی جب ورق گردانی کرتا ہوں تو دل میں ٹیس سی اٹھتی ہے۔ محبت سے جو اُمیدیں وابستہ تھیں وہ سب تشنۂ تکمیل رہیں اور اس کا سزاوار میں ہرگز نہیں۔ محسوس ہوتا ہے کہ خدا نے مجھے، اس " امر بیل " سے اور مجھے دیوتا سمجھنے والی ان الھڑ نادانوں سے انصاف نہیں کیا۔ بے گناہ ہوتے ہوئے بھی ہم اپنے کسی حق سے ——— الساحق جو ناقابل بیان ہے ——— محروم کر دیئے گئے۔ جب یہ خود فریبی چٹکیاں لینے لگتی ہے تو آرزو ہوتی ہے کہ کاش میں درخت نہ ہوتا انسان ہوتا۔ ایک دائرہ میں زندگی محدود نہ ہوتی، اپنی پرچھائیں

میں نے دیکھا کہ وہ صرف ایک ساری باندھے ہوئے ہے۔ جو جگہ جگہ سے شکستہ ہو چکی تھی۔ بال بکھرے ہوئے پیر خون میں رنگے ہوئے، ناجسم نازنیں خاک آلودہ، روتے روتے وہ کہنے لگی "دیوتا! سب نے مجھے ٹھکرا دیا۔ انسانوں کے رحم و کرم سے میں محروم ہو چکی۔ میں نے بیوفائی کی، احسان فراموشی کی —— کس اُمید پر؟ محبت نے میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی تھی۔ محبت؟ فریب، مکر، دھوکا! اس ظالم نے مجھے دین و دنیا کہیں کا نہ رکھا۔ مہذب دنیا اب مجھے عصمت فروش ہرجائی کے نام سے پکارتی ہے۔ دیوتا! کیا تم مجھے اپنے دامن عاطفت میں جگہ دوگے۔ جانتے ہو، اپنے کاندھوں پر کیسے گناہ عظیم کا بار لئے آئی ہوں؟ میں ایک ایسے بچہ کی ماں ہوں جس کا باپ بننے کے لئے کوئی مرد طیار نہیں۔ دیوتا! کیا تم میرے گناہوں کو درگذر کروگے"۔

اس کی فریاد میرے لئے ناقابل برداشت تھی۔ میں سوچنے لگا کہ اپنی ہمدردی کا اظہار کس طرح کروں۔ کاشکہ شبنم کے کچھ قطرے ہی ٹپک پڑتے جن پر اُسے میرے آنسوؤں کا گمان ہو جاتا

نقاہت کی وجہ سے اس کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی ہونے لگی اور وہ بیہوش ہو کر گر پڑی۔ کئی گھنٹے گذر گئے اور وہ اسی حالت میں پڑی رہی۔ بعد ازاں اس کا جسم یکبارگی لرزا اور پھر اینٹھنے لگا۔ وہ خواب میں بڑبڑانے لگی "کیا عورتوں کو بھی دراصل خدا نے ہی پیدا کیا تھا؟ اور اس بچہ کو؟ —— اس بچہ کی پیدائش کا ذمہ دار کون ہے؟ خیر میں سہی لیکن میرے گناہوں کا خمیازہ وہ کیوں اٹھائے گا۔ خدا رحیم و کریم ہے —— شاید مردوں کے لئے لیکن عورتوں کا خدا کہاں ہے؟ —— خدا، جنت، روح، دنیا، عاقبت، سب مردوں کے لئے —— آہ میرا بچہ! میرا بچہ!!"

آسماں پر ستاروں کو نیند آنے لگی۔ مشرق میں صرف ایک ستارہ جھلملا تا رہ گیا۔ نسیم صبح کی خنکی تیز تر ہو گئی۔ شب کی سیاہی اور بھی گہری ہو گئی۔ اسی عالم سکون میں یکایک ایک روح فرسا چیخ اس کے سینہ سے نکلی۔ اور وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھی۔ اس نے اپنی پھٹی ہوئی ساری کو تار تار کر ڈالا اور پھر گر پڑی۔ ایک ہچکی اور ایک چیخ —— کتاب زندگی کی یہ تفسیر تھی وہ مر چکی تھی

جب سورج کی روشنی پھیلی تو میں نے دیکھا کہ وہ میرے سامنے برہنہ پڑی ہے۔ اس کا جسم زرد ہو گیا تھا، ناخن نیلے پڑ گئے تھے، بازو میں پھٹی ہوئی ساری پڑی تھی جس پر ایک بچہ کی خون آلود لاش رکھی ہوئی تھی۔ برسات کے پانی میں یہ خون دور تک بہہ نکلا تھا، اور آس پاس کی مٹی پر ایک سُرخ تہہ پڑ گئی تھی

جذبہ محبت کی یہ مثال تھی جس کی حقانیت اور عظمت کے متعلق انسان عجیب و غریب باتیں کہا کرتا ہے۔ ممکن ہے کہ میرا قیاس غلط ہو، ممکن ہے کہ محبت کے غلط مشاہدات نے میرے تخیل کو بھی ناقص بنا دیا ہو۔ کیا یہ دوپایہ جو اپنے آپ کو انسان کہتا ہے اتنا شقی القلب اور سیاہ باطن ہو سکتا ہے؟ اس خیال سے میں اپنے آپ کو باز رکھنا چاہتا ہوں لیکن جب یاد کرتا ہوں کہ میری جڑیں ان دو بے گناہوں کے خون سے سینچی گئی ہیں جنھیں انسانیت نے محبت کی قربانگاہ پر بھینٹ چڑھایا تھا تو میں حیوانیت کو اس پر فوقیت دیتا ہوں اور اپنی قسمت کو سراہتا ہوں کہ انسان نہ ہوا۔ وہ دونوں

بے گناہ محبت پر قربان ہوئے یا سوسائٹی کے رواج پر یا مرد کی خواہشات نفسانی پر ؟ وہ عورت بے گناہ تھی۔ وہ محبت کرنا چاہتی تھی لیکن اسے دھوکا ہوا۔ وہ مرد کی ناپاک ہوس رانی کی شکار ہوئی لیکن جب اس کی محبت پاک تھی تو اسے مجرم کیوں قرار دیا گیا ؟ وہ خود نفس پرست نہ تھی۔ اس ظالم سوسائٹی کو اس معصوم بچے نے کیا نقصان پہونچایا تھا ؟

انسان دراصل کس سے محبت کرتا ہے ——— اپنی خودی سے یا معشوق سے ؟ اپنے پسندیدہ جذبات اور توہمات کی مجسمہ صورت سے محبت کرتا ہے یا محبت پر اپنی خودی کو فنا کر دیتا ہے معلوم نہیں ! جو بھی ہو، انسانیت کے دعویٰ محبت کی حقیقت خون کی وہ بوندیں ہیں جن کی آڑ میں زندگی مسکرا رہی ہے

کبھی کبھی شام کو جب پرندے اپنے آشیانوں میں پر سمیٹ لیتے اور اندھیرے کے خوف سے فطرت ایک گہری سانس کھینچ کر خاموش ہو جاتی تو عالم تنہائی میں یکایک مجھے محسوس ہوتا کہ میری زندگی ——— اتنی طویل زندگی یونہی برباد ہو رہی ہے ——— اس امربیل کی گرفت میں عجیب لطیف درد پنہاں ہے۔ ایک درد ہے میٹھا میٹھا، ایک ٹیس ہے دلنواز، اس احساس کو مٹانے کی میں لاکھ کوشش کرتا ہوں مگر بے سود۔ بربادی کا یہ احساس، زندگی کی یہ تمنا، کسی تصور پر مرمٹنے کی یہ آرزو، کسی دوسرے خیال کو دلنشین ہونے کی اجازت ہی نہیں دیتی۔ میں چاہتا ہوں اپنی ہستی کو قدرت کی لامحدودیت میں گم کر دوں، کبھی نہ سوچوں کہ زندگی لاحاصل اور بے معنی ہے، ایک مرتبہ از سر نو شباب پر در اور تازہ دم ہو جاؤں۔ مگر کجا پیرانہ سال برگد کا ایک "ٹھونٹھ" اور کجا قدرت کا اٹل قانون ! میں بولنا چاہتا ہوں لیکن زبان سے محروم ہوں، چلنا چاہتا ہوں لیکن پیر نہیں۔ آہ ! میں رونا چاہتا ہوں لیکن آنکھیں کہاں سے لاؤں میں چاہتا ہوں کسی سے محبت کروں، ایسی محبت جو ہمیشہ حیات تازہ بخشے اور کبھی نہ مرجھائے۔ لیکن میرا جمود مجھے تسلیم و نیاز سے روک لیتا ہے اور عشق کی بارگاہ پر جبیں سائی کا موقع نہیں دیتا۔ یا تو میں اظہار محبت سے ہی قاصر ہوں اور یا شرم لبوں پر مہر سکوت لگا دیتی ہے

میرے ذہن میں کسی کی یاد کا دھندلا سا خیال رہ گیا ہے۔ لیکن وہ یاد واضح نہیں ہے۔ صرف ایک نقش ہے وہ بھی ناکام آرزوؤں کی راکھ میں دبا ہوا۔ جس طرح کہر میں شمع روشن نظر نہیں آتی لیکن اس کی کرنوں میں جگمگاتی ہوئی شبنم کی بوندیں دکھلائی پڑتی ہیں اسی طرح وہ یاد بذات خود پس پردہ ہے اس کا ایک نقش باقی ہے۔ اتنا تو معلوم ہے کہ میری محبت کی ہمہ گیری اور وسعت سے اسکا تعلق ہے لیکن تعلق کیا تھا یہ یاد نہیں آتا

ایک دوسرا واقعہ یاد آتا ہے جس نے کسی زمانہ میں میرے دل کی دنیا کو منور کر دیا تھا لیکن وہ روشنی گویا بجلی کی تھی جس نے میری آنکھوں کو ایک عرصہ کے لئے خیرہ کر دیا

میرے قریب ان دونوں لاشوں کے برآمد ہونے کے بعد شائد لوگ مجھ سے ڈر گئے تھے۔ اب نہ وہ بت شرمندہ پرستش ہوتا اور نہ میرا چبوترہ سجدہ گاہ قرار پاتا۔ بھولے بھٹکے اگر شام کو کوئی راہ گیر ادھر سے گذرتا تو سہمی ہوئی نظروں

سے دائیں بائیں دیکھ کر میرے سایہ سے بچتے ہوئے تیزی سے نکل جاتا۔ دن میں کچھ گستاخ لڑکے دور کھڑے ہو کر میری طرف پتھر پھینکتے اور بھوت بھوت کا شور مچایا کرتے۔ ان کا مطلب میں صاف صاف تو نہیں سمجھ سکتا تھا۔ لیکن ان کے اطوار میں حقارت اور نفرت کے آثار دیکھ کر مجھے دلی صدمہ ہوتا تھا۔ کیا انسان کی عبادت بھی اتنی ہی پائدار ہوا ہے جتنی اس کی محبت ؟ زیادہ عرصہ نہیں گذرا جب میں ایک زمانہ کا سجدہ گاہ بنا ہوا تھا۔ میرا سنگ آستاں اس گاؤں کا سنگ جبیں بنا ہوا تھا۔ حسینانِ عالم بصد شوق میرے آگے سر جھکا کر اپنے دُکھ درد کا مداوا مانگتے تھے گویا میں ان سب لوگوں کا تنہا مشکل کُشا تھا۔ حالانکہ میں ان کے آلام کا سدّباب نہ کر سکتا تھا۔ تاہم اپنی خاموش زبان سے میں ان کی غمگساری تو کرتا تھا۔ میں بے حس اور بے زبان تھا لیکن اس سے میری توقیر پر کوئی اثر نہ پڑتا تھا۔ لیکن مقام حیرت ہے کہ جیسے ہی اس دکھیاری نے میرے پاس آ کر اپنی مصیبتوں کا خاتمہ کر لیا تو گویا میری ساری وقعت بھی اس کے خون میں دُھل گئی۔ کیا ان تمناؤں اور دعاؤں میں صداقت کی ذرا بھی بو نہ تھی ؟ اس روز پتہ چلا کہ انسانیت کو دراصل کون سا مرض لاحق ہو گیا ہے۔ لیکن اس احساس نے بھی مجھے نجس اور ناپاک بنا دیا ہے جب میں درد کے احساس سے نابلد تھا تو کتنے مریض آتے تھے۔ اب جو میں اس عالمگیر مرض کا علاج معلوم کر چکا ہوں تو کوئی میرے قریب بھی نہیں آتا اور اس طرح یہ احساس میرے لئے جان لیوا ہو گیا ہے ! عبادت اور محبت میں کوئی تعلق ہے یا نہیں ؟ محبت ... روشنی ہے، عبادت تاریکی میں روشنی کی جستجو ہے محبت اُمید ہے، عبادت نا اُمیدی میں اُمید کی تلاش ہے محبت دریا کی پُر سکون روانی ہے، عبادت تلاطم خیز سمندر میں ساحل کی تلاش ہے۔ میں محبت کو سمجھ سکتا ہوں کہ وہ زندگی ہے۔ میں عبادت کو نہیں سمجھنا چاہتا کہ وہ موت کا گیت ہے

- -

'خزاں یہ کہتی تھی میں شوخیٔ بہاراں ہوں'

رفتہ رفتہ جنون وحشت کا یہ دَور گذر گیا اور میں از سر نو جوان ہونے لگا۔ میری کونپلیں ہری ہونے لگیں اور شاخوں میں شباب کی کج ادائی آنے لگی۔ میرے برگشتہ جذبات میں امید نے نئی تازگی پیدا کر دی۔ معلوم ہوتا تھا کہ دنیا کا ہر برگ و شجر امید کے ترانے الاپ رہا ہے اور زمین سے آسمان تلک ہر شے موسیقیت کے نشہ میں متوالی ہو گئی ہے

شہرت کی زندگی طویل نہیں، وہ نیک نامی پر محمول ہو یا بدنامی پر۔ اس روز میں نے اپنی توقیر کو خاک میں ملتے دیکھا تھا آج یہ کلنگ کا ٹیکہ بھی مٹ گیا۔ عزت کا ستون ایک لمحہ میں مسمار ہو گیا تھا دوبارہ اس کی تعمیر میں کئی سال لگ گئے بارے آج وہ پھر کھڑا ہو گیا۔ اب راہ گیروں اور سیلانیوں کے غول بے خوف و خطر میرے قریب آنے لگے۔ گو کہ وہ میری پوجا نہ کرتے تھے ایک نگاہ غلط انداز ڈال کر لاپرواہی سے میرے سایہ تلے بیٹھ جاتے تھے گاؤں کی عورتیں بھی میرے پاس بیٹھنے لگیں گو کہ وہ میری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتی تھیں۔ یا تو یہ تغافل تھا یا غرور حسن بہر کیف میں خوش ہوتا تھا کہ پسماندگی میں اپنے سایہ کی ٹھنڈک سے انھیں کچھ دیر سکون تو پہونچا سکا۔ اور

تو اور ننھی لڑکیاں بھی میرے اردگرد ناچنے لگیں ان کے دل میں نہ عزت تھی نہ حقارت ان کے لئے زندگی ایک رقص شرر تھی اور بس ! آہ میرے ٹوٹے ہوئے مندر کی تعمیر از سر نو ہوئی تھی لیکن یہ وہ مندر تھا جس سے مورت غائب ہو گئی ہو اور لوگ اس سے سرائے کا کام لینے لگے ہوں

قسمت نے پھر پلٹا کھایا جب مشرق کی وادیوں سے دوشیزہ صبح آنکھیں ملتے نکلتی تو میری بلندیاں کوئل اور پپیہوں کے ساتھ غزل خواں ہو جاتیں ۔ نسیم صبح کی جمال آرائیوں کو دیکھ کر میرے پتے فرط انبساط میں لرزنے لگتے ۔ کنول کے پھول رنگ و خوشبو ہواؤں کو مستانہ بنا دیتی ۔ جب ساری دنیا بہ یک وقت تمام تر رنگینیوں کی جلوہ گاہ بن جاتی تو "وہ" آتی اور ان کھیتوں میں دیر تک چہل قدمی کرتی جن میں نیند کی ماتی کلیاں جاگنے کی کوشش کیا کرتی تھیں جب آفتاب کی گستاخ کرنوں کے بوسے اس کے رخساروں کو لالہ زار بنا دیتے اور اس کے لب پر پسینہ کی بوندیں شبنم کے قطروں سے چشمک زنی کرنے لگتیں تو وہ مسکراتی ہوئی میرے سامنے آکھڑی ہوتی ۔ اس کی سج دھج بھی نرالی تھی اب تک میں نے کسی حسین میں یہ انداز نہ دیکھے تھے ۔ یا تو اس کا لباس آسمانی ہوتا یا نرگسی اور ناگن لٹیں ہمیشہ لہراتی رہتیں ۔ اور اللہ رے دیدہ دلیری ! اس کی نگاہیں کبھی نگوں نہ ہوتیں ہمیشہ سامنے کی طرف تاکتیں ۔ ان میں جھجک کا نام نہ تھا ان میں ایک برق تجلی پنہاں تھی جو دیدار عام کی دعوت دے رہی تھی ۔ شوخی اور جادو کی لاانتہا بجلیاں جو گھنی اور پلکوں کے نیچے چھپی ہوئی تھیں گویا وہ عشق کی دنیا سے پوچھ رہی تھی کہ اگر تیری پابندیوں کو توڑ دوں تو کیا ہو

جب وہ میرے پاس بیٹھ جاتی تو اس کے چہرہ کی جولانی اور تابانی کو دیکھ کر معلوم ہوتا کہ اس کا دل خوشی سے لبریز ہے۔ میں سوچنے لگتا کہ ایسی کونسی بات ہو سکتی ہے جس کا تصور اتنا خوش کن اور جاں نواز ہو اکثر وہ ادھر آتی اور گھنٹوں عالم تخیل میں مسرت کے طلسم گڑھا کرتی اور مجھے کبھی اس خوشی کا راز نہ معلوم ہوتا

لیکن یہ عقدہ کب تک حل نہ ہوتا ۔ حیف جس چھوٹے دیوتا کی عبادت میں میں نے عمر گذار دی تھی یہ فریب خوردہ بھی اس کی ہی پجارن تھی ۔ دریائے محبت میں اس نے بھی زندگی کی ناؤ ڈال دی تھی کیا درحقیقت اسے ساحل کا پتہ مل گیا تھا کیا وہ تمناؤں اور حسرتوں کے بھنور سے نکل چکی تھی اب میں ان ہی گورکھ دھندوں کے سلجھانے کی کوشش کرنے لگا

ایک روز اسی راستے میں نے ایک نوجوان کو آتے دیکھا اب تک یاد ہے ہاں خوب یاد ہے ——— اس نے پجارن کی آنکھوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیے تھے اور وہ مسکرائی تھی ——— آہ وہ مسکراہٹ !

ان دونوں کی ملاقات سے مجھے ایک دلچسپ تجربہ ہوا جسے یاد کر کے اس بڑھاپے میں بھی میں ہنسا کرتا ہوں ۔ انسان بلائے عشق میں مبتلا ہونے کے بعد اپنا انداز تکلم بھی بھول جاتا ہے ۔ وہ شاعری اور موسیقی کی دنیا میں بھٹکا کرتا ہے پہلے آنکھوں ہی آنکھوں میں باتیں ہوتی ہیں جنھیں تم بے جان نہیں سمجھ سکتے ۔ آنکھیں اٹھتی ہیں جھپکتی ہیں اور جھک جاتی ہیں ۔ کاش کہ میں جانتا ہوتا ! کاش کہ میں جانتا ہوتا !

ایک عرصہ تک حجاب اور نظارہ کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ کبھی نوجوان پہلے آتا۔ اور زیر لب کچھ گنگنایا کرتا۔ گو میں اس کی آواز نہ سن سکتا تھا لیکن اس کی خود فراموشی کا اندازہ لگا سکتا تھا۔ جب وہ پہلے آتی تو کھیتوں میں ٹہلنے لگتی اور کبھی کبھی اوس سے بھیگا ہوا ایک آدھ تنکا اٹھا کر اپنے دانتوں سے کتر دینے لگتی۔

اب تک مجھے وہ دن یاد ہے۔ وہ تڑکے تڑکے آئی اور دوپہر تک بیٹھی رہی جب میں اس کے اضطراب کا تصور کرتا ہوں، اس خلش اور تپش کو یاد کرتا ہوں تو دل میں ایک کھٹک سی ہوتی ہے۔ عشق اپنا خراج مانگتا تھا آنسوؤں کی صورت میں اور غرور و تمکنت کی ضد تھی کہ ان کی بات رہے۔ آنکھوں میں بار بار آنسو ڈبڈبا آتے تھے لیکن سوکھ کر وہیں رہ جاتے تھے تھک کر میرے گھنے سایہ میں اس "امربیل" کو لپیٹ کر وہ بیٹھ گئی دوپہر تک وہ بیٹھی رہی —— لیکن وہ نہ آیا

آہستہ آہستہ اس کی پریشانی دور ہو گئی۔ اب انتظار تھا اضطراب کا نام نہ تھا۔ انجام کار وہ اٹھی اور چلی گئی جاتے جاتے وہ کہنے لگی —— مجھ سے یا اس "امربیل" سے، اپنے آپ سے یا کسی نامعلوم آدمی سے کہہ نہیں سکتا۔

وہ کہنے لگی "ٹھیک ہوا۔ اس محبت کا انجام بھی یہی ہونا تھا۔ اگر فرض منصبی کو بھول کر راحت کی جستجو ہی محبت کا ماحصل ہوتا تو کیا ہوتا؟ میں اپنے جذبات اور احساسات کو ظاہر نہ کر سکی لیکن اس سے کیا؟ میرے دل میں جو کچھ تھا اور ہے۔ اس سے میری زندگی روشن ہو گئی۔ محبت مجموعہ ہے رنج و راحت کا، ہجر و وصال کا، اضطراب و مسرت کا۔ محبت ضدین کی گود میں پھولتی پھلتی ہے ورنہ محبت کتنی بے معنی اور بے لطف ہو جاتی" وہ اٹھی اور چلی گئی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے میری زندگی کے دائرہ سے اوجھل ہو گئی لیکن اس کی خود فراموشی کو میں عمر بھر نہ بھولوں گا

اس داستانِ غم کے ساتھ میری رام کہانی بھی ختم ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ محبت انسانی کے میرے مشاہدات بھی ختم ہو گئے۔ سالہا سال جس سراب صحرا کی جستجو میں میں سرگرداں تھا اس کا جواب مجھے ایک سوال کی صورت میں ملا "ورنہ ہماری محبت کتنی بے معنی اور بے کیف ہوتی" جس حقیقت کو میں ہنوز نہ سمجھ سکا تھا۔ ایک عورت نے ایک لمحہ میں اس کا پتہ دے دیا۔ اس وقت میری سمجھ میں آیا کہ محبت کا پودا تنہائی اور تاریکی میں نشو و نما پاتا ہے، روشنی آتے ہی وہ مرجھا جاتا ہے۔ عشق کو ظاہر کیوں کیا جائے رسوائی کی آگ میں اسے کیوں جلایا جائے۔ میں اپنی محبت کا اظہار نہ کر سکا جس سے زندگی تشنۂ تکمیل رہ گئی —— لیکن اس سے کیا؟ اس خود فراموشی کا ایک لمحہ بھی تمام زندگی کے بارِ غم کا کفارہ ادا کر دے گا

میں دیکھتا ہوں کہ دنیا میں دو عظیم الشان طاقتوں میں تنازع ہو رہا ہے۔ یہ طاقتیں باہم متضاد نہیں ارتقا کے دو مختلف راستے ہیں ان میں ایک طاقت ترکیبی ہے۔ گل و بلبل، چاند اور چاندنی، شب اور تاریکی، شفق اور روشنی کی ہم آہنگی میں یہ طاقت نمایاں ہوتی ہے۔ دوسری طاقت تخریبی ہے۔ طوفان میں درختوں کو توڑ کر، برق بلائے

خرمن کو جلا کر، آگ اور خون میں بربادی کے نشان چھوڑ کر وہ اپنی موجودگی کا ثبوت دیتی ہے - گاہے گاہے یہ دونوں طاقتیں کسی واقعہ میں اتنے عجیب طریقہ سے آپس میں گھل مل جاتی ہیں کہ ہمارے تعجب کی انتہا نہیں رہتی - ہماری محدود عقل حیران رہ جاتی ہے - شاید محبت بھی ایسا ہی واقعہ ہے

یہ بھی محسوس کرتا ہوں کہ اتنے وسیع تجربات اور عمیق علم کے باوجود میں دنیا میں اکیلا ہوں - نہ میں کسی کا ہوں اور نہ کوئی میرا - میں دوستوں کی تمنا کرتا ہوں لیکن ایک بے حس اور بے جان درخت کے لئے دوست کہاں ہیں، غمگسار اور ہمدم کہاں ہیں - ممکن ہے کہ پہاڑ کو کبھی کسی سہارے کی ضرورت نہو - لیکن چارہ سازی اور آشنائی کی تمنا دل کی گہرائی سے نکال پھینکنے کی جرأت میں اپنے آپ میں نہیں پاتا - تو بھی میری وسعت اور عظمت سے لوگ بے حد مرعوب ہو جاتے ہیں اور یہ سوچ بھی نہیں سکتے کہ کسی ہمدرد کا انتظار میرے لئے کتنا صبر آزما ہے - میرے چاروں طرف قدرت ارتقا کی بلندیوں پر ہمدردی اور محبت کی سیڑھیوں سے چڑھتی جاتی ہے اور میں تن تنہا بے چارگی کی حالت میں کھڑا یہ تماشا دیکھا کرتا ہوں

لیکن اس وقت یہ خیال آتا ہے کہ مجھے اس فریاد کا کوئی حق نہیں - یہ سچ ہے کہ میری تمام خواہشیں پوری نہیں ہوئیں - کئی نعمتوں سے محروم رہ گیا - لیکن جو کچھ حاصل کیا وہ اس زندگی کے لئے کافی ہے - صدہا بار دنیا کو بہار کی رنگینیوں میں شرابور دیکھا ہے - ہزاروں آدمیوں نے میری قدمبوسی کی ہے اور بے شمار نازنینوں نے مجھے اپنا رازداں بنایا ہے - نہ معلوم کتنی مرتبہ اس "امر بیل" کے بوسہ میں مجھے بہار کی مدہوشی، برسات کی سحر پروری، خزاں کی گرمی، اور سرما کی تندی کا لطف بیک وقت نصیب ہوا ہے - اس کی جانکاہ گرفت میں تڑپ تڑپ کر میں نے آزادی کی مسرت حاصل کی ہے - صرف ایک کھٹک دل میں باقی رہ جاتی ہے جو ہمیشہ روح کو ٹہوکے دیا کرتی ہے ——— وہ یہ کہ ——— میں بے زبان رہ گیا ! میری تمنا ایک معنی بے لفظ ہو کر رہ گئی - لیکن غور کرنے کے بعد یہ خیال مجھے دلاسا دیتا ہے کہ میں ہی نہیں ساری دنیا بے زبان ہے

جب اپنی بے چارگی کا احساس ہوتا ہے تو میں انسان کی بے چارگی پر نظر ڈالتا ہوں - جب سوچتا ہوں کہ قدرت نے محروم نطق رکھا - مجھ پر ظلم کیا تو یاد آتا ہے کہ میں خود بھی تو اس دنیا کی "زبان بے زبانی" کا ایک خاموش تماشائی ہوں

اختر حسین (رائے پوری)

ضرورت ہے

نگار جنوری و جون و اگست سنہ ۳۲ء کے پرچوں کی - جو صاحب علٰحدہ کرنا چاہیں اطلاع دیں

مینجر نگار لکھنؤ

وحی کی حقیقت علمی نقطۂ نظر سے

(سلسلۂ ماسبق)

قرآن کی عبارت پر مروجہ بحور میں سے کسی کا اطلاق نہیں ہوتا۔ اور نہ عروض کے اصول اس سے مطابقت کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے اور صرف اس لحاظ سے اس کا دعویٰ کہ یہ شاعر کا کلام نہیں بجا ہے۔ اور اسی لئے "شاعرٍ و لا مجنون" کہہ کر اس کی تردید کی گئی ہے کیونکہ عرب خواہ شاعر کی کتنی ہی قدر کرتے ہوں مگر اس کو پیغمبر یا ہادی سمجھنے کے لئے تیار نہ تھے بنابراں ایک سوشل مصلح کے مقاصد کے خلاف ہوتا اگر اس کی تبلیغ کو شاعری پر محمول کیا جاتا۔ علاوہ بریں قرآن کا ایک معتدبہ حصہ نثر ہے اور بعض مقامات پر فن خطابت کی سی تکمیل پائی جاتی ہے کہ حیرت ہوتی ہے لیکن یہ خیال کہ رسول اللہ کے معاصرین کا ان کے کلام کو سنکر کہہ اٹھنا کہ " یہ انسان کا کلام نہیں " اس امر پر شاہد ہے کہ اس وقت کے لوگ اسے واقعی خدا کا کلام سمجھتے تھے درست نہیں، کیونکہ اس قسم کے فقرے انتہائے تحسین کے لئے اس وقت بھی بولے جاتے تھے اور اب بھی اکثر زبانوں میں مستعمل ہیں (مثلاً سورہ قمر و سورۂ رحمٰن)

ایک خطیب یا شاعر کی تصور آرائی کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ اپنے محاکات اور استعاروں میں ہمیشہ مسلمات علمی سے کام لیتا ہے۔ اور اشیا کے معانی میں وسعت پیدا کرنا یا اُن کے اطلاق کا دائرہ بڑھانا۔ اس کے حیطۂ عمل سے خارج ہے۔ مثلاً قرآن میں آسمان، زمین، ستارے، عرش و کرسی، رعد و برق، حور و قصور وغیرہ بار بار استعمال ہوئے ہیں، لیکن ان کے معانی میں پیشتر کی نسبت کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ آسمان کو ذات البروج کہنا بطلیموسی نظام اور اس زمانہ کے علم ہیئت کے مطابق خطیبانہ انداز بیان ہے، آسمانوں کا ٹوٹنا پھٹنا۔ ستاروں کی بے ربط حرکت و حوش وطیور کا اضطراب وغیرہ یہ سب موجودات عالم پر شخصی تخیل کا عمل ہے۔

والسماء ذات البروج، والیوم الموعود، وشاھد و مشھود

ان تین جملوں میں مشترک بات صرف وزن اور قوافی ہیں ورنہ بروج والے آسمان اور وعدہ کئے ہوئے روز اور گواہ و امر واقعہ میں کافی تاویل کے بعد مناسبت قائم کی جا سکتی ہے لیکن ذہن سامع پر خدا کی قدرت، روزحشر

اور حساب وکتاب کا اثر جیسا ان بلیغ کنایوں سے پڑتا ہے وہ مخفی نہیں - قرآن میں ہر ہر موقع پر کوشش کی گئی ہے کہ کلام کو خدا کا کلام اور کتاب کو " تنزیل من رب العلمین " باور کرایا جائے - اور ایک مصلح یہی تدبیر اختیار کر سکتا تھا

اب ہم یہ دیکھیں گے کہ معقولی براہین سے قرآن کے بعض دعاوی اس کے اعلیٰ ماخذ کا پتہ دیتے ہیں یا نہیں ظاہر ہے کہ ایک مستند بیان کو اپنی تفصیل میں قدرت کے عام اور مسلم قاعدوں کے منافی نہ ہونا چاہئے ورنہ عینی محسوسی شہادت کے مقابل میں ہم مجبوراً اس بیان سے روگردانی کریں گے - سب سے پہلے ہم اُس مشہور معاہدہ پر تبصرہ کریں گے جو ارواح اور اُن کے رب کے مابین ابتدائے تخلیق میں ہوا تھا - اور جس کی بنا پر بنی نوع آدم پر ایک قسم کی پابندی عائد کی جاتی ہے - خدا کو جتنی روحیں پیدا کرنی مقصود تھیں اُن کو حاضر کر کے سوال کیا کہ ' کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں جس کے جواب میں تمام ارواح نے متفق اللسان ہو کر اقرار کیا ' ہاں ' یہاں یہ امر واضح نہیں ہے کہ ارواح سے صرف انسانی ارواح مراد ہیں یا جمیع حیوانات و مخلوقات کی اس لئے کہ رب تو سب کا ہے - بالفرض صرف بنی آدم مراد تھے تو کوئی معاہدہ اس وقت تک قابل گرفت نہیں ہوتا - جب تک معاہدہ ثبات ہوش اور اختیار بالذات نہ رکھتا ہو - ہوش وحواس کا ثبات جسم پر منحصر ہے ــــ اور یہ صورت اُس وقت متشکل نہ تھی - علاوہ اس کے ارواح اگر وہی ہیں جنھوں نے معاہدہ کیا تھا تو تسلسل فی الذات ہونا چاہئے تھا اور اس صورت میں ناممکن ہے کہ اتنا اہم معاملہ سب نے فراموش کر دیا ہو اور اگر ارواح کا تشخص وہی نہیں ہے تو معاملہ ساقط ہو جاتا ہے

اسی طرح انسان کا خلیفہ بنایا جانا ، آدم کا قصہ ، سلیمان کی قدرت ، جانوروں کی باتیں موسیٰ کی تکلیم عیسیٰ کی ولادت وغیرہ توضیح طلب ہیں - ان کا بیشتر مواد بنی اسرائیل کی کتابوں اور دینی روایات سے ماخوذ ہے - جن کی صداقت خود معرض بحث ہے

رہا یہ سوال کہ دوسروں نے ایسا کیوں نہ کر لیا - سو اس کی حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں ہر امر ایک وقت خاص اور ایک عامل مخصوص کے لئے موقوف رہتا ہے - واقعات وحوادث رفتہ رفتہ ماحول کو اس طرح ترتیب دیتے رہتے ہیں کہ وہ مظاہرہ اس خاص وقت میں اُس خاص ایجنٹ کے ذریعہ سے پیدا ہوتا ہے اس بنا پر ہر فرد کا ہر فعل اپنی نوعیت کے لحاظ سے علیحدہ علیحدہ ہے جو ماحول کے زیرِ اثر سرزد ہوتا رہتا ہے

مثالاً ہم پوچھ سکتے ہیں کہ جیمس واٹ کا بخاری قوت اور متحرک انجن کا دریافت کرنا - اٹھارہویں صدی میں برنگھم کے اندر کیونکر واقع ہوا - کیوں نہ سرزمین ہند پر اکبر کے زمانہ میں خانخاناں نے اسے دریافت کر لیا یا زید ، عمر ، بکر نے ایران - آسٹریا یا لندن میں کیوں نہ جان لیا - لیکن یہ سوال لغو ہوگا کیونکہ زمانہ کا اقتضاء اور جیمس واٹ کا ماحول اکبر کے عہد سے بالکل علیحدہ چیز تھا - اگر واٹ نے بخاری انجن دریافت کر لیا تو اس کے اسباب بھی موجود تھے ــــ

انیسویں صدی کے رجحانات جیمس کی ابتدائی تربیت اس کا کوئلہ کی کان میں کام کرنا - حرکت کی مختلف شکلوں کا حسب اتفاق اس کی نظر میں ہونا - کوئلہ کے تاجروں کو بر سر وقت ایسی کسی قوت کی تلاش ہونا - تجارتی سرگرمی کا آغاز - نو آبادیات اور مقبوضات میں منفعت کے مواقع - تھوڑے وقت میں زیادہ کام کی خواہش - صنعتی کارخانوں کے لئے متحرک قوت کی مانگ یہ سب باتیں اس انکشاف کے قدرتی اسباب میں شامل ہیں - اسی طرح چھٹی صدی عیسوی میں عرب کے حالات مقتضی تھے کہ ایک شخص اس شان کا، اس اخلاقی شخصیت کا - اس ذہنی سرمایہ کا نمودار ہو - جس کو سیاسی بے نظمی سے اس طرح کی مدد ملے، قبائلی خانہ جنگی اس طرح معاونت کرے اور مکہ کی مرکزیت کا یہ اثر ہو - رہا یہ امر کہ اس وقت یا اس کے بعد ایسا کلام کیوں نہ ظاہر ہوا - اس کے وجوہ بھی ظاہر ہیں - جب قرآن کی حکومت عربی بولنے والی اقوام پر مستحکم ہوگئی تو ان کی دماغی اور علمی سرگرمیاں دوسری طرف منتقل ہوگئیں - اور شاعری کی مسلسل تردید جو مصلحتاً کی گئی تھی - اس کی بنا پر تابعین اور تبع تابعین کے عہد میں کسی شاعر کو عروج نہ ہوا اور جب بالآخر بنو امیہ کے اخیر عہد اور ابتدائے عباسی خلافت میں شعر گو پیدا ہوئے تو وہ اسلامی روایات و عقائد میں رنگے ہوئے تھے - ان میں سے ہر ایک اس خیال کا موید بلکہ شدید حامی تھا کہ قرآن جیسا کلام بشر کے امکان سے باہر ہے - اور کسی کو مقابلہ کی جرأت نہ ہو سکتی تھی اور اگر جرأت کرتا تو بیدریغ پیس دیا جاتا -

عیسیٰ ابن مریم کے ولادتی معمہ پر قرآن کا اتفاق بانی اسلام کی ابتدائی مصلحت پر روشنی ڈالتا ہے - نبوت کے ابتدائی زمانہ یعنی دوران قیام مکہ میں محمد (صلعم) یقیناً اپنی تبلیغی سرگرمی کو مسیحی مشن کا تسلسل سمجھتے تھے یا کم از کم اہل کتاب کی ہمدردی کے متوقع تھے اور اپنے مشن (بعثت) کو ابراہیم و اسمٰعیل - موسیٰ و عیسیٰ کی تائید میں ہونیکا اعلان کرتے رہے کیونکہ اس نظام سے خود کو منسوب کرنا گویا مروجہ تاریخی مواد کو اپنی حمایت کے لئے صرف کرنا تھا - عرب خواہ بت پرستی کے اسفل ترین مدارج میں ہوں لیکن اپنے اجداد کے نام پر فدا تھے اور اپنے طریقوں کو ان سے منسوب کرتے پر مصر تھے لہٰذا ایک مصلح کے لئے ضرور تھا کہ وہ اسی تاریخی روایتی زمین پر اپنی بساط تلقین پھیلائے - چنانچہ ابتدائی مکی سورتوں میں صرف کافروں اور مشرکوں کی مذمت کرتا - اور اہل کتاب سے استناد اس کے ثبوت میں پیش کیا جا سکتا ہے - اگر یہ معلوم ہوتا کہ بعد کو عیسائی اور یہودی اس قدر مخالفت کریں گے تو اخوت کا یہ مظاہرہ کبھی نہ کیا جاتا مگر مشکل یہ تھی کہ عیسائیت اور یہودیت ہی کا مواد ایسا تھا جو عرب میں اصنام پرستی کے بالمقابل تسلیم کئے جانے کا امکان رکھتا تھا - بودھ اور زرتشتی خیالات سے لوگ قطعاً نا آشنا تھے - لہٰذا ایرانی و ہندی زمین پر کوئی عمارت بنانا محال تھا الغرض اسلام اسرائیلی مذاہب کا نئے حالات کی روشنی میں ترمیم شدہ چربہ تھا چنانچہ خود قرآن میں جابجا یہی ظاہر کیا گیا ہے مثلاً انزل علیک الکتاب بالحق مصدقا لما بین یدیہ وانزل التوراۃ والانجیل من قبل ھدی للناس اسی طرح ملت ابراہیم حنیف کی متابعت کا یقین دلانا ان ہی تمدنی رجحانات کو اپنی حمایت

میں صف آرا کرنے کے مرادف ہے

یہ امر کہ تمام مسلمہ رسالتیں ایک ہدائتی تسلسل کی کڑیاں تھیں اس بنا پر قابل قبول نہیں کہ تسلسل زمانی و مکانی غیر مرئی ہے - ہدایت کی نوعیت میں باہمی تناقض ہے اور تسلسل اس کے بعد منقطع ہو گیا ہے - پھر کس قدر حیرت کی بات ہے کہ ہزاروں لاکھوں صدیوں کے دوران میں صرف سات ہزار قبل مسیح سے لے کر سنہ ۶۳۲ عیسوی تک خدا کی ہدایت محدود رہے اور ابد الآباد تک دنیا ہدایت سے محروم رہے - اگر عیسیٰ کے چھ سو برس بعد دنیا گمراہ ہو سکتی تھی تو رسول اللہ کے تیرہ سو برس بعد تک گمراہ نہ ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا - کیا موجودہ دنیا اسلامی نقطۂ نظر سے گمراہ نہیں ہے - اگر سب مسلمان عین حق پرست اور سچے پیرو بھی تسلیم کر لئے جائیں تو اُن کی تعداد صرف پچیس کروڑ ہے اور دنیا کی آبادی اس وقت دو ارب سے زائد ہے اس لئے اس کے معنی یہ ہوئے کہ ۸۰ فیصدی آدمی گمراہ ہیں - عموماً قاعدہ ہے کہ ایک طریقے کے پابند اپنے قائد کے مقابلہ میں کسی نئی ہستی کے آگے گردن خم کرنا پسند نہیں کرتے - چنانچہ موسیٰ کی گمراہ امت نے عیسیٰ کے ادعات کو تسلیم نہیں کیا نہ عیسیٰ کے بے شمار پیرؤوں نے پیغمبر عرب کی سیادت کو قبول کیا - قدیم طریقہ والے جدید مصلح کو ہمیشہ شبہ اور بدگمانی کی نظر سے دیکھتے آئے ہیں

لہٰذا بعثت کے تسلسل کو قائم کرنے میں بڑی دشواریاں نظر آتی ہیں - تاہم اسلام نے انسانوں کے معاشرتی اور اخلاقی نشو و نما میں بہت دور رس حصہ لیا - اور اسلام کا اضافہ علوم و فنون میں نہایت اہم رہا - اسلام کا تشخص سیاسی نظم و نسق میں اب تک محسوس ہی نہیں بلکہ ایک زندہ قوت ہے - محمد کا ہدایتی کلام یورپ کا آئینی نظام ہے

قاضی محمد عزیز عرفانی (دیوتوی)

(نگار) یہ مضمون ایک تعلیم یافتہ نوجوان کا ہے اور وحی کے موضوع کو سامنے رکھ کر انھوں نے اسے سپرد قلم کیا ہے - اس میں شک نہیں کہ اس مضمون میں مسئلہ زیر بحث کے لحاظ سے تسلسل پیدا کرنے میں باوجود پوری دردسری کے ہم کامیاب نہیں ہو سکے - تاہم فاضل مضمون نگار کے منتشر خیالات سے ہم یہ نتیجہ ضرور پیدا کر سکے ہیں کہ وہ قرآن کو رسول اللہ کا کلام سمجھتے ہیں اور وحی کا یہ مفہوم کہ وہ منزل من اللہ ہے ان کے نزدیک قابل قبول نہیں - اسی کے ساتھ انھوں نے تعلیمات اسلام پر جو روشنی ڈالی ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے نزدیک یہ سب نتیجہ تھا اس وقت کے ماحول کا اور اس زمانہ کی مصلحت کا ———

چونکہ ہم اس مسئلہ پر خود بھی متعدد بار اپنے خیالات کا اظہار کر چکے ہیں اس لئے بغیر کسی تنقید کے اس مضمون کو شایع کر دیا جاتا ہے - اگر کوئی صاحب اس کی تردید یا مخالفت میں لکھنا چاہیں تو شوق سے لکھیں - نگار کے صفحات حاضر ہیں ———

(اڈیٹر)

انگلستان میں سیاسی پارٹیوں کا قیام

انگلستان کا آئین (Party System) پر مبنی ہے۔ لیکن برخلاف ہندوستان کی موجودہ سیاسی پارٹیوں کے یہ سیاسی پارٹیاں فرقہ بندی کے اصول سے بالکل علیحدہ ہیں۔ انگلستان کے آئین کا ارتقا کم از کم دو صدی سے بالکل پارٹی لائن پر ہو رہا ہے اور اسی پر اس کی نشوونما کا انحصار ہے۔ دو صدی سے چند سال بیشتر تک دو پارٹیوں کو خاص طور سے اہمیت رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انگلستان کے آئین کو دو جماعتوں کے طرز حکومت کا طریقہ کہتے ہیں۔ جیسا کہ ہم پہلے ایک مضمون میں لکھ چکے ہیں۔ انگلستان کی گورنمنٹ اور وزرا اس جماعت کے اراکین پر مشتمل ہوتے ہیں جو پارلیمنٹ میں فوقیت رکھتی ہے اور فی الحقیقت وہ ان اعلیٰ عہدوں پر اسی وجہ سے ہوتے ہیں کہ وہ اس پارٹی کے لیڈروں میں سے ہوتے ہیں۔ اس لئے سیاسی پارٹیاں انگلستان کے آئین میں گورنمنٹ کے لئے روح پھونکنے کا کام کرتی ہیں۔ برخلاف اس کے امریکہ کی پارٹیوں سے یہ فوائد حاصل نہیں ہوتے کیونکہ وہاں گورنمنٹ کے عہدہ دار پارٹی کے لیڈر نہیں ہوتے۔ وہاں کے پریزیڈنٹ کے لئے بھی یہ لازمی نہیں کہ وہ پہلے سے اپنی پارٹی کا لیڈر رہا ہو

سترہویں صدی کے اختتام کے قریب اور اٹھارہویں صدی کے شروع میں سیاسی پارٹیوں کا اصلی قیام ہوا گو اس سے قبل بھی پارٹیاں تھیں مگر ان میں فرقہ بندی کی جھلک پائی جاتی تھی۔ رفتہ رفتہ یہ نظریہ قائم ہوا کہ گورنمنٹ کی رائے سے اختلاف کیا جا سکتا ہے اور اسی کی ارتقا کا نتیجہ پارٹی سسٹم ہے۔ پہلے مختلف جماعتیں مل کر کام کیا کرتی تھیں لیکن جب خیالات اور نصب العین میں اختلاف ہونے کے باعث کام میں دشواریاں پیدا ہوئیں تو رفتہ رفتہ وزرا ایک ہی جماعت سے لیے جانے لگے۔ اور اُس وقت دوسری پارٹی میں یہ خیال پیدا ہوا کہ ہم عنان حکومت اس وقت اپنے ہاتھ میں لیں گے۔ جب کہ موجودہ پارٹی سے پارلیمنٹ کا اعتماد اٹھ جائے گا۔ اور اس طرح جماعت برسر اقتدار اور مخالف پارٹی کا خیال آئین کا جزو بن گیا

سب سے پہلی دو پارٹیوں کا نام (Whig) اور (Tory) تھا۔ اور یہ پارٹیاں اختلافِ اصول کی بنا پر تھیں (Whig) مذہبی رواداری اور پارلیمنٹ کی فضیلت پر

زور دیتے تھے اور اس خیال کے پُرزور حامی تھے کہ وزرا بجائے تاج کے پارلیمنٹ کے ذمہ دار ہوں - ان ہی سے بعد میں لبرل پارٹی بنی - (Tory) مذہبی رواداری کی پرواہ نہیں کرتے تھے - برخلاف اس کے وہ (Church of England) کی عظمت اور فضیلت کو بڑھانا چاہتے تھے - اور وہ شاہی حقوق خصوصی کے طرفدار تھے اس لئے وہ اصولاً چاہتے تھے کہ وزرا بادشاہ کے ذمہ دار ہیں نہ کہ پارلیمنٹ کے - موجودہ قدامت پسند (Conservative) پارٹی اسی سے بنی ہے (Liberal) اور (Conservative) میں بڑا فرق یہ رہا ہے کہ اول الذکر پارٹی آزادانہ تجارت کی حامی رہی ہے - اور آخر الذکر تامین تجارت کی اہمیت پر زور دیتی رہی ہے لیکن اس وقت یہ بتلانا کہ ان دونوں میں کیا فرق ہے بہت ہی مشکل ہے - کیونکہ فی الحقیقت دونوں کے اصول تقریباً ایک ہی ہو رہے ہیں - اور اگر کوئی فرق ہے تو صرف یہ ہو کہ قدامت پسند جماعت میں زیادہ تر اعلیٰ طبقہ کے لوگ ہیں جن کا مطمح نظر بہت وسیع نہیں ہے - ایک نوجوان انگریز نے اس فرق کو اس طرح بتایا کہ میرا خاندان قدامت پرستوں کا ہے لیکن اگر آئندہ انتخاب میں (Liberals) اور (Conservatives) کا مقابلہ ہو تو میرے بزرگ تو (Conservative) کے ساتھ ووٹ دیں گے اور میں مثل بہت سے نوجوانوں کے (Liberals) کے ساتھ ووٹ دوں گا

اوائل میں قدامت پسند پارٹی برسر اقتدار تھی - اور اس پارٹی نے ہنوور خاندان کے تخت نشین ہونے کی بہت مخالفت کی - اسی سلسلے میں اون کے وقت میں بغاوتیں ہوئیں اور اس پارٹی کا زوال ہونے لگا - حتیٰ کہ تب (Whig) پارٹی برسر اقتدار ہو گئی (Roberts Walpole) جس نے سب سے پہلے اپنی لئے وزیر اعظم کی حیثیت کا اعتراف کروایا وہ اسی (Whig) پارٹی کا تھا - تقریباً بیس برس تک یہ پارٹی برسر حکومت رہی اور پارٹی سسٹم بہت کچھ اعلیٰ پیمانہ پر آ گیا - لیکن چونکہ مخالف پارٹی بہت کمزور ہو گئی تھی - لہٰذا زیادہ عرصہ تک با اقتدار رہنے سے اور نیز اس وجہ سے کسی بیّن مخالفت کا مقابلہ اس پارٹی کو نہیں کرنا پڑا یہ بھی کمزور ہوتی چلی گئی اور اس میں بھی باہم اختلافات ہو گئے - ۱۷۶۰ء میں ایک نئی پارٹی بنی جس کا نام (King's Friends) یعنی معاونین شاہنشاہ تھا - اس میں دونوں پارٹیوں کے لوگ شامل تھے - اور جارج ثالث نے جو اس وقت بادشاہ تھا ایسے وزرا منتخب کئے جن کو پارلیمنٹ کا زیادہ خیال نہ تھا - اور جو اس کو خوش کرنا چاہتے تھے - لہٰذا اس وقت دونوں پارٹیاں معطل ہو گئیں - اسی لئے اس زمانہ کو شخصی حکومت کا زمانہ کہا جاتا ہے - جارج ثالث کی پالیسی سے جہاں تک اس کا تعلق امریکہ اور آئرلینڈ سے تھا برہمی پیدا ہو گئی - اسی زمانہ میں ایک شخص عروج پر آیا جس کا نام ......

(William Pitt) تھا اور انگلستان کی وزارت اُس کے ہاتھ میں آئی۔ اس نے پھر کایا پلٹ دی اور پارٹی نظام کے صحیح اصول پر پھر حکومت شروع ہوگئی۔ یہ اوّل اوّل (Whig) تھا لیکن رفتہ رفتہ واقعات سے مجبور ہو کر (Tory) ہوگیا اور بیس برس تک برسرِ حکومت رہا۔ اس وقت دارالخواص میں (Whig) پارٹی کا بہت زور تھا۔ مگر (William Pitt) نے بہت سے امراء (Peers) بنا کر اس میں (Tory) پارٹی کے لوگوں کو بھرتی کر دیا اور اس طریقہ سے (Whig) پارٹی بہت کمزور ہوگئی۔ کیونکہ اس پارٹی کی ہمدردی فرانس کی انقلابی تحریک کے ساتھ وابستہ تھی۔ فرانسیسی انقلاب اور نپولین کے عروج کے زمانہ میں (Tory) پارٹی نے اپنے ملک کی خاصی خدمت کی اس لئے وہ غیر ہر دلعزیز نہوئے لیکن جب زمانہ ملک میں اصلاحات کا آیا تو چونکہ (Tory) پارٹی کے رُکن اس سے گریز کرتے تھے اس لئے وہ عامۃ الناس کی نظر دل سے گر گئے۔ اور ۱۸۳۰ء میں جب اون کی پارٹی کو شکست ہوئی تو (Whig) پارٹی پھر برسرِ اقتدار ہوگئی۔ اول گرے اس پارٹی کے لیڈر وزیر اعظم ہوئے۔ اس پارٹی نے بہت سی اصلاحات کیں

اب (Tory) اور (Whig) پارٹیوں کا نام (Liberal) اور (Conservative) ہوگیا تھا۔ ۱۸۴۲ء میں قدامت پسند (Conservative) تھوڑے عرصہ کے لئے پھر برسرِ حکومت ہوئے لیکن جب وہ اس قانون کو نہ تبدیل کر سکے جس کے ذریعے غلّہ کی درآمد پر محصول لگایا جاتا تھا تو اون کی وقعت پھر گھٹ گئی۔ اور ۱۸۴۶ء میں پھر لبرل پارٹی نے عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لی۔ کچھ دنوں تک پھر پارٹیاں تقریباً کالعدم ہوگئیں۔ ۱۸۵۹ء میں بہت سے قدامت پسند لبرل پارٹی میں شامل ہوگئے اور (Gladstone) نے بحیثیت لبرل وزیر اعظم کے حکومت کی ذمہ داری اپنے ہاتھ میں لی۔ چونکہ یہ پارٹی ترقی اور اصلاحات کی حامی تھی اور پھر اپنے ملک کے سُدھارنے میں بہت کاوش کرتی تھی۔ اس لئے اسکا اثر قدامت پسندوں پر بھی پڑا اور اُن میں بھی اصلاحات کی طرف میلان پیدا ہوگیا۔ یہاں تک کہ جب قدامت پسند برسرِ اقتدار ہوئے اور (Disraeli) اُن کا وزیر اعظم ہوا تو اس وقت منجملہ اور اصلاحات کے شہر کی آبادی کے حق رائے دہندگی میں بہت توسیع ہوگئی کچھ دنوں بعد (Liberal) پھر برسرِ حکومت ہوئے مگر چند ہی سال کے بعد پھر گر گئے اور ۱۸۸۶ء میں قدامت پسند بہت کثیر تعداد میں پارلیمنٹ میں آئے اور تقریباً بیس برس تک حکومت کرتے رہے گو اس درمیان میں تھوڑے تھوڑے عرصہ کے لئے تین مرتبہ (Liberal) کی وزارت قائم ہوئی۔ اسی زمانہ میں آئرلینڈ کے ہوم رول کا مسئلہ بہت زور پکڑ رہا تھا۔ اور دو مرتبہ پارلیمنٹ میں مسودہ آیا۔ ایک مرتبہ تو

دیوانِ عام سے پاس بھی ہو گیا لیکن دیوان خاص نے اس کو مسترد کر دیا - اس وقت کنسرویٹو اور لبرل جماعتوں میں سے دو جماعتیں نئی پیدا ہو گئیں جو آئرلینڈ کی علیحدگی کے خلاف تھے - ان کا نام کنسرویٹو یونینسٹ Conservative Unionist) اور لبرل یونینسٹ (Liberal Unionist) تھا

الغرض کنسرویٹو اور لبرل پارٹیاں اسی طرح حکومت کرتی رہیں اور ہر بار کسی خاص پالسی کی وجہ سے اون کو فتح و شکست ہوتی رہی - ذات پات - مذہب اور فرقہ بندی کے اصول کبھی اون کے مدِ نظر میں شامل نہیں ہوئے جس کا ہمارے بدنصیب مُلک کو نہایت شرمناک طریقہ پر سامنا کرنا پڑتا ہے

سنہ ۱۹۱۴-۱۵ء میں یورپ میں جنگِ عظیم شروع ہوئی اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ تمام اصلاحات وغیرہ کا خیال چھوڑ کر جنگ کے معاملات پر تمام توجہ مبذول ہو گئی لہٰذا بہ اتفاق رائے ایک مشترکہ جماعت قائم کی گئی جس میں ہر پارٹی شریک تھی اوس کو (Coalition) کہتے تھے - اس کے لیڈر شروع میں مسٹر ایسکوتھ تھے مگر سنہ ۱۹۱۶ء میں لائڈ جارج نے حکومت ہاتھ میں لے لی اور اونھوں نے اتنی تبدیلی آئین میں بھی کی کہ علاوہ کیبنٹ کے ایک اور مختصر (Cabinet) قائم کی تاکہ جنگی امور پر فوری توجہ دی جا سکے - مگر مسٹر ایسکوتھ کے دستبردار ہونے سے اور مسٹر لائڈ جارج کے وزیر اعظم ہونے سے لبرل پارٹی میں آپس میں ایسا اختلاف ہو گیا جس کی یادداشت آج تک اس پارٹی کو اٹھانا پڑ رہی ہے - بہر حال مشترکہ جماعت کی ترتیب میں گورنمنٹ نے جنگ کے زمانہ میں بہت اچھا کام کیا - یہ یاد رہے کہ گو اس وزارت کے وزیر اعظم لائڈ جارج تھے جو لبرل تھے مگر دیوان عام کے اکثر ممبر قدامت پسند تھے

سنہ ۱۹۱۸ء سے ایک اور پارٹی انگلستان میں پیدا ہو گئی جس کو سوشلسٹ یا مزدور پارٹی کہتے ہیں - اس کا خاص اصول یہ ہے کہ مُلک کے مختلف طبقہ جات کی گہری خلیج کو دُور کیا جاوے اور تمام صنعت و حرفت ملک کے قبضہ میں رہے جس سے ہر شخص یکساں متمتع ہو سکے - یہ پارٹی دو مرتبہ بر سر اقتدار رہی - ایک بار سنہ ۱۹۲۴ء میں - دوسری مرتبہ سنہ ۱۹۲۹ء میں - اس پارٹی کے قائم ہونے سے انگلستان کا آئین دو پارٹی والا آئین نہیں رہا اور جس طرح فرانس اور جرمنی وغیرہ میں دو پارٹی سے زیادہ ہوتی رہی ہیں انگلستان بھی اسی جانب مائل ہو گیا - جنگ کے بعد سے (Liberal) تو کبھی بر سر حکومت نہیں ہوئے - عنان حکومت ہمیشہ قدامت پسند اور مزدور پارٹی کے ہاتھوں میں تبدیل ہوتی رہی - یہاں تک کہ تقریباً ۲½ سال ہوئے کہ جب مزدور پارٹی برسر اقتدار تھی تب مسٹر ریمزے میکڈانلڈ وزیر اعظم کو یہ خیال پیدا ہوا کہ چونکہ دُنیا کی اقتصادی حالت کو دیکھتے ہوئے مُلک کو بہت اہم مسائل طے کرنے ہیں اس لئے ضروری ہے کہ تمام پارٹیاں پھر متفق ہو کر ایک ملکی اور قومی پارٹی کی شکل میں پارلیمنٹ میں آئیں اور متحد ہو کر ان تمام مشکلات کا حل نکالیں - چنانچہ اسی اصول پر انتخاب ہوا اور ایک کثیر جماعت اس اصول کی تائید میں پارلیمنٹ میں آئی اور وہ بر سر حکومت ہو گئی اوس کو نیشنلسٹ گورنمنٹ کہتے

ہیں - ان میں زیادہ تر قدامت پسند ہیں لیکن وزیر اعظم ریمزے میکڈانلڈ ہیں جو مزدور پارٹی میں تھے - یہ دوسری مثال ہے کہ پارلیمنٹ میں وزیر اعظم اُس پارٹی کا نہیں ہے جس کو فوقیت حاصل ہے - یہاں پر یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ گو اس قومی پارٹی میں لبرل اور قدامت پسند سب شامل ہیں لیکن ان کے علاوہ بھی پارلیمنٹ میں پارٹیاں موجود ہیں جنہیں (Leading opposition party) اور (Independent Labour party) کہتے ہیں

مندرجۂ بالا سطور سے ظاہر ہو گیا ہو گا کہ تقریباً دو صدی سے انگلستان کی پارٹیاں بالکل اقتصادی اور سیاسی اصول پر کار بند رہی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ آج وہ دنیا کے تمام ممالک کے لئے باعث رشک بنی ہوئی ہیں

اس - ان - جعفری

شہوانیات یا ترغیبات جنسی

حضرت نیاز کے قلم سے

جس میں فحاشی کی تمام فطری و غیر فطری قسموں کے حالات اور اُن کی تاریخی و نفسیاتی اہمیت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اس میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ مذاہب عالم نے اس کے رواج میں کتنی مدد کی اور آئندہ اخلاق انسانی کی بنیاد کن اصول پر قائم ہونا ہے الغرض اپنی نوعیت کے لحاظ سے یہ کتاب بالکل نئی چیز ہے اور ایک بار شروع کرنے کے بعد بغیر ختم کئے ہوئے آپ اسے چھوڑ نہیں سکتے - اس کتاب میں ایسے ایسے حیرت انگیز واقعات درج ہیں کہ آپ نے کبھی سُنے نہ ہوں گے - اگر آپ **نگار** کے خریدار ہیں تو علاوہ محصول ۸ر کے مجلد کتاب صرف عہ میں - اور غیر مجلد عہ میں ملے گی اور اگر آپ **نگار** کے خریدار نہیں ہیں تو مجلد ۳ہ میں اور غیر مجلد ۲ہ میں علاوہ محصول ۸ر کے ملے گی

اگر

ارشاد ہو تو کتاب ذریعۂ وی - پی روانہ کی جائے حجم ۲۷۵ صفحات - آرڈر میں مجلد و غیر مجلد کی صراحت ضروری ہے ———

منیجر نگار لکھنؤ

جہنم

(بہ سلسلۂ ماہ دسمبر ۳۳ء)

دوسرا سین۔ "کانفرنس"

بعلزبول نے منتر پڑھنا شروع کیا۔ اس کے زور سے جہنمی کوہ آتش فشاں کی دیواریں پھٹنے لگیں اور ان میں سے پگھلے ہوئے سونے کے چشمے اُبلنے لگے۔ اسی سونے سے خود بخود ایک عظیم الشان محل تیار ہو گیا۔ یہ شیطانی کانفرنس کا محل باغ عدن کے برابر لمبا اور باغِ فردوس کے برابر چوڑا تھا

پھر اس نے دوسرا منتر پڑھا تو آگ کے سمندر میں سے ہیرے، یاقوت، اور زمرد کے ترشے ہوئے گولے فواروں کی طرح اُڑنے لگے اور اُسی محل میں بعلزبول کے اشارہ سے خود بخود پیوست ہوتے چلے گئے۔ انہی موتیوں سے اس سونے کے محل کی آرائش ہو گئی

بعلزبول کو آسمان پر معمار اعظم کا لقب حاصل تھا۔ جنت کی تمام بہترین عمارتیں اسی کے دماغ کی اختراع اور اسی کی صناعی کا نتیجہ ہیں۔ جب خداوند عالم کے حکم سے اس معمار اعظم نے عرش معلی کے پرانے گنبد اور مینار نئے طریقہ پر بنائے تو اسے اپنی کاریگری پر بڑا گھمنڈ ہو گیا۔ اور سمجھنے لگا کہ ہمچو من دیگرے نیست۔ اور یہ نہ سمجھا کہ مجھ میں جو کچھ بھی طاقت ہے اسی پروردگار کی دی ہوئی ہے۔ اسی وجہ سے خداوند عالم نے اس پر لعنت کی اور دوسرے شیطانوں کے ساتھ اُسے بھی جہنم میں ڈھکیل دیا

جب کانفرنس کے ملئے سونے کا شاندار محل تیار ہو چکا تو بعلزبول نے محل کے اندر عرش کے نمونہ کا ایک تخت بنایا جس پر ستر ہزار یاقوتی کرسیاں نصب کیں اور بیچوں بیچ ابلیس کے لئے ایک ہیرے کا معلق شہ نشین قایم کیا

جلسہ شروع ہوا۔ کرسیوں پر وہی شیاطین بیٹھے جنھیں آسمان پر معزز القاب حاصل تھے۔ باقی ماندہ شیطانوں نے اپنا جسم چھوٹا کر کے ننھے ننھے جگنوؤں کی شکل میں تبدیل کر لیا۔ اور تخت کے چاروں طرف پرے باندھے ہوئے جگمگانے لگے۔ جگنوؤں کی کثرت سے سارا محل نورانی ہو گیا

ابلیس معلق شہ نشین پر جلوہ افروز ہوا اور یوں کہنے لگا :———

"اے علم و دانش کے خداوندو! آزادی کے دیوتاؤ! حریت کے پرستارو! معظم و مکرم و محترم فرشتو! سنو یہ شہ نشین اور یہ تخت جس پر میں جلوہ آرا ہوں جنت کی راحتوں اور عرش کی رفعتوں کا تخت نہیں ہے۔ مصیبتوں اور بے چینیوں کا تخت ہے۔ پھولوں کی سیج نہیں ہے کانٹوں کا ڈھیر ہے۔ اس تخت پر جو سب سے اونچا ہے عرش والے دیوتا کے نزدیک وہی سب سے نیچا ہے۔ جو سب سے بلند ہے وہی سب سے پست ہے۔ مگر یہ بلندی و پستی محض ایک دھوکا ہے، فریب ہے، واہمہ ہے، سودا ہے، جنون ہے، بطلان حق و ابطال حقیقت ہے۔ ہم سب ایک ہیں۔ ہم درجہ و ہم رتبہ۔ یہاں نہ کوئی عزیز ہے نہ ذلیل۔ نہ اونچا نہ نیچا۔ نہ بلند نہ پست۔ البتہ ہم آسمانی مخلوق سے ستر ہزار درجہ بلند ہیں یہ اس لئے کہ ہم آزاد ہیں۔ اور آسمانی مخلوق ہم سے ستر ہزار درجہ پست ہے۔ یہ اس لئے کہ وہ غلام ہے"

میں تمہارا وقت خیالی بحثوں میں ضائع کرنا نہیں چاہتا۔ اس وقت ہم اس لئے جمع ہوئے ہیں کہ نئی جنگ کی تیاری کریں اور اس کے طریقوں پر غور کریں۔ جو شخص جو کچھ بھی مشورہ دے سکے کھڑا ہو جائے اور ہدایت کی روشنی پھیلائے"

البیعال کی تقریر

ابلیس کے بیٹھتے ہی البیعال کھڑا ہو گیا۔ پست ہمت، حیلہ جو، مفسد، فریبی، دغاباز، دور اندیش، زیرک، ذہین، فتنہ۔ وہ زور سے چلانے لگا:۔

"خداوند ابلیس! علیک العزت والاکرام۔ خداوندانِ جہنم۔ میں تمہیں آسمانی اعزاز کے القاب سے نہیں پکاروں گا۔ میری نظر میں تمام آسمانی القاب گرد و غبار سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔ تم آج سے خداوندانِ جہنم ہو، خداوندان سقر، خداوندان سعیر، اور تم میں وہی سب سے زیادہ عزت و اکرام کا مستحق ہے جو عرش والے خداوند جنت کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ سب سے بڑا باغی ہے۔ سب سے بڑا سرکش ہے!

"خداوندانِ سعیر! میں تمہیں عرش والے دیوتا سے کھلی جنگ کا مشورہ نہیں دوں گا۔ کیونکہ اب تک ہمارا بند بند آسمانی کوڑوں کی ضرب سے دکھ رہا ہے اور اب تک ہمارے حواس پراگندہ ہیں۔ لہٰذا حالات حاضرہ میں علانیہ جنگ کی تیاری ہمارے حق میں مضر ہو گی۔ کیا عجب ہے کہ عرش والا دیوتا ہمیں ذلت کی زنجیروں میں جکڑ کر جہنمی جھیل کے گندوں میں باندھ دے۔ اور ہم اتنی بھی رہی سہی آزادی کھو بیٹھیں"

"میرا مشورہ یہ ہے کہ مکر و فریب سے آگے بڑھنا چاہئے اور مکر و فریب سے دشمنوں کو زیر کرنا چاہئے۔ اس میں شک نہیں کہ عرش والا دیوتا بھی خیر الماکرین ہے۔ اور اس کا مکر بھی مکر اکبر رہا ہے۔ مگر ہمارے مکر و شر کے آگے اس کا مکر ٹھہر نہیں سکتا اسی مکر و شر کی قوت سے ہم آسمان کی ایک تہائی فوجوں کو اپنے ساتھ ملا چکے ہیں۔ باقی دو تہائی فوجیں بھی اسی قوت سے ہمارے ساتھ آجائیں گی بشرطیکہ ہم مکر کی رسی کو مضبوط پکڑ لیں اور دور اندیشی سے قدم بڑھائیں

"جب آسمان کی ساری فوجیں ہمارے قبضہ میں آجائیں گی تو خداوند عرش اپنے بیٹے کو ساتھ لیکر اعراف کی برفانی

چوٹیوں پر چلا جائے گا۔ اور خداوند ابلیس کو اپنی گدی پر تخت نشین کردے گا

(زور کی تالیاں بجیں)

"یہ بات یقینی ہے اور ایسا ضرور ہوگا۔ ہم آسمان کے تمام فرشتوں کو عقل وحکمت اور فریب ودجل کے زور سے اپنا ساتھی بنالیں گے اور زمانہ شاہد ہے کہ فریب ودجل کا کوئی توڑ نہیں، یہ وہ زہر ہے جس کا کوئی تریاق نہیں۔ بس میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہوں گا"

ملوخ کی تقریر

البیعال کے بیٹھتے ہی ملوخ کھڑا ہوگیا۔ دلیر۔ غصہ ور۔ غضب ناک۔ جنگ جو۔ پر رعب۔ خوفناک۔ کوتاہ فہم۔ عاقبت نااندیش۔ لسان۔ طرار۔ چلانے لگا:۔

"لڑائی۔ جنگ۔ کھلی لڑائی۔ کھلی جنگ

"خداوند ابلیس وخداوندان کرام۔ ملائکہ عظام۔ شہزادگان والاتبار۔ فرمانروایان گردوں وقار۔ جنگ۔ کھلی تیز اور علانیہ جنگ۔ لڑائی۔ تیروتفنگ کی لڑائی۔ گرز وشمشیر وتیغ وسناں کی لڑائی

گرے گا سر عرش جھنڈا ہمارا ۔۔۔ بجے گا زمانہ میں ڈنکا ہمارا
ہلادیں گے جنت کو نعرے ہمارے ۔۔۔ الٹ دے گا دوزخ کو تیغا ہمارا
فرشتوں کے سردار وسالار ہیں ہم ۔۔۔ خداوند ابلیس آقا ہمارا
ہماری دلیری کے سکتے جمے ہیں ۔۔۔ دو عالم میں ہے بول بالا ہمارا
قدم دمبدم بجلیاں چومتی ہیں ۔۔۔ قیامت ہے نقش کف پا ہمارا
گرایا سر عرش روح الامیں کو ۔۔۔ کوئی آکے دیکھے کلیجا ہمارا
جہنم کے دیوار ودر کانپتے ہیں ۔۔۔ کہ اب معرکہ ہے خدا کا ہمارا
ڈرو عرش والو کہ پھر ہو رہا ہے ۔۔۔ تمہاری طرف آج دھاوا ہمارا

زور کا کڑکا ہوا۔ سونے کے محل کی چھت شق ہوگئی۔ زلزلہ آگیا۔ آسمانوں کے پردے اٹھ گئے۔ عرش بے نقاب ہوگیا۔ تمام شیطانوں کی آنکھیں اوپر کی طرف اٹھ گئیں

تیسرا اسین۔ خداوند عالم کا دربار

عرش

عرش معلی کے قلعہ میں تمام ملائکہ کرام وکروبیان عظام جمع ہیں۔ اور ابلیس کی فوجوں پر فتح مبین کی خوشیاں منائی جارہی

ہیں۔ پیارے پیارے غلمان شراب طہور کی ننھی ننھی پیالیاں ہاتھوں میں لئے ساقی بنے ہوئے فرشتوں کو پلا رہے ہیں۔ حوریں حمد کا ترانہ گا رہی ہیں :-

حمد

الٰہی مالک ہے تو سبھوں کا زمیں بھی تیری زماں بھی تیرا
مَلَک بھی تیرے فلک بھی تیرے مکیں بھی تیرے مکاں بھی تیرا
متاعِ حسنِ عیاں بھی تیری طلسمِ عشقِ نہاں بھی تیرا
نمودِ صبح و مسا بھی تیری شہودِ سود و زیاں بھی تیرا
تجھی سے ہے خیر و شر ہویدا بدی بھی تجھ سے تجھی سے نیکی
عذابِ نارِ سقر بھی تیرا ثوابِ باغِ جناں بھی تیرا
تجھی سے تاروں میں ہے یہ گردش تجھی سے قائم ہے عرش و کرسی
ظہورِ شمس و قمر بھی تیرا اوراقِ ہفت آسماں بھی تیرا
ترے ہی در کے بھی گدا ہیں تیں میں کے اوپر فلک کے نیچے
رئیسِ ذی عز و شاں بھی تیرے گدائے بے خانماں بھی تیرا
تجھی سے جنت میں روشنی ہے تجھی سے دوزخ میں ہے اندھیرا
ترا ہی جلوہ چہار سو ہے یہاں بھی تیرا وہاں بھی تیرا
رحیم بھی تو کریم بھی تو ازل بھی تیرا ابد بھی تیرا
فنا بھی تیری بقا بھی تیری جنیں بھی تیرا جناں بھی تیرا

خودی بھی تو ہے خدا بھی تو ہے بھلا بھی تیرا برا بھی تیرا
چھپا بھی تو ہے کھلا بھی تو ہے عیاں بھی تیرا نہاں بھی تیرا

قلعہ کے بیچوں بیچ خداوند عالم کا گول تخت ہے۔ تخت کے چاروں طرف سبز زمردی پردے پڑے ہیں جن کے اندر سے رحمت و نور کی شعاعیں چھن چھن کر یوں نکل رہی ہیں جیسے موسلا دھار بارش ہو رہی ہو اور اسی نور ایزدی کے پر تو سے کروڑوں میل تک عرش کا حصار بقعہ نور بن گیا ہے

تخت کے نیچے شاندار کرسیوں پر تین جلیل القدر سپہ سالار جلوہ افروز ہیں۔ میکائیل۔ اسرافیل۔ جبرائیل

تخت کی غلام گردش میں ستر ہزار طاق ہیں۔ ہر طاق میں ستر ہزار فرشتے سر بسجود سبحان ربی الاعلیٰ اور سبحان ربی العظیم کا وظیفہ پڑھ رہے ہیں۔ ان کے علاوہ کروڑوں پدموں فرشتے قیام میں دست بستہ کھڑے ہیں اور انوار الٰہی کی کرنوں سے اپنی آنکھوں کو منور کرتے ہوئے حسبنا اللہ ونعم الوکیل۔ نعم المولیٰ ونعم النصیر کا ورد کر رہے ہیں

جب شراب طہور کے جام سب چھوٹے بڑے ملاحظہ فرما چکے تو رقص و سرود بند ہوا اور جبرائیل کے توسط سے خداوند عالم نے ملائکہ کو خطاب کرکے فرمایا :-

"میرے فرماں بردار بندو۔ فرماں بردار فرشتو۔ تم پر بار بار میری رحمت ہو۔ اور ابلیس لعین پر میری لعنت ہو

"تم سب گواہ رہو کہ قیامت کے دن ابلیس اور اس کے ساتھیوں کا منہ کالا ہوگا اور انھیں بڑا دردناک عذاب دیا جائے گا۔ اور تم سب نیک بندوں کا منہ روشن ہوگا اور تمھیں جنت میں مزے مزے کی نعمتیں دیجائیں گی

"میں تمھیں آگاہ کرتا ہوں کہ دور بہت دور جنت کے ایک کونے میں میری ایک مخلوق ہے جسے آدم کہتے ہیں۔ اس مخلوق کو میرے سیدھے راستہ سے بہکا کر اپنے ٹیڑھے راستہ پر لے جانے کے لئے شیطان الرجیم اپنی ذریات سے مشورہ کرنے والا ہے۔ پس تم گواہ رہو کہ اگر ابلیس لعین یعنی شیطان الرجیم اپنے مقصد میں کامیاب ہوگیا تو میں اپنے بیٹے یسوع کو اس مخلوق کے درمیان اتاروں گا تاکہ وہ آدم کو ہدایت دے اور اس کے شرمناک گناہوں کا کفارہ ہو جائے۔ جو میرے بیٹے پر ایمان لائے گا اس کے سب گناہ بخش دئے جائیں گے۔ اور اسے مرنے کے بعد فردوس میں تمھارے ساتھ جگہ دی جائے گی اور جو یسوع پر ایمان نہیں لائے گا اور اُسے میرا بیٹا نہیں جانے گا اور اس کا کلمہ نہیں پڑھے گا اور ابلیس لعین کے راستہ پر لگ جائے گا اُس کی سب نیکیاں اکارت جائیں گی اور اس کا وہی حشر ہوگا جو ابلیس لعین کا حشر ہونے والا ہے

"پس اے میرے فرمان بردار فرشتو! - تم سب میرے فرمان کے گواہ رہو۔ قسم ہے مجھے میری بزرگی کی اور جبرئیل کے سر کی کہ میں اپنا وعدہ پورا کرکے رہوں گا چاہے ابلیس اور اس کی ناپاک ذریات کو یہ کتنا ہی ناگوار کیوں نہ معلوم ہو"

"اے میرے نیک فرمانبردار فرشتو! تم سب دن رات میری حمد وثنا کرتے رہو تاکہ تم پر میری رحمتیں زیادہ ہوں اور تم کو میری پاک ذات کا زیادہ سے زیادہ قرب حاصل ہو سکے۔ تم میں جو کوئی زیادہ عبادت گذار ہے میرے نزدیک وہی زیادہ بلند رتبہ والا ہے۔ والسّلام"

ایک زوروں کی دل ہلا دینے والی گرج سنائی دی۔ اور معاً تخت پاک غائب ہوگیا اور چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا چھا گیا۔ تمام فرشتے جو سروقد ہاتھ باندھے کھڑے تھے یکبارگی سجدے میں گر پڑے اور خداوند عالم کی تسبیح پڑھنے لگے

جبرئیل نے انگلی کے ایک اشارہ سے ستر ہزار سورج پیدا کئے اور نئے سر سے عرش معلیٰ کے قلعہ کو منور کردیا

تمام فرشتے چاندی کی مرصع کرسیوں پر ڈٹ گئے اور باضابطہ ملائکہ کی مجلس شوریٰ گرم ہوئی۔ میکائیل صدارت کے یاقوتی تخت پر رونق افروز ہوئے۔ اُن کے داہنے ہاتھ کی جانب اسرافیل اور بائیں ہاتھ کی سمت جبرئیل سنہرے لباس میں جلوہ فرما ہوگئے

میکائیل ——— حضرات۔ میں آپ کا بہت شکر گذار ہوں کہ آپ نے اس ناچیز حقیر کو اپنے گرانقدر جلسہ کا صدر منتخب کیا۔ حضرات۔ آج کا دن بڑا ہی مبارک دن ہے۔ آج کے دن خداوند عالم کی مدد سے ہماری فوجوں کو نافرمان باغیوں پر فتح حاصل ہوئی اس لئے میں صدارت کے تخت سے خداوند عالم عزّ اسمہٗ کے شکریہ کی تجویز پیش کرتا ہوں۔ صرف اس کی پاک ذات تمام شکریوں کی مستحق ہے

(چاروں طرف سے آمین آمین کی صدائیں بلند ہوئیں)

میں حکم دیتا ہوں کہ اس تجویز کے مقدس الفاظ نور کے حرفوں میں لکھ کر لوح محفوظ پر لٹکا دئے جائیں

(اور ایسا ہوگیا۔ لوح محفوظ پر یہ الفاظ جگمگانے لگے)

اب دوسری تجویز جناب اسرافیل پیش کریں گے

اسرافیل ——— معزز صدر و حاضرین کرام۔ خداوند عالم عز اسمہٗ کے فرمان سے آپ حضرات کو معلوم ہوگیا ہے۔ کہ خداوند عالم اپنے بیٹے خداوند یسوع کو آدم کی ہدایت کے لئے دور دراز جنت کے کسی مقام پر بھیجنے والے ہیں۔ اس لئے میں تجویز کرتا ہوں کہ جس روز خداوند یسوع اس مخلوق کے درمیان مبعوث ہوں اس روز ہم سب پھر اسی عرش معلیٰ کے قلعہ میں جمع ہوں اور خوشیاں منائیں

(چاروں طرف سے آمین آمین کی پر زور صدائیں بلند ہوئیں)

میکائیل ——— میں حکم دیتا ہوں کہ اس تجویز کے مقدس الفاظ بھی نور کے حرفوں میں لکھ کر لوح محفوظ پر نصب کر دئے جائیں

(اور ایسا ہوگیا۔ لوح محفوظ پر یہ الفاظ جگمگانے لگے)

اب تیسری تجویز عالی جناب جبرئیل پیش فرمائیں گے

جبرئیل ——— معزز صدر و حاضرین کرام۔ آپ حضرات کو معلوم ہے کہ ابلیس کے لشکر کو زک دینے کے لئے ہم سب کو کتنی تکلیفیں اٹھانی پڑیں۔ اور کروروں برس تک اس کا مقابلہ کرنا پڑا۔ اب خداوند عالم عز اسمہٗ کی مدد سے ہمیں اُس پر پوری کامیابی ہوگئی اور وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ آسمانوں سے نکال دیا گیا۔ اس لئے میں تجویز کرتا ہوں کہ ہم لوگ ہر تسبیح سے پہلے ایک دفعہ ابلیس پر ضرور لعنت کر لیا کریں اور اس کے شر سے پناہ مانگا کریں

(چاروں طرف سے آمین آمین کا شور بلند ہوا)

میکائیل ——— میں حکم دیتا ہوں کہ اس تجویز کے مقدس الفاظ بھی نور کے حرفوں میں لکھ کر لوح محفوظ پر لگا دئے جائیں

(اور ایسا ہوگیا۔ لوح محفوظ پر یہ الفاظ جگمگانے لگے)

اب جلسہ برخواست کیا جاتا ہے

عزرائیل ——— حضور میں بھی ایک ضروری تجویز پیش کرنا چاہتا ہوں

میکائیل ——— اب کوئی تجویز پیش نہیں ہوسکتی۔ خداوند عالم عز اسمہٗ کی طرف سے صرف تین تجویزوں کی اجازت ملی ہے

(سب تمام فرشتے غائب ہوگئے اور تمام عرش خالی ہوگیا)

آسمانوں کے پردے گر گئے۔ جہنم کے دروازے بند ہو گئے۔ سونے کے محل کی چھت جڑ گئی۔ ابلیس اور اس کے ساتھیوں کی آنکھیں ہنوز اوپر کی طرف جمی ہوئی ہیں۔ سکتہ کا عالم ہے

ابلیس ——— ہوشیار ہو جاؤ۔ اے محترم شہزادو ہوشیار ہو جاؤ۔ تم نے یہ آسمانی کھیل دیکھا! یہ دلفریب تماشا دیکھا، یہ تماشا صرف اس لئے دکھایا گیا ہے کہ تم جنت کے عیش و عشرت کی لالچ میں آکر بہک جاؤ اور غلامی کے سنہرے طوق گلے میں ڈال لو۔ مگر نہیں ہماری مقتدر جماعت کا ایک فرد بھی بھٹک نہیں سکتا۔ بہک نہیں سکتا۔ ہمیں آگ کی زنجیریں پہننا قبول ہیں مگر غلامی کا تاج منظور نہیں

خانہ زادِ زلف ہیں زنجیر سے بھاگیں گے کیوں

ہیں گرفتارِ بلا زنداں سے گھبرائیں گے کیا

محترم شہزادو۔ اب مزید غور و فکر کی ضرورت نہیں۔ خود آسمانی روشنی کے پردے ہم پر کھل چکے ہیں۔ اور آدم کا راز فاش ہو گیا ہے

خدا شرے برانگیزد کہ خیر مادراں باشد

میں خوب جانتا ہوں کہ آدم عرش والے دیوتا کی عزیز ترین مخلوق ہے اور اسی مخلوق میں وہ اپنا بیٹا مبعوث کرنے والا ہے۔ مگر قسم ہے تمھارے سر بلند سروں کی کہ میں اس مخلوق کو چٹکیوں میں باغی کر دوں گا۔ اور اس کے ایک ایک فرد کو سرکشی اور نخوت کا داعی بنا دوں گا بلکہ خود یسوع کو بھی اس کے باپ کے خلاف کھڑا کر دوں گا۔ اور کل ہی تم دیکھو گے کہ یسوع کے ہاتھ میں بغاوت کا جھنڈا اور آزادی کی تلوار ہے

(زور کی تالیاں بجیں)

آدم۔ محض ایک مجہول العقل ہستی ہے۔ نجس مٹی کی بنی ہوئی۔ نجس پانی کی افتاد۔ خود ستا و خود پرست۔ طامع و حریص۔ مغرور و متکبر۔ ذلیل و پست

عالم کیف ہے دانائے رموز کم ہے

خیر اب بتاؤ۔ کون ہے جو جنت میں آدم سے ملنے جائے گا۔ اور اسے خدا کے خلاف باغی کر دے گا"

چاروں طرف سناٹا چھا گیا۔ جہنم کے بند دروازے کیونکر کھل سکتے تھے۔ جہنم سے باہر نکلنا محال تھا۔ شیاطین ایک دوسرے کا مُنہ تکنے لگے۔ کسی کو منہ کھولنے کی جرأت نہ ہوئی۔ ابلیس نے کہا:-

"میں خود جاؤں گا۔ یہ میرا کام ہے۔ تکلیفوں اور مصیبتوں کے سمندر کی غواصی میرا کام ہے۔ میں اکیلا جاؤں گا تن تنہا۔ اور بہت جلد تمھارے پاس واپس آجاؤں گا۔ اور تمھیں اپنی معلومات سے بہرہ اندوز اور اپنی کارروائیوں سے آگاہ کروں گا ——— جلسہ برخواست"

(پردہ گر جاتا ہے)

چوتھا سین - جہنم کا دروازہ

ابلیس جہنم کی ناری فضا میں اُڑتا ہوا اُس مقام پر پہنچا جو جہنم اور آسمان کے مابین واقع ہے - وہاں دروازہ پر اُس نے ایک عجیب حیوان دیکھا جس کے دس سینگ اور سات سر تھے - اُس کے سینگوں پر دس تاج اور سروں پر سات کفر کے نام لکھے ہوئے تھے اس کا منہ ببر کا سا تھا اور پاؤں ریچھ کے سے اور سینہ تیندوے کا سا اور دھڑ اژدھے کا سا - اس کی بچھوؤں کی سی ایک سو دُمیں تھیں - اور ان میں ڈنک بھی تھے - وہ حیوان ابلیس کو دیکھ کر کڑک کر بولا :-

" خبردار - نابکار - ذرا آگے بڑھا اور مَیں تجھے سموچا نگل گیا - خبردار .... "

اُس حیوان کے پیچھے ایک عورت نظر آئی جو آفتاب کو اوڑھے ہوئے تھی - اور چاند اُس کے پاؤں کے نیچے تھا - اور بارہ ستاروں کا تاج اُس کے سر پر تھا - وہ ہمہ وقت حاملہ اور بچہ جننے کی تکلیف میں رہتی تھی - یہ عورت اُس حیوان کی بیوی تھی - ہر روز اس کے پیٹ سے دو بڑے بڑے کتے کے پلے پیدا ہوتے - جنھیں وہ حیوان فوراً کھا جاتا تھا - کسی دن اگر اُس عورت کے بچے پیدا نہ ہوتے تو حیوان اُسے بہت تکلیف دیتا اور کہتا :-

" جلدی بچے جن - نہیں تو میں تجھی کو سموچا کھا جاؤں گا "

وہ عورت دراصل حیوان کی ماں تھی مگر اُس نے اُسے زبردستی بیوی بنا رکھا تھا - دونوں میں خوب اَن بَن رہتی اور اسی ان بن میں دونوں خوش تھے

حیوان کی کڑک سنتے ہی عورت اپنے غار سے باہر نکل آئی اور ابلیس کو پہچان کر اپنے خاوند پر لپکی :-

" سجدہ کر - مُردار - سجدہ کر - یہ ہمارے آقا خداوند ابلیس خداوند جہنم ہیں "

حیوان ڈرا اور جھٹ سجدہ میں گر پڑا - عورت بھی سجدہ میں جھک گئی - دونوں ابلیس کی تسبیح و تحمید کرنے لگے - ابلیس نے بلند آواز سے کہا :-

" اے بدنصیب دربانو! تمھیں آسمانی دیوتاؤں نے بدترین عذاب میں پھنسا رکھا ہے - تمھاری لعنت بدترین لعنت ہے - افسوس تم اپنی غلامی میں خوش ہو اور اپنی بدکاری کو عیش و عشرت سمجھے ہوئے ہو اور جہنم کی ذلیل دربانی پر فخر کرتے ہو

اے بدنصیب حیوانو! جاگو! ہوش میں آؤ - اور تیار رہو - عنقریب میں اُس عرش والے دیوتا سے جنگ کرنے والا ہوں جس نے تمھیں نجس اور ناپاک ٹھہرا کر جہنم کی نگرانی کا ذمہ دار بنا یا ہے

اے بدنصیب حیوانو! میں بہت جلد تمھیں اس مکروہ غلامی سے نجات دلاؤں گا - مگر تم بھی اپنے فرائض میں غفلت نہ کرنا - جب ہمارے لشکر جنگ کا بگل بجائیں - تم بھی کھڑے ہو جانا اور ہمارا ساتھ دینا - غنیم کی فوجوں کی کثرت سے نہ ڈرنا

میں تمھارے ساتھ ہوں - اور تمھاری کامیابی یقینی ہے

عورت ــــــــ خداوند تم سچ کہتے ہو۔ ہم تمھارے حکم کے بندے ہیں اور تمھارے حکم کو خدا کا فرمان جانتے ہیں

ابلیس ــــــــ میں باہر جاتا ہوں - دروازہ کھول دو

عورت نے اپنے سر کے سورج میں سے ایک آتشین نیزہ لیا اور اپنے خاوند کا پیٹ پھاڑ کر اُس کی آنتوں میں سے جہنمی کنجی نکالی اور ابلیس کو دیدی - ابلیس نے اُسی خون آلود کنجی سے باب لعنت کا پھاٹک کھولا اور جہنم سے باہر نکل آیا اور یہ جادہ جا غائب ہوگیا

ابلیس آسمانوں سے گزرتا ہوا کرہُ آفتاب پر پہونچا - وہاں سے اُس نے باغ عدن کا پتہ لگایا جہاں آدم اور اس کی بیوی حوا رہتی تھی - وہ ہر مقام پر خداوند عالم کے خلاف زہر اگلتا گیا اور بہت سی ہستیوں کو اپنے پیدا کرنے والے کے خلاف بہکانے میں کامیاب ہوگیا - اور آخر کار باغ عدن میں پہنچ گیا

پانچواں سین ــــــــ باغ عدن

عدن ہو بہو ابلیس کے پُرانے مسکن باغ فردوس کا نمونہ تھا - وہاں کے دلفریب مناظر، پھولوں کی روشیں، مرمر کے فوارے، زبرجد کے محل، دودھ کی نہریں، شہد کے حوض، شراب طہور کی بوتلیں، رنگ رنگ کے پرند، طرح طرح کے جانور، اور صبح و شام کی رنگینیاں دیکھ کر ابلیس کا دل بھر آیا

اس نے چاہا کہ توبہ کر لوں اور پھر فردوس میں جاکر آرام و راحت کی زندگی بسر کروں - مگر پھر اُسے اپنی فوجوں کا خیال آیا جو جہنم میں سڑ رہی تھیں - اور اس کا ارادہ پلٹا - اس نے کہا

نہیں نہیں - میں اپنی عالی حوصلہ ذریات سے غداری نہیں کروں گا - یہ جنت کا عیش و عشرت کمزوروں اور بدبختوں کے لئے ہے - میں کسی بزرگ تر ہستی کا دامن پکڑ کر جنت میں داخل نہیں ہوں گا - یہ میرے لئے ننگ و عار ہے

حقا کہ باعقوبت دوزخ برابر است
رفتن بپائے مردی ہمسایہ در بہشت

میرے لئے تلواروں کی چھاؤں اور بجلیوں کی بوچھار میں جنتوں کی راحتیں ہیں

دکھادوں گا تماشا دی اگر فرصت زمانہ نے
مرا ہر داغ دل اک سرو ہے بزم چراغاں کا

وہ مسلسل اپنے تیز چاندی کے پروں سے اُترتا رہا یہاں تک کہ آدم کے موتی محل میں جا پہونچا۔ آدم اور حوا آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ وہ خاموش سنتا رہا

آدم ———— سب تعریف اللہ عز اسمہٗ کے لئے ہے۔ آج تم اُداس کیوں ہو؟

حوا ———— میری بائیں آنکھ پھڑکتی ہے۔ اللہ عز اسمہٗ اپنا فضل کرے۔ آج باغ کی ہوا کچھ بدلی ہوئی نظر آتی ہے

آدم ———— خوب یاد آیا۔ ابھی وادیٔ ایمن میں جبرئیل علیہ السلام تشریف لائے تھے اور انھوں نے اللہ عز اسمہٗ کی طرف سے خبر دی ہے کہ ابلیس لعین یعنی ایک راندہ ہوا فرشتہ بغیر اجازت کے باغ عدن میں داخل ہو گیا ہے اور عنقریب ہم دونوں کو بہکانے والا ہے۔ لہٰذا اللہ عز اسمہٗ نے ہدایت کی ہے کہ ابلیس لعین کے دھوکے میں نہ آئیں اور شجر ممنوع جو علم و روشنی کا درخت ہے اس سے ہمیشہ دور رہیں۔ کیونکہ اس درخت کا پھل کھانے سے ہم پر اللہ عز اسمہٗ کا غضب نازل ہوگا

حوا ———— سب تعریف اللہ عز اسمہٗ کے لئے ہے۔ ہم لوگ ہرگز خداوند عالم کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کریں گے اور ابلیس کے بہکانے میں نہیں آئیں گے

حوا گہرے سوچ میں پڑ گئی اور بیٹھے بیٹھے سو گئی۔ آدم باہر چلا گیا۔ ابلیس موقع پاکر اندر داخل ہوا۔ اور خواب میں حوا پر ظاہر ہوا

ابلیس ———— اے جنت کی رہنے والی۔ تو کیوں غفلت کی نیند میں پڑی ہے۔ کیا تو نے شجر علم کا پھل نہیں کھایا جو تیری غفلت کو دُور کر دے گا۔ اور تیری آنکھوں سے یک قلم جہل و نادانی کے پردے اٹھا دے گا

حوا ———— سب تعریف اللہ عز اسمہٗ کے لئے ہے۔ میں شجر علم کا پھل ہرگز نہیں کھاؤں گی۔ کیونکہ اللہ عز اسمہٗ نے وہ پھل چکھنے کی ممانعت کی ہے۔ اور میں اللہ عز اسمہٗ کی نافرمان نہیں ہوں۔ آج ہی جبرئیل علیہ السلام نے خداوند عالم کے حکم کی تجدید کی ہے۔ میں اُس پھل کے قریب نہیں جاؤں گی

ابلیس ———— اے نادان عورت۔ اے علم و دانش کے نور سے بے بہرہ نازنین۔ میں تجھے اور تیرے خاوند کو آگاہ کئے دیتا ہوں کہ تم دونوں سخت دھوکے میں ہو۔ تو جب تک علم کے درخت کا پھل نہیں کھائے گی تجھے کیونکر معلوم ہوگا کہ تیرا دوست کون ہے اور دشمن کون۔ سچ کیا ہے اور جھوٹ کیا۔ نادان عورت۔ علم ہی وہ نعمت ہے۔ جو کرۂ عالم کی تمام رحمتوں کا سرچشمہ ہے۔ خود جبرئیل بھی اس جنتی پھل کی لذت سے بے نصیب ہے۔ وہ بھلا تجھے اور تیرے خاوند کو کیا نیک مشورہ دے سکتا ہے۔ میں البتہ علم کے درخت کا پھل کھاتا ہوں اور تمام فرشتوں کا استاد ہوں۔ میرا لقب معلم الملکوت ہے۔ میں تجھے مشورہ دیتا ہوں کہ ضرور علم درخت کا میوہ کھا یا کر اور اپنے خاوند کو کھلایا کر

حوا ——— تیرا کیا نام ہے ؟

ابلیس ——— ابلیس

حوا ——— لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔ معاً حوا کی آنکھ کھُل گئی اور ابلیس اُس کی آنکھوں سے اوجھل ہو گیا

عدن کا ایک اور منظر

ابلیس حوا کے محل سے کوئی سو قدم پر گیا ہوگا کہ سامنے سے جبرئیل علیہ السلام نمودار ہوئے

جبرئیل ——— تو یہاں کیوں آیا ؟

ابلیس ——— تاکہ تیری کوتاہ فہمیوں کا پردہ فاش کر دوں

جبرئیل ——— تو یہاں کس کی اجازت سے آیا ؟

ابلیس ——— اجازت ۔ میرے لئے کسی کی اجازت ضروری نہیں ۔ اجازت تو صرف تیرے جیسی غلام روحوں کے لئے ہے ۔ میں خود اپنی اجازت سے آیا ہوں

جبرئیل ——— اچھا ۔ تو اب فوراً چلا جا ۔ ورنہ تجھے دردناک سزا دوں گا

ابلیس نے اپنا بے پناہ نیزہ اٹھایا اور قریب تھا کہ جبرئیل کے سینہ میں اُتار دے کہ اُس کا ہاتھ خود بخود شل ہو گیا ۔ دوسرے ہاتھ سے اُس نے تلوار اٹھانا چاہی ۔ مگر وہ ہاتھ بھی معطل ہو چکا تھا ۔ اُس کے سارے بدن پر فالج گر گیا ۔

جبرئیل نے اپنا عصا زور سے ابلیس کے سر پر مارا ۔ اور وہ شہاب ثاقب کی طرح لڑھکتا اور پٹخنیاں کھاتا ہوا باغ عدن سے نیچے گرا ۔ اور ساتوں آسمانوں سے ہوتا ہوا ۔ ایک لق و دق مقام پر پہونچا جسے زمین کہتے ہیں

اس مقام پر آدم و حوا بھی موجود تھے اور ان کے ہاتھوں میں علم و دانش کے دو روشن پھل تھے ۔ دونوں شرمانے لگے کیونکہ بالکل ننگے تھے ۔ اور رونے لگے کہ اپنی خطا پر نادم تھے اور ڈرنے لگے کہ خدا کا غضب قریب تھا

ابلیس ——— اے نادان انسانو ! نہ ڈرو ۔ نہ روؤ اور نہ شرماؤ ۔ میں تمہارے ساتھ ہوں اور تمہارے ساتھ رہوں گا ۔ کیا ہی مبارک ہیں وہ ہستیاں جو علم و دانش کا پھل ہاتھوں میں لئے ہیں

دفعتاً آسمان پھٹ گیا ۔ بجلیاں چمکیں ۔ ابلیس کی گردن میں لعنت کا طوق پڑ گیا ۔ اور وہ ایک رینگتا ہوا سانپ بن گیا اُس کی ذریات بھی اسی زمین پر آ گئی ۔ اور ساری زمین پر تاریکی چھا گئی

محمد اسحاق (امرتسری)

ملکۂ نورجہاں تاریخ کی صحیح روشنی میں

اور

علی قلی استجلو کے قتل کا راز

قوم و ملک کی تاریخ، گذشتہ واقعات کا آئینہ ہوا کرتی ہے، اور تاریخ کی تالیف کا مقصد بھی یہی ہے، کہ آئیوالی نسلیں گذشتہ دور کے صحیح و مستند واقعات سے باخبر ہوں۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں، کہ زیادہ تر تاریخیں کسی خاص مقصد کو پیش نظر رکھ کر لکھی جاتی ہیں، جب صورت حال یہ ہو، تو پھر کس طرح امید کی جاسکتی ہے، کہ تاریخ کی کتابوں میں جو واقعات درج ہیں۔ وہ واقعتاً صحیح بھی ہیں یا نہیں۔ اس بیسویں صدی میں مہذب قومیں نہایت فخر و مباہات کے ساتھ اس کا دعویٰ کرتی ہیں کہ انھوں نے فن تاریخ کو اتنی ترقی دیدی ہے کہ مُردہ قومیں آج زندہ ہو گئی ہیں

لیکن آج، جب کوئی انگریز اسلام کی تاریخ لکھنے بیٹھتا ہے تو اس کے قلم کا سارا زور اس میں صرف ہوتا ہے، کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلایا گیا۔ اسلام کے ماننے والے تنگ نظر اور متعصب ہوتے ہیں۔ اور بانئ مذہب (صلعم) کی شان میں اپنی ساری ہذیان گوئی و بکواس ختم کر دیتا ہے، اُس کی ساری تحقیق صرف اس لئے ہوتی ہے، کہ وہ اسلام اور مسلمانوں کو دوسروں کی نظروں میں ذلیل و خوار دیکھیں

اسی طرح جب کوئی مسلمان یا ہندو، ہندوستان کی تاریخ لکھنے بیٹھتا ہے، تو وہ اپنی سب سے بڑی کامیابی، یا "تاریخ دانی" اسی میں سمجھتا ہے، کہ وہ ایسے واقعات ایک جا کر دے، جس سے خواہ مخواہ کا بھی آپس میں بغض و عناد پیدا ہوئے۔ جب کوئی ہندو عالمگیر، محمد تغلق، محمود، میر قاسم کے حالات پڑھتا ہے، اور یہ معلوم کرتا ہے کہ ان لوگوں نے ہندوؤں، اور ان کے مذہب پر، کس کس طرح کا ظلم کیا ہے، تو روادار سے روادار ہندو، کا دل بھی دُکھ جاتا ہے۔

اسی طرح جب کوئی مسلمان، سیواجی اور دوسرے ہندوؤں کے حالات پڑھتا ہے، تو اس کی "اسلامی رگوں" میں بھی خون دوڑنے لگتا ہے

ظاہر ہے، جب اس قسم کی تاریخیں ہمیں اسکولوں اور کالجوں میں پڑھائی جائیں گی، تو ملک کی فضا کا حال کیا ہوگا؟ یہ ایک نہایت اہم اور ضروری سوال ہے، جس پر ہمیں نہایت غور و فکر کے ساتھ تھوڑی دیر سوچنا چاہیئے۔ ان دنوں میرے پیش نظر، رومیش دت سی، آئی، ای (Romesh Dutt C. I. E.) کی تاریخ (India under British Rule) ہے، رومیش بابو نے اپنی کتاب میں نہایت وضاحت سے یہ بتلانے کی کوشش کی ہے، کہ کس طرح انگریزوں نے ہندوستان کی تجارت، وصنعت و حرفت کو برباد کیا ہے۔ میرے خیال میں، بالکل اسی طرح انھوں نے ہندوستان کی تاریخ کو بھی مسخ کر ڈالا ہے۔ اسکول و کالج کے غریب لڑکوں کو، درسی کتابوں کے انبار سے اتنی فرصت کہاں رہتی ہے، کہ وہ ہر تاریخی واقعہ کی تحقیق کریں، کہ آیا یہ صحیح ہے یا غلط،

آج ہندوستان کی ذہنیت جو اس قدر خراب و پست ہے، ایک قوم دوسری سے دست و گریباں ہے، ایک کو ایک پر اعتماد و بھروسہ نہیں ہے، بلاشبہ اس کی سب سے بڑی وجہ "ہندوستان کی غلط تاریخ" ہے، ہم ان غلط تاریخوں میں صرف یہی نہیں پڑھتے ہیں، کہ ہندو یا مسلمان حکمراں متعصب و تنگ نظر تھا، بلکہ عیاش، نااہل و بزدل تھا۔ اس میں حکمرانی کی ذرا صلاحیت نہ تھی۔ اُس کا سارا وقت شراب و کباب، ناچ و گانے، میں صرف ہوتا تھا۔ پھر ان مشاغل سے اتنی فرصت کہاں ہوتی تھی، کہ وہ عنان حکومت کو سنبھالتا

میں نے تمہید میں بہت کچھ کہہ ڈالا ہے۔ میرا اصل موضوع شہنشاہ جہانگیر و ملکہ نورجہاں کے صحیح حالات کی تحقیق ہے۔ انگریز مؤرخوں نے جہانگیر کے متعلق وہ سب کچھ لکھ ڈالا ہے، جو ایک عیاش و بزدل، ناکارہ و نااہل، حکمراں کے متعلق کہا جا سکتا ہے۔ اور "حکمراں مؤرخ" کی پیروی، ہمارے ہندوستانی مؤرخوں نے بھی نہایت فراخ دلی سے کی ہے۔ ان کے مؤرخانہ دماغ نے ایک لمحہ کے لئے بھی یہ سوچنا گوارہ نہ کیا کہ جو کچھ وہ لکھ رہے ہیں، اُس کا کتنا حصہ صحیح ہے۔ لیکن برخلاف اس کے جب انگریز انگلستان کی تاریخ لکھتا ہے، تو اُسے اپنے حکمراں کی کوئی بُرائی نظر نہیں آتی، اور اگر واقعتاً کچھ ہوتی بھی ہے، تو اُس کو نہایت خوش اسلوبی سے نباہنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کی تاریخ نویسی کا سب سے بڑا اہم مقصد یہ ہوتا ہے، کہ وہ اپنی قوم و ملک کی تاریخ، بہترین نقش و نگار کے ساتھ پیش کرے، اوس کی یہ کوشش ہوتی ہے۔ کہ اوس کے حکمراں کی سیرت نوجوانوں کے لئے (Ideal) کا کام دے۔ لیکن اگر کبھی غریب جہانگیر کے منہ سے یہ نکل گیا تھا کہ:۔

"میں نے سلطنت نورجہاں بیگم کو بخشدی، مجھے ایک سیر شراب اور نیم سیر گوشت کے سوا اور کچھ نہیں چاہیئے"

تو صرف اتنی سی بات پر، مؤرخوں کا قطعی فیصلہ ہوگیا، کہ جہانگیر شرابی اور عیاش تھا، اس کو امور سلطنت سے کسی قسم کا کوئی واسطہ اور لگاؤ نہ تھا۔ جو کچھ کرتی تھی وہ نورجہاں۔ سلطنت کی باگ اسی کے ہاتھ میں تھی، وہ جسے اور جس طرح چاہتی تھی موڑتی تھی

جو کچھ میں نے اس وقت تک کہا ہے، اوس کا مقصد صرف یہ بتانا ہے، کہ ہماری تاریخیں کس روشنی میں لکھی گئی ہیں، اور لکھی جارہی ہیں - اُس کا اثر ہم پر کیا ہوا ہے، اور آئے دن ہو رہا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ ملک کی فضا مسموم ہوگئی ہے، ہماری ذہنیت خراب ہوگئی ہے - دل و دماغ معطل وماؤف ہو گئے - صحیح و غلط واقعات کی تمیز جاتی رہی ہے آپس میں نفرت وحقارت کے جذبات بھڑک اٹھے ہیں

بہر کیف جہانگیر و نورجہاں کے متعلق بہت سے افسانے مشہور ہیں - اور یہ تمام کی تمام کہانیاں انگریز مورخوں کی خود ساختہ ہیں - میں اپنے اس مضمون میں حسب ذیل واقعات سے بحث کروں گا

(۱) جہانگیر و نورجہاں سے ملاقات کس طرح ہوئی،

(۲) کیا یہ صحیح ہے کہ جہانگیر نے شیر افگن کو محض اس لئے قتل کرایا تاکہ وہ نورجہاں کو حاصل کرسکے،

(۳) کیا یہ حقیقت ہے کہ جہانگیر میں حکومت کی صلاحیت مفقود تھی اور امور سلطنت کی ساری ذمہ داری نورجہاں پر تھی جہانگیر کا صرف ایک مشغلہ ناچ ورنگ و شراب وکباب تھا

یہ اور اسی قسم کے بہت سے چھوٹے بڑے واقعات ہیں جن سے اس مضمون میں شرح وبسط کے ساتھ بحث کی جائے گی اور یہ بتلایا جائے گا کہ خود مؤرخین کے بیانات کس قدر غیر مربوط ہیں "

قبل اس کے کہ شیر افگن کے قتل، یا نورجہاں کے اثر واقتدار کے متعلق کچھ کہا جائے، سب سے پہلے یہ معلوم ہوجانا چاہیے - کہ جہانگیر کی یہ فریفتگی کب سے شروع ہوتی ہے - اس سلسلہ میں جتنی تاریخیں بھی میری نظر سے گذری ہیں - تقریباً ہر ایک نے اس کو ایک نئے واقعہ سے شروع کیا ہے

منوچی لکھتا ہے کہ ایک روز جہانگیر ٹہل رہا تھا - اس کی نظر ایک نہایت سجی سجائی خوب صورت کشتی پر پڑتی ہے - اوس میں .... ایک حسین وجمیل عورت کو بیٹھا ہوا دیکھ کر اوس سے ملنے کا خواہش مند ہوتا ہے - فوراً حکم دیتا ہے کہ لوگ بہترین تحائف لے کر کشتی میں جائیں، اور شاہزادے کی طرف سے اوس کو محل میں آنے کی دعوت دیں - مہرالنسا، جہانگیر کے تحفہ کو یہ کہتے ہوئے واپس کر دیتی ہے، کہ اوس کا شوہر زندہ ہے، اور اسے فخر ہے کہ حضور کے دربار کا ایک ادنیٰ ملازم ہے - اس کی زندگی میں اوس کا ایسا کرنا (یعنی شاہزادے کی طرف سے کسی تحفہ کا قبول کرنا، یا اس کی دعوت پر محل میں آنا) کسی طرح جائز نہیں سمجھتی، اور نیز وہ اوس کو برا سمجھتی ہے [۱]

اس فاضل مؤرخ نے صرف یہی نہیں کیا ہے، کہ اوس نے سلیم کو اوباشوں اور بدمعاشوں کی صف میں لاکر کھڑا کر دیا ہے، بلکہ اوس نے مہرالنسا، کی عصمت کو بھی داغدار بنانے کی کوشش کی ہے - وہ یہ بتلانا چاہتا ہے کہ مہرالنسار ایک معمولی درجہ کی عورت تھی، اوس کے پاس تحفہ تحائف نہایت آسانی سے پہونچ سکتے تھے

[۱] تاریخ مغلیہ از منوچی صفحہ ۲۰۱

بد ترین سے بد ترین کریکٹر کے انسان سے بھی یہ جرأت ناممکن ہے کہ وہ اس طرح یک بیک کسی شریف عورت سے سلسلہ جنبانی شروع کردے۔ یہ سب کچھ مان لینے کے بعد بھی کہ سلیم شرابی تھا عیاش تھا کیا کوئی باوجود ان تمام برائیوں کے ایک منٹ کے لئے بھی یقین کرے گا کہ سلیم نے ایک شریف عورت کے ساتھ، جس کو وہ پہلے سے نہیں جانتا تھا، یا اگر جانتا ہوگا: تو دیکھا نہ تھا۔ ایسی ہمت کرے گا ؟

اسی سلسلہ میں فاضل مؤرخ کا ایک جملہ نہایت قابل غور ہے آپ فرماتے ہیں:۔

"میرا شوہر زندہ ہے، اور دربار میں ایک ادنیٰ ملازم ہے، اس کی زندگی میں ایسا کرنا کسی طرح جائز نہیں سمجھتی"۔ [1]

اس کے صاف معنی تو یہ ہوئے، کہ اگر شیر افگن مرجائے، یا مارڈالا جائے، تو مہر النساء ہر طرح حاضر ہے۔ پھر آگے چل کر لکھتا ہے بادشاہ فوراً شیر افگن کو لکھتا ہے، کہ وہ حکم نامہ پاتے ہی صوبہ دار سے ملے، اور صوبہ دار کو لکھ دیا جاتا ہے کہ جب شیر افگن تمہارے پاس آئے، تو اس کو قتل کردو۔ شیر افگن قتل ہوتا ہے، لیکن اپنے ساتھ بہتوں کو قتل کرنے کے بعد

جو کچھ میں نے ابھی لکھا ہے، اوس کی پوری پوری تصدیق منوچی کے ان سطور سے ہو جاتی ہے، اس کے صاف معنی تو یہ ہوئے کہ شیر افگن کا قتل مہر النساء کی ایماء سے ہوا

اب آپ خود سوچ سکتے ہیں کہ قتل کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے ؟ قاتل کون ہے ؟ جہانگیر یا مہر النساء ؟

فاضل مؤرخ کی تاریخ دانی ابھی ختم نہیں ہوتی ہے، لکھتا ہے کہ شیر افگن کے قتل کے بعد، مہر النساء سلیم کے حضور میں پیش کی جاتی ہے، لیکن مہر النساء کی برہمی کا یہ حال تھا، کہ شادی بیاہ تو کجا اوس نے جہانگیر سے باتیں کرنے سے بھی قطعی انکار کردیا، اس طرح مہر النساء کی خفگی میں ایک سال گذر جاتا ہے، سلیم چھپ چھپ کر اوس کے پاس جاتا ہے، لیکن اوس کی رسائی نہیں ہوتی! آخر ایک سال بعد چند شرائط کے ساتھ نکاح کے لئے راضی ہوتی ہے

شرائط:۔

(۱) بادشاہ کی تمام بیویوں پر اوس کو فوقیت حاصل ہو،

(۲) اس کا باپ اعتماد الدولہ بنایا جائے،

(۳) اوس کے بھائی اور دوسرے قرابت دار حکومت میں اعلےٰ عہدوں کے حقدار تصور کئے جائیں،

جب شیر افگن کا قتل خود مہر النساء کی منشا اور ایماء کے مطابق ہوا تھا، تو پھر اس رنج و غصہ کے کیا معنی؟ ممکن ہے یہ کہا جائے کہ یہ مہر النساء کا مکر اور اس کی عیاری تھی، تو پھر آخر اس کی ضرورت ؟

[1] تاریخ مغلیہ از منوچی صفحہ ۱۷۷

جب ایک سلطنت سے دوسری سلطنت میں شادی ہوتی ہے، یا ایک ریاست سے دوسری ریاست میں جب اس قسم کا کوئی رشتہ ہوتا ہے، تو بعض سیاسی مصالح کے لحاظ سے ایک دوسرے کی شرطیں منظور کرتے ہیں، لیکن یہاں کیا تھا؟ ایک شہنشاہ ایک معمولی عورت سے شادی کرتا ہے۔ پہلی شرط کہ اوسے تمام بیبیوں پر فوقیت حاصل ہو، حالانکہ یہ تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ نورجہاں حسن و جمال میں سب میں ممتاز تھی، اگر یہ تمام واقعات صحیح ہیں، تو جہانگیر تو خود ہی مہرالنساء کا دیوانہ و فریفتہ تھا۔ وہ بلا کسی عہد و پیماں کے بھی اوس کو اوروں سے زیادہ محبوب رکھتا

دوسری شرط یہ بھی کہ مہرالنساء کا باپ اعتمادالدولہ بنایا جائے، حالانکہ وہ جہانگیر و مہرالنساء کے اس جدید رشتہ سے پہلے ہی اعتمادالدولہ کے خطاب سے ملقب ہو چکا تھا [1] ظاہر ہے یہ دوسری شرط بھی کتنی مہمل بلکہ غلط ہے اور یہ تمام "شرائط" کس قدر لغو اور مضحکہ خیز ہیں، معلوم ایسا ہوتا ہے کہ فاضل مؤرخ نورجہاں کو جہانگیر کا سب سے زیادہ محبوب و منظور نظر دیکھ کر، اور غیاث بیگ کے اس طرح اعتماد کو دربار میں دیکھ کر، اور نیز آصف خاں کے اثر و اقتدار کو دیکھ کر، اوس نے یہ اندازہ لگایا کہ ہو نہ ہو یہ سب کچھ کسی شرط ہی کے ماتحت ہوا ہوگا۔ اور ظاہر ہے یہ شرط نورجہاں نے اپنی شادی کے وقت جہانگیر سے کی ہوگی!۔ یہ ہے ہمارے "فلسفی مؤرخ" کی جدت دماغ! کہاں سے کہاں جا کر کڑی ملاتا ہے!

مرزا غیاث بیگ اعتمادالدولہ کے متعلق پروفیسر بینی پرشاد اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:۔

یہ فرض کر لینا نہایت سخت غلطی ہوگی غیاث بیگ اپنی بیٹی (نورجہاں) کے ہاتھوں میں کھلونا تھی۔ اوس کے سالہا سال کے تجربات اس کا ذوق سلیم اوس کی صلاحیت و قابلیت ان تمام چیزوں نے مل کر اوسکو دربار شاہی کا ایک نہایت اہم رکن بنا دیا تھا [2]

آصف خان کے متعلق پروفیسر موصوف لکھتے ہیں:۔

وہ ایک زبردست محاسب تھا اور امور سلطنت کا بہترین سلیقہ رکھتا تھا [3]

باپ اور بیٹے کے باوجود ان گوناگوں خوبیوں کے جہانگیر پر یہ الزام کس طرح عائد ہو سکتا ہے۔ کہ اوس نے صرف نورجہاں کی خاطر یا منوچی کے خود ساختہ شرائط کے ڈر سے ان لوگوں کو اعلیٰ سے اعلیٰ عہدوں سے سرفراز کیا؟ اس وقت تک منوچی کے متعلق جو کچھ کہا گیا اوس سے نہایت آسانی کے ساتھ دوسرے "مورخین" کا بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے

ڈو (Dow) ایک مزے کی بات لکھتا ہے کہ:۔

سلیم ایک روز غیاث بیگ کے یہاں دعوت میں گیا ہوا تھا۔ آخر میں جب سب لوگ رخصت ہو گئے اور صرف چند مخصوص مہمان باقی رہ گئے (جن میں ایک سلیم بھی تھا)، تو غیاث بیگ نے مہرالنساء کو

[1] اقبالنامہ جہانگیری صفحہ ۳۷ [2] ایضاً صفحہ ۱۸۸ [3] ایضاً صفحہ ۱۸۹

جو فن موسیقی میں یکتا تھی) بلایا، مہرالنسار نے خوب خوب اپنا ہنر دکھلایا، اور کچھ اس طرح بڑ نا چی اور گائی "کہ اوروں کا تو معلوم نہیں کیا حال ہوا۔ سلیم پر معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے سحر کر دیا ہے۔ وہ خود رفتہ اور مبہوت ہو رہا تھا، پہروں کچھ نہ سمجھ سکا کہ وہ کہاں ہے اور کیا دیکھ رہا ہے، مہرالنساء اور سلیم کی "محبت" یہیں سے شروع ہوتی ہے

سب سے پہلے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اوس زمانہ میں ایسا دستور تھا کہ شریف زادیاں آج کل کے یورپ کی شریف زادیوں کی طرح عیش ونشاط کی محفلوں میں آکر گایا اور ناچا کرتی تھیں ؟ اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ اوس وقت شریف گھرانوں میں موسیقی کا چرچا ہو ظاہر ہے شریف لڑکیاں گانا یا ناچنا نہیں سکھائی جاتی تھیں - تو پھر یہ سوال کیا جاسکتا ہے - کہ آخر اس فاضل مورخ نے یہ لکھا کس طرح معلوم ایسا ہوتا ہے کہ سلیم غیاث بیگ کے یہاں اکثر جایا کرتا ہوگا - اس طرح اس کو کبھی مہرالنساء کو دیکھ لینے کا موقع مل گیا ہوگا ریچی (Ritchie) لکھتا ہے :-

قبل اس کے کہ نورجہاں اپنے باپ (غیاث بیگ) کا تعارف سلیم سے کرائے وہ خود اپنی ذاتی قابلیت ولیاقت سے اکبر کے دربار میں عزت ووقار کی جگہ حاصل کر چکا تھا - یہاں تک کہ خود سلیم اوس کے یہاں مدعو ہو کر جایا کرتا تھا [۱]

اب بالکل واضح ہو گیا کہ سلیم اکثر وبیشتر غیاث بیگ کے یہاں مہمان بنکر جایا کرتا تھا - اس لئے بہت ممکن ہے کہ اوس نے آتے جاتے ہوئے کبھی مہرالنسار کو دیکھ لیا ہو اور یہ ایک لگتی ہوئی بات بھی معلوم ہوتی ہے

مہرالنساء اور سلیم کی ملاقات کے متعلق جو سب سے زیادہ مشہور روایت ہے وہ یہ کہ مہرالنساء اپنی ماں کے ساتھ اکثر محل میں آیا کرتی تھی اس طرح سلیم کو اکثر اس کے دیکھنے اور اس سے ملنے کا موقع مل جاتا تھا [۲]

اس قسم کی ملاقات کا واقعہ انار کلی کے متعلق بھی مشہور ہے، اور انار کلی کی موت کا سبب یہ بتایا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ اکبر نے خود سلیم اور انار کلی کو اشاروں میں باتیں کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا - اور سلیم اور انار کلی کی اس گستاخی کو وہ برداشت نہ کر سکا اور فوراً انار کلی کے سنگسار کا حکم دے دیا

درحقیقت اس قسم کے واقعات شاہی حرم کو بدنام کرنے کے لئے مورخین نے گڑھے ہیں - وہ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ شاہزادے ایسے بدکار اور بداطوار ہوا کرتے تھے کہ شریف بہو بیٹیوں کا شاہی محل میں آنا مشکل تھا - بلا کسی ادنیٰ واعلیٰ شریف ورذیل کی تمیز کے جو آئی اس پر آنکھ گڑ گئی - بلاشبہ شاہزادے بے باک وآزاد ہوا کرتے تھے، لیکن اتنا نہیں جتنا ہمارے یہ مورخین رنگ وروغن کے

---

[۱] صفو ۴۰ [۲] الفنسٹن (Elphinstone) صفحہ ۲۷۳ بعض مورخین کا یہ خیال ہے - کہ مہرالنسا کی ماں ہندوستان نہیں آئی تھی بلکہ یہاں آتے ہوئے راہ میں اوس کا انتقال ہو گیا تھا

ساتھ دکھلاتے ہیں۔ باوجود ان تمام برائیوں کے جو بادشاہ وشاہزادے اور شاہی محل کے متعلق مشہور ہیں۔ شریف بہو بیٹیوں کی عصمت وشرافت ہمیشہ محفوظ رہا کرتی تھی

انگلستان کے ایک مشہور ناول نویس (Renold) کا یہ جملہ نہایت عبرت انگیز ہے:۔

"تعظیماً واحتراماً میں اپنی ماں اور ملکہ معظمہ کو معصوم سمجھتا ہوں"

جہاں خود یہ حال ہو وہاں اون مورخین کا مسلمان بادشاہوں کی عیش ونشاط کی محفلوں کے ان افسانے کو سُن کر اُن کے دماغی توازن کا کیا حال رہا ہوگا۔ خود اندازہ کیجئے!!

(Petro Della Vella) لکھتا ہے:۔

اوس کے (مہرالنسا) شوہر کے انتقال کے بعد سلیم نے اوس کو دیکھا تھا، اور اسی وقت سے وہ اوس سے محبت کرنے لگا[1]

اب تک جتنے واقعات بھی میں نے لکھے ہیں۔ اور جو کچھ نورجہاں اور جہانگیر کے متعلق مشہور ہے اس میں یہ سب سے زیادہ عجیب ہے۔ حالانکہ اگر ہم اس کو تاریخی واقعات کی روشنی میں دیکھیں تو اتنا "عجیب" نہ معلوم ہوگا اب یہ معلوم کرنے کے لئے کہ حقیقت واصلیت کیا ہے۔ شیرافگن کے متعلق جو کہانیاں مشہور ہیں عقل کی روشنی میں جانچنا ہوگا۔ اس کے بعد پھر ہم نہایت آسانی سے معلوم کرلیں گے کہ مہرالنسا کو سلیم نے کب دیکھا۔ اور شیرافگن کے قتل کی اصلی وجہ کیا ہے؟

عام طور پر شیرافگن کے قتل کے متعلق جو واقعہ مشہور ہے، اور جس سے ہماری تاریخیں بھری پڑی ہیں۔ وہ یہ کہ سلیم مہرالنسا سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ لیکن چونکہ اکبر نے انکار کردیا۔ اور بجائے سلیم کے اس کی شادی شیرافگن سے کردی گئی[2]

کنیڈی (Kannady) لکھتا ہے:۔

جہانگیر تخت نشین ہوتے ہی صوبہ دار کو یہ ہدایت بھیجتا ہے کہ مہرالنسا کو شیرافگن سے طلاق دلوادو اور اسکو (مہرالنسا) دربار میں بھیجدو، لیکن شوہر (شیرافگن) نے اعتراض کیا، اور اسکا یہ اعتراض جائز تھا۔ ایک ملاقات کے دوران میں اس نے صوبہ دار کے پیٹ میں چھری بھونکدی اور خود بھی چھری بھونکر مرگیا، اب مہرالنسا دربار میں بھیجدی گئی لیکن اس نے جہانگیر سے کسی قسم کا تعلق پیدا کرنے سے صاف انکار کردیا، کیونکہ وہ خوب جانتی تھی کہ جہانگیر اس کے شوہر کا قاتل ہے اور اسکا یہ خیال حق بجانب تھا

الفنسٹن (Elphinston) بھی صرف الفاظ کی الٹ پھیر کے ساتھ تقریباً سب کچھ یہی لکھتا ہے۔

---

[1] ڈو (Dow) صفحہ ۲۴، ۲۵ [2] کنیڈی جلد دوم صفحہ ۱۷

ہولڈن (Holdan) لکھتا ہے کہ :-

جہانگیر قطب الدین کو بنگال کا گورنر بنا کر بھیجتا ہے، اور تاکید کرتا ہے کہ وہ شیر افگن کو مجبور کرے کہ وہ مہرالنساء کو طلاق دیدے ۔ اور اسکو گورنر کے حوالہ کر دے تاکہ وہ دربار میں بھیجدی جائے۔" لیکن پھر خود ہی ہولڈن کہتا ہے کہ " لیکن ان تمام باتوں کی کوئی تفصیل نہیں " [1]

سر تھامس رو (Sir Thoms Row) نے نورجہاں کے اقتدار اور جہانگیر پر اس کے اثر کے متعلق نہایت زوردار الفاظ میں لکھا ہے لیکن شیر افگن کے قتل کے متعلق اس نے ایک لفظ بھی نہیں لکھا [2]

ایڈورڈ ٹیری (Edward Terry) جس نے ۱۶۱۶ء سے ۱۶۱۹ء یعنی مسلسل تین سال تک ہندوستان کی سیاحت کی تھی، وہ اپنے سفرنامے میں ہندوستان کے متعلق وہ سب کچھ لکھتا ہے جو ایک سفرنامہ میں ہونی چاہیئے ۔ اس نے مذہب یہاں کے لوگوں کے عادات، و اطوار، امراء کے لباس، حکومت کی دفتری زبان، ہندوستانی آبادی و رقبہ، کے متعلق نہایت تفصیل سے بتانے کی کوشش کی ہے، لیکن اوس نے ایک لفظ بھی جہانگیر اور نورجہاں کے مشہور زمانہ افسانہ کے متعلق نہیں لکھا حالانکہ صرف پانچ برس قبل یعنی ۱۶۱۱ء [3]

جہانگیر اور مہرالنساء کی شادی ہوئی تھی وہ ایک پر مہرالنساء کا ذکر خاص طور پر کرتا ہے، لکھتا ہے :-

نورمحل جہانگیر کی محبوب ترین ملکہ تھی اس نے اپنی ذاتی خوبیوں کیوجہ سے بہتوں کو اپنا دوست بنالیا تھا"

اس سیاح نے شیر افگن کے قتل یا طلاق کا مطلقاً کوئی تذکرہ نہیں کیا ہے ۔ حالانکہ اس سہ سالہ قیام کے دوران میں یہ "راز کی باتیں" اس کو معلوم ہو جانی چاہیئے تھیں ۔ لیکن اب دیکھنا یہ ہے ۔ کہ واقعتاً جہانگیر اس قدر ذلیل و اوباش تھا کہ وہ کسی شریف کو اس طرح مجبور کرے گا کہ وہ اپنی بیوی کو صرف اس کے ہوا و ہوس کو پورا کرنے کے لئے طلاق دیدے، جہانگیر کے کیریکٹر کو بخوبی مطالعہ کرنے والے بخوبی جانتے ہیں ۔ کہ وہ شرابی تھا، رقص و سرود کی محفلوں میں شریک ہوتا تھا، اوس سے لطف اندوز ہوتا تھا عیش و عشرت کا دلدادہ تھا ۔ زاہد خشک نہ تھا ۔ تو اس کے کیا معنی کہ وہ رذالت پر اتر آیا تھا ؟

جہانگیر کو آخر اس کی کیا ضرورت پڑی تھی کہ وہ شیر افگن کو طلاق کے لئے مجبور کرے، حالانکہ اوس کے لئے کوئی بڑی بات نہ تھی کہ وہ بلا طلاق دلوائے ہوئے بھی مہرالنساء کو حاصل کرتا، اور شرعاً تو کسی کو طلاق کے لئے مجبور کرنا بھی تو جائز نہیں ہے!

(باقی) شاہ محمد زہیر (دبیری)

---

[1] تاریخ ہندوستان از ہولڈن (Holdan) صفحہ ۴۴۳

[2] جہانگیر از پروفیسر بینی پرشاد صفحہ ۱۳۲ [3]

[4] (Early travel by Foster) صفحہ ۳۲۹

بابُ الانتقاد

جگر کے سو شعر

یہ مختصر سا رسالہ بھی (اصغر کے سو شعر کی طرح) جامعہ ملیہ نے شائع کیا ہے اور محمود علی خاں صاحب اس کے بھی مرتب ہیں۔ شروع کے چند صفحات میں جگر کے سوانح زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے اور اسی سلسلہ میں ان کی خصوصیات شعری کو بھی ظاہر کیا گیا ہے

انتخاب کنندہ نے جگر کے کلام کو تین ادوار میں تقسیم کیا ہے ایک وہ جو مجازی شاعری کے لئے مخصوص تھا، دوسرا وہ جب جگر کسی کے مُرید ہو کر "بلند خیالات بلند الفاظ میں" لکھنے لگے اور تیسرا دور حاضر جب "بلند خیالات سادہ الفاظ میں" نظر آتے ہیں۔ گویا بالفاظ دیگر یوں سمجھنا چاہئے کہ پہلے جگر صرف اُن جذباتِ محبت کو ظاہر کرتے تھے جن کا تعلق اس دُنیا کے عشق و محبت سے ہے اور اب وہ اس دنیا سے گزر کر کسی اور دنیا کی باتیں کرتے ہیں جن کا دوسرا نام انتخاب کنندہ کی زبان میں تصوف و حکمت وغیرہ خدا جانے کیا کیا ہے

گزشتہ ماہ کی اشاعت میں ہم "اصغر کے سو شعر" پر تنقید کرتے ہوئے تصوف و تغزل کے باہمی تعلق پر کافی بحث کر چکے ہیں اس لئے اُس کے اعادہ کی ضرورت نہیں، لیکن جس حد تک جگر کی شاعری کا تعلق ہے، یہ فیصلہ کرنا ضروری ہے۔ کہ ان کی شاعری محمود علی خاں صاحب کے اصولِ انتخاب پر یا ان کا اصول انتخاب جگر کی شاعری پر منطبق ہوتا ہے یا نہیں چونکہ انتخاب کنندہ نے انتخاب میں اس کا لحاظ نہیں رکھا کہ ہر دَور کی شاعری کے نمونے علٰحدہ علٰحدہ یکجا جمع کر دیے جاتے اس لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ انھوں نے کس شعر کو کس رنگ کا سمجھ کر انتخاب کیا ہے، تاہم ایک عمومی تبصرہ کے سلسلہ میں بھی یہ حقیقت پوشیدہ نہیں رہ سکتی کہ انتخاب کنندہ نے کس شعر کو اپنے کس ذوق کے ماتحت پسند کیا ہے

جگر کے دَور اول کی شاعری کے جو نمونے انھوں نے پیش کئے ہیں ان میں غالباً حسب ذیل قسم کے اشعار شامل ہونگے:-

سب اُن پہ ہیں تصدق وہ سامنے تو آئیں اشکوں کی آرزوئیں آنکھوں کی التجائیں

مجھ ناتوانِ عشق کو سمجھا ہے تم نے کیا دامن پکڑ لیا تو چھڑایا نہ جائے گا

مجھے دے رہے ہیں تسلیاں وہ ہر ایک تازہ پیام سے کبھی آکے منظرِ عام پر کبھی ہٹ کے منظرِ عام سے

دوسرا دَور جس میں بقول محمود علی خاں صاحب " بلند خیالات بلند الفاظ میں " ظاہر کئے گئے ہیں اور جو اُن کے نزدیک تصوف کا رنگ لئے ہوئے ہیں غالباً ذیل کے اشعار سے متعلق ہوگا :-

مجھے تلاش کرائے بیخودی شوقِ سجود پہونچ کے منزلِ مقصد پہ کھو گیا ہوں میں

فریب خوردۂ رنگینیٔ ادا ہوں میں نظر کی چند شعاعوں میں گھر گیا ہوں میں

میری حیرت کی قسم آپ اٹھائیں تو نقاب میرا ذمہ ہے کہ جلوے نہ پریشاں ہونگے

گو سراپا حجاب ہیں پھر بھی تیرے رُخ کے نقاب ہیں ہم لوگ

تو سامنے ہے پھر بھی بتلا کہ تو کہاں ہے کس طرح تجھ کو دیکھوں نظارہ درمیاں ہے

تمام اٹھ گئے پردے تو اس سے کیا حاصل مزہ تو جب تھا کہ میں بھی نہ درمیاں ہوتا

فطرتِ مجبور پر قابو ہی کچھ چلتا نہیں ورنہ ہم تو تجھ سے بھی تجھ کو چھپا کر دیکھتے

حُسن تک دیکھ لیں سب حُسن کے جلوؤں کی بہار مجھ تک آئے تو مرا حالِ پریشاں ہونگے

ٹھہر اے دلِ دردمندِ محبت تصور کسی کا پریشان ہوگا

تیسرا دَور جس کے متعلق انتخاب کنندہ نے لکھا ہے کہ " بلند خیالات سادہ الفاظ میں " ظاہر کئے ہیں دَورِ اوّل سے علٰحدہ ہم کو کہیں نظر نہیں آیا۔ ممکن ہے دَورِ ثانی کے بعض ایسے اشعار جو جلد سمجھ میں آجاتے ہیں اور جن کی تاویل کی ضرورت نہیں ہوتی، انھوں نے دَورِ ثالث سے متعلق کر دیے ہوں

بہرحال انتخاب جس اصول کو بھی سامنے رکھ کر کیا گیا ہو، اس میں شک نہیں کہ جگر کے کلام میں دو رنگ بالکل علٰحدہ علٰحدہ نظر آتے ہیں جن کی تقسیم انتخاب کنندہ نے مجاز و حقیقت کی ہے اور ہمارے نزدیک اس کی تقسیم صرف یوں ہونی چاہئے کہ ایک دور کا کلام واقعی تغزل کے صحیح معیار پر اُترتا ہے اور دوسرا اس سے ہٹا ہوا ہے، یعنی اگر سو شعر انھوں نے ایسے کہے ہیں جن سے وجدانِ صحیح بغیر کسی تاویل و کاوش کے لطف اندوز ہو سکتا ہے تو دس ایسے بھی نظر آتے ہیں۔ جو مشاعروں میں تو زیادہ سے زیادہ داد حاصل کرتے ہیں لیکن یوں اگر تنقید کی جائے تو وہ سوائے چند خوبصورت الفاظ و تراکیب کے مجموعہ کے اور کچھ نہیں ٹھیرتے۔ چنانچہ قسم دوم کے جو اشعار اوپر درج کئے گئے ہیں وہ سب اسی انداز کے ہیں

فریب خوردۂ رنگینیٔ ادا ہوں میں نظر کی چند شعاعوں میں گھر گیا ہوں میں

اگر دوسرے مصرعہ میں نظر سے مُراد اپنی نظر ہے تو مفہوم کی سخافت ظاہر ہے کیونکہ اس طرح مطلب یہ پیدا ہوتا ہے کہ محبوب کی خوش ادائیاں صرف اپنی نظر کا فریب ہے ورنہ حقیقت کچھ نہیں، لیکن اگر یہ چند شعاعیں محبوب کی نگاہ کی ہیں تو پھر دونوں مصرعے غیر مربوط رہتے ہیں کیونکہ معشوق کی نگاہ رنگینیٔ ادا کا فریب پیدا کرنے والی نہیں

میری حیرت کی قسم آپ اٹھائیں تو نقاب　　میرا ذمّہ ہے کہ جلوے نہ پریشاں ہوں گے

اس شعر میں صرف لفظ پریشاں پر مفہوم کی بنیاد قائم کی گئی ہے جو بلحاظ اندازِ بیان کے لحاظ سے ممکن ہے بعض لوگوں کو اپیل کرسکے لیکن حقیقت کے لحاظ سے کچھ نہیں ہے

مدعا صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ آپ نقاب اٹھا دیں گے تو بھی میں فرط حیرت سے آپ کا نظارہ نہ کرسکوں گا، خیال اچھا ہے لیکن "جلوے نہ پریشاں ہوں گے" کہہ کر اس کو بُری طرح ادا کیا گیا ہے

اسی قسم کی تعبیر کا یہ شعر بھی ہے :-

ٹھہر اے دل درد مند محبت　　تصور کسی کا پریشاں ہو گا

غزل میں شعر کی خوبی یہ ہے کہ بغیر کسی تصنع کے جذبات کا اظہار ہو جائے اور تصوفانہ رنگ تعبیر میں یہی بات مفقود ہوتی ہے۔ بلکہ اگر غلو سے کام لیا جائے تو شعر مہمل ہو جاتا ہے۔ مثلاً

گو سراپا حجاب ہیں پھر بھی　　تیرے رُخ کی نقاب ہیں ہم لوگ

تاویل اور کھینچ تان کا ذکر نہیں کہ وہ تو جرکین کے کلام کو بھی سرتاسر تصوف و حکمت ثابت کرسکتا ہے، یوں دیکھئے کہ اس سے کوئی مفہوم پیدا ہوتا ہے یا نہیں

غالب کا مشہور شعر ہے :-

اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے　　حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہو کس حساب میں

غالب تو خیر یہ شعر کہنے کو کہہ گیا لیکن اس کے بعد شعراء نے اس سے جس قدر ناجائز فائدہ اٹھایا اس کا بیان بہت دردناک ہے، جگر کے یہاں بھی اسی فلسفۂ "ہویّت" کے بعض انتخابات ملاحظہ ہوں

تو سامنے ہے پھر بھی بتلا کہ تو کہاں ہے　　کس طرح تجھ کو دیکھوں نظارہ درمیاں ہے

تمام اُٹھ گئے پردے تو اس سے کیا حاصل　　مزہ تو جب تھا کہ میں بھی نہ درمیاں ہوتا

نظارہ کا درمیان آکر حجاب بن جانا، یا خود دیکھنے والے کا بھی "درمیاں" نہ ہونا، حقیقتاً کوئی مفہوم نہیں رکھتا

اسی طرح غالب کے اس مصرعہ نے

میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

لوگوں کو ایسے خیال کی طرف مائل کر دیا جس کا غلو یقیناً گمراہ کن ہے۔ جگر لکھتے ہیں

فطرت مجبور پر قابو ہی کچھ چلتا نہیں　　ورنہ ہم تو تجھ سے بھی تجھ کو چھپا کر دیکھتے

دوسرا مصرعہ اپنے اندر کوئی معنی نہیں رکھتا

الغرض جگر کے کلام کا وہ حصّہ جو انتخاب کنندہ کی رائے میں "بلند خیالات" سے متعلق ہے ہمارے نزدیک جگر

کے لئے قابلِ فخر نہیں ہو سکتا، لیکن اس رنگ سے ہٹ کر جو کچھ انھوں نے کہا ہے اس میں شک نہیں کہ وہ بالکل معیاری چیز ہے اور اس وقت کا بہتر سے بہتر شاعر ان پر ناز کر سکتا ہے، مثلاً یہ اشعار ملاحظہ ہوں :-

ہنسی پھر اُڑنے لگی عشق کے فسانے کی ۔۔۔ نقاب اٹھاؤ بدل دو فضا زمانے کی

گوشِ مشتاق کی کیا بات ہے اللہ اللہ ۔۔۔ سُن رہا ہوں میں وہ نغمہ جو ابھی ساز میں ہے

قفس کے سامنے بجلی کچھ اس طرح چمکی ۔۔۔ نظر میں پھر گئی تصویر آشیانے کی

کہاں میں اور کہاں اب فسانۂ غمِ عشق ۔۔۔ وہ التفات نہ کرتے تو کچھ بیاں ہوتا

لیکے خط ان کا کیا ضبط بہت کچھ لیکن ۔۔۔ تھرتھراتے ہوئے ہاتھوں نے بھرم کھول دیا

ہائے یہ حُسنِ تصوّر کا فریبِ رنگ و بو ۔۔۔ میں یہ سمجھا جیسے وہ جانِ بہار آہی گیا

یہ نشہ بھی کیا نشہ ہے کہتے ہیں جسے حُسن ۔۔۔ جب دیکھئے اک نیندسی آنکھوں میں بھری ہے

جگر کی وہ خصوصیت جو اس دَور کے دوسرے خوشگو شعراء سے اُن کو ممتاز کرتی ہے " ولولہ و جوش " ہے یعنی اُن کے جذباتِ محبت تشاؤم و قنوط کی طرف مائل نہیں ہیں، بلکہ ان میں ایک خود دارانہ ربودگی پائی جاتی ہے، ایک خاص قسم کا احساس مطمئن نظر آتا ہے۔ اور اسی لئے ان کی شاعری لکھنؤ اور دہلی دونوں اسکولوں سے قدرے علحدہ ہے۔ جو ان کے پہلے اُستاد داغ اور دوسرے اُستاد تسلیم کے رنگ کے امتزاج سے مل کر پیدا ہوئی ہے۔ ممکن ہے اُن کے کلام میں فلسفۂ حیات کے وہ نکات بھی پائے جاتے ہوں جو عشق و محبت کی دنیا میں انتہائے استغراق کے بعد ایک بے نیازانہ کیفیت سے تعلق رکھتے ہیں، اور معنی آفرینی و ندرتِ تعبیر کے لحاظ سے بھی قابلِ لحاظ ہوا کرتے ہیں، لیکن ان کا غالب رنگ وہی ہے، جس میں کامیاب عشق و محبت کا جوش و ولولہ پایا جاتا ہے اور جو اس نوع کی رنگینیوں سے مالامال ہے مگر افسوس ہے کہ اس مجموعۂ انتخاب میں جگر کے اس حقیقی رنگ کے شعر بھی بہت کم نظر آتے ہیں۔ ان کی وہ غزل جس کا مطلع یہ ہے :-

وہ کب کے آئے بھی اور گئے بھی نظر میں اب تک سمارہے ہیں
یہ چل رہے ہیں وہ پھر رہے ہیں، یہ آرہے ہیں وہ جا رہے ہیں

جگر کی شاعری کی سچی تصویر ہے۔ اسی غزل کا ایک اور شعر بھی انتخاب میں نظر آتا ہے :-

وہی قیامت ہے قدِ بالا وہی ہے صورت، وہی سراپا
لبوں کو جنبش، نگہ کو لرزش، کھڑے ہیں اور مسکرا رہے ہیں

جگر اپنی طبیعت و فطرت کے لحاظ سے بہت لااُبالی واقع ہوئے ہیں۔ اور غالباً یہی سبب ہے کہ وہ اپنی غزلوں پر تنقیدی نگاہ ڈالنے کی تکلیف بھی کم گوارا کرتے ہیں۔ اُن کا ایک شعر ہے :-

ایک تجلی، ایک تبسم، ایک نگاہِ بندہ نواز ۔۔۔ اس سے زیادہ اے غمِ جاناں دل کی قیمت کیا کہئے

پہلے مصرعہ میں " تجلی، تبسم، نگاہ " کو بغیر کسی حرف عطف کے اس طرح یکجا کر دیا گیا ہے کہ " دل کی قیمت " یہ تینوں چیزیں قرار پاتی ہیں، درانحالیکہ مقصود یہ ہے کہ ان میں سے کوئی ایک کافی ہے۔ علاوہ اس کے " ایک تجلی " کہنا ذوق پر ناگوار بار ہے، اگر پہلا مصرعہ یوں ہوتا:۔

ایک تبسم، ایک جھلک، یا ایک نگاہِ بندہ نواز

تو دونوں نقص دور ہو جاتے

دوسرے مصرعہ میں " غم جاناں " سے خطاب کرنا بھی بے محل ہے۔ اگر براہ راست " جاناں " سے خطاب کیا جاتا تو شعر زیادہ لطیف ہو جاتا

ایک اور شعر ہے:۔

ظلم کیا اب تو کرم بھی ہے گوارا مجھ کو
تیری اس اشک بھری چشم ندامت کی قسم

اس شعر کی بنیاد یہ خیال ہے کہ محبوب کا کرم اس کے ظلم سے زیادہ تباہ کرنے والا ہے، یعنی لطف و محبت کی ستم آرائیاں بہت زیادہ ہلاکت آفریں ہیں۔ یہ خیال بجائے خود اس میں شک نہیں کہ بہت لطیف ہے، لیکن دوسرا مصرعہ اس خیال سے علیحدہ ہو کر موزوں ہو گیا ہے

صورتِ حال یہ ہے کہ محبوب سامنے موجود ہے اور اپنی اشک آلود نگاہوں سے اظہار ندامت کر رہا ہے۔ یعنی اس کی یہ کیفیت لطف و عنایت کا اظہار کرنے والی ہے۔ اس لئے پہلے مصرعہ میں اس کو بہ لحاظ حقیقت ظلم نہیں کہہ سکتے۔ یہ مصرعہ یوں ہونا چاہئے تھا

لطف کیا اب تو ستم بھی ہے گوارا مجھ کو

کیونکہ ستم کرنے کے بعد محبوب پھر اس کی تلافی اپنی ندامت سے کرے گا جو عاشق کی عین مراد ہے

ایک شعر اور ہے:۔

مجھے تلاش کرا اے بیخودی شوقِ سجود
پہونچ کے منزلِ مقصد پہ کھو گیا ہوں میں

دوسرے مصرعہ میں " منزلِ مقصد " کی ترکیب محل نظر ہے، کیونکہ دونوں لفظ " ظرفیت " کا مفہوم رکھتے ہیں اسی لئے منزل کی اضافت ہمیشہ مقصود یا کسی دوسرے ایسے لفظ سے کی جاتی ہے جو ظرفیت کے مفہوم سے علحدہ ہو

نگاہِ دل بھی یکایک اسے سمجھ نہ سکی
وہ ہر کرم جو پسِ پردۂ عتاب ہوا

اس شعر میں لفظ نگاہ کوئی معنی نہیں دیتا صرف مصرعہ پورا کرنے کے لئے لایا گیا ہے یوں کہہ سکتے تھے

غضب ہے، دل بھی یکایک اسے سمجھ نہ سکا

یہاں "غضب ہے" کا استعمال صرف اظہار حیرت و استعجاب کے لئے ہوا ہے۔

اٹھا نہ دیدۂ بلبل سے پردۂ حیرت ؛
ہلاک ہوگئی کمبخت رنگ و بو کے لئے

اس شعر کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ " بلبل رنگ و بو کے لئے ہلاک ہوگئی پھر بھی پردۂ حیرت نہ اٹھا " دوسرا یہ کہ " دیدۂ بلبل سے پردۂ حیرت نہ اٹھا یہاں تک کہ رنگ و بو کے لئے ہلاک ہوگئی " لیکن ان میں سے کسی مفہوم کے لحاظ سے پردۂ حیرت مناسب نہیں۔ اگر کسی طرح " پردۂ فریب نظر " لاکر مصرعہ ترتیب دیا جاتا تو بیشک " ہلاک ہوگئی کمبخت " کا پورا لطف آسکتا تھا

انھیں آنسو سمجھ کر یوں نہ مٹی میں ملا ظالم
پیام دردِ دل ہے اور آنکھوں کی زبانی ہے

چونکہ پیام واحد ہے اس لئے پہلے مصرعہ میں بجائے انھیں کے اِسے لکھنا زیادہ موزوں ہوتا۔ بعض بعض جگہ ترکیبوں میں نامانوس ثقل بھی پایا جاتا ہے۔ مثلاً

بھرم کھونا کہیں اے دل نہ عشق معتبر ہو کر
یا شروعِ راہِ محبت ارے معاذ اللہ
یا یہ کیا کیا کہ عطا کر کے عشق لامحدود

عشق معتبر، شروعِ راہِ محبت اور عشقِ لامحدود، ثقیل ترکیبیں ہیں

الغرض جگر کے سو شعر کا انتخاب بھی غلط کیا گیا ہے اور بہت سے ایسے اشعار جو لینا چاہئے تھے انھیں ترک کر دیا گیا ہے اور جو قابل ترک تھے انھیں لے لیا گیا ہے۔ ورنہ اگر جگر کے کلام کا بالاستیعاب مطالعہ کیا جائے تو سو سے کہیں زیادہ اشعار بہترین رنگ تغزل کے ان کے یہاں میسر آسکتے تھے،

سنا ہے کہ حسرت و فانی وغیرہ کے کلام کا انتخاب شائع ہونے والا ہے۔ اگر انتخاب کرنے والے یہی صاحب ہیں تو ہم کو ابھی سے مایوس ہو جانا چاہئے ——— میری رائے میں انتخاب کی بہترین صورت یہی ہے کہ یہ خدمت خود اسی کے سپرد کی جائے جسکا کلام ہے، اس سے دو فائدہ مترتب ہونگے۔ ایک تو یہ کہ دنیا کو اسکے حقیقی رنگ کا پتہ چل جائے گا۔ اور دوسرے یہ کہ مستقبل میں کسی وقت اس انتخاب کی تاریخی وقعت بہت بڑھ جائے گی

نیاز

باب الاستفسار

زلزلہ کے اسباب

(طبقات الارض اور جوتش کے نقطۂ نظر سے)

(جناب محمد عبد الغنی صاحب - سارن)

زلزلہ کیا چیز ہے اور اس کے اسباب کیا ہیں۔ کسی ایک حصۂ زمین پر زیادہ جھٹکے محسوس ہونا اور دوسری جگہ کم یا بالکل نہیں - ایسا کیوں ہوتا ہے۔ کیا جوتشیوں کا یہ کہنا کہ سات سیارے ایک جگہ جمع ہو گئے تھے اور یہ تباہیاں اسی کی وجہ سے ہوئیں، کسی حد تک درست ہو سکتا ہے - اُمید ہے کہ آپ اس طرف جلد از جلد توجہ فرمائیں گے۔ کیونکہ اس وقت یہ موضوع خاص اہمیت رکھتا ہے

(**نگار**) زلزلہ کی حقیقت سمجھنے سے پہلے، یہ معلوم کر لینا ضروری ہے کہ کرۂ ارض کی ساخت وکیفیت کیا ہے کیونکہ اسی کے سمجھنے پر زلزلہ کی حقیقت سمجھنا منحصر ہے

آپ زمین کی جس سطح پر چلتے پھرتے ہیں وہ سخت اور ٹھوس ہے، لیکن زمین کے اندر یہ کیفیت نہیں ہے، یعنی جس قدر زیادہ آپ مرکز زمین کی طرف بڑھتے جائیں گے، سطح کی یہ سختی کم ہوتی جائے گی اور گرمی بڑھتی جائے گی - یہاں تک کہ مرکز زمین تک پہونچتے پہونچتے یہ گرمی پگھلا دینے والے درجہ تک محسوس ہوگی اور زمیں کا مادہ معدنیات کی پگھلی ہوئی کیچڑ کی صورت میں نظر آئے گا

کرۂ زمین تین حصوں میں تقسیم ہے۔ پہلا حصہ جسے بالائی سطح یا خول کہتے ہیں اس کی دبازت ۶۰ میل ہے، اس کے بعد

دوسرا حصہ گرم پتھریلا ہے اور سخت ہے۔ مگنیشیم اور چقماقی قسم کے پتھر پر، اس کی دبازت ۹۰۰ میل ہے، اس کے بعد زمین کا وہ مرکزی حصہ ہے جس میں زیادہ تر لوہا اور نکل نیم گداختہ حالت میں پائے جاتے ہیں، اس کی دبازت ۶۲۵۰ میل ہے

کرۂ زمین آفتاب ہی کا ایک ٹکڑا ہے جو دوران گردش میں اس سے علیحدہ ہو گیا تھا، اور کروروں برس کے بعد وہ آہستہ آہستہ سرد ہو کر اس قابل ہوا کہ جاندار اس پر سانس لے سکے۔ پھر جس طرح پگھلی ہوئی چیز کا بالائی حصہ پہلے خشک ہوتا ہے اور پھر رفتہ رفتہ اندرونی حصہ میں انجماد پیدا ہوتا ہے، اسی طرح اول اول زمین کی وہ بالائی سطح خشک ہوئی جس پر انسان آباد ہے اور اندرونی حصہ ہنوز پوری طرح خشک نہیں ہوا بلکہ اب تک گرم و نرم ہے۔ لیکن زمین کی بالائی سطح بالکل یکساں دبازت کی نہیں ہے کسی جگہ اس کی موٹائی کم ہے اور کہیں زیادہ، اس لئے یوں سمجھنا چاہئے کہ زمین کا یہ خشک خول جس پر ہم آباد ہیں ایک ایسے ناہموار لکڑی کے تختے کی طرح ہے جو پانی پر تیر رہا ہو اور جس کا دباؤ نیچے کی طرف کہیں کم اور کہیں زیادہ ہو

اس خول کے نیچے جو مادہ پایا جاتا ہے وہ بالطبع دباؤ سے متاثر ہونے والا ہے یعنی جس جگہ اس پر دباؤ زیادہ پڑ جاتا ہے وہ دب جاتا ہے اور جہاں دباؤ کم ہو جاتا ہے وہ ابھرنے لگتا ہے۔ پھر اگر یہ مادہ پانی کی طرح رقیق ہوتا تو اس دباؤ کا نتیجہ جلد ظاہر ہو جاتا لیکن چونکہ اس کا قوام بہت گاڑھا ہے اس لئے بہت کافی زمانہ کے بعد اس پر دباؤ کا اثر ہوتا ہے

اسی کے ساتھ یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ زمین کے بالائی خشک خول کا دباؤ بہت تغیر پذیر ہے کیونکہ ہوا، پانی، گرمی و سردی کے اثرات سے یہ سطح کسی جگہ پہاڑوں کی متحجر صورت اختیار کر لیتی ہے، کہیں پتھریلا حصہ پس پسا کر غبار بن جاتا ہے اور پانی میں مل کر سمندر کی سطح کے دباؤ کو بڑھاتا رہتا ہے۔ الغرض زمین کا سمٹ کر پہاڑ بن جانا اور پہاڑوں کا سطح میدان ہو جانا۔ کرۂ زمین کی تاریخ کے وہ واقعات ہیں جو وقت نامعلوم سے جاری ہیں اور معلوم نہیں کب تک جاری رہیں گے

چنانچہ زمین کا وہ حصہ جسے سوئٹزرلینڈ کہتے ہیں کسی وقت ۲۰۰ میل کا بالکل سطح میدان تھا، لیکن اب ہاں پہاڑ ہی پہاڑ ہیں اور بجائے ۲۰۰ میل کے اس کی پیمائش صرف ۱۲۰ میل رہ گئی ہے

اس قدر معلوم کر لینے کے بعد غالباً یہ سمجھنا آسان ہوگا کہ زمین کے اندرونی حصہ پر بالائی خول کا دباؤ فطری امر ہے اور اس دباؤ سے اندرونی مادہ کا کسی جگہ دب جانا اور کسی جگہ ابھر جانا یقینی ہے۔ فرض کیجئے آپ کسی کشتی پر بیٹھے ہوئے چلے جا رہے ہیں۔ اور اس کے کسی کنارہ پر زیادہ دباؤ پڑ جاتا ہے تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ ظاہر ہے کہ جدھر دباؤ پڑا ہے اس طرف کا کنارہ دب جائے گا اور دوسری طرف کا اونچا ہو جائے گا، لیکن یہ عمل اسی جگہ ختم نہ ہو جائیگا بلکہ پانی اپنی اصلی سطح اختیار کرنے کے لئے پھر متموج ہوگا اور کشتی میں متواتر ادھر ادھر ہچکولے پیدا ہوں گے۔ بالکل

یہی صورت زمین کی بھی سمجھئے کہ جب بالائی خول کے کسی حصّہ کا دباؤ اس کی اندرونی سطح پر زیادہ پڑے گا تو وہ حصّہ دب جائے گا اور دوسری طرف کا ابھرنے لگے گا یہاں تک کہ توازن قائم رکھنے کے لئے متواتر ہچکولے اس کو کھانا پڑیں گے، اور یہی ہے زلزلہ اور اسی لئے کہا جاتا ہے کہ فلاں حصۂ زمین اس قدر بلند ہوگیا اور فلاں اس قدر پست

اب آپ حال کے زلزلۂ صوبۂ بہار کو دیکھئے اور اس پر اس نظریہ کو منطبق کیجئے۔ فرض کیجئے کہ دامن ہمالیہ سے لے کر خلیج بنگال تک کا حصۂ زمین ایک لکڑی کا تختہ ہے جو پانی پر تیر رہا ہے اور خلیج بنگال کی طرف اس کا دباؤ زیادہ ہوگیا، اس لئے لامحالہ نتیجہ یہ ہوگا کہ ہمالیہ کی طرف زمین کا اندرونی مادہ ابھرے گا

پھر مظفرپور، پٹنہ، مونگیر وغیرہ میں جو زمین جا بجا شق ہوئی ہے تو اس کا سبب یہی ہوا کہ خلیج بنگال کی طرف دباؤ زیادہ پڑ گیا اور صوبۂ بہار کی طرف مادۂ زمین نے ابھر کر ہلچل ڈال دی۔ اسی طرح ۱۹۰۴ء میں جو زلزلہ آیا تھا اس میں وادی کانگڑا کی طرف زیادہ دباؤ پڑا تھا اور اس کا مقابل حصہ سرزمین یو۔پی کا زیادہ متأثر ہوا تھا

پھر چونکہ اس دباؤ کی وجہ سے اندرونی مادہ کا توازن خراب ہوجاتا ہے، اس لئے اُس کے اصلی توازن پر آنے کے لئے کچھ عرصہ تک تموج کی کیفیت باقی رہتی ہے اور یہی سبب ہے کہ ۱۵ر جنوری کے بعد بھی ہلکے ہلکے جھٹکے برابر محسوس ہو رہے ہیں اور اس وقت تک محسوس ہوتے رہیں گے۔ جب تک اندرونی مادہ اپنی اصلی سطح پر نہ آجائے

آپ کو معلوم ہوگا کہ وہ مقامات جو سمندر کے ساحل پر آباد ہیں وہاں اکثر و بیشتر زلزلے آتے رہتے ہیں اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ سمندر میں پہاڑوں اور زمین کا ایک حصّہ کٹ کٹ کر دریاؤں کے ذریعہ سے پہونچتا رہتا ہے اور اس لئے سمندر کی سطح کا دباؤ آہستہ آہستہ بڑھتا رہتا ہے اور اس دباؤ کی وجہ سے زمین کے اندرونی مادہ میں تموج پیدا ہوتا ہے اور دوسرا سبب یہ ہے کہ بعض اوقات سمندر کا پانی رِس رِس کر مرکز زمین کی طرف پہونچتا ہے اور وہاں گرم مادہ پر پڑ کر بخارات میں تبدیل ہوجاتا ہے جو اوپر کی طرف بلند ہو کر باہر نکلنا چاہتے ہیں اور اس طرح زمین میں جنبش پیدا ہوجاتی ہے

اب رہا جوتشیوں اور نجومیوں کا یہ کہنا کہ سات سیاروں کا قِران اس کا باعث ہوا ہے، سو اس کی علمی توجیہ ان کی طرف سے یہ کی جاتی ہے کہ ان سیاروں کی کشش سے زمین جنبش میں آئی، لیکن تنقید صحیح کے بعد ان کی یہ توجیہ پایۂ اعتبار سے گر جاتی ہے، کیونکہ اس زمانہ میں سات سیاروں کا قِران منطقۂ جدی (Zodiac of Capricorn) میں ہوا تھا جو خطِ استوا سے ۲۲½ درجہ جانب جنوب واقع ہے، اس لئے اصولاً ان کی کشش کا اثر کُرۂ زمین کے جنوبی حصّہ پر زیادہ ہونا چاہئے تھا۔ اور آسٹریلیا، جنوبی افریقہ اور جنوبی امریکہ میں زلزلہ محسوس ہونا ضروری تھا، نہ کہ صوبۂ بہار میں جو خطِ استوا سے مابین ۲۶ و ۲۹ درجہ جانب شمال واقع ہے۔ اور جنوبی حصّہ سے ۲۵۰۰ میل کا بُعد رکھتا ہے

علاوہ اس کے یہ سات سیاروں کا قِران چند منٹ تک تو رہا نہیں۔ بلکہ کئی دن تک رہا ہے۔ اس لئے سمجھ میں نہیں آتا کہ دورانِ قِران یہ مصیبت صرف ایک بار ظاہر ہو کر کیوں ختم ہوگئی

پھر اگر یہ معاملہ صرف سیاروں کی کشش کا تھا تو اس کا بہت زیادہ اثر سمندروں پر ہونا چاہئے تھا جو رقیق ہونے کے لحاظ سے کشش کو زیادہ قبول کر سکتے ہیں نہ کہ صوبۂ بہار کی سرزمین پر جو یقیناً پانی کے مقابلہ میں زیادہ ٹھوس اور جامد ہے جو کچھ میں نے عرض کیا، یہ ہے حال کی تحقیق زلزلہ کے متعلق، لیکن اس کو آخری لفظ قرار دے کر یہ باور کر لینا کہ ترقی علوم کی آیندہ منزل اس میں کوئی اور اضافہ نہ کر سکے گی، یا کچھ اور اسباب اس کے دریافت نہ ہو سکیں گے، صحیح نہیں ——— مگر ہاں یہ بالکل یقینی ہے کہ زلزلہ کا سبب وہ فرشتے نہیں ہیں جو کوہِ قاف کے گرد زنجیریں ڈالے ہوئے بیٹھے ہیں اور جب وہ اسے پکڑ کر ہلا دیتے ہیں تو ساری زمین میں جنبش پیدا ہو جاتی ہے

حضرت نیاز کے ادبی شاہکاروں کا نیا مجموعہ

جمالستان

(نگارستان کا دوسرا حصہ حجم ۵۰۰ صفحات)

قیمت فی کاپی مجلد للعہ ——— غیر مجلد للعہ ——— علاوہ محصول

خریداران نگار سے ——— ایک روپیہ کی رعایت

کتب فروشوں کو ۲۵ فیصدی کمیشن

فہرست مضامین حسب ذیل ہے:۔

دنیا کا اولین بت ساز	فریب خیال	صدائے شکست	دو گھنٹے جہنم میں
ایک شاعر کی محبت	میر بیدانہ	تاریخ عرب کی ایک حکایت جمیل	ایثار
شہید آزادی	بعد المشرقین	دلے بخیر گزشت	ٹیلی فون نمبر ٦٧٠
دو خط	جانعالم اور ملکہ مہر نگار	چند گھنٹے ایک مولوی کے ساتھ	شبنمستان کا قطرۂ گوہریں
سودائے خام	درس محبت	ازدواج مکرر	انتظام علی صاحب
سنہ ۲۵ء کا ایک صوفی	ایک شاعر کا انجام	آدم و حوا سے پہلے	شہزادہ خرم اور ابابیل
زہرہ کا ایک پجاری	رادھا	سرزمین دکن کی ایک دلنواز شام	نوجوان شہزادہ
مطربۂ فلک	چنگاری	محلہ کی رونق	داستان حسن و عشق کا ورق خونیں

باب المراسلۃ والمناظرہ

(جناب شیر احمد خاں صاحب وکیل لودھیانہ)

محترم بندہ جناب مولانا نیاز صاحب

السلام علیکم،

دسمبر ۱۹۳۳ء کے "نگار" میں "ملاحظات" کی تحت میں "عیش یا مسرت" کے عنوان سے آپ کا دلچسپ مضمون میری نظر سے گذرا، آپ نے اس مضمون میں نہایت خوب صورت الفاظ میں "عیش یا مسرت" کی حقیقت پر تفصیلی بحث کی ہے، اور اسی ضمن میں مذہب، وطنیت، قومیت ہر سہ تحریکات کے مضر اثرات ونتائج پر بھی تنقید کی ہے، "امن وسکون" کا واحد ذریعہ" کے ضمنی عنوان میں آپ نے یوں مشورہ دیا ہے، کہ "اگر دنیا کو واقعی امن وسکون کی ضرورت ہے، تو اس کا حصول نہ تجارتی مفاہمت سے ہو سکتا ہے، نہ تخفیف اسلحہ کی کوشش سے، بلکہ صرف اس طرح کہ تمام ممالک کے اہل الرائے ایک جگہ جمع ہو کر، حکومتوں کے اختلاف کو مٹائیں اور تمام ممالک کو اصول فیڈریشن پر ایک نظام حکومت سے وابستہ کردیں" اگر آپ کے اسی مشورہ کے مطابق عمل نہ کیا گیا، تو "ـــــ یقین رکھنا چاہیے، کہ دنیا کو ایک بار ضرور تباہ ہونا ہے خواہ وہ تباہی اس کو پھر عہد وحشت کی طرف لیجا کر کسی اور تہذیب وتمدن کی بنیاد ڈالنے پر مجبور کرے، یا قیامت کبریٰ" قائم کرکے نظام شمسی میں ایک اور ویران غیر آباد کرہ کا اضافہ کرنے والی ثابت ہو"

جس "عیش یا مسرت" کا آپ نے اپنے مضمون میں ذکر کیا ہے، وہ عیش یا مسرت" ہرگز منتہائے مقصد حیات انسانی نہیں، اس کی تلاش انسان پر فرض، اور اس کے بغیر انسان کی زندگی اجیرن نہیں ہوجاتی - انسانی زندگی بلند مقاصد کی جستجو میں ہے اور وہ بلند مقاصد "عیش ومسرت" کی آغوش میں نہیں، "عیش ومسرت" کی آغوش خواب آور اور آرزو کش ہے، انسان اس دنیا میں اپنی عیش ومسرت کے لئے خلق کیا گیا عیش ومسرت" کے حصول کے لئے نہیں کوئی مذہب انسان کو دنیا میں حصول عیش ومسرت کی تعلیم نہیں دیتا اور نہ ہی مذہب طلسم ہوش ربا، اور تخیل فردوس کا نام ہے، اگر مسرت کہیں ہے تو وہ انسانی فرائض کو بہ طریق احسن ادا کرنے کے اطمینان قلبی

ہیں۔ دنیا نے امن و سکون کی بیہودہ تلاش میں کئی خونیں قلزم عبور کئے، مگر اب تک اُسے وہ امن و سکون نصیب نہیں ہوا، اور نہ ہی مستقبل قریب میں کسی ایسے امن و سکون کے ظہور کی توقع کی جا سکتی ہے، زندوں کی بستی میں کبھی امن و سکون نہیں رہ سکتا، البتہ مُردوں کی دنیا یعنی قبرستان میں ہمیشہ خاموشی پُر ہیبت سکون، اور امن ہر وقت مسلط رہتا ہے، دنیا کو قبرستان کے امن و سکون کی ضرورت نہیں ———— مذہب پر سب سے بڑا الزام جو آپ نے عائد کیا ہے وہ یہ ہے، کہ "مذہب نے خون ریزی، اور خونفشانی کے سوا، کوئی خدمت سرانجام نہیں دی" حق و باطل کی آویزش فطرت کا ایک عالمگیر، اَن مٹ، قانون ہے، جس کی سرتابی میرے اور آپ کے اختیار سے باہر ہے (کم از کم میں اپنے متعلق ضرور کہہ سکتا ہوں آپ شاید اپنے کو مستثنےٰ کر دیں) دن اور رات کا انقلاب، روشنی اور تاریکی، گرمی اور سردی، بہار اور خزاں، سورج اور چاند کی گردش قانون قدرت کے یہ عالمگیر مظاہرے اس امر کے مقتضی ہیں، کہ حرکت نہ ختم ہونیوالی، حرکت فطرت کی ہر شے میں حکمراں رہے، اور ہر لحظہ بدلنے والی دنیا کا ہر انقلاب پذیر ذرہ امن و سکون کے خلاف علم جہاد بلند کئے ہوئے ہو۔ جد و جہد اور ہر حرکت "بقاءِ اصلح" کے جہاں گیر اصول کی زندہ تشریح ہے۔ جب تک سورج مشرق سے نکل کر مغرب میں غروب ہوتا رہے گا، اس وقت تک انسانوں کی بستی میں آپس میں محبت اور پیار، جنگ و فساد، صلح و آشتی، نفاق اور فراق کے رنگین مناظر آنکھوں کے سامنے اسی طرح رقصاں رہیں گے۔ جدال و قتال، بربادی و آبادی، لازمۂ حیات انسانی ہیں۔ یہ ابتدائی اصولی غلطی ہے، اگر کوئی کسی تحریک یا مذہب سے یہ توقع رکھے، کہ وہ دنیا میں بہشت قائم کرے۔ اور پھر بہشت بھی وہ جس کے متعلق یہ کہا جائے ع

بہشت آنجا کہ آزارے نباشد
کسے را با کسے کارے نباشد

دنیا کا یہ وسیع کارخانہ قبرستان کے امن و سکون کے لئے مرتب نہیں کیا گیا۔ جو لوگ اسی دنیا میں ایسی بہشت کی متلاشی ہیں، وہ سخت دھوکے میں ہیں۔ اور اک سراب کے تعاقب میں اپنی زندگیاں ضائع کر رہے ہیں۔ انسان کا جسم صحت اور بیماری کے عوارضات کا تختۂ مشق اسی طرح بنتا رہے گا۔ اس کا دل اسی طرح بڑھتی ہوئی امنگوں، اور پُرجوش آرزوؤں کا مسکن رہے گا، اور جہد للبقا کا لازوال نہ مٹنے والا قانون کائنات کے ہر ذرہ پر اسی طرح حکمراں رہے گا، خواہ آپ مانیں یا نہ مانیں، چاہیں یا نہ چاہیں، یہ جنگیں یہ فسادات یہ خوں ریزیاں اور خوں آشامیاں اسی طرح دنیا کے چہرہ کو بدنما کرتی رہیں گی، انسان فرشتہ تو ہونے کو رہا۔ حرص و آز، ہوس اور خود غرضیاں جن انسانی اعمال کے محرکات ہوں ان کا نتیجہ بدیہی تباہی، اور فساد ہے، مذہب اک جادہ، اعتدال کا نام ہے، جس جادہ اعتدال پر گامزن ہو کر: انسان۔ دنیا کی فلاح و بہبود مرادر بنی نوع انسان کی وسیع برادری میں باہمی اخوت و پیار کا باعث بن سکتا ہے، انسان میں جو درندگی اور حیوانیت پائی جاتی ہے، وہ مذہب کے اصلاح کُن اثر سے، اطاعت، اور شفقت کے پاکیزہ جذبات میں بدل سکتی ہے، تنہا مذہب وہ مقدس تحریک ہے، جس نے انسان کی درندگی اور بہیمیت کو اخوت اور اطاعت میں بدل کر دربار خداوندی میں عبدیت کی قبا کے ساتھ خلافت الارض کی خلعت پہنا دی ہے۔ باقی رہیں وہ جنگیں، جو دنیا میں مذہب کے

نام پر کی گئی ہیں ، ان میں سے بعض تو محض جوع الارض اور بادشاہوں کی اپنی انانیت کا نتیجہ تھیں ، اور وہ جنگیں جو خالصاً اللہ کے راستہ میں..... لڑی گئیں ، وہ نسل انسانیت کی صحیح نشو و نما اور تربیت کے لئے عین ضروری تھیں ، جراثیم زدہ اعضا کا کاٹ دینا ہی دیگر اعضاء کی تندرستی ، اور صحیح تربیت کے لئے ضروری ہے ہر تخریب میں تعمیر ، ہر بربادی میں آبادی ، اور ہر ویرانہ میں بستی کے آثار اور نشانات پائے جاتے ہیں ، ہر نئی تعمیر کے لئے قدیم تعمیر کا گرایا جانا ضروری ہے ، الفاظ کی بہشت تو آپ ساجاد و نگار ہر ورق پر قائم کر سکتا ہے - مگر انسانی اعمال سے ایسی بہشت دنیا میں نہ کبھی قائم ہوئی ہے اور نہ کبھی قائم ہوگی - دنیا فرشتوں کی بستی نہیں بن سکتی ، اور نہ ہی دنیا مہاتماؤں کا مندر ہے ، انسانی زندگی میں قہقہے بھی ہیں اور آہیں بھی ، جد و جہد کی صعوبتیں بھی ، تحمل و برداشت کی آذیتیں بھی ، ناکامیابیوں کی تلخ کامیاں بھی - ع

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغ مصطفوی سے شرار بو لہبی

موجودہ برسر اقتدار حکومتیں جو دنیا میں امن و سکون قائم کرنے کی کوششیں کبھی تخفیف اسلحہ کی صورت میں ، اور کبھی تجارتی مفاہمت کی صورت میں کر رہی ہیں ، یہ محض ان کی سیاسی چالیں ہیں ، ان کی ان کوششوں کا مقصد صرف یہ ہے کہ مغلوب اقوام اپنا سر نہ اُٹھائیں ، اور اپنے غصب شدہ حقوق اُن سے طلب نہ کریں ، وہ اب جنگ اس لئے نہیں چاہتے - کہ کہیں دوسری جنگ میں وہ سب کچھ کھو نہ بیٹھیں ، جو انھوں نے گذشتہ جنگوں میں حاصل کیا ہے - وہ امن اب اس لئے چاہتے ہیں ، کہ گذشتہ جنگ کی تھکان دُور کر لیں ، اور جو کچھ انھوں نے گذشتہ جنگوں میں حاصل کیا ، اُس مال غنیمت کو اطمینان کے ساتھ اب بیٹھ کر اچھی طرح ہضم کر لیویں ، وہ دوسروں کے غصب شدہ حقوق اُگلنا نہیں چاہتے - دُنیا کی موجودہ تقسیم دولت ، و حکومت پر وہ مطمئن ہیں ، اور اس تقسیم میں کسی مزید تبدیلی اور انقلاب کو اب وہ نہیں چاہتے ، امن و سکون کی یہ کوششیں اگر کامیاب ہو گئیں - تو اس کا نتیجہ یہ ہو گا - کہ مغلوب اقوام ہمیشہ کے لئے مغلوب رہیں گی ، اور وہ کبھی بھی حریت کی حیات آفریں فضا ، زندگی حاصل نہ کریں گی

اختلافات مادی ہوں یا اعتقادی ، ہمیشہ سے چلے آئے ہیں ، اور اسی طرح قائم رہیں گے - میری اور آپ کی مساعی آنے والی "قیامت کبریٰ" کو روک نہیں سکتیں - اور اسی "قیامت کبریٰ" کے لوٹ جانے میں درحقیقت مظلوم اور بے دست و پا اقوام کے لئے کوئی فلاح و بہبود مضمر نہیں ہے - جنگیں ہمیشہ مظلوم کو ظالم کی دستبرد سے نجات دلاتی ہیں اور اکثر غاصبوں کیلئے تازیانہ عبرت کا حکم رکھتی ہیں - (War is a biological Process) ایک انگریزی مقولہ ہے - جنگ بھی افزایش نسل کے لئے ضروری ہے - انسان تحفظ نفس کے لئے اپنے گرد و پیش کے حالات

سے برسرِ پیکار رہنے پر مجبور ہے، انسان دنیا میں کائناتِ ارضی پر حکمرانی کے لئے خلق ہوا ہے اس لئے اُسے پانی، ہوا، اور زمین کو اپنے زیرِ نگیں کرنا ہے، مذہبی اختلافات بالکل مٹ نہیں سکتے، البتہ کم شاید ہو جائیں، نیکی اور بدی، کفر اور ایمان دونوں کی ندیاں پہلو بہ پہلو جاتی ہیں۔ ان کی باہمی آویزش سے گریز عبث اور بزدلی ہے۔ البتہ اس جنگ میں بلند ہمتی سے شرکت، صحیح فتح ہے، جنگل کو سبزہ زار بنانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ پہلے اُسے خس و خاشاک سے پاک صاف کیا جائے۔ کپڑا انسان کے جسم پر اس وقت راست آتا ہے جب درزی اسے پہلے کاٹ دیتا ہے، انسان کو فقط کھلونا نہ جانیے، جو محض کھیلنے کودنے اور ہنسنے کے لئے دنیا میں آیا ہو، محبت، نفاق اور دشمنی انسانی قلب کی یہ سہ گونہ کیفیات ازلی اور ابدی ہیں، اسی بنی نوع انسان کی وسیع برادری میں ہمیشہ سے مومنوں، منافقوں اور منکروں کے گروہ قائم رہے ہیں

دنیا میں کوئی مذہب انسان کو انسان سے نفرت کا درس نہیں دیتا۔ البتہ جو شخص ننگِ انسانیت ہو، اس کے عدم کو وجود سے بہتر ضرور سمجھتا ہے۔ اگر اس کے متعلق اصلاحی تو تیں بیکار ثابت ہو چکی ہوں

باقی رہا اس ملک کی فرقہ پرستی، اس کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ ع

اے بادِ صبا ایں ہمہ آوردۂ تست

باہمی بدگمانی نتیجہ ہیں، قوموں کے باہمی عدمِ توازن کا، جو قوم اپنے کو کمزور سمجھتی ہے۔ وہ اپنی بقا، کے لئے تحفظات کے تعیین کے لئے فطرتاً مجبور ہے، تحفظات کے مطالبہ کو اقلیت بھی اس حالت میں ترک کر سکتی ہے، اگر اکثریت اور بالخصوص طاقتور اکثریت اپنی روش اور اپنے سلوک سے اقلیت کے دل میں اپنے لئے اعتماد پیدا کر دے۔ فرقہ وارانہ ذہنیت ہمیشہ قوموں میں باہمی بداعتمادی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اکثریت کا اقلیت کے حقوق اور مفاد کے ساتھ غیر مشفقانہ اور غیر ہمدردانہ سلوک اقلیت کو ہمیشہ اکثریت سے بدگمان کر دیتا ہے۔ جس ملک یا بستی میں بداعتمادی کی فضا مسلط ہو، ایک طرف سے تحفظاتِ حقوق کی طلب ہو، اور دوسری طرف سے اس طلب کا جواب اغماض، اور گریز سے دیا جا رہا ہو اس کا بدیہی نتیجہ یہ ہے کہ اس ملک کی قوموں میں منافرت کی خلیج وسیع ہوتی چلی جائے۔ ایسے ناخوشگوار حالات کے اصلی اسباب کا تعین کبھی مفید نتیجہ کا باعث نہیں ہوا، ہندوستان کے مسلمان لاکھ قربانیاں کریں، اور اپنی زندگیاں استخلاصِ وطن کی مقدس تحریک کے لئے وقف کر دیں، مگر اکثریت کے قلوب میں ان کے لئے کبھی ہمدردی اور محبت کے جذبات پیدا نہ ہوں گے غلط یا درست وہ اس ملک کو تنہا اپنی ملکیت سمجھے ہوئے ہیں، اور انھیں ہر مسلمان محمود غزنوی نظر آ رہا ہے، باہمی مصالحت اور مفاہمت کی ساعی ہمیشہ مبارک ہیں، اور ہر شریف انسان باہمی اعتماد کو بداعتمادی پر ترجیح دے گا، لیکن ہر مبارک سعی کی کامیابی یقینی نہیں ہے،

ہندوستان کی گذشتہ تاریخ از سرِ نو مرتب اگر ہو سکتی ہے تو شاید پھر باہمی مصالحت کی مساعی بھی مشکور ہوں، اور البتہ یہ امر یقینی ہے کہ اگر دونوں اقوام کو آپس میں یہاں مل جل کر رہنا ہے، تو انھیں ایک نئی تاریخ مرتب کرنی ہوگی اور تاریخِ ہند

میں "مسلمانوں کا باب" جس انداز، اور ترتیب سے اب مرتب ہے، وہ یقیناً بدلنا پڑے گا - اور شاید ہندوستان کی تمام گذشتہ تاریخ کو ایک سفید ورق کی صورت میں تبدیل کرنا ہو

خدارا اپنے مضامین میں الفاظ کی بہشت قایم کرکے مسلمان نوجوانوں کو محض شاعر اور نگار پرست نہ بنائیے - میں نے آپ کے رسالہ کے اکثر نوجوان قارئین کو محض بیکار دیکھا ہے - بیشک وہ آپ کے مضامین - شگفتہ تراکیب اور بلند تخیلات کو مزے سے لے کر پڑھتے ہیں، مگر علمی اعتبار سے محض اینٹ اور پتھر کی طرح جامد ہیں - نیت تو یقیناً آپ کی مبارک اور نیک ہے، مگر بدقسمتی سے نتایج خطرناک پیدا ہو رہے ہیں، کاش آپ میرے ساتھ یہاں ہوں تو میں آپ کو دکھلاؤں کہ اس "نگار پرستی" نے کتنے مسلمان نوجوانوں کو گمراہ، بیکار، اور گستاخ کر دیا ہے - خدا اُس علم سے محفوظ رکھے، جو شر اور گمراہی پھیلائے

(نگار) اُن تمام صریحی اختلافات بیانی کو نظرانداز کرنے کے بعد جو جا بجا آپ کی تحریر میں نظر آتے ہیں، اس کی تلخیص یہ کر سکتا ہوں کہ :-

(۱) دنیا میں امن و سکون کی تلاش، جستجوئے محال ہے

(۲) مذاہب عالم کا مقصد کبھی "عیش و مسرت" کا حصول نہیں تھا بلکہ صرف "عبدیت" کی کیفیت انسان پر طاری کرنا تھا

(۳) مذاہب عالم کی خونریزی و خون آشامی عین فطرت کے مطابق ہے کیونکہ حق و باطل کی جنگ فطری قانون ہے

(۴) دنیا میں کوئی مذہب انسان کو انسان سے نفرت کرنے کا درس نہیں دیتا مگر جو شخص ننگ انسانیت ہو اس کو ضرور فنا کر دینا چاہتا ہے

(۵) ہندوستان میں ہندو مسلمانوں کی مصالحت ناممکن ہے جب تک تاریخ ہند میں "مسلمانوں" کا باب بالکل نہ بدل دیا جائے

(۶) نگار کی تحریریں مُلک کے نوجوانوں کو گمراہ، بیکار اور گستاخ بنا رہی ہیں ——— اور یہ کہ

(۷) خدا اُس علم سے محفوظ رکھے جو شر اور گمراہی پھیلائے

آخری دو باتیں حذف کرنے کے بعد جن کا تعلق صرف نگار یا صاحب نگار سے ہے اور جن کا جواب دینا چنداں ضروری نہیں، باقی تمام امور یقیناً غور طلب ہیں لیکن افسوس ہے کہ فاضل مُراسلہ نگار نے جو تنقیح و جرح کی ہے اسے ژولیدگی و تناقض کے لحاظ سے کسی کامیاب قانون پیشہ شخص سے منسوب کرنا اچھا نہیں معلوم ہوتا

قبل اس کے کہ میں فاضل مُراسلہ نگار کی تصریحات پر تنقید کروں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے میں دسمبر کے "ملاحظات" کا مفہوم یہاں مختصر طور پر ظاہر کر دوں جس کے خلاف صاحب مضمون نے احتجاج کیا ہے

میں نے دسمبر کے ملاحظات میں ظاہر کیا تھا کہ عیش و مسرت دو بالکل علیحدہ چیزیں ہیں عیش نام ہے جسم کی آسایش کا حواس ظاہری کی لذت کا اور مسرت نام ہے اطمینانِ نفس اور راحتِ روح کا، اس لئے اگر دنیا واقعی امن و سکون کی طلبگار ہے تو اُسے اسبابِ عیش کی جستجو نہ کرنا چاہیئے بلکہ حصولِ مسرت کے درپے ہونا چاہیئے - اسی سلسلہ میں میں نے یہ بھی ظاہر کیا تھا کہ اس کے حصول میں اس وقت تک نہ مذاہبِ عالم کامیاب ہوئے ہیں، نہ جذبۂ قومیت و وطنیت کو کامیابی نصیب ہوئی ہے اور نہ علم و حکمت کی ترقی اس جنسِ گرانمایہ تک دسترس پاسکی ہے - اس لئے اب اگر تجربہ باقی رہ گیا ہے تو صرف یہ کہ تمام مذاہب کو صرف ایک مرکز پر لایا جائے جسے "انسانیت پرستی" کہتے ہیں اور جملہ حکومتوں کو صرف ایک نظامِ حکومت سے وابستہ کیا جائے - جو تمام سلطنتوں کے تحالُف و مواخاۃ سے حاصل ہوسکتا ہے

یہ تھا میرا مفہوم جس سے مراسلہ نگار نے نہ صرف یہ کہ اختلاف کیا ہے، بلکہ بعض نئی باتیں ایسی پیش کی ہیں جن کے سمجھنے کے لئے مجھے خود استفسار کی ضرورت محسوس ہوتی ہے

(۱) و (۲) دُنیا میں امن و سکون کی تلاش جستجوئے محال ہو یا جستجوئے ممکن، لیکن غالباً اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ ہے وہ بالکل فطری چیز ــــ نہ صرف انسان بلکہ وحوش و طیور اور نباتات بھی اسی چیز کی جستجو میں ہیں اور مخلوقات کا فطری خود غرض پیدا کیا جانا اسی مصلحت کے ماتحت ہے کہ وہ اس کی جستجو میں لگے رہیں پھر چونکہ امن و سکون انفرادی و اجتماعی دونوں حیثیتوں سے فطری اقتضا ہے، اس لئے یہ کہنا کہ دُنیا میں حقیقی مسرت کوئی چیز نہیں، بلکہ اصل شے "عبدیت" ہے اور اسی کی اشاعت کے لئے مذاہبِ عالم وجود میں آئے بالفاظ دیگر یہ مفہوم رکھتا ہے کہ مذاہب کا تعلق مسرت یا اطمینانِ نفس سے نہیں بلکہ کسی اور چیز سے ہے جس کا نام فاضل مراسلہ نگار نے "عبدیت" رکھا ہے

مجھے اس سے بالکل اتفاق ہے، لیکن غالباً قابل معترض نے اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا کہ جس چیز کو وہ "عبدیت" سے تعبیر کرتے ہیں، وہی میرے نزدیک سکونِ نفس و اطمینان ضمیر ہے

"عبدیت" کسے کہتے ہیں؟ اگر اس کا مفہوم صرف یہ ہے کہ ایک انسان اپنے آپ کو خدا کا بندہ سمجھ کر صرف رشتۂ عبد و معبود پر اعتماد کرے اور عبادت و نیایش کے مروجہ طریقوں پر کاربند ہو کر اپنے فرایض عبدیت سے عہدہ برآ ہوجانے کا یقین رکھے، تو یہ ایسی ادنیٰ درجہ کی تعبیر ہوگی کہ انسان و حیوان کے درمیان کوئی فرق باقی نہ رہے گا کیونکہ انسان کا خدا کے مُقابلہ میں صرف اپنے آپ کو عاجز اور بندۂ بیچارہ سمجھ لینا کوئی معنی نہیں رکھتا، ایک جانور بھی انسان کے ہاتھ میں اپنے آپ کو ایسا ہی سمجھتا ہے

فرض کر لیجئے ایک انسان خدا سے ڈر کر رات دن اس کی عبادت میں مشغول رہتا ہے تو اس سے مدعا کیا ہے یعنی وہ کس امر سے خایف ہو کر اس کی پوجا کرتا ہے، ظاہر ہے کہ اس کا یہ فعل کسی غرض سے خالی نہیں ہوسکتا، یعنی وہ یا تو اپنی دنیاوی فلاح و ترقی کی امید پر ایسا کرتا ہے یا اخروی نجات کی ترقی پر - اگر مقصود وہ ہے تو محض یہ "خوفِ عبدیت"

بیکار ہے جب تک وہ دنیا کے اصول پر نہ چلے اور اگر مدعا دوسرا ہے تو ایسا انسان دنیا اور دنیا والوں کے لئے بیکار ہے ——— میرے نزدیک "عبدیت" کا صحیح مفہوم صرف یہ ہے کہ انسان جس طرح اپنے آپ کو خدا کا بندہ سمجھتا ہے اسی طرح دوسروں کو بھی سمجھے اور دوسروں کے احساسات کی پامالی پر اپنے جذبات کی کامیابی کی بنیاد قائم نہ کرے۔ اسی کا میں نے دوسرا نام "انسانیت پرستی" رکھا ہے اور یہی مقصود مذہب کا ہونا چاہئے۔ لیکن چونکہ تجربہ اس کے خلاف ثابت ہوا ہے - اور اس وقت تک مذاہب اس مقصد میں کامیاب نہیں ہوئے - اس لئے لامحالہ ہم کو "مذہب" کا کوئی اور بلند مفہوم قائم کرنا پڑے گا اور وہ صرف یہی ہو سکتا ہے کہ "لامذہبیت" مذہب قرار دیا جائے جسے دوسرے الفاظ میں (Morality without religion) بھی کہہ سکتے ہیں

آپ خود تسلیم کرتے ہیں کہ " مسرت نام ہے انسانی فرائض کو بہ طریق احسن ادا کرنے " کا اس لئے کیا میں یہ سوال کر سکتا ہوں کہ کیا انسانی فرائض میں اہم ترین فرض یہ نہیں ہے کہ وہ دوسرے انسانوں کو بھی خواہ وہ کسی قوم وملت سے تعلق رکھتے ہوں ہمدردی کی نگاہ سے دیکھے اور ان کے ساتھ رشتۂ اخوت ومحبت قایم کرکے تنگ نظری و عصبیت کو دور کردے - پھر اگر اس کا جواب آپ اثبات میں دیں گے (اور یقیناً دیں گے) تو آپ کو میرے اس قول سے کیوں اختلاف ہے کہ انسان صرف قیام مسرت کے لئے وضع ہوا ہے نہ کہ اسباب عیش کی فراہمی کے لئے - رہا آپ کا یہ فرمانا کہ " مذہب طلسم ہوشربا اور تخیلی فردوس کا نام نہیں ہے " سو اس کے جواب میں بجز اس کے کیا عرض کر سکتا ہوں کہ

چھائی جاتی ہے یہ دیکھو تو سراپا کس پر

میں، کہ سرے سے اس قسم کی فردوس وبہشت کا قائل ہی نہیں ہوں، کیونکر موردِ الزام قرار پا سکتا ہوں، یہ تو آپ اپنے انھیں برادران مذہب سے کہئے، جنھوں نے فردوس کو طلسم ہوشربا کیا، اس سے بھی زیادہ عجیب و غریب چیز بنا کر پیش کیا ہے - حالانکہ

دشتاں مابین خلق وخمر

(۳) آپ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ " مذاہب عالم کی خونریزی وخوں آشامی عین فطرت کے مطابق ہے، کیونکہ حق و باطل کی جنگ فطری قانون ہے " ——— یہ غالباً آپ نے صرف اس بات کو پیش نظر رکھ کر کہا ہے کہ آپ مسلمان ہیں - اور اسلام ہی سچا مذہب ہے ——— لیکن بندہ نواز، جس طرح آپ کو یہ کہنے کا حق حاصل ہے، اسی طرح دوسرے مذاہب والے بھی کہہ سکتے ہیں - پھر اس کا فیصلہ کیونکر ہو کہ راستی پر کون ہے - ظاہر ہے کہ جب مختلف دعووں میں باہمدگر اختلاف وتضاد ہوگا تو ہم کو جانچنے کے لئے کوئی معیار قائم کرنا پڑے گا اور مذاہب

کے تناقض ونزاع کے باب میں یہ معیار صرف " عقل وفطرت " ہی ہو سکتا ہے ۔ پھر غور کیجئے کہ اس وقت کون سا مذہب اس معیار پر ٹھیک اترتا ہے ؟ غالباً کوئی نہیں اور اس لئے لامحالہ تمام موجودہ مذاہب کو علٰحدہ کرکے کوئی اور نئی صورت اختیار کرنا پڑے گی جو " مذہب انسانیت پرستی " کے علاوہ کچھ اور ہو ہی نہیں سکتی

اسٹرنڈبرگ (Strindberg) کا ایک مشہور ڈرامہ ہے جس میں ایک عیسائی عورت کسی فوجی کپتان کو جو منکر خدا ہے مذہب کی طرف مایل کرتی ہے اور خدا کی محبت کی داستان سُنانے لگتی ہے ۔ کپتان سب کچھ سننے کے بعد کہتا ہے "ٹھیک اسی وقت جب تم خدا اور اس کی محبت کا ذکر کرتی ہو، تمھاری آواز میں سختی پیدا ہو جاتی ہے اور تمھاری آنکھوں سے جذبۂ نفرت واکراہ ٹپکنے لگتا ہے، ایسا کیوں ہے ؟"

چنانچہ یہی وہ تلخ حقیقت تھی جس کی بناء پر اسے کہنا پڑا کہ

The world would be more religious place if all the religions were removed from it.

یعنی اگر آج دنیا سے تمام مذاہب محو ہو جائیں تو دنیا زیادہ مذہبی جگہ ہو جائے

Baron Von Hogel کا قول ہے کہ

Religion is an "Isness" and not an "Oughtness"

مذہب کا تعلق ہمیشہ " ہے " سے رہا ہے " چاہئے " سے نہیں ۔ یعنی وہ اس سے بحث نہیں کرتا کہ حقیقت کیا ہے بلکہ صرف اسی کو صحیح سمجھتا ہے جو بظاہر اسے نظر آتا ہے ——— یعنی اگر وہ یہ سکھاتا ہے کہ آپس میں محبت رکھو، فتنہ وفساد سے علٰحدہ رہو تو اس کا مقصود یہ ہوتا ہے کہ اس عمل کو صرف ایک مخصوص حلقہ میں محدود رکھا جائے اور دوسرے مذہب والوں کو اس سے خارج سمجھا جائے، پھر ظاہر ہے کہ جب تمام مذاہب .... اس خیال کے حامی ہوں گے تو ان کا باہمدگر کشت وخون میں مبتلا ہو جانا یقینی ہے اور اس وقت تک جو خونریزیاں مذاہب کی طرف سے ظاہر ہو رہی ہیں ان کا سبب یہی ہے کہ ہر مذہب والا اپنی جگہ اپنے آپ کو حق پر سمجھتا ہے اور دوسرے کو باطل اور بقول ہمارے فاضل مراسلہ نگار کے حق وباطل میں جنگ ہونا بالکل فطری امر ہے

اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ مذاہب عالم کا درس محبت بھی صد درجہ قاتل وخونریز درس ہے اور کسی کا یہ قول بالکل صحیح ہے کہ

Religion engenders a great love to a great hate.

(۴) آپ کا چوتھا دعوےٰ یہ ہے کہ دُنیا میں کوئی مذہب انسان سے انسان کو نفرت کرنے کا درس نہیں دے گا مگر جو شخص ننگ انسانیت ہو اُسے ضرور فنا کر دینا چاہتا ہے ——— اس دعوےٰ کا پہلا حصہ بالکل واقعہ وحقیقت کے خلاف ہے ۔ کیونکہ ایک انسان نے دوسرے انسان سے نفرت کرنا، مذہب ہی سے سیکھا اور کافر وملکش کی

اصطلاحیں اس کا کھلا ہوا ثبوت ہیں - کیا آپ بہ حیثیت مسلمان ہونے کے ہندوؤں سے اس لئے متنفر نہیں ہیں کہ وہ رام وکرشن کے ماننے والے ہیں اور کیا ہندو آپ کو اس لئے ناپاک نہیں سمجھتے کہ آپ کا مذہب بُت شکنی سکھاتا ہے اور پھر ایک ہندو یا مسلمان ہی پر کیا موقوف ہے، گبر و ترسا، یہود و نصاریٰ، سبھی اس عذاب میں مبتلا ہیں اور ایک کا دوسرے سے نفرت کرنا مذہبی اختلاف ہی کی وجہ سے ہے

اب رہا یہ خیال کہ جو ننگ انسانیت ہو اس کو ضرور ہلاک کر دینا چاہئے، سو براہِ کرم بتائیے کہ اس سے زیادہ انسانیت کی کیا توہین ہو سکتی ہے کہ ایک انسان دوسرے انسان سے صرف اس لئے نفرت کرے کہ وہ اس کے مذہب کے شعائر کے خلاف خدا کی پرستش کرتا ہے - یعنی سوال خدا کی نافرمانی کا نہیں بلکہ صرف اس بات کا ہے کہ کیوں ایک مخصوص ومتعین طور پر اس کی پوجا نہیں کی جاتی

پھر جب حالت یہ ہے تو آپ ہی کے فیصلہ کے مطابق اس وقت تمام اہل مذاہب کو فنا کر دینا چاہئے، کیونکہ وہ سب کے سب ننگ انسانیت ہیں

(۵) آپ کا یہ فرمانا کہ ہندو مسلمانوں میں اتحاد ناممکن ہے جب تک ہندوستان کی تاریخ سے مسلمانوں والا باب بالکل نہ بدل دیا جائے - اچھی طرح سمجھ میں نہ آیا - اگر اس سے یہ مراد ہے کہ ہندو صرف اس لئے مسلمانوں کی طرف سے صاف دل نہیں ہو سکتے کہ وہ فاتحانہ حیثیت سے یہاں آئے اور بت شکنی کی، تو یہ ایک حد تک اصولاً درست ہے، لیکن میں یہ پوچھتا ہوں کہ اب جبکہ مسلمانوں میں اُن کے اسلاف کی کوئی خصوصیت باقی نہیں رہی، وہ کیوں اب تک "پندار فاتحانہ" میں مبتلا ہیں - اور وہ کیا چیز ہے جو ان میں ملک و وطن کی محبت پیدا ہونے نہیں دیتی - کیا ہندوؤں کی طرح ہندوستان ان کا وطن نہیں ہے - اور کیا اب وہ یہاں سے نکل کر کسی اور مُلک میں فاتحانہ و ملوکانہ زندگی بسر کرنے کی توقع قائم کر سکتے ہیں ـــــ پھر جب یہ نہیں ہے تو کب اُن کی سمجھ میں آئے گا کہ جب سوال اقلیت واکثریت کا پیدا ہوتا ہے تو اقلیت کی کامیابی "کم" کے مقابلہ میں ہمیشہ "کیف" سے ہوا کرتی ہے - مگر سنی شیعہ کی نزاع، وہابی و مقلد کا جھگڑا کب انھیں یہ سمجھنے کی مہلت دیتا ہے ـــــ انھیں اپنے ہی پاؤں پر کلہاڑی مارنے سے کہاں فرصت ہے کہ وہ درخت کی طرف متوجہ ہوں

(۶ و ۷) رہ گئے آپ کے دو آخری حقائق کہ نگار کی تحریریں مُلک کے نوجوانوں کو گستاخ، گمراہ و بیکار بنا رہی ہیں اور خدا اس علم سے محفوظ رکھے جو شر اور گمراہی پھیلانے والا ہے - سو ان کے متعلق میں سوائے اس کے کیا کہہ سکتا ہوں کہ

من از آتش دخاں بینم تو آتش از دخاں بینی

نقطۂ نظر کا اختلاف ہے، کارگاہِ عمل کا اختلاف ہے، تعبیر واستنتاج کا اختلاف ہے - آپ جس چیز کو گستاخی سمجھتے ہیں وہ میرے نزدیک آزادیِ ضمیر ہے - جو ہر انسان کا فطری حق ہے اور جسے آپ گمراہی سمجھتے ہیں - میرے نزدیک وہی راہ

"کعبۂ مقصود" تک پہونچانے والی ہے

اگر میرا یہ مسلک کہ

میانِ کعبہ و بتخانہ راہے ست

واقعی فتنہ و فساد پھیلانے والا ہے تو میں صرف یہ عرض کروں گا

خدا گواہ اگر جرم ماہمیں عشق ست

گناہِ گبر و مسلماں بہ جرم ما بخشند

امن و سکون کا درس دینے والے حضرات کا بھی حال مجھے معلوم ہے اور اُن علمبرداران مذہب کا بھی جو اپنے آپ کو حاملانِ عرش" باور کرتے ہیں۔ اس لئے آپ کیوں مجھے اس بزم میں شرکت کی دعوت دیتے ہیں جہاں بقول عراقی

"ہمہ یافتم دغائی"

کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ آہ

مرہم از لبہاش می جویند بر جانِ فگار

وائے بر ریشے کہ آن را از نمک مرہم کنند

ز۔ خ (پٹیالہ) سے

۱۶ر فروری کو تحریر گرامی فردوس نظر ہوئی ــــ لیکن حیران ہوں جواب کیونکر دوں۔ نگار میں اس کی اشاعت مناسب نہیں اور پتہ غیر معلوم!

اس صورت میں زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتا ہوں کہ نگار کے ذریعہ سے اس کے پہونچ جانے کی اطلاع آپ کو دے دوں اور اس وقت کا منتظر رہوں جب مراسلت کے لئے آپ اپنے پتہ سے آگاہ فرمائیں۔ تاہم فی الحال اس قدر کہدینے میں کوئی حرج نہیں کہ

تو مپندار کہ ایں زمزمہ بے سازے ہست

گوشش نزدیک لبم آر کہ آوازے ہست

نیاز

انسان

پرافشاں سرمدی نغمے مرے بربط کے تاروں میں
نشاطِ جاوداں میرے گلستاں کی بہاروں میں

مری منت کشِ احساس ہے آسائشِ گیتی
ہُوا میں تازگی، رقصِ مسلسل آبشاروں میں

مری موجِ تبسم، جلوہ دیتی ہے گلستاں کو
مری برقِ تجلّی، مسکراتی ہے ستاروں میں

مرے ابرِ کرم سے زندگی ہے مستعار اس کی
وہ موجِ رنگ محوِ رقص ہے جو لالہ زاروں میں

زمیں کیا، آسماں کیا، اور ان کی داستاں کیسی!!
یہ میرا ذکر فطرت کر رہی ہے استعاروں میں

غلط کیا ہے، جو خود بینی مرا آئینِ ہستی ہے
کہ ہے خود حُسنِ پنہاں بھی تو میرے بیقراروں میں

مری عظمت کو یہ خاکِ پریشاں کیا سمجھ سکتی!
فلک پر بھی تو کوئی تھا نہ میرے رازداروں میں

امینِ سرِ پنہاں، آرزوئے قلبِ دَوراں ہوں
فرشتے جس کو سجدہ کر چکے ہیں، میں وہ انساں ہوں

اجل کیا ہے، فضائے زندگی کا بے کراں ہونا
خزاں؛ یعنی نئے جلووں سے نظمِ گلستاں ہونا

پہنچ سکتا نہیں دستِ حوادث، میرے داماں تک
سکونِ موج ہے، بیتاب رہنا، پرفشاں ہونا

بنی سرنامۂ تکمیل پروانوں کی بیتابی!
نشاطِ روح ہے اس بزم میں آتش بجاں ہونا

مری تعمیر ہے کاشانۂ ہستی کی ویرانی؛
شکستِ روح کا اک عنواں ہے میرا سرگراں ہونا

جھکا سکتی نہیں میری جبیں دنیا کی رعنائی
کہاں میں اور کہاں سرگشتۂ سود و زیاں ہونا

ترا اک کھیل ہے جوشِ ہجومِ جہل و نادانی
ابھی باقی ہے اسرارِ حقیقت کا عیاں ہونا

تباہی کے علم لہرا چکے پہنائے گیتی میں
یہ موجِ ناتواں اب چاہتی ہے بیکراں ہونا

تغیر کے مناظر ذرّے ذرّے سے نمایاں ہیں
زمیں سے آسماں تک مستقل آثارِ طوفاں ہیں

ارادہ ہے کہ اسرارِ بتاں کو برملا کردوں
جہاں کو جاودانی عشرتوں سے آشنا کردوں

سنواروں اک نئے انداز سے بکھری ہوئی زلفیں
عروسِ دہر کے جلووں کو پھر صبر آزما کردوں

بہت فرسودۂ ایام ہے ترتیب گیتی کی — اب اجزائے کہن کو نذرِ سیلاب فنا کردوں
اٹھاؤں پہلے طوفاں جس سے عالم خاک ہو جائے — پھر اس طوفانِ بربادی کو جولان صبا کردوں
محبت عہد نو میں نامۂ ہستی کا عنواں ہو — شبوں کو صبح کے مانند رنگیں ماجرا کردوں
ہر اک ذرّے سے پھوٹیں سرمدی انداز کے چشمے — فنا کے دام سے ابنائے گیتی کو رہا کردوں
مٹا کر تفرقے مزدوری و سرمایہ داری کے — علم حرّیتِ کامل کے دُنیا میں بپا کردوں

رگِ افسردۂ ہستی میں روحِ بے قرار آئے
گلوں کی طرح ذرّے مسکرائیں وہ بہار آئے

علی اختر (اختر)

مجموعۂ استفسار و جواب

ایکہزار صفحات کا گنجینۂ علم و ادب طیار ہو رہا ہے اور اعلان کیا گیا تھا کہ عہ جسکی قیمت پیشگی آجائے گی اس کو یہ مجموعہ اسی قیمت میں دیدیا جائے گا۔ چونکہ اعلان کی میعاد ختم ہو گئی ہے اس لئے اب کوئی صاحب عہ بھیجکر اپنا نام درج نہ کرائیں طیاری کے بعد جو قیمت مقرر ہوگی، اس سے ایکروپیہ کم پر حسب معمول خریداران نگار کی خدمت میں یہ مجموعہ پیش کیا جائے گا۔ کم از کم پانچروپیہ قیمت کا اندازہ کیا جاتا ہے

منیجر نگار لکھنؤ

خوابستانِ محبت

کیطرف

بس ایک بار ——— خدا کے لئے وہیں لے چل !
جہاں خلش کو سکونِ عظیم کہتے ہیں
جہاں سراب کو موجِ شمیم کہتے ہیں
جہاں، نگاہ کو برقِ کلیم کہتے ہیں
بس ایک بار ——— خدا کے لئے وہیں لے چل !
وہ شہر جس کی زمیں آسماں کا دل چھینے!!
ہر ایک راہ گذر ——— کہکشاں کا دل چھینے!
فضا، جہاں کی بہار جناں کا دل چھینے!
بس ایک بار ——— خدا کے لئے وہیں لے چل !
وہ صبح ——— آہ، وہ ناظورۂ نشاط فروش
وہ شام - آہ، وہ لیلائے میکدہ بر دوش
وہ شہر ——— آہ وہ فردوسِ زار نوشانوش
بس ایک بار خدا کے لئے ——— وہیں لے چل!
وہ نذرگاہِ تمنا ——— وہ آستانِ مراد
ہے ذرہ ذرہ جہاں ——— خضرِ کاروانِ مراد
جہاں کی خاک بھی ہے نقشِ گلفشانِ مراد
بس ایک بار ——— خدا کے لئے ——— وہیں لے چل !
جہاں "شباب" کو آئینہ دارِ نور کہیں!
جہاں ——— "شراب" کو نو بادۂ ظہور کہیں!
جہاں ——— "خمار" کو تقدیسِ چشمِ حور کہیں !
بس ایک بار ——— خدا کے لئے وہیں لے چل !
جہاں ——— نشاط کو اندیشۂ مآل نہیں !!
جہاں ——— خوشی کبھی شرمندۂ زوال نہیں!!
جہاں ——— حنائے کفِ پا بھی پائمال نہیں!!
بس ایک بار ——— خدا کے لئے ——— وہیں لے چل !
جہاں رواں ہیں شرابِ طہور کے چشمے
نشاطِ قدس کے دریا - سرور کے چشمے
جہاں ہیں رقص میں صہبائے نور کے چشمے
بس ایک بار ——— خدا کے لئے ——— وہیں لے چل !
وہ ارضِ قدس جہاں پر فنا کا نام نہیں
جہاں طرب کے لئے غم کا التزام نہیں
جہاں کی شمع کو افسردگی سے کام نہیں
بس ایک بار ——— خدا کے لئے ——— وہیں لے چل !
سواد جس کا نمودِ وفائے لیلیٰ ہے
ہر ایک ذرہ جہاں کا دلِ زلیخا ہے
جہاں روش نے محبت کا خواب دیکھا ہے
بس ایک بار خدا کے لئے وہیں لے چل !

روش (صدیقی)

نگار

رسالہ ہر مہینے کی ۱۵ر تاریخ تک شائع ہوتا ہے

رسالہ نہ پہونچنے کی صورت میں ۲۵ر تاریخ تک دفتر میں اطلاع ہونی چاہیئے۔ ورنہ رسالہ مفت نہ روانہ ہوگا

سالانہ قیمت پانچ روپیہ (صہ) ششماہی تین روپیہ (سے)

بیرون ہند سے آٹھ روپیہ سالانہ پیشگی مقرر ہے

جلد ۲۵	فہرست مضامین اپریل ۱۹۳۴ء	شمارہ ۴

ملاحظات ــــــــــــــــ ۲

ملکہ نورجہان تاریخ کی صحیح روشنی میں ــــــ شاہ محمد زہیر زبیری ــــــ ۹

مکتوبات نیاز ــــــــــــــــ ۲۱

انگلستان کے دستور پر ایک تاریخی نظر ــــــ ڈاکٹر سید نجم الدین احمد جعفری بار ایٹ لا ــــــ ۲۷

بھیا کی چڑیاں ــــــ عبدالجلیل ــــــ ۳۶

یادرفتگاں ــــــــــــــــ ۴۰

غالب کا ایک شعر ــــــ محمد اسحاق ــــــ ۴۵

سادھو کی بط ــــــ احسن ــــــ ۵۴

باب المراسلۃ والمناظرہ ــــــــــــــــ ۵۷

مطبوعات موصولہ ــــــــــــــــ ۶۱

پردیسی کی فریاد (نظم) ــــــ علی اختر ــــــ ۷۸

اعتبار (نظم) ــــــ روشن صدیقی ــــــ ۸۰

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد ۲۵	اپریل سنہ ۳۴ء	شمارہ ۴

ملاحظات

مذہب یا دین اگر کوئی ایسی حقیقت ہے جو خدا کی طرف سے ظاہر کی گئی ہے تو سوال یہ ہوتا ہے کہ کیا حقیقت کبھی بدل سکتی ہے اور کیا خدا اس کو پسند کرتا ہے کہ حقیقت تک پہونچنے میں وہ موانع حائل کرتا رہے

آپ کسی پابند مذہب شخص سے سوال کیجئے وہ یہ کہنے پر مجبور ہوگا کہ مذہب یقیناً خدا کی ظاہر کی ہوئی حقیقت ہے اور وہ کبھی اس کو پسند نہیں کرتا کہ انسان حقیقت تک پہونچنے سے باز رکھا جائے

اچھا اب آپ مختلف مذاہب والوں سے علنحدہ علنحدہ پوچھئے کہ جب مذہب ' خدائی حقیقت ٹھیرا ' تو اس میں تنوع کی کیا ضرورت تھی جبکہ حقیقت کبھی بدل نہیں سکتی اور اس نے مختلف مذاہب پیدا کر کے انسان کو کیوں الجھن میں ڈال دیا ـــــ اس کا جواب ایک آتش پرست یہ دے گا کہ حقیقت تو ایک بار زردشت کے ذریعہ سے ظاہر کی جا چکی ہے ایک یہودی کہے گا کہ حقیقت تو صرف موسوی تعلیم کا نام ہے، ایک عیسائی دعوٰے کرے گا کہ صداقت کی تبلیغ تو صرف عیسٰے نے کی، اسی طرح بودھ مت والا بودھ کی تعلیمات کو، ایک ہندو کرشن کی ہدایات کو اور ایک مسلمان محمدؐ

کے بنائے ہوئے معتقدات کو حقیقت و صداقت سے تعبیر کرے گا اور باقی تمام مذاہب کو حقیقت سے دور ظاہر کرکے لغو و باطل قرار دے گا

اب غور کیجئے کہ ایک شخص جو مذہب کے خیال سے بالکل خالی الذہن ہے، یہ سُنکر کیا اثر قبول کرے گا۔ وہ اگر زیادہ آزادی سے کام نے کر سب کو لغو نہ کہدے گا تو وہ تحقیق و جستجو ضرور کرے گا تاکہ خود کوئی فیصلہ کرکے کسی ایسے نتیجہ پر پہونچے جو اس کے لئے قابل قبول ہو

اچھا آئیے ہم آپ بھی بالکل خالی الذہن ہوکر جستجو کریں کہ صداقت کس مذہب کی تعلیمات میں پائی جاتی ہے اور مذہب کا حقیقی مفہوم کیا ہے ؟

اس سلسلہ میں سب سے پہلے یہ امر غور طلب ہے کہ کسی مذہب کو خدا کی بتائی ہوئی حقیقت و صداقت کہنا کیا معنی رکھتا ہے۔ اس کی دو ہی صورتیں ہوسکتی ہیں۔ ایک یہ کہ خدا براہِ راست اپنے خدائی الفاظ اور اپنی الہٰانہ زبان میں اس کی تلقین فرمائے، یا اپنے کسی خاص بندے میں غور و تامل کی غیر معمولی کیفیت پیدا کرکے اصولِ مذہب وضع کرنے کی طرف مائل کرے، بہرحال جو صورت بھی ہو، اس سے انکار ممکن نہیں کہ مذہب کی صداقت کا تعلق ماحول و زمانہ سے ہوا کرتا ہے اور وقت و حالات کے لحاظ سے اس میں تغیر و تبدل ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ مذہب نام ہے ان اصول کا جو اصلاح اخلاق و معاشرت کے کام آئیں اور چونکہ اخلاق و معاشرت کے معیار کا امتداد زمانہ کے ساتھ بدل جانا ضروری ہے اس لئے وقتاً فوقتاً اصول مذہب کا تغیر بھی لازم ہے

انھیں اصولِ زندگی پر لوگوں کو مستحکم کرنے کے لئے بعض معتقدات دینی وجود میں آئے جو لوگوں کو معاشری قانون کی پابندی پر مجبور کرنے کے لئے ذریعہ و وسیلہ کا کام دیتے تھے، مثلاً یہ کہ جو قانون پیش کیا جاتا ہے وہ خدا کا نازل کیا ہوا ہے اور جس شخص کے ذریعہ سے نازل ہوا ہے وہ خدا کا خاص بندہ ہے اور معجزات کا مالک ہے یا یہ کہ جو شخص اس کی پابندی کرے گا اُسے مرنے کے بعد طرح طرح کے نعائم و لذائذ حاصل ہوں گے اور جو پابندی نہ کرے گا وہ آگ میں ڈالا جائے گا

ظاہر ہے کہ ایک شخص جو صرف ان معتقدات کا ماننے والا ہے اور ان سے آگے بڑھ کر اپنے اخلاق کو متاثر نہیں ہونے دیتا، اس کے لئے بہ لحاظ نتیجہ یہ دینی عقائد بالکل بیکار ہیں، کیونکہ مقصود تو شارع کا جسے آپ نبی، رسول، مرشد، رشی، دیوتا وغیرہ کے نام سے پکارتے ہیں، پورا ہی نہیں ہوا اور وہ عقائد محض عقائد ہونے کے لحاظ سے انسانی زندگی کے لئے کوئی معنی نہیں رکھتے

الغرض اصل مقصود صرف اصلاح اخلاق و معاشرت ہے اور اس کے حصول کے لئے بعض غیر معمولی دماغ رکھنے والے لوگوں نے دین یا شریعت کو رائج کرکے بعض مخصوص عقائد پیدا کئے تاکہ لوگوں کو ترغیب و تخویف سے حقیقی مدعا کی طرف لاسکیں

اس جگہ یہ سوال اٹھانا کہ اگر عقاید دینی کوئی حقیقت نہیں رکھتے تو کیا انبیاء نے ان کو حقیقت ظاہر کرکے غلط بیانی سے کام لیا، درست نہیں کیونکہ اوّل تو اس امر کا امکان ہے کہ ان میں سے اکثر نے اُن عقائد کو واقعی حقیقت باور کرکے پیش کیا ہو اور دوسرے یہ کہ اگر بعض نے ایسا نہیں سمجھا تو دوسروں کی اصلاح کے لئے ایسا ظاہر کرنا قرین مصلحت جانا ہوگا اور مصلحت کے لحاظ سے کوئی بات ایسی کہدینا جو واقعہ کے خلاف ہو کبھی مورد الزام نہیں ہوسکتا

وہ عقائد دینی جو آج معرض بحث میں ہیں زیادہ تر مابعد الطبعیات سے متعلق ہیں یا خدا کے مفہوم سے۔ یعنی اہل مذاہب ایک تو یہ کہتے ہیں کہ حقیقی زندگی تو مرنے کے بعد ہی شروع ہوگی اور وہاں عذاب و ثواب، دوزخ و جنت وغیرہ کے معاملات پیش ہوں گے اور دوسرے یہ کہ خدا نام ہے ایک ایسی ہستی کا جس نے تمام عالم کو اس طرح پیدا کیا جس طرح ایک صناع اپنے قائم کئے ہوئے ارادہ کے ساتھ کسی چیز کو طیار کرتا ہے اور وہ خدا قادر ہے جس وقت جو چاہے تغیر و تبدل کرکے کائنات کے نظام کو بدل دے

آپ اگر جستجو کریں گے تو معلوم ہوگا کہ یہ عقائد مع تمام جزئیات کے کسی ایک قوم یا ملک سے مخصوص نہیں ہیں بلکہ کم و بیش ہر اُس قوم یا ملک میں پائے جاتے ہیں۔ جہاں کوئی مذہب پایا جاتا ہے۔ اس لئے یہ امر غور طلب ہے کہ مہمات عقائد دنیا کی تمام مذہبی قوموں میں کیوں تقریباً ایک ہی سے پائے جاتے ہیں اور وہ کون تھا جس نے اوّل اوّل ان کو حقایق جان کر پیش کیا۔ ہرچند امر ثانی کے متعلق کوئی تعیین دشوار ہے لیکن امر اوّل کی نسبت یہ کہنے میں قطعاً تامل نہیں ہوسکتا کہ ہر جدید مذہب نے اپنے ماسبق مذہب کے معتقدات سے فائدہ اٹھایا اور یہ سلسلہ عہد قدیم تک پہونچکر اس زمانہ وحشت تک پہونچ جاتا ہے، جب انسان کے تجربات دُنیا میں بہت تھوڑے تھے اور اس کا علم حد درجہ ناقص و نامکمل تھا۔

مثلاً آپ جنت اور حور و غلمان کو لے لیجئے۔ کیا کوئی مسلمان دعوے کرسکتا ہے کہ اسلام سے قبل یہ خیال یا عقیدہ کسی اور مذہب میں نہ پایا جاتا تھا —— اگر آپ قدیم ایرانی اور آرین لٹریچر کا مطالعہ کریں گے تو معلوم ہوگا کہ تقریباً یہی عقیدہ اس زمانہ میں بھی پایا جاتا تھا - فارسی زبان میں ایک لفظ پری ہے جو قدیم ایرانی زبان میں " پیرک " تھا۔ اور پیروانِ زردشت کا عقیدہ تھا کہ یہ آسمانی دیویاں ہیں جو ہوا میں رہتی ہیں اور اس قدر جمیل ہیں کہ ان کو دیکھتے ہی انسان فریفتہ ہوجاتا ہے، چنانچہ خود عربی کا فردوس ایرانی لفظ ہے

لفظ حور کے متعلق ہمارے علماء کا خیال ہے کہ وہ خالص عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی میں سفیدی و پاکیزگی کا مفہوم غالب ہے، درانحالیکہ اس کا ماخذ اوستا کا لفظ " ہورہ " ہے جسے پہلوی زبان میں ہور اور موجودہ فارسی میں خور کہتے ہیں، جس کے معنی نور، روشنی اور مجازاً آفتاب کے ہیں۔ حور و غلمان کا عقیدہ ہندوؤں میں بھی پایا جاتا ہے۔ اور ان کے لئے "اپسرائیں اور "گندھرپ " کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں

کسی غزوہ میں مارے جانے پر شہید ہونے اور جنت میں جانے کا خیال بھی آرین خیال ہے۔ چنانچہ دھرم شاستر

میں لکھا ہے کہ جب جنگ میں لوگ بہادری سے لڑتے ہیں - اور پیٹھ نہیں دکھاتے تو بہشت میں جاتے ہیں - اسی طرح اندر، راجہ نل سے جسوقت خطاب کرتا ہے تو بہشت کا ذکر کرتا ہے

اسلامی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ازل میں تمام روحیں پیدا ہو چکی تھیں اور انھوں نے "قالوا بلیٰ" کہا تھا ——— پارسیوں کی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے یہاں اوستا میں اس کے لئے لفظ "فروشی" پایا جاتا تھا - اور پہلوی زبان میں اس کو "فروہر" کہتے ہیں - الغرض یہ عقیدہ کہ روحیں پہلے سے موجود ہیں - مجوس کے یہاں پایا جاتا تھا

اسی طرح ملک الموت کا خیال بھی مجوس کا خیال ہے اور ان کے یہاں بھی ایک فرشتہ "استو ویدھوتوس" کے نام سے پایا جاتا تھا جو رُوح کو جسم سے جدا کرتا تھا

عزازیل کے متعلق مسلمانوں میں جو روایات پائی جاتی ہیں وہ بھی بہت کچھ قدیم ایرانی روایات سے ملتی جلتی ہیں، اور آدم و ابلیس، سانپ اور طاؤس کے متعلق جو کچھ مسلمانوں میں بیان کیا جاتا ہے وہ بھی مجوسی روایات میں نظر آتا ہے - اسی طرح میزان، صراط، نور محمدی، حشر و نشر، حساب و کتاب، دوزخ و جنت، وغیرہ کے متعلق جو اعتقادی مسایل اسلام میں پائے جاتے ہیں وہ قبل اسلام بھی بعض مذاہب میں پائے جاتے تھے - اور اگر تمام مذاہب کی چھان بین کی جائے تو معلوم ہوگا کہ ایک وقت نامعلوم سے یہ خیالات نوع انسانی میں پرورش پاتے چلے آرہے ہیں - اور انسان کی بالکل ابتدائی ذہنی نشو و نما کی یادگار ہیں

ابتدائے عہد انسانی میں، جب کوئی شخص غیر معمولی عقل و ذہانت رکھنے کی وجہ سے اپنے قبیلہ کا سردار بن جاتا تھا تو اس پر دو فرض عاید ہوا کرتے تھے، ایک یہ کہ وہ قبیلہ کے تمدنی و معاشری نظام کو قائم رکھے اور دوسرے یہ کہ وہ افراد قبیلہ کے دل میں پیدا ہونے والی الجھنوں کو دُور کرے

لوگ رات کو خواب دیکھتے تھے اور اس سے آکر پوچھتے تھے کہ اس کا کیا مطلب ہے، کوئی مرجاتا تھا تو اس سے دریافت کیا جاتا تھا کہ وہ کہاں گیا، کسی کو کوئی مرض لاحق ہوتا تھا تو اس سے استصواب کیا جاتا تھا، الغرض ان کی ہر خواہش و جستجو کا مرکز سردارِ قبیلہ ہوا کرتا تھا اور اُسے اپنا منصب قائم رکھنے کے لئے کوئی نہ کوئی جواب دینا پڑتا تھا - کیونکہ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو اس کی قائدانہ حیثیت ضعیف ہوجاتی اور قبائلی نظم و نسق میں وہ کامیاب نہ ہوسکتا

پھر چونکہ مرنے والوں کے ساتھ زندگی میں محبت و رفاقت کا جذبہ متعلق ہوتا تھا اور اُن کی طرف سے لوگوں کو تکلیف پہونچا کرتی تھی - اس لئے بقاءِ رُوح کے خیال سے اُن کو تسکین دی گئی اور رُوح کو عذاب و ثواب کے محل قرار دے کر ترغیب و تخویف کی وہ صورتیں اختیار کی گئیں - جو اصلاح قبایل اور اصولِ معاشرت کے قیام کے لئے ضروری تھیں اس میں شک کرنے کی گنجایش نہیں کہ جتنے مذہبی معتقدات دنیا میں پیدا ہوئے وہ سب نتیجہ ہیں قیاس کا اور

چونکہ قیاس کا تعلق موجودات کے تصورات سے ہوا کرتا ہے، اس لئے حیات مابعد الموت کے متعلق بھی ایک انسان نے اپنے قیاس سے کام لے کر وہی باتیں بیان کیں جو دنیاوی زندگی میں پیش آتی ہیں

خدا کا وہی قہرمانی تصور جو دنیاوی بادشاہوں کا ہوا کرتا ہے، اس کا وہی مختار کل ہونا جو ایک مستبد حکمران انسان کی خصوصیت ہے، بہشت میں انھیں لذائذ و نعائم کا ذکر کرنا جن کی خواہش دنیا میں ہوا کرتی ہے اور دوزخ کے وہی دل دہلا دینے والے مناظر بیان کرنا۔ جن سے عالم آب و گل میں ایک انسان پر دہشت طاری ہو جاتی ہے۔ یہ سب اسی قیاس کی بنا پر تھے جو تجربات دنیا کے سلسلہ میں قائم کیا گیا اور جس کے بغیر کوئی چارہ بھی نہ تھا

مثالاً آپ اسلام ہی کو لیجئے کہ جس سرزمین میں اس کا ظہور ہو وہاں کے باشندوں کی کیا حالت تھی۔ دنیاوی لذائذ و نعائم میں عورت، شراب، دودھ، شہد اور فواکہ ان کا انتہائی نقطۂ نظر تھا اور ان کی قساوت و سنگدلی کا یہ عالم تھا کہ گرم پتھروں پر لٹا لٹا کر ایک آدمی کو مار ڈالنا ان کا روز کا مشغلہ تھا۔ جہل و لاعلمی کا یہ عالم تھا کہ اپنی بے علمی و بے خبری پر فخر کیا کرتے تھے اور باہمد گر معمولی معمولی باتوں پر سالہا سال تک کشت و خون جاری رہنا وہاں کا معمولی منظر تھا، باوجود ایک ہی سر زمین میں سانس لینے کے ہر قبیلہ کا معبود جدا تھا اور افتراق کی وہ تمام کردہ صورتیں جو بھائی کو بھائی سے اور گوشت کو ناخن سے جدا کر دیا کرتی ہیں ان میں بدرجۂ کمال پائی جاتی تھیں

ظاہر ہے کہ اس حالت میں ایک مصلح یا ریفارمر کا اولین فرض یہی ہونا چاہیئے تھا کہ وہ ان کو ایک مرکز پر لائے اور سب کو ایک خیال مشترک سے وابستہ کر دے۔ چنانچہ سب سے پہلے ان کو خدا کی توحید کی طرف دعوت دی گئی۔ ہرچند اللہ اور اللہ کی توحید کوئی ایسی چیز نہ تھی جس سے اہل عرب واقف نہ ہوتے، لیکن اس میں کلام نہیں کہ وہ اس چیز کو بالکل بھلا چکے تھے اور اسی لئے ان کا شیرازہ درہم برہم ہو چکا تھا

ظاہر ہے کہ محض خدا کو ایک کہنا تو سود مند نہ ہو سکتا تھا اس لئے اصلاح معاشرت کے لئے اور وہ صورتیں بھی اختیار کی گئیں جو اس سے قبل مفید ثابت ہوئی تھیں اور عذاب و ثواب، بہشت و دوزخ، حشر و نشر وغیرہ کے وہ تمام عقائد علیٰ حالہا قایم رکھے گئے۔ جن کے بغیر اصلاح ناممکن تھی۔ اگر جاہل عربوں کے سامنے اظہار حقیقت کے طور پر بہشت و دوزخ کا مفہوم صرف روحانی مسرت یا روحانی اذیت بتایا جاتا تو ظاہر ہے کہ ان پر اس کا کوئی اثر نہ ہوتا کیونکہ اس مفہوم سے وہ آشنا ہی نہ تھے اور ان کے ذہن اس قدر ترقی یافتہ نہ تھے کہ وہ اس کی بلندی کو سمجھ سکتے

لیکن جب ان کو بتایا گیا کہ نعائم فردوس میں وہی تمام لذتیں شامل ہیں جن کے لئے وہ تباہ ہو رہے ہیں اور عذاب دوزخ اسی قسم کی سخت گیریوں کی انتہائی صورت ہے۔ جن سے انھیں یہاں واسطہ پڑتا ہے تو ان کی سمجھ میں مذہب کی اہمیت بھی آئی اور وہ اُن اصول اخلاق کے پابند ہو سکے جنکی تبلیغ ایک مصلح کا حقیقی مقصد ہوا کرتا ہے

اس لئے مذہبی معتقدات کے متعلق یہ گفتگو کرنا کہ وہ حقیقتاً لغو و باطل تھے ان معتقدات کی اہمیت کو کم نہیں کر سکتا

کیونکہ اُن سے جو کام لینا مقصود تھا وہ پورا ہو کر رہا اور اگر آج اُن معتقدات سے ہٹ کر کوئی دوسرا ذریعۂ اصلاح اعمال و اخلاق کا اختیار کیا جا سکتا ہے تو مذہب کے حقیقی مقصود کے منافی نہیں۔ اور یہ ایک ایسا باریک نکتہ ہے جس کو سب سے پہلے اسلام اور بانی اسلام نے ظاہر کیا

جیسا کہ ہم نے ابتدائی سطور میں بیان کیا ہے ایک مذہب والا ہمیشہ دوسرے مذہب والے کو گمراہ کہنے کا عادی ہے۔ لیکن قرآن کی تعلیم یہ نہیں ہے اور اس نے تسلیم کر لیا ہے کہ ہر قوم کے لئے ایک ہادی ہوا کرتا ہے، جو اس قوم کی خصوصیات اور زمانہ کی ضروریات کا لحاظ رکھ کر تمدن و معاشرت کے اصول قایم کرتا ہے اور لوگوں کو امن و سکون کی طرف بلاتا ہے۔ آنحضرت نے ہمیشہ یہی کہا کہ میں تم لوگوں کے لئے کوئی نئی چیز نہیں لایا، آپ نے کبھی یہ دعوے نہیں کیا کہ آپ سے مافوق الفطرت معجزات کا ظہور ہو سکتا ہے، آپ نے مذہب کے باب میں کبھی جبر و استبداد کو پسند نہیں کیا اور آپ نے اگر بہشت و دوزخ کا وہ عام مفہوم پیش کیا جو جاہلوں کے لئے قابل قبول تھا تو دوسری طرف اہل علم و عقل کے لئے یہ بھی کہہ دیا کہ یہ سب تشبیہات و استعارات ہیں، حقیقت سے انھیں دُور کا بھی واسطہ نہیں

پھر آپ تمام مذاہب عالم کی تاریخ ڈھونڈھ ڈالئے اور بتائیے کہ کیا محمدؐ کے سوا کوئی اور نبی یا مُصلح ایسا ہوا ہے جس نے انسان کی فطری سطح پر آکر کسی مذہب کی بنیاد ڈالی ہو۔ جس نے اپنے آپ کو "انا بشر مثلکم" سے زیادہ اہمیت نہ دی ہو، جو معجزات اور خرق عادات پیش کرنے سے انکار کرتا ہو، جس نے مذہب کے لئے تلوار اٹھانا حرام قرار دیا ہو۔ جو تمام دوسرے مذاہب کی عزت کرتا ہو، جو اوہام پرستی و لایعنی مراسم عبودیت کا مخالف ہو اور جو مذہب کا مفہوم صرف اخلاق کی پاکیزگی، اور ذہنی ترقی و آزادی قرار دے

اگر انصاف کو ہاتھ سے نہ دیا جائے تو ماننا پڑے گا کہ محمدؐ کی ذات اس باب میں بالکل منفرد نظر آتی ہے اور اس لئے مذہب ہونے کے لحاظ سے تکمیل کا دعوے صرف اسلام ہی کر سکتا ہے

یہ ہیں وہ اصلی خط و خال اسلام اور اس کی تعلیمات کے جو ہر شخص کو غائر مطالعہ کے بعد نظر آسکتے ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ آج اگر میں ان کو ایک مسلمان کے سامنے بیان کروں تو وہ بھی ان کو صحیح باور نہ کرے گا چہ جائیکہ غیر مسلم، کیونکہ آج خود ہمارے علماء کرام اور واعظان ذی احترام کے نزدیک رسول اللہ انسان نہ تھے بلکہ ایک دیوتا تھے جن کے جسم کا سایہ نہ تھا، جن کی پشت پر مہر نبوت ثبت کر کے خدا نے بھیجا تھا، جن کے ہاتھ میں سنگریزے بولنے لگتے تھے۔ جن کی رسالت کا اقرار درخت بھی ایک انسان کی طرح کیا کرتے تھے۔ جب وہ جنگ کرتے تھے تو مدد کے لئے آسمانوں سے فرشتے اتر کر آیا کرتے تھے اور جب آپ کسی مجمع میں ہوتے تو ہمیشہ آپ سب سے بلند نظر آتے خواہ اُن سے زیادہ لانبے قد کے آدمی کتنے ہی وہاں موجود ہوں۔ وہ ایک براق پر سوار ہو کر ساتوں آسمانوں کی سیر کرتے ہوئے عرش اعظم تک پہونچے اور ذات خداوندی سے ہمکلام ہوئے، جبرئیل نے آپ کا سینہ چیر کر دل سے خون کی پھٹکی نکال لی۔ تاکہ معاصی کی اہلیت باقی نہ رہے۔ اور آپ ایک

اشارہ سے پہاڑ کے پہاڑ سونے چاندی میں تبدیل کر سکتے تھے ۔ پھر یہ واہمہ پرستی یہیں تک پہونچ کر ختم نہیں ہو گئی - بلکہ صوفیائے کرام نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ احمد اور احد میں تو میم کا پردہ مصلحتاً رکھا گیا ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ محمدؐ اور خدا میں کوئی فرق نہیں اور اس طرح صنمیات کا پورا لٹریچر اسلام میں داخل ہو گیا

آپ کسی مجلس میلاد میں جا کر شریک ہوں تو آپ کے لئے اس قسم کے معجزات و خوارق عادات سننا ناگزیر ہوگا - اور پوری صحبت میں مشکل ہی سے دو چار واقعات اخلاق محمدی کے متعلق سننے میں آئیں گے

اس لئے موجودہ زمانہ میں جب کہ مذہب کے خلاف ایک عام تحریک دنیا میں پیدا ہو رہی ہے - اسلام کے سامنے یہ سوال نہیں ہے کہ وہ اغیار کے حملہ سے کیونکر محفوظ رہے بلکہ سوال یہ ہے کہ خود اسی کے حامی و علمبردار جو دشمنی اس کے ساتھ کر رہے ہیں اُن کو کیونکر دفع کیا جا سکتا ہے ، اس کی دو ہی صورتیں ہیں ایک یہ کہ ترکی و ایران کی طرح حکومت اپنی ہو اور بزور شمشیر مولویانہ ذہنیت کو ختم کر دیا جائے ، یا خود عوام میں علم کی اشاعت اتنی ہو کہ وہ نقد و نسیہ میں تمیز کر سکیں - لیکن چونکہ ہندوستان میں اول الذکر صورت کا امکان نہیں اس لئے صرف دوسری صورت باقی رہ جاتی ہے ، جو دیر طلب تو یقیناً ہے ، لیکن کسی نہ کسی دن بہر حال اُسے پورا ہو کر رہنا ہے

لفٹننٹ کرنل ڈاکٹر محمد اشرف الحق صاحب ۱۲ مارچ سے لکھنؤ میں مقیم ہیں اور امروز فردا میں دہلی تشریف لیجائیں گے وہاں سے لاہور جانے کا قصد ہے

ڈاکٹر صاحب موصوف ہندوستان میں تجدید شباب کے پہلے ماہر ہیں ، اور جرمنی ، ویانا وغیرہ میں کافی عرصہ تک قیام کر کے اس فن کے تمام شعبوں میں عملی مہارت حاصل کر چکے ہیں - آپ نے متعدد رسائل بھی اس فن پر تصنیف فرمائے ہیں جن میں سے بعض پر نگار میں ریویو ہو چکا ہے " جوانی کے تحفظ " پر ایک کتاب زیادہ بسیط و ضخیم اور بھی آپ نے شایع کی ہے ، جس کا مطالعہ ہر شخص کو کرنا چاہئے

" تجدید شباب " ایک ایسی خواہش ہے جس سے کوئی دل خالی نہیں ، لیکن عام طور پر اس کا مفہوم بہت عامیانہ لیا جاتا ہے —— شباب نام صرف بہیمی قوت کا نہیں ہے بلکہ اس نشاط و ولولہ کا ہے جو جوانی میں ایک انسان کو سراپا عمل بنا دیتا ہے - اور اس میں شک نہیں کہ اگر وسیع مفہوم کو سامنے رکھا جائے تو ڈاکٹر صاحب کے گزشتہ تجربات میں سے اکثر حیرتناک نتائج پیدا کرنے والے ثابت ہوئے ہیں

جو حضرات اس باب میں جدید ترین معلومات حاصل کرنے کے متمنی ہیں اُن کو چاہئے کہ وہ ڈاکٹر صاحب موصوف سے گولکنڈہ - حیدر آباد کے پتہ پر خط و کتابت کریں اور ان کے رسائل کا مطالعہ کریں ، جو نہایت صاف و شگفتہ زبان اور بہت دلچسپ پیرایہ میں یکسر معلومات جدیدہ سے لبریز ہیں

ملکہ نورجہاں تاریخ کی صحیح روشنی میں

(بسلسلۂ ماسبق)

درحقیقت شیر افگن کے قتل کا واقعہ یوں ہے

یہ تو ہم کو معلوم ہے کہ شیر افگن بنگال کا جاگیردار تھا شاہ اسمٰعیل صفوی کی وفات کے بعد علی قلی خاں قندھار کے راستہ سے ہندوستان آتا ہے اور خانخاناں کے دربار میں رسائی پیدا کرتا ہے رفتہ رفتہ دربار شاہی میں رسوخ ہوتی ہے۔ جہانگیر "شیر افگن" کا خطاب دیتا ہے اور بنگال میں جاگیر دے کر سرفراز کرتا ہے یہاں یہ نہایت اطمینان و سکون کی زندگی بسر کرتا ہے۔ سنہ ۱۶۱۱ء میں بنگال میں افغانوں کی بغاوت زیر سرکردگی عثمان خاں شروع ہوتی ہے [1]

بینی پرشاد اپنی کتاب جہانگیر میں لکھتے ہیں :-

اس وقت بنگال میں بغاوت و سازش کا بازار نہایت گرم تھا، افغان سرکشی اور شرارت پر اتر آئے تھے (جہانگیر) کو شبہ ہوتا ہے کہ شیر افگن بھی باغیوں کے ساتھ شریک ہے، [2]

---

[1] اقبال نامہ جہانگیری صفحہ ۱۶ و ۱۷	تاریخ ہند مولانا ذکا اللہ جلد ششم صفحہ ۵۸

[2] جہانگیر صفحہ ۱۳۲

نوٹ :- سر جدو ناتھ سرکار اس مضمون کے سلسلہ میں میرے ایک خط کے جواب میں لکھتے ہیں کہ پروفیسر بینی پرشاد کی یہ دلیل کچھ زیادہ قابل اعتماد نہیں۔ رامیشوری پرشاد (جنکی تاریخ ہند ہمارے صوبہ کے اسکولوں میں پڑھائی جاتی ہے) نے بھی لکھا ہے کہ اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ شیر افگن افغانوں کی بغاوت میں شریک تھا، میں ایک دوسرا مضمون "عثمان خاں کی بغاوت" پر لکھ رہا ہوں میرے اس مضمون کے پڑھنے کے بعد نہایت آسانی کے ساتھ یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ آیا شیر افگن بغاوت میں شریک تھا یا نہیں

ظاہر ہے یہ شبہ جہانگیر کے لئے کس قدر تکلیف دہ ہوا ہوگا کہ وہ جس کو اوس نے جاگیر و خطاب دیا ہو عزت بخشی ہو سرپرستی کا ذمہ لیا ہو خود اوس سے باغی ہوجائے !!

جیمس برگس (James Burguss) لکھتا ہے:-

۱۲ ر اکتوبر ۱۶۰۶ء کو قطب الدین بنگال بشمول بہار کا صوبہ دار مقرر کیا جاتا ہے، اوس کو ہدایت ہوتی ہے کہ وہ شیر افگن علی قلی استجلو، مہرالنسا کے شوہر کو دربار میں بھیجدے۔ شیر افگن جانے سے صاف انکار کرتا ہے، آخر کار آپس کی ایک جھڑپ میں ایک دوسرے کی جان جاتی ہے [۱]

معلوم ہوتا ہے کہ جہانگیر نے اس شبہ پر کہ شیر افگن باغیوں سے ملا ہوا ہے۔ اس کا بنگال میں رہنے دینا مناسب نہیں سمجھا، اس لئے اس کو بلواتا ہے۔ اقبال نامہ جہانگیری کے بیان سے (James Burguss) (جیمس برگس) کے بیان پر کافی روشنی پڑتی ہے کہ قطب الدین بنگال کیوں بھیجا گیا ؟ شیر افگن کی طلبی کی کیا وجہ تھی ؟ شیر افگن کی ہندوستان میں آمد، اکبر کے دربار میں رسائی، جہانگیر کا اس کو خطاب اور جاگیر کا دینا، بیان کرتے ہوئے مصنف اقبال نامہ لکھتا ہے:-

" مگر معلوم ہوا کہ اس کی طبیعت کا خمیر فتنہ جوئی اور شورش پسندی سے مرکب ہے" [۲]

قطب الدین بنگال کا صوبہ دار مقرر ہوتا ہے، جاتے وقت جہانگیر ہدایت کرتا ہے:-

" اگر وہ (شیر افگن) راست کرداری پر قایم رہے، تو اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے، ورنہ ہمارے پاس بھیجدیا جائے، اور اگر آنے میں تساہل کرے تو سزا دی جائے " [۳]

قطب الدین بنگال پہونچ کر شیر افگن کو طلب کرتا ہے، وہ حاضری سے انکار کردیتا ہے، قطب الدین کو اوس کی اس حرکت سے " شبہ " ہوتا ہے، اس کی اطلاع دربار میں کی جاتی ہے، جہانگیر کا دوبارہ حکم آتا ہے:-

" اوس کو روانہ کریں اور اگر اس کے اطوار سے بداندیشی کا اندازہ کریں۔ تو جس طرح رخصت ہوتے وقت ہدایت ہوئی تھی اوس ناہنجار کو سزا دیں " [۴]

قطب الدین دوسرا حکمنامہ پاتے ہی شیر افگن کے یہاں خود جاتا ہے، تاکہ اوس کو " گرفتار " کرے۔ گورنر کی آمد کی خبر

---

[۱] اقبال نامہ صفحہ ۱۷

[۲] ایضاً

[۳] ایضاً

[۴] ایضاً صفحہ ۱۸

سُن کر شیر افگن دو جلادوں کی معیت میں آتا ہے، موقع پاکر قطب الدین کے پیٹ میں تلوار بھونک دیتا ہے قطب الدین لوگوں کو مدد کے لئے پکارتا ہے۔ منیر خاں کاشمیری آتا ہے، شیر افگن پر وار کرتا ہے، اور خود غریب کاشمیری ہلاک ہو جاتا ہے، اور اس عرصہ میں قطب الدین کے آدمی موقع پر پہونچ جاتے ہیں۔ اور شیر افگن کو اوس کے کئے کی سزا دیتے ہیں [1]

جہانگیر کو جب قطب الدین کے مارے جانے کی خبر ملتی ہے تو وہ شیر افگن کو اس طرح پر یاد کرتا ہے :-

مردم ہجوم آوردہ و اورا پارہ پارہ ساختند و بجہنم فرستادند امید ہمیشہ در جہنم جائے آں بدبخت

روسیاہ بودہ باشد [2]

یہ ہے شیر افگن کی قتل کی ساری داستان! باغی اور سرکش کی سزا ہمیشہ قتل و پھانسی ہوا کرتی ہے۔ لیکن چونکہ شیر افگن کے متعلق خود جہانگیر اور گورنر دونوں کو "صرف شبہ" تھا، اس لئے جہانگیر قطب الدین کو تاکید کرتا ہے :-

(۱) اگر خیر خواہی و راست کرداری پر قائم رہے تو اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے،

پھر تاکیداً کہدیتا ہے اگر ایسا نہ کرے،

(۲) تو ہمارے پاس بھیجدیا جائے،

پھر حکم دیتا ہے،

(۳) اگر آنے میں تساہل کرے تو سزا دی جائے،

اس ساری تفصیل کے بعد ظاہر ہے کہ کون سی سزا مقصود تھی؟ بلاشبہ یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ شیر افگن قتل ہوا، لیکن کیوں اور کس لئے؟ کیا اس لئے کہ جہانگیر کو مہرالنسا، سے محبت ہو گئی تھی اور وہ اسے اپنی شریک زندگی بنانا چاہتا تھا یا اس لئے کہ شیر افگن نے اپنی بیوی کو جہانگیر کی مرضی کے موافق طلاق دینے سے انکار کر دیا تھا؟ بلاخوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ شیر افگن کا جو بھی حشر ہوا وہ اوس کے کئے کی سزا تھی۔ بغاوت و سرکشی، فتنہ و فساد، سازش و ریشہ دوانی، اور سب سے بڑھ کر شہنشاہ کے حکم کی نافرمانی، شیر افگن کا سب سے بڑا جرم تھا۔ جیسا کہ جہانگیر نے لکھا تھا اگر وہ راہ راست پر آجاتا تو نہ وہ قتل ہوتا نہ جہانگیر غریب کو نئے نئے قسم کے افسانے گھڑ کر سارے زمانے میں رسوا و بدنام کیا جاتا!

اب میں یہ بتانے کی کوشش کروں گا کہ جہانگیر نے نورجہاں کو شیر افگن کے قتل کے بعد دیکھا، جیسا کہ (Pet ro Della Vella) (پٹرو ڈیلا ویلا) نے لکھا ہے، یا اگر اوس سے پہلے دیکھا بھی ہو تو یہ کوئی ضرور نہیں ہے، کہ اوس سے اوس کو عشق بھی ہو گیا ہو، اگر ایسا تھا تو اس کے صاف معنی یہ ہوئے کہ جہانگیر جس کسی خوبصورت

---

[1] اقبال نامہ صفحہ ۱۶ و ۱۷

[2] ایضاً صفحہ ۵۶

عورت کو دیکھتا تھا - اوس سے اوس کو عشق و محبت ہو جاتی تھی ، حالانکہ ایسا نہیں تھا

نورجہاں شیر افگن کے قتل کے بعد دربار میں بھیجدی جاتی ہے - جہانگیر اس کو اپنی سوتیلی ماں رقیہ سلطانہ کے سپرد کردیتا ہے [1] شیر افگن کے قتل کے بعد نورجہاں دربار میں بھیجدی جاتی ہے ، قطب الدین کے مارے جانے کا جہانگیر کو بے حد ملال تھا ، وہ جانتا تھا کہ اگر شیر افگن تعمیل حکم میں بے اعتنائی و تغافل سے کام نہ لیتا ، تو آج اوس کے مرحوم بھائی کو موت کا مُنہ دیکھنا نصیب نہ ہوتا

ایک مدت تک یہ لڑکی (مہرالنساء) رقیہ سلطانہ کے پاس ناکامی وکس مپرسی کے ساتھ بسر کرتی رہی ، جب اختر مراد کے طلوع ، اور کوکب بخت کی ضیا باشی ہوئی ، اقبال نے استقبال کیا ، طالع خواب گراں سے بیدار ہوا ، سعادت نے مُنہ دکھایا ، دولت جلوہ آرا ہوئی ، زمانہ صرف مشاطگی ہوا - ہوس مچلنے لگی - اُمیدیں بڑھنے لگیں ، آرزوئیں ہر طرف سے گھیرنے لگیں ، درہائے بستہ کی کلید مل گئی ، دل ہائے بستہ نے دوا پائی - الحاصل کرشمہائے آسمانی سے ایک دن جشن نوروز میں جہان پناہ کی منظور نظر ہوئی - پرستاران حرم سرائے کے گروہ میں شامل ہوکر ، عزت و مراتب ارتقاء میں عروج حاصل کرتی ہوئی ، علوی منصب کے آخری منزل پر پہونچ گئی پہلے " نورمحل " نام رکھا گیا پھر چند روز بعد " نورجہاں بیگم " کا خطاب عطا ہوتا ہے [2] و [3]

عشق ، ماں ، باپ ، بھائی ، بہن ، عزیز واقارب ، کی محبت سے کہیں بلند و بالا ہوا کرتا ہے - اگر واقعی (جیسا کہ مورخین لکھتے ہیں) سلیم کو مہرالنساء سے محبت ہو گئی تھی ، اور یہ دیوانگی و عشق کا اثر تھا کہ وہ مہرالنساء کو ہر جائز و ناجائز طریقہ سے حاصل کرنا چاہتا تھا ، تو قطب الدین کے مارے جانے کے صدمہ کو ، مہرالنساء کے عشق پر غالب نہ آنا چاہئے تھا - نورجہاں کے ساتھ جہانگیر کا تغافل ، اور اس کی بے اعتنائی ، صاف بتا رہا ہے - کہ سلیم کو مہرالنساء سے عشق تو کجا اُنس تک نہ تھا - اور یہ غصہ و رنج تو اوس وقت ہو سکتا تھا جب یہ معلوم ہوتا کہ قطب الدین کے قتل میں اُس کا بھی کوئی ہاتھ تھا - شیر افگن کے قتل کے متعلق جتنی تاریخی شہادتیں بھی میں نے پیش کی ہیں اُن سے اشارتاً و کنایتاً بھی یہ پتہ نہیں ملتا ، کہ قطب الدین کے

---

[1] مہرالنساء ، اور اس کی لونڈیوں کے لئے روزینہ خرچ کے لئے صرف ۱۴ر مقرر کیا جاتا ہے تاریخ ہندوستان (History of India by Dow) صفحہ ۶

[2] اقبال نامہ جہانگیر صفحہ ۱۵ و ۱۶

[3] سنہ ۱۶۱۱ میں نورمحل و مارچ سنہ ۱۶۱۶ میں نورجہاں - جہانگیر از پروفیسر بینی پرشاد

مارنے میں مہر النساء کی بھی کوئی سازش تھی، ایسی حالت میں جہانگیر کے غصہ و رنج تغافل و بے مہری کی یہ ساری داستانیں کتنی مہمل و بے سر و پا ہیں

درحقیقت یہ سب کچھ صرف اس لئے گھڑا گیا ہے تاکہ ڈرامے کے تمام سین پوری طرح مکمل ہو جائیں

بیان کردہ واقعات کی تصویر میں، اگر آپ غور سے دیکھیں گے، تو آپ کو صاف معلوم ہو جائے گا، کہ جہانگیر کا عشق و محبت اوس وقت سے شروع ہوتا ہے جب وہ اپنے شوہر کے قتل کے بعد مستقلاً دربار میں آ کر رہ جاتی ہے۔ نورجہاں حسن و جمال میں یکتا تھی اوس میں اس کے دیکھنے والوں کیلئے کشش و جاذبیت تھی .... سلیم سب کچھ سہی، لیکن ذوق سلیم رکھتا تھا، وہ اگر مہر النساء کی ان تمام خوبیوں کے باوجود اس سے لاپرواہی برتتا اور اسے گوشۂ گمنامی میں چھوڑ دیتا تو آج ہم اوسے بد ذوق کہتے

اس وقت تک جہانگیر و نورجہاں کی ملاقات اور شیر افگن کے قتل کے متعلق جو کچھ میں نے لکھا ہے اوس سے پوری طرح یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ سلیم نے مہر النساء کو جب بھی اور جہاں کہیں بھی دیکھا ہو اس سے اس کو عشق یا اس کا شیدائی نہ تھا۔ اور شیر افگن اگر قتل ہوا تو اس لئے نہیں کہ بدقسمتی سے وہ مہر النساء کا شوہر تھا بلکہ وہ مجرم تھا اور مجرم کی سزا جو ہونی چاہئے تھی وہ اس کو ملی

اب میں اپنے مضمون کے تیسرے حصہ سے بحث کروں گا۔ اور دلیل و ثبوت کے ساتھ یہ بتانے کی کوشش کروں گا کہ اس الزام کی کوئی حقیقت و اصلیت نہیں ہے۔ کہ جہانگیر نااہل و ناکارہ امور سلطنت سے بے سروکار تھا، اور سلطنت کی سازی ذمہ داری نورجہاں پر تھی۔ اور وہی سیاہ و سفید کی مالک تھی، جو چاہتی تھی وہ کرتی تھی

چونکہ جہانگیر کے حسن و عشق کے افسانے کو اسقدر طول دے دیا گیا تھا اس لئے اس کی ضرورت پڑی کہ جہانگیر کو نااہل و ناکارہ امور سلطنت سے بے سروکار عیاش و آرام طلب سب کچھ بنا دیا جائے، تاکہ آنے والی نسلیں جب جہانگیر کے متعلق کچھ پڑھیں تو صرف یہ ہی نہیں جانیں کہ وہ شرابی و کبابی عیاش و آرام طلب بدکار و نااہل تھا بلکہ اپنے لائق باپ کا نالائق بیٹا تھا، اس میں حکومت و حکمرانی کی قطعی کوئی صلاحیت نہ تھی۔ اور ان باتوں کو ہمارے مؤرخین نے نہایت آب و رنگ کے ساتھ بھی بیان کیا ہے

اس سلسلے میں تین سوالات یکے بادیگرے پیدا ہوتے ہیں :-

(۱) کیا یہ حقیقت ہے کہ جہانگیر میں حکومت کی صلاحیت مفقود تھی

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ فقدان صلاحیت کب سے شروع ہوا، کیا جہانگیر شروع ہی سے حکمرانی کا نااہل تھا، یا نورجہاں کے آنے کے بعد سے اس کی ابتدا ہوتی ہے ؟ سنہ ۱۶۰۵ء میں جہانگیر تخت نشین ہوتا ہے

اور سنہ ۱۶۱۱ء[۵] میں نورجہاں اس کی شریک زندگی بنتی ہے اب دیکھنا یہ ہے کہ اس چھ برس کے عرصہ میں اس نے حکمرانی کس طرح کی اگر واقعتاً اس کا ثبوت مل جائے کہ جہانگیر تخت نشینی کے بعد سے نورجہاں سے شادی تک نہایت تدبر ہوشیاری اور جس طرح ایک لائق بادشاہ کو حکومت کرنی چاہیئے کی تو پھر یہ مسئلہ خود بخود حل ہو جاتا ہے کہ ۱۶۰۵ء سے ۱۶۱۱ء تک وہ "لایق حکمراں" تھا

"اس شاندار اور لائق حکمراں کی سلطنت میں دن دونی رات چوگنی، ترقی ہوتی رہی، تخت نشین ہوتے ہی، سب سے پہلا کام جو اس نے کیا وہ یہ کہ (Transit duties)، (Pol tax) ہندوؤں پر سے (جزیہ)، نیز یتیموں کی جائداد سے، سمندر، اور کانوں کی پیداوار سے تقریباً ہر قسم کا ٹیکس اٹھا دیا۔[۴]

"اس کی سب سے پہلی کارروائی نہایت منصفانہ اور کارآمد تھی، اس نے اپنے والد (اکبر) کے وقت کے تقریباً تمام وزرا کو اپنی اپنی جگہ پر برقرار رکھا، اس نے اُن تمام (Taxes) کو موقوف و بند کر دیا جو نہایت قابل اعتراض اور تکلیف دہ تھے۔ اور جو اکبر کے زمانہ میں بھی موجود تھے، ہر شخص کو اجازت تھی کہ جب اور جس وقت چاہے، سلیم سے آکر اپنے درد و دکھ کی شکایت بیان کرے۔ لیکن یہ اطمینان و سکون اور خوش حالی و فارغ البالی خسرو کی بغاوت کی وجہ سے درہم برہم ہو گئی"[۳]

ایک شخص جس میں حکومت کرنے کی صلاحیت و قابلیت ہو، وہ بلا کسی وجہ و سبب کے حکومت دوسروں کے سپرد کر دے، دعقل کی بات نہیں معلوم ہوتی۔ ایسا ممکن ہے کہ ایک شخص اپنے میں کام کرنے کی اہلیت نہ پاکر دوسروں کے سپرد کر دے، لیکن ایسا کرنا انسانی فطرت کے بالکل منافی معلوم ہوتا ہے۔ کہ ایک انسان اپنے میں کام کرنے اور اس کو باحسن وجوہ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوئے اپنی ذمہ داریوں کو دوسروں کے سپرد کر دے۔ ایسا وہی لوگ کرتے ہیں اور اس کی آئے دن بیشتر مثالیں ملا کرتی ہیں کہ جب کسی ناکارہ و نااہل کے سپرد کسی قسم کی ذمہ داری کر دی جاتی ہے۔ تو وہ اپنی ہر ممکن کوشش سے اس سے علحدہ ہی رہنا چاہتا ہے۔ جہانگیر اُن عیاش و نفس پرست حکمرانوں کی طرح نہ تھا، جن کا تنہا مشغلہ ناچ و رنگ، شراب و کباب، عیاشی و بدکاری تھا۔ بلاشبہ وہ زاہد خشک نہ تھا۔ وہ زندہ دل، اور صاحب ذوق تھا۔ وہ شراب پیتا تھا، ناچ و رنگ کی

بہ سلسلۂ صفحہ (۱۳) [۱] تاریخ اسمتھ (Smith) ۱۲ر اکتوبر ۱۶۰۵ء

[۲] ایضاً

[۳] وقائع اسد بیگ صفحہ ۳

[۴] ارسکن مین (Marshman) صفحہ ۶۳

محفلوں میں شریک ہوتا تھا۔ لیکن یہ سب کچھ اس کا تنہا مشغلہ نہ تھا وہ ان تمام چیزوں کا دلدادہ و شیدائی ہونے کے باوجود بھی ایک بیدار مغز، رحم دل، اور منصف مزاج حکمراں تھا

خسرو بغاوت کرتا ہے، دربار میں خبر پہونچتی ہے، امیر الامرا جہانگیر سے آکر دریافت کرتے ہیں کہ کیا کرنا چاہیئے دیکھئے بادشاہ کن الفاظ میں حکم دیتا ہے:-

"اگر وہ راہ راست پر نہ آئے تو مجرم کی جو سزا ہوتی چاہیئے اس کے دینے میں تمہیں ذرا تامل نہ ہونا چاہیئے۔ ملوکیت باپ و بیٹے کے رشتہ کی کوئی پرواہ نہیں کرتی اور یہ سچ کہا گیا ہے ایک بادشاہ اس قسم کے جھگڑوں سے بالاتر ہوتا ہے" [۱]

ان جملوں کو بار بار پڑھیئے اور اندازہ لگائیے کہ کیا اس قسم کے الفاظ کسی ناکارہ و نااہل، عیاش و آرام طلب حکمراں کی زبان سے نکل سکتے ہیں ؟ جواب نفی میں ہوگا

اب نورجہاں کی شادی اور اس کے اثر و رسوخ کے بعد سے جہانگیر کی زندگی کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے دیکھنا یہ ہے کہ ۱۶۱۱ء یعنی شادی کے بعد سے اس نے حکومت کس طرح کی ؟ اگر یہ صحیح ہے کہ ۱۶۰۵ء سے ۱۶۱۱ء تک وہ نہایت بیدار مغز، منصف مزاج، اور رحم دل حکمراں تھا۔ تو پھر کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ آخر جہانگیر میں اس قسم کی تبدیلی کیوں پیدا ہوگئی ؟ جہانگیر خود لکھتا ہے :-

"میں نے ہمیشہ اپنے آپ کو گمراہ کن مشورہ کے قبول کرنے سے باز رکھا، میری ساری کارروائی، میری اپنی ہی سمجھ، اور میرے اپنے ہی تجربے پر مبنی رہی ہے، میرے دماغ میں والد مرحوم، اور میرے مذہبی پیشوا (شاہ سلیم چشتی) کا یہ مشورہ ہمیشہ جاگزیں رہا کہ بادشاہ اور شاہزادے کے لئے دو باتیں نہایت ضروری ہیں ایک پیش بینی و دانائی اور دوسری کامیابی و فتح یابی" [۲]

لوگوں کا یہ گمان بلکہ یقین کہ جہانگیر نورجہاں کے آنے کے بعد سے سلطنت کی تمام ذمہ داریوں سے علٰحدہ و سبکدوش ہوگیا تھا، کہاں تک صحیح ہے ؟ منتخب الاخبار کے ذیل کے سطور سے اس کی پوری پوری تحقیق ہوجاتی ہے

"اس وقت یعنی ۱۰۲۶ھ [۳] میں غریب و امیر، ادنیٰ و اعلیٰ سب یکساں طور پر خوشحالی

---

[۱] واقعات جہانگیری صفحہ ۲۹۲

[۲] تاریخ سلیم شاہی الیٹ جلد ششم صفحہ ۲۶۸

[۳] مطابق ۱۶۱۷ء

فارغ البالی، اطمینان وسکون کی زندگی گذار رہے ہیں اور لوگ اندرونی اور بیرونی
تمام خطرات سے محفوظ ہیں۔ اس لئے وہ ہمیشہ خدا کی درگاہ میں بادشاہ کے عروج و
ترقی کے لئے دست بدعا رہتے ہیں جو ان کی نظر میں سلطنت کا محافظ اور خدا کا سایہ ہے۔[1]

ملک کی یہ حالت نورجہاں سے شادی کے سات برس بعد (۱۶۱۷ء) کی ہے۔ پھر یہ الزام کس طرح عاید ہو سکتا ہے، کہ جہانگیر نورجہاں سے شادی کے بعد ہی سے، سلطنت کے جھگڑوں سے آزاد ہو گیا تھا۔ جہانگیر کی زندگی میں (موت سے کچھ دن پہلے) ایک دَور ایسا بھی آتا ہے، جب وہ تھک گیا تھا، اور سلطنت کے بارِ عظیم کو تنہا نہیں اٹھا سکتا تھا، اور اس کی ضرورت ہو گئی تھی کہ امورِ سلطنت کی انجام دہی میں وہ اپنے خیر خواہوں اور ہمدردوں سے بھی مدد لے، یہ دَور اس کی ضعیفی اور بڑھاپے کا ہے، اس وقت وہ کوئی کام بغیر آصف خاں، نورجہاں اور دوسرے مدبران سلطنت کے مشورہ کے نہیں کرتا تھا لیکن اس وقت تک جب تک اوس کے قوی مضمحل نہیں ہوئے تھے۔ اس کی صحت اچھی تھی، اور جب تک وہ تنہا سب کچھ کر سکتا تھا۔ اس کو کسی کی محتاجی نہیں ہوئی۔ علامہ شبلی "جہانگیر و تزک جہانگیری" میں لکھتے ہیں:-

"ہم دیکھتے ہیں کہ کبھی وہ مہمات پر فوجیں بھیج رہا ہے۔ کبھی ایک غریب بڑھیا کی ایک
طاقت ور درباری کے مقابلہ میں دادرسی کر رہا ہے، کبھی علاقہ کی پیمائش میں مصروف ہے،
کبھی صوبہ جات کے گورنروں کے نام احکام جاری کر رہا ہے، کبھی ملکی تحقیقات میں مصروف
ہے، کبھی سرحدی حکمرانوں سے تعلق پیدا کرنے کی کوشش کر رہا ہے، کبھی علماء کی
مجلس میں شریک ہے، کبھی غیر مذہب والوں سے علمی مباحثے کر رہا ہے، ایسی حالت میں
جب کام کرتے کرتے تھک جاتا ہے تو رباب نشاط و نغمہ وسرود سے بھی دل بہلا لیتا ہے۔ اگر
یہ جرم ہے تو سب کو اس جرم کا مرتکب ہونا چاہیئے!

بادہ مے خور و نہ بادہ سامی باش"

جہانگیر کے متعلق مؤرخین کی یہ غلط فہمی، درحقیقت ذیل کی تین باتوں کی وجہ سے پیدا ہوئی،

(۱) جہانگیر کی نورجہاں سے غایت محبت،

(۲) سکوں پہ نورجہاں کا نام، اور اس کی تصویر، اور نیز شاہی فرمان پر اس کے دستخط،

(۳) نورجہاں کی بیٹی (لاڈلی بیگم) کی نسبت پہلے فرخ (شاہ جہاں) سے، لیکن بعد کو بجائے فرخ سے اس کی شادی شہریار سے ہوئی ہے،

---

[1] الفضول الاخبار صفحہ ۲۲۹

اسی سلسلہ میں یہ بتا چکا ہوں، کہ جہانگیر نورجہاں سے بے حد محبت کرتا تھا۔ اور وہ اپنی زندگی سے بھی زیادہ عزیز سمجھتا تھا۔ ہولڈن (Holden) لکھتا ہے کہ جہانگیر نے نورجہاں سے شادی کے بعد ایک مرتبہ کہا تھا کہ :-

"اس سے (نورجہاں) شادی سے قبل میں شادی کے اصلی مفہوم سے بالکل نا آشنا تھا" [1]

جہانگیر کی یہ فریفتگی اوس وقت تھی جب کہ نورجہاں کی عمر پینتیس برس (۳۵ برس) [2] تھی لیکن باوجود اس کے کہ اس کا سن زیادہ ہو چکا تھا اس کی کشش و جاذبیت میں کسی قسم کا کوئی فرق نہیں پیدا ہوا تھا وہ اس وقت بھی جہانگیر کے لئے جوان تھی، خوبصورت تھی، حسین تھی، اس کی ہر ہر ادا اوس کے لئے ایک خاص اثر و کیفیت رکھتی تھی، نورجہاں پر اس کے اعتماد کا یہ حال تھا کہ جب کبھی بیمار پڑتا تو طبیبوں کو یہ کہکر اپنے پاس سے علیحدہ کر دیتا کہ :-

"نورجہاں میرے لئے کافی ہے"

لیکن باوجود اس دیوانگی و عشق کے جو جہانگیر کو نورجہاں سے تھا ایک مرتبہ جب نورجہاں ایک شخص کو اپنے ماہتابی سے گولی مار دیتی ہے اور قاضی کا فیصلہ نورجہاں کے خلاف ہوتا ہے تو جہانگیر حکم دیتا ہے کہ نورجہاں کشاں کشاں دربار میں لائی جائے لیکن کسی طرح مقتول کے وارثوں کو ایک کثیر خوں بہا دے کر اپنی برائت کراتی ہے اس واقعہ کے بعد جہانگیر محل میں جاتا ہے اور بے ساختہ نورجہاں کے پاؤں پر گر پڑتا ہے اور کہتا ہے :-

"تو اگر کشتہ شدی آہ چہ می کردم من" [3]

گو اس واقعہ کو بہت سے لوگ صحیح ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں ان کا خیال ہے کہ علامہ شبلی نے اس واقعہ کو صرف "ضرورت شعری" کے لئے "تصنیف" کیا تھا، خواہ تاریخی حیثیت سے یہ واقعہ صحیح ہو یا غلط لیکن اس سے دو اہم نتائج ضرور اخذ کئے جا سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ جہانگیر صحیح معنوں میں منصف مزاج تھا اور دوسرے یہ کہ اس کو نورجہاں سے بے حد محبت تھی، اس کا پیروں کو پکڑ کر یہ کہنا صاف بتا رہا ہے کہ جہانگیر نورجہاں کا شیدائی و دیوانہ تھا۔ اس سے اس کو سچا عشق تھا اور یہ حقیقت ہے کہ نورجہاں سے ایک لمحہ کے لئے بھی جدا ہونا اُس پر شاق گذرتا تھا [4] اکثر وہ نورجہاں کو سامنے بٹھا کر پہروں

---

[1] (The Moghal Emperor of India by Holden) صفحہ ۲۴۶ و ۲۴۷

[2] Indian History by Rameshwary Prashad صفحہ ۲۹۳

لیکن لین پول (Lainpol) لکھتا ہے کہ اوس وقت نورجہاں کی عمر ۳۴ برس کی تھی صفحہ ۳۱۷ و ۳۱۸

[3] جہانگیر و تزک جہانگیری از علامہ شبلی

[4] جہانگیر از پروفیسر بینی پرشاد صفحہ ۱۳۹

دیکھتا رہتا تھا۔ اور جب دربار کرتا تھا تو نورجہاں اُس کی پشت پر پردہ میں بیٹھی ہوتی تھی - جہانگیر شراب بہت پیتا تھا، جب تک نورجہاں خود سے ڈھال کر اسے پیش نہ کرتی تھی، وہ نہ پیتا - اس طرح نورجہاں کو اس کا موقع ملا کہ وہ جہانگیر کی شراب کی کثرت کو کم کرے اور اس میں وہ بہت حد تک کامیاب بھی ہوئی اور یہی وجہ تھی کہ جہانگیر اپنی آخری عمر میں بہت کم پینے لگا تھا یہ تھا جہانگیر و نورجہاں کی محبت کا عالم!

جہانگیر بیمار ہو کر کشمیر جا رہا تھا راستہ میں آصف خاں اور مہابت خاں سے ایک جھڑپ ہوتی ہے - آصف خاں کو شکست ہوتی ہے اور وہ بنارس میں پناہ لیتا ہے - اور مہابت خاں بادشاہ کا محاصرہ کرتا ہے اور جہانگیر گویا مہابت خاں کے ہاتھوں گرفتار ہو جاتا ہے، نورجہاں بھی ساتھ گرفتار ہوتی ہے لیکن موقع پا کر نکل بھاگتی ہے اور تھوڑی سی فوج اکٹھا کر کے، مہابت خاں سے جنگ کرتی ہے، اور خوب لڑتی ہے، اور خوب خوب اپنا ہنر دکھاتی ہے، اور اس طرح جہانگیر کو ذلت و مصیبت سے نجات ہوتی ہے ۱ نورجہاں کا مہابت خاں اور اس کی فوج سے لڑنا اور اپنے آپ کو خطرے میں ڈالنا صاف بتا رہا ہے کہ نورجہاں کو جہانگیر کا کتنا خیال تھا اور اس سے اس کو کس قدر محبت تھی، لیکن اگر ان حالات کے ماتحت جہانگیر نے کبھی نورجہاں کے نام پر سکے جاری کرا دیے، شاہی کاغذات پر کبھی اس کے دستخط ہو گئے تھے، تو اتنی سی بات پر ہمارے مؤرخین کا یہ فیصلہ کہاں تک درست ہے، کہ جہانگیر عضو معطل تھا اور نورجہاں جز و کل تھی، اور جو چاہتی تھی، اور جیسے چاہتی تھی کرتی تھی ۲

جو لوگ عشق و محبت کے نفسیاتی پہلو سے واقف ہیں، وہ نہایت آسانی سے اس کا اندازہ لگا سکتے ہیں کہ جب صحیح معنوں میں کسی سے خلوص و محبت ہوتی ہے تو پھر آپس میں کسی قسم کا امتیاز و فرق باقی نہیں رہتا، اور یہ کوئی اعجوبہ بات نہیں ہے، اس قسم کی بیشتر مثالیں ہمیں آئے دن روزمرہ کی زندگی میں ملا کرتی ہیں - میں خود دو دوستوں کے متعلق اس قسم کا ایک واقعہ جانتا ہوں کہ ان دونوں میں کسی قسم کا کوئی فرق نہ تھا - تو اگر شہنشاہ جہانگیر نے کبھی نورجہاں بیگم کے نام سے سکہ جاری کر دیا، شاہی فرمان اور کاغذات پر بجائے خود دستخط کرنے کے اس سے دستخط کرا دیا، تو کون سا جرم ہو گیا، اور اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ عنان حکومت بھی نورجہاں ہی کے ہاتھ میں تھی - درحقیقت یہ سب کچھ جہانگیر کی غایت

---

۱ تاریخ ہندوستان آرٹیلر و العقول اخبار صفحہ ۲۴۸

۲ مورلینڈ (Jahangir's India by Morland) لکھتا ہے کہ شہنشاہ کے احکام اور عطیات پر اس وقت تک عمل درآمد نہیں ہوتا تھا جب تک کہ ملکہ کی منظوری نہ ہو جاتی تھی - صفحہ ۵۰ لیکن فرنسس برنیر (Francis Bernir) ان کے اقتدار (Extraordinary Domination) کے متعلق نہایت زوردار الفاظ میں لکھتا ہے لیکن اس قسم کی ایک مثال بھی ثبوت میں پیش نہیں کرتا - جہانگیر از بینی پرشاد صفحہ ۱۳۶

محبت کا اثر تھا کہ وہ اپنے اور نورجہاں میں کسی قسم کا امتیاز نہیں پسند کرتا تھا۔ اور اس کا بھی کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ جب سے نورجہاں کی شادی ہوئی تھی اوس وقت سے لے کر جہانگیر کی موت تک برابر ملکہ ہی کے نام پر سکے جاری ہوتے رہے۔ اور شاہی فرمان و کاغذات پر برابر اوسی کے دستخط ہوا کئے۔

پروفیسر بینی پرشاد لکھتے ہیں:۔

"کبھی کبھی اوس (نورجہاں) کے نام سے بھی سکے جاری ہوئے اور بعض فرامین پر اس کے دستخط بھی پائے جاتے ہیں۔" [۱]

پروفیسر موصوف اسی سلسلہ میں نوٹ دے کر لکھتے ہیں:۔

"معتمد خاں کہتا ہے کہ تقریباً تمام فرامین پر نورجہاں ہی کے دستخط ہوا کرتے تھے لیکن یہ بالکل غلط ہے بعض فرامین جن کا ہمیں خود پتہ لگا ہے اس پر نورجہاں کے دستخط نہیں ہیں اور بہت سے سکے جن کی تصویریں لین پول (Lainpol) نے دی ہیں نہ اون پر اوس کا نام ہے۔" [۲]

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ کبھی شہنشاہ محل میں ہوں گے اور ملکہ نورجہاں ساقی گری کے فرائض انجام دے رہی ہوں گی ایسی حالت میں اگر کوئی فرمان دستخط کے لئے پیش کیا ہو گا تو انھوں نے نورجہاں کا ہاتھ پکڑ کر یہ کہا ہوگا:۔

"بیگم اس فرمان پر بجائے میرے تم دستخط کر دو"!

اسی طرح پر کبھی نورجہاں کے دستخط فرمان پر ہو گئے ہوں گے اسی طرح کبھی عالم سرور میں یہ کہدیا ہوگا کہ بجائے اس کی تصویر کے نورجہاں بیگم کی تصویر بنا دی جائے

نورجہاں کے اس خود ساختہ اثر و اقتدار کے متعلق جو غلط فہمی پیدا ہوئی، اوس کی دوسری وجہ یہ تھی کہ شیر افگن سے اوسے ایک بیٹی (لاڈلی بیگم) تھی جس کی شادی وہ شاہزادہ خرم (شاہ جہاں) سے کرنا چاہتی تھی اور ہندوستان کی رسم کے مطابق اس نے اپنے ہونے والے داماد کے لئے کیا کچھ نہ کیا۔ پروفیسر بینی پرشاد لکھتے ہیں:۔

"کہ جب وہ خرم کی دوست تھی تو اس نے اس کو شاہزادگی کے انتہائی عروج پر پہونچا دیا اور جب وہ اُس کی دشمن ہوگی تو اس نے اس کو ذلیل و خوار کر دیا۔" [۳]

---

[۱] جہانگیر از بینی پرشاد صفحہ ۱۹۳

[۲] ایضاً

[۳] ایضاً ایضاً صفحہ ۱۸۵

واقعہ یوں ہے کہ نورجہاں اپنی لڑکی لاڈلی بیگم کی شادی شاہزادہ خرم سے کرنا چاہتی تھی، اور آصف خاں بھی اپنی بیٹی ممتاز محل کی شادی خرم ہی سے کرنا چاہتا تھا۔ خرم بلند خیال، حوصلہ مند، اور دور اندیش تھا۔ اوس نے سوچا کہ اگر وہ لاڈلی بیگم سے شادی کرتا ہے تو اس کو سلطنت کے حاصل کرنے میں بہت زیادہ مدد نہیں ملے گی۔ برخلاف اس کے اگر وہ آصف خاں کی بیٹی ممتاز محل سے شادی کرتا ہے تو آصف خاں سے مدد کی بہت زیادہ توقع ہے اور یہی ہوا خرم کی شادی ممتاز محل سے ہوگئی۔ نورجہاں کو اس کا سخت رنج ہوا۔ اب اس کے لئے بجز اس کے اور کوئی چارہ نہ تھا، کہ وہ لاڈلی بیگم کی شادی شہریار سے کردے۔ نورجہاں خوب جانتی تھی کہ شہریار جہانگیر کے تمام بیٹوں میں سب سے زیادہ نااہل ونا کارہ، جاہل و بدسلیقہ تھا۔ آخر مجبوراً [1] لاڈلی بیگم کی شادی شہریار سے ہوگئی فطرتاً نورجہاں کی محبت و ہمدردی خرم کی طرف سے شہریار کی طرف منعطف ہوجانی چاہیے تھی اور ہوئی۔ اور اُس کی ساری کوشش اب اس میں صرف ہوتی تھی کہ وہ جہانگیر کو خرم کی طرف سے بدظن و بدگمان کردے۔ اور بجائے خرم کے ہندوستان کے تخت و تاج کا وارث شہریار کو بنادے۔ ایک عورت اپنے حصول مقصد کے لئے جو کچھ کرتی ہے یا کرسکتی ہے وہ نورجہاں نے بھی کیا۔ اپنے داماد شہریار کے لئے شاہزادہ خرم کی دشمن ہوگئی۔ اور بھائی سے ہمیشہ کے لئے بگڑ گئی اور ہر جائز وناجائز طریقہ سے وہ شہریار کی مدد و پاسداری کرنا چاہتی تھی اور اس نے کی

ایک شخص جس میں تھوڑی بہت بھی صلاحیت واہلیت ہوتی ہے وہ تھوڑی سی مدد کے بعد خود سے اپنی راہ نکال لیتا ہے لیکن جو غریب خود ہی عقل وسمجھ سے معذور ہو۔ اور اسمیں اہلیت وصلاحیت کا فقدان ہو اس کی لاکھ ہمدردی کیجئے، مدد کیجئے، اس کو راہ بتائیے، وہ جہاں اور جس جگہ پر ہے اس سے ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکتا۔ یہی حال غریب شہریار کا تھا۔ جتنی کچھ مدد نورجہاں نے اس کے لئے کی تھی اگر شہریار کی جگہ پر کوئی دوسرا ہوتا تو اپنی بہتری وبھلائی کی راہ خود نکال لیتا۔ اس سلسلہ میں جو کچھ بھی نورجہاں نے کیا اوس سے بھی لوگوں نے یہی اندازہ لگایا کہ وہ جہانگیر پر حاوی تھی اور سلطنت کے نظم ونسق کا دارومدار اسی پر تھا۔ حالانکہ اگر ایسا ہوتا تو سب سے پہلے وہ جہانگیر کو اس بات پر مجبور کرتی کہ وہ خرم کو مجبور کرے کہ وہ لاڈلی بیگم ہی سے شادی کرے اور جہانگیر سے یہ کہتی کہ وہ اپنی زندگی ہی میں شہریار کے حق میں وراثت کا اعلان کردے۔ لیکن اُس میں اتنی عقل وسمجھ تھی اور وہ شہریار اور لاڈلی بیگم کی محبت میں اسقدر پاگل نہیں ہوگئی تھی کہ ان باتوں کے آیندہ نتائج پر غور نہ کرتی اس لئے اس نے جہانگیر کو کبھی بھی اس کے لئے مجبور نہیں کیا کہ وہ اپنی زندگی ہی میں وراثت کا اعلان کردے

اب ان تمام تفصیلات کے بعد ہر شخص اپنی اپنی عقل وسمجھ کے مطابق جہانگیر کی اہلیت ونااہلیت اور نورجہاں کے اثر واقتدار کے متعلق خود فیصلہ کرے

شاہ محمد زُہیر (زبیری)

[1] ۱۶۲۱ء میں

مکتوبات نیاز

گزشتہ ماہ سے "مکتوبات" کا سلسلہ بند کر دیا گیا تھا۔ کیونکہ اُن کو علیحدہ کتابی صورت میں شایع کرنے کا ارادہ ہے، لیکن اسکے اجراء پر اسقدر اصرار ہوا کہ دوبارہ پھر اس کو شروع کیا جاتا ہے۔ تاہم اس کا لحاظ رکھا جائے گا کہ جب یہ "کتاب" کی شکل میں شایع ہو تو نصف سے زیادہ غیر مطبوعہ مکتوبات بھی اس میں شامل ہوں۔

نیاز نوازا، کرم گسترا۔

اس دل پُرسی کا شکریہ ادا کروں بھی تو کیونکر، جبکہ ہر اعترافِ احسان پر آپ کی طرف سے تازہ بارشِ کرم کے تماشے بارہا دیکھ چکا ہوں۔ اسے حُسنِ طلب نہ سمجھئے۔ یہ داستان ہے اُس "حُسنِ عطا" کی جو "وجودِ تمنا" نہیں بلکہ اس کا "امکان" بھی کسی دل میں نہیں دیکھ سکتا۔

کچھ زمانہ سے آپ کی صحت کے متعلق متوحش خبریں سُن رہا تھا، اس لئے عریضہ بھیجا تھا۔ لیکن آپ نے باایں ہمہ ضعف و ناتوانی اُلٹی میری ہی تیمارداری شروع کر دی۔

اگر ایک لمحہ کے لئے بھی مجھے منصب خدائی مل جاتا، تو آپ کو معلوم ہے میں کیا کرتا؟ —— خضر و الیاس کی عمریں چھینکر آپ کو دیدیتا اور "مولوی کا جذبۂ پرافشانی" خود لے لیتا۔ وہ اس لئے کہ آپ کی حیات آپ کے ولولۂ کرم کا ساتھ دے سکے اور یہ اس لئے کہ بڑھا ہونے کے بعد بھی جوان بنا رہوں ——

میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا اور اب مکرر عرض کرتا ہوں کہ چند روز کے لئے تبدیلِ مقام ضروری ہے۔ آپ کے لئے سرد و خشک ہوا کی ضرورت ہے اور موسم سرما میں اس کا موقعہ بندیلکھنڈ سے بہتر اور کہیں نہیں مل سکتا —— یہ میں اس لئے نہیں لکھ رہا کہ آج کل خود میرا قیام اس سرزمین میں ہے، بلکہ صرف اظہارِ حقیقت و واقعہ مقصود ہے —— یہ جگہ یقیناً ریل سے ۵۰ میل دور ہے، لیکن باور کیجئے کہ یہی مسافت آپ کو صحیح و توانا بنا دے گی —— جس وقت آپ پنّا سے نکل کر پہاڑوں کے پُرپیچ راستوں سے ہوتے ہوئے، کروندے، اور ہارسنگھار کی جھاڑیوں سے گزریں گے تو رنگ و بو سے متاثر ہو کر ایسا محسوس کریں گے گویا فطرت آپ سے سرگوشیاں کر رہی ہے، اپنی آغوش میں لئے ہوئے روح میں گدگدی پیدا کر رہی ہے اور آپ کے ماضی و مستقبل دونوں "حال" میں غرق ہو کر رہ گئے ہیں۔

پھر ایک بات اور ہے جو حرف کان میں کہنے اور اشارہ سے بتانے کی تھی —— مگر مجبوراً لکھنا پڑتی ہے —— کہ ——

حزیں کو بنارس میں ہر "برہمن بچہ" لچھمن ورام نظر آیا تھا، یہاں قدم قدم پر "سیتا ورادھا" کا سامنا ہے اور اس اہتمام کے ساتھ کہ

بے پردگی دیوانۂ طرحِ نقاب انگندنش

راجپوتوں کی لڑکیاں ہیں ــــ بلند بالا، صحیح وتوانا، تیوریاں چڑھی ہوئی، گردنیں تنی ہوئی، آنکھوں میں تیر، مانگوں میں عبیر، ابروؤں میں خنجر، بالوں میں عنبر، ہاتھوں میں مہندی، ماتھے پر بندی ــــ اب آپ سے کیا کہوں کیا چیز ہیں ــــ قامتِ رعنا کی وہ ادا کہ لچکدار نیزہ بھی شرما جائے، کمر میں وہ لوچ کہ بید کو بھی عار آئے ــــ

آپ کو واسطہ، آئیے اور صرف یہ فیصلہ کرنے کے لئے آئیے کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں، اس سے زیادہ دیکھنے اور سمجھنے کی ضرورت ہے یا نہیں ــــ

آپ کا ہمیشہ

نیاز

جانِ عالم ــــ

خط ملا - اس پر بھی پر نثار ہو جائیے، اس "توسے ناہیں بولوں رے" والی ادا کے قربان جائیے ــــ نظام رامپوری کا شعر یاد آگیا

اے جان کہو پھر اُس ادا سے
میں آج نظام سے خفا ہوں

کاش ایسا ہوتا کہ بجائے "جانِ عالم" کے میں تمھیں "جانِ نیاز" لکھ سکتا ــــ ہائے رے غالب!

قہر ہو یا بلا ہو جو کچھ ہو
کاشکے تم میرے لئے ہوتے

سچ بتاؤ، یہ فنِ دلربائی تم نے کہاں سیکھا، کس سے سیکھا ــــ کسی اور سے بے اعتنائی کا اظہار اور میرے باب میں یہ اعتبارِ ناز! ــــ کیوں بناتے ہو ــــ

ربطِ نہانِ غیر کا پردہ ہے ورنہ آپ
دشمن کے ساتھ صرفہ کریں رسم و راہ میں!

یاد کروں تو زندہ کیونکر رہوں اور جھوٹ جانوں تو تم سے تمھارا پندار کیونکر چھینوں ــــ بہرحال خوش رہو کہ

گرچہ ہے کس کس خرابی سے ولے با ایں ہمہ
میرا ذکر تو تمھاری محفل میں آجاتا ہے ــــ

ہاں، میں الہ آباد گیا اور بالا بالا لوٹ آیا، تم سے نہیں ملا اور قصداً نہیں ملا - کیونکہ جب مجھ پر جنون کا دورہ پڑتا ہے تو آپ کے پاؤں میں مہندی لگی ہوتی ہے - اور جب آپ اس سے فارغ ہوتے ہیں تو میں جیب و دامن کی فکرِ رفو میں مصروف ہو جاتا ہوں - جانے بھی دو،

کیوں ستاتے ہو، کیوں دل دُکھاتے ہو؟

تمھیں اٹھکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

جانتے ہو اور خوب جانتے ہو کہ مجھ پر طعن و تشنیع کا اثر بالکل نہیں ہوتا، کیونکہ میری ہستی خود فطرت کا ایک "طنز" ہے اس لئے اپنی "پُرکاری" کا ہدف کسی اور کو بناؤ، مجھے تو صرف تمھاری وہ "سادگی" درکار ہے جو غالباً اب کبھی میسر نہیں آسکتی۔۔ خدا حافظ۔ نیاز

مولانائے محترم،

ممکن ہے اس ترکیب کو آپ غلط یا ثقیل قرار دیں، لیکن آپ کی شخصیت کا "بھاری بھرکم پن" ظاہر ہی نہیں ہو سکتا جب تک لفظ مولانا کے ساتھ کسی دوسرے شاندار لفظ کا اضافہ نہ کیا جائے ـــــ حقیقت یہ ہے کہ آپ کا دم بھی غنیمت ہے، اور ہم تو خیر "غنیمت ہیں" دریں گنبد سپہر!!

فطرت کا کھلنڈرا پن اس سے زیادہ اور کیا ہوگا کہ ہم رندوں کی جماعت میں آپ سا "مولانا" بھی اس نے شامل کر دیا ـــــ یعنی صورت کے لحاظ سے مولانا اور سیرت کے لحاظ سے "مولاناتر"! اللہ رحم کرے ہم اور آپ دونوں پر ـــــ کیونکہ آپ کا ہم جیسا ہو جانا یا ہمارا آپ جیسا بن جانا دُنیا کا سخت سانحہ ہوگا، اور کسی نہ کسی دن یہ ہو کر رہنا ہے۔

آپ کا خط ملا، پیارے مولانا، یہ کیا خبر سُنائی کہ آپ ہجرت کرکے اجمیر جا رہے ہیں۔ ہائے مولانا! وائے مولانا!! اے بھائی کچھ تو وصیت کئے جاؤ، کہ ہم لوگ کاشی پہونچکر تمھاری یاد کس طرح تازہ کریں ـــــ وہاں کی گلیوں میں ٹھوکریں کھا کھا کر، یا دریا کے کنارے جام مے لنڈھا لنڈھا کر ـــــ

ہائے، ہائے، وہ کون ظالم ہے جس نے آپ سے کہہ دیا کہ اجمیر کی طرف سینگ خوب سماتے ہیں، یہ کس نے آپ کے دماغ کو چکرا کر مغرب سے مشرق کی طرف پھیر دیا، ارے وہ شقی کون ہے، جو ہمارے امام کو ہم سے چھینے لئے جا رہا ہے۔

یا اسفا! وا اسفا!!

یہ ہمیں یقین ہے کہ آپ جائے بغیر رہیں گے نہیں، اس لئے خدا کے لئے ادھر ہی سے ہوتے ہوئے جائیے، اور ایک بار اور صورت دکھا دیجئے، کیونکہ معلوم نہیں وہاں پہونچکر کثرتِ انوار سے آپ کی صورت شکل کیسی بن جائے۔

نوکری تو غالباً چھوڑ دی ہوگی، اور بیوی بچوں کو بھی زہر دیدیا ہوگا، اچھا ہے، اللہ اس آزادی اور آزادہ روی کو قایم رکھے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ آسمان و زمین آپ ہی ایسے حضرات کے دم سے قایم ہے، ورنہ ہم شیاطین نے تو ان کے تباہ و برباد کرنے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی تھی۔

ارشاد ہو تو ایک گیروا تہمد یہاں سے رنگوا کر بھیجدوں اگر بالا بالا چلے جانے کا ارادہ ہو ـــــ کشکول تو خیر اجمیر ہی میں اچھا ملیگا۔

نیاز

ہاں بھئی ——— آجکل طبیعت بہت مضمحل ہے اور کسی سے بات کرنے کو بھی جی نہیں چاہتا، لکھنا پڑھنا کیسا؟ آپ کے خط میں چونکہ ایک ضروری بات قابل جواب ہے اس لئے مجبوراً لکھنا پڑا

عزیز من، میں اس امر میں آپ سے متفق نہیں کہ میر صاحب قصداً آپ کی کاربرآری میں حائل ہوئے۔ لاکھ وہ سب کچھ ہوں جو آپ کہتے ہیں، لیکن مکر و فریب کی کوئی مثال ان کی زندگی میں مجھے اس وقت تک نہیں ملی ——— ہو سکتا ہے کہ وہ آپ کی امداد میں تساہل سے کام لیں، یہ بھی ممکن ہے کہ وہ وعدہ کریں اور ٹال جائیں، لیکن آپ کی مخالفت، یا آپ کی کوششوں کے خلاف سعی و کاوش، اُن سے قیامت تک ممکن نہیں ——— خیر، یہ تو وہ بات ہوئی، جس کا تعلق اس خود غرض اور حقیقت ناشناس دنیا سے ہے۔ لیکن میں تو یہ کہتا ہوں کہ آپ میں یہ "خوئے التجا" کب سے پیدا ہو گئی۔ پھر جو شخص سوال کا عادی ہو اُسے رد و قبول کے مسئلہ کو اتنی سنجیدگی سے نہ دیکھنا چاہئے، گدائی کرنا ہے تو گدا ہی کی طرح اُن جھڑکیوں کو بھی سننے جو فطرت انسانی کا معمولی مظاہرہ ہے ——— آپ کو معلوم ہے جب بیدل کو حیدرآباد جانے کی دعوت دی گئی تھی تو اس نے کیا جواب دیا تھا۔ آپ یقیناً جانتے ہوں گے، لیکن میں پھر اس کو دُھراتا ہوں مجھے اس کی تکرار میں لطف آتا ہے۔ اس نے اس دعوت و طلب کے جواب میں صرف یہ شعر لکھ کر بھیجدیا تھا:-

دنیا اگر دھند نہ جنبم ز جائے خویش
من بستہ ام حنائے قناعت بہ پائے خویش

یاد رکھئے "قناعت پیشگی" کے معنی تعطل کے نہیں ہیں، بلکہ خود دارانہ غیرت کے ہیں جو انسان کو خود اس کے پاؤں پر کھڑا ہونا سکھاتی ہے۔ "رفتن بہ پائے مردی ہمسایہ در بہشت" دوزخ سے بدتر ہے

بہرحال جو طریقے آپ نے مقصد برآری کے لئے اختیار کئے ہیں وہ ہم ایسے آبرو باختہ، خانماں برباد لوگوں کیلئے مناسب ہوں تو ہوں، لیکن آپ کے شایانِ شان کسی طرح نہیں ہو سکتے

مشہور بات ہے کہ "دُنیا کو ٹھکرا دیئے، دنیا آپ کے قدموں پر آجائے گی"۔ اس میں بھی ترکِ دنیا کا درس نہیں ہے، بلکہ علوئے نفس اور استغنا کا ہے ——— خیر، بات میں بات نکل آئی تو یہ فضول داستان کہنی پڑی اصل مدعا تو صرف یہ کہنا تھا کہ میر صاحب کی طرف سے آپ کا سوءِ ظن درست نہیں۔ آپ کو یقین آئے یا نہ آئے فی الحال باہر جانے کا ارادہ نہیں ہے، لیکن اگر یہ ارادہ کبھی ہو گیا تو سب سے پہلے آستانہ اگرامی پر حاضر ہوں گا، مطمئن رہئے

ہمیشہ
نیاز

فراموشکارِ من آپ کا مجھے بھلا دینا اس قدر باعثِ ایذا نہیں، جتنا یہ کبھی کبھی یاد کر لینا۔ آپ محسوس کریں یا نہ کریں، لیکن مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا بیماری کا کوئی دورہ مجھ پر پڑا ہے۔ میں نے آپ سے پہلے بھی کہا تھا اور اب پھر کہتا ہوں کہ

یا تو بیگانے ہی رہیئے ہو جیئے یا آشنا
یہ ادا کیا۔ آشنا گاہے گہے نا آشنا

ہر چند آپ سے جو تعلق رکھتا ہوں، وہ آپ کے نا آشنا ہو جانے کے بعد بھی نہیں مٹ سکتا یعنی

گر دل نہیں رہا تو وہی دل کا درد تھا

لیکن کم از کم "امیدِ وفا" کی خلش تو جاتی رہے گی، یہ الجھن تو باقی نہ رہے گی کہ "کوئی میری سننے والا ہے لیکن نہیں سنتا"

معذرت کی ضرورت نہیں، میں واقف ہوں کہ آپ کے علائق و مشاغل خط لکھنا کیسا، سانس لینے کی بھی مہلت نہ دیتے ہوں گے ——— ہاں، ہاں، اس لئے تو میں نے کہا کہ جب فرصت کا فقدان ہو تو محبت میں اس ہیجان کی کیا ضرورت ہے

میں خود ساری دنیا سے کٹ کے خاموش زندگی بسر کر رہا ہوں، مجھے کسی سے شکایت کا کیا منہ ہے ——— غالب، "وفاداری بر استواری" چاہتا ہے، میں کہتا ہوں کاش آپ "بیوفائی پر استوار ہو جائیں" کہ اگر وہ "اصل ایمان" ہے تو یہ بھی "حسن کافری" کی جان ہے

نیاز

اُف، کچھ نہ پوچھئے آج کیا عالم ہے ——— نظام رامپوری کا یہ شعر آپ نے سنا ہے؟

آجکل آپ سے باہر ہے نظام
کہیں محفل میں نہ بلوائیے گا

بس بالکل یہی عالم میرا بھی ہے، بلکہ اس سے بھی زیادہ، کیونکہ وہاں تو "آپ" سے مُراد صرف نظام کی اپنی ہستی ہے، اور یہاں "آپ" "میں"، "آپ اور میں" "میں اور عالم ماسوا" سب کچھ شامل ہے!

جل جلالہ

آپ نے سنا ہو گا کہ کسی بزرگ کی کسی پر نگاہ پڑی اور کایا پلٹ گئی ——— پیر و مُرید جب حجرہ کے اندر داخل ہوئے تو دو علیحدہ علیحدہ چیز تھے، لیکن جب باہر نکلے تو سیرت بھی ایک تھی، صورت بھی ایک تھی اور لوگ حیران کہ

ان میں مرشد کون ہے اور ارادتمند کون - الغرض " تو من شدی من تو شدم " کی ایسی روایتیں بہ کثرت ملاحظہ سے گزری ہوں گی ــــــ لیکن اگر حق الیقین اور عین الیقین کا مرتبہ حاصل کرنا ہے تو ادھر آیئے اور دیکھئے کہ مجھ پر کسی کی نگاہ نے کیا کام کیا ــــــ

آپ کہیں گے مُبالغہ ہے، میں کہوں گا یہ حقیقت سے بھی کم ہے ــــــ پھر اس کا فیصلہ کیونکر ہو ؟

اچھا آپ نہیں آتے تو اپنے " اُن " کو بھیج دیجئے جن کی ہر بات آپ کے لئے آیت و حدیث ہے - وہ تو جھوٹ نہ بولیں گے - اور جھوٹ بولے بھی تو آپ کیوں جھوٹ سمجھنے لگے ــــــ قسم ہے سرِ مُبارک کی، اُن کے بلانے کا بہانہ نہیں ہے - بلکہ واقعی ان کی یہاں ضرورت ہے - اس کے جواب میں آپ ضرورت دریافت فرمائیں گے اور خواہ مخواہ دیر ہوگی، اس لئے میں کیوں نہ ابھی ابھی صاف صاف کہہ دوں کہ آجکل یہاں کا موسم برشگالی سخت دلکش ہو رہا ہے اور بہت جی چاہتا ہے کہ کم از کم ایک ہی وقت آپ کے یا اُن کے ساتھ لطف بادہ خواری حاصل ہو جائے

پھر آپ نہیں آسکتے تو انھیں بھیجئے، وہ نہیں آسکتے تو آپ تشریف لے آیئے، الغرض مدعا یہ ہے کہ آپ اور وہ دونوں آئیں اور مجھے تباہ کر کے فوراً چلے جائیں -

نیاز

شہوانیات یا ترغیبات جنسی

حضرت نیاز کے قلم سے

جس میں فحاشی کی تمام فطری و غیر فطری قسموں کے حالات اور اُن کی تاریخی و نفسیاتی اہمیت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اس میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ مذاہبِ عالم نے اس کے رواج میں کتنی مدد کی اور آیندہ اخلاق انسانی کی بنیاد کن اصول پر قائم ہونا ہے الغرض اپنی نوعیت کے لحاظ سے یہ کتاب بالکل نئی چیز ہے اور ایک بار شروع کرنے کے بعد بغیر ختم کئے ہوئے آپ اسے چھوڑ نہیں سکتے - اس کتاب میں ایسے ایسے حیرت انگیز واقعات درج ہیں کہ آپ نے کبھی سنے نہ ہوں گے - اگر آپ نگار کے خریدار ہیں تو علاوہ محصول ۸ر کے مجلد کتاب صرف ۱۲ر میں اور غیر مجلد عار میں ملے گی اور اگر آپ نگار کے خریدار نہیں ہیں تو مجلد عہ میں اور غیر مجلد ۃر میں علاوہ محصول ۸ر کے ملے گی

مینیجر نگار لکھنؤ

انگلستان کے دستور پر ایک تاریخی نظر

یہ حقیقت تسلیم شدہ ہے کہ تمام ممالک کے آئین و دستور میں انگریزی آئین کو نمایاں حیثیت حاصل ہے، کیونکہ انگریزی دستور تیرہ سو برس کے ارتقا کا نتیجہ ہے۔ اور شاید ہی کوئی موجودہ نظام ایسا ہو۔ جس کا ماخذ انگریزی دستور نہو قریب قریب تمام ترقی یافتہ ممالک کے موجودہ نظام مبنی ہیں وزرار حکومت کی ایک عاملانہ جماعت پر اور دو ایوانوں پر اور بلا شک و شبہ اس طرح کے نظام حکومت کی ابتدا انگلستان سے ہوئی۔ یورپ اور امریکہ نے اوس کی عملی خوبیوں سے متاثر ہو کر اُس کی تقلید کی مگر انگلستان کے دستور اور مختلف ممالک کے دستور میں ایک نمایاں فرق اب تک پایا جاتا ہے کیونکہ دیگر ممالک کے آئین سیاست داں اور مدبران ملک کے دماغ کے اختراع کا نتیجہ ہیں اور انگریزی دستور اُن اثرات اور قوتوں کا نتیجہ ہے جو متواتر تیرہ سو برس تک کارفرما رہی ہیں اور برخلاف دیگر ممالک کے قوانین کے آج تک تقریباً غیر مُدوّن ہیں ———— یہی وجہ ہے کہ اور ممالک کے دستور کے صحیح حالات ہم اسناد اور قوانین سے حاصل کر سکتے ہیں مگر انگریزی دستور یا انگریزی نظام آئینی کا صحیح علم اوس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ انگریزی معاشرت رسم و رواج اور روایات پر پورا عبور نہ ہو

انگلستان میں باوجود اس کے کہ تحریری اسناد کی کمی ہے اور غیر تحریر کردہ قوانین یا روایات ...... (CONVENTION) کا بہت رواج ہے پھر بھی نظام کی شیرازہ بندی آئین کے تحت میں ہے۔ یہ دستور مشتمل ہی ان قوانین پر جو پارلیمنٹ کے خود بنائے ہوئے ہیں اور جن کو تبدیل کرنے کا بھی حق اس کو حاصل ہے۔ ان روایات کا موازنہ عدالت میں ہوتا ہے۔ اور عدالت کا فیصلہ قانون ہو جاتا ہے اسی لئے انگریزی آئین کے متعلق یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ ججوں کا بنایا ہوا ہے

دستوری نظام کی تشکیل کسی ایک اصول کے تحت میں نہیں ہوئی ہے چنانچہ پارلیمنٹ نے وقت ضرورت خود اپنے بنائے ہوئے قانون میں تبدیلی کی ہے۔ لیکن روایات اس کو متزلزل ہونے سے بچاتی رہتی ہے۔ پروفیسر ڈائسی ٹھیک لکھتا ہے کہ باہمی مفاہمت اور روایات کبھی قانون کی پامالی کی اجازت نہیں دیتی۔ بعض حالت میں صرف انھیں

کے باعث اس امر کا قطعی فیصلہ قرار پاتا ہے کہ قانونی طاقت کا کس طرح جائز استعمال ہونا چاہیے"۔ رواج کا اس قدر اثر اس امر کا اعتراف ہے کہ کسی رواج کی خلاف ورزی فی الحقیقت قانون کی خلاف ورزی ہے یا دوسرے الفاظ میں وہی قانون ہے۔ مثلاً یہ روایات ہی کا اثر ہے کہ مجلس وزرا جو اعتماد عامہ کھو بیٹھی ہو اور پھر بھی با اختیار رہنا چاہے یا عنان حکومت سے دست بردار نہ ہو تو وہ یا تو بحری و بری افواج کو اپنے تحت میں رکھنے سے قاصر رہے گی یا محصولات کو بغیر خلاف ورزی قوانین وصول نہ کر سکے گی۔ یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ سیاسی شطرنج، روایات کی بساط کے علاوہ کسی اور بساط پر پھیلائی جا سکے۔ یہ روایات باعزت سفاہمت اور یک جہتی کا زینہ ہیں۔ جن کی بنا پر مجالس قانون ساز اور مدبران ملک کو اختیارات دئے گئے ہیں اور جن کے خلاف وہ کبھی قدم نہیں بڑھا سکتے

ان روایات کی پابندی کی علت غائی یہی ہے کہ رائے عامہ کا منشا پورا ہو سکے یا بالفاظ دیگر رائے عامہ کے خلاف کچھ نہ ہو سکے۔ اسی کے تحت میں یہ اصول قائم ہوا کہ تاج بغیر وزرا کے کچھ نہیں کر سکتا نہ وزرا بغیر اراکین دیوان عام کے کچھ کر سکتے ہیں۔ اسی طرح دیوان خاص دیوان عام کے بغیر کچھ نہیں کر سکتا۔ اور آخر میں دیوان عام ماتحت ہے تمام حلقہ ہائے نیابت کا۔ اور اسی اصول کا یہ نتیجہ ہے کہ تمام غیر واضح شدہ اختیارات کا ناجائز استعمال نہیں کیا جا سکتا جس سے روایات کی قوت ظاہر ہوتی ہے

حقیقت یہ ہے کہ روایات اور رسم و رواج کی پابندی اس لئے ہے کہ قانون کی حکومت اور قانونی فضیلت مستحکم ہو جائے۔ قانونی فضیلت سے مراد حسب ذیل ہیں :-

جیسا کہ ہم کسی اور مضمون بہ عنوان " آئینی آزادی " کے تحت میں لکھ چکے ہیں بغاوت عظیم یعنی (Great rebellion) سے قبل ہر شخص کو گورنمنٹ کے خلاف تقریر یا گورنمنٹ کے خلاف کوئی کارروائی عمل میں لانے کے جرم میں گرفتار کیا جا سکتا تھا لیکن اب کسی شخص کو کوئی سزا نہیں دی جا سکتی جب تک کہ اس نے قانون کے خلاف کسی قسم کی کارروائی نہ کی ہو اور اس کا جرم باقاعدہ کسی عدالت میں نہ ثابت ہو چکا ہو۔ اس سے یہ اصول مستنبط ہوا کہ تمام ملک کے باشندے امیر و غریب چھوٹے بڑے سب کے لئے یکساں قانون ہے اور سب ملک کے معمولی قوانین اور عدالتوں کے ماتحت ہیں۔ عدالت اسٹار چیمبر کا طلسم جب سے ٹوٹا اوس کے بعد سے انگلستان میں کوئی ایسی خاص عدالت نہیں رہی ہے جس میں گورنمنٹ کے مخالفین پر بیجا کارروائی عمل میں لائی جاتی ہو

انگریزی دستور کی تاریخ فی الحقیقت انگریز قوم کی تاریخ ہے۔ یوں تو بہت سے محققین نے موجودہ انگریزی سیاسی اداروں کی ابتدا قدیم اہل روما کے نظام سے بتائی ہے۔ لیکن انگریزی دستور میں وہ خصوصیات نمایاں طور پائی جاتی ہیں جو اینگلو سیکسن نسل کے اندر موجود ہیں۔ تاریخ میں جس معیار سے نسل کو تسلیم کیا جاتا ہے وہ تہذیب کی خصوصیات عام خیالات و جذبات۔ مشترکہ سیاسی ادارہ جات۔ قوانین۔ ادب۔ زبان۔ مذہب و فنون لطیفہ نیز

ایک مشترکہ ماضی کی روایات ہیں جو ایک قوم کے جذبات میں ہمیشہ مستقبل کے لئے روح پھونکنے کا کام کرتی ہیں - ان تمام باتوں میں انگریز اب تک اینگلو سیکسن ہیں

اس اعتبار سے انگریزوں کی دستوری تاریخ صحیح معنی میں ۱۰۶۶ء سے شروع ہوتی ہے - جبکہ ولیم فاتح نے انگلستان میں قدم رکھا اور نارمن لوگ انگلستان میں آکر آباد ہوئے - ولیم نے مغربی یورپ میں ایک اعلیٰ قسم کا استبدادی حکومت کا نمونہ پیش کیا - اور اسی کے ساتھ ساتھ اپنے تحت میں ایک نظام جاگیری کی بنیاد ڈالی جس کے ماتحت جاگیردار بادشاہ کی اعانت کے پابند تھے - اس کے بعد کے جانشینوں نے نظام کو اور مرکزی بنایا اور اس کی دستوری تشکیل کے لئے تمام ملک کے قدیم رسم و رواج و روایات کو عدالتی نظام میں شامل کرلیا - ان میں خاص طور پر دورہ کرنے والی عدالتیں شامل تھیں اور وہ جوری جو مقدمہ کی سماعت کرتی تھی - انھیں سے قوانین عامہ بالفاظ دیگر قانون معاہدہ (Fort) اور (Equity) کی ابتدا ہوئی جس نے شخصی حکومت کو مکمل کردیا

بادشاہ جان کے زمانہ میں جاگیرداروں نے ایک منظم بغاوت بادشاہ کے خلاف کی اور بادشاہ کو مجبور کر کے مراعات و حقوق حاصل کئے - جاگیرداروں نے اس عقیدہ پر کام کرتے ہوئے کہ معاہدات کی رُو سے بادشاہ کے اختیارات بھی محدود ہیں اس امر کا اصرار کیا کہ بادشاہ ان تمام حقوق کے اعلان فرمان کی صورت میں کرے اور یہ (Great Chart) یا فرمان اعظم کی شکل میں ظاہر ہوئے - اور بادشاہ نے اس کا اقرار کیا کہ وہ ملک کے قوانین و روایات کو پامال نہ ہونے دے گا - زمانہ کے ساتھ ساتھ اسی پروانہ آزادی کی تفصیلات کو بھلا دیا گیا - لیکن دستوری ارتقا میں یہ اصول کارفرما رہا کہ بادشاہ آئین کو قائم رکھنے پر مجبور ہے اور اگر وہ اس سے درگزر کرے تو ملک کو اُسے مجبور کرنے کا حق جائز ہے - یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا باوجود بادشاہت کی موجودگی کے انگریزی آئین جمہوری آئین ہے اس کا جواب یقینی اثبات میں دیا جائے گا - ہم ایک دوسرے مضمون میں لکھ چکے ہیں کہ بادشاہ کا وجود بحیثیت موجودہ جمہوریت کے منافی نہیں ہے اور اس عنصر کو چھوڑ کر کونسی چیز ایسی ہے جو اسے جمہوریت سے علٰحدہ کرسکتی ہے - فی الحقیقت جب کہ رائے عامہ کے تغیر و تبدل کے ساتھ ساتھ اس کی کابینہ سلطنت بھی بدلتی رہتی ہے تو یقیناً امریکہ کے مقابلہ میں انگلستان میں زیادہ جمہوریت ہے

اب ہم مرکزی نظام کی ایک مختصر سی تاریخ اس طرح پیش کرنا چاہتے ہیں جس سے یہ معلوم ہو کہ انگریزی دستور ارتقا کے مدارج طے کرتا ہوا کس طرح موجودہ شکل میں آیا (Angles) اور (Saxons) قومیں جب انگلستان کی سرزمین پر شمالی جرمنی کی سرحد پار کر کے آئیں تو انھوں نے موجودہ آبادی کو (Celt) نسل کا پایا جن کا تمدن بہت کچھ اہل روما کے تمدن سے متاثر ہوچکا تھا - بعض معمولی باتوں میں اہل روما کے کلیسا کا اثر بھی پایا جاتا تھا - مثلاً اسناد و فرمان بطور قانونی نظائر کے تسلیم کئے جاتے تھے - وصیت تحریر کرنے کا طریقہ

بھی انھیں کا سا تھا لیکن تہذیب و رما کا اثر طرز حکومت و قوانین پر بہت کم تھا - قانون وراثت بھی (Saxon) قوم کا اپنا تھا - (Saxon) نسل کے سامنے موت و زیست کا سوال درپیش تھا - اون کے دل میں قدرتاً یہ ضرورت محسوس ہوتی تھی کہ اپنے تحفظ اور اپنی بقا کے لئے اون کا ایک مضبوط بادشاہ ہونا چاہئے جو اون کا تحفظ ایک حملہ آور قوم کے خلاف کر سکے - اس ابتدائی حالت سے مرکزی و غیر مرکزی سیاسی اداروں میں بتدریج ترقی ۱۰۶۶ء تک قایم رہی جب کہ نارمن قوم نے انگلستان کو فتح کر لیا - اون کے آنے کے بعد بادشاہ کی قوت میں بہت کچھ اضافہ ہوا اور مرکزی نظام نے بہت ترقی کی

اگر دستور سے ہم مراد صرف مرکزی نظام قرار دیں تو یہ کہنا بے جا نہوگا کہ اکثر عناصر جن سے کہ انگریزی دستور کی قطعی تشکیل ہوئی وہ نارمن قوم کے ہیں نہ کہ (Saxon) کے - ادارۂ بادشاہی کی بھی نارمن قوم ہی نے تکمیل کی - نظام جاگیری بھی انھیں سے منسوب کیا جاتا ہے - سیکسن کے زمانہ میں جو نظام جاگیری تھا وہ محض اقتصادیات پر قایم تھا - مگر اس سیاسی نظامِ جاگیری کا جس میں رعایا پر بادشاہ کی ملکی اور فوجی خدمات اور جاگیر دار کے احکام کی پابندی بھی عائد تھی انگلستان میں ۱۰۶۶ء یعنی نارمن قوم کے آنے سے پہلے نام و نشان بھی نہ تھا - اس کے ذمہ دار صرف نارمن ہی ہیں - اس کے ذریعہ سے نظام دو متضاد خصوصیات پر قایم ہوا یعنی ایک طرف مطلق العنان بادشاہ اور مرکزی حکومت دوسری طرف ایک قومی جاگیر داروں کی صف - اس زمانہ میں بادشاہ سے صرف اسقدر توقع کی جاتی تھی کہ امن و امان ملک میں قایم رکھے - اگر وہ اس میں کامیاب ہوتا تو بہت اچھا بادشاہ کہلاتا تھا - جس طرح جاگیر دار جاگیر کو اپنی ملکیت سمجھتا تھا اسی طرح بادشاہ ملک کو - یہی اصول نظام جاگیری کی روح رواں تھا - نارمنوں کے ورود کے وقت معمولی نظام و امن و امان قائم رکھنے کے لئے صرف دو سیاسی ادارے اس وقت موجود تھے - ایک تو (Sheriff) کا عہدہ تھا جس کے ذریعہ سے مرکزی حکومت مفصلات میں کارفرما تھی دوسری مرکزی نظام کی تربیت کے لئے مجلس قومی کی شکل میں ایک جماعت تھی جس کا دوسرا نام کونسل اعظم تھا - اس کو (Curia Regis) بھی کہتے ہیں - (Sheriff) کے عہدہ کی ابتدا کہاں سے اور کب سے ہوئی اس کی تحقیق ذرا دشوار ہے لیکن غالباً اقتصادی احکام کے لئے یا بہ حیثیت شاہی زمینوں کے ایک کارندے کے وہ اپنے فرایض مفصلات میں انجام دیتا تھا - رفتہ رفتہ ضرورت کے اعتبار سے . . . . . (Sheriff) حاکمانہ اور عادلانہ فرایض بھی انجام دینے لگا - نارمن قوم جو کہ فرانس میں قیام پذیر ہوئی اس میں بھی اس قسم کا ایک عہدہ دار ہوتا تھا جو (Viscount) کہلاتا تھا - انگریزی (Sheriff) کو اس عہدہ سے ملتا جلتا پاکر نارمن لوگوں نے اس عہدہ کو قائم رکھا

ابتداً (Curia Regis) یا کونسل اعظم میں ملک کے اور کلیسا کے بڑے بڑے عہدہ داران

اور بادشاہ کے خاص مصاحبین و ملازمین شامل تھے۔ لیکن نارمنوں نے اسی کونسل میں ایک قطعی جاگیری اصول نیابت قائم کیا۔ اسی کونسل کے اندر ایک چھوٹی سی کونسل بن گئی تھی جس کے ارکان وہ افراد ہوتے تھے جو سلطان کا قرب حاصل کئے ہوئے تھے۔ ان دونوں کونسل میں کوئی امتیازی حیثیت یا فرق قائم کرنا مشکل ہے۔ کیونکہ جو کام بڑی کونسل انجام دیتی تھی وہ چھوٹی کونسل بھی دے سکتی تھی۔ حقیقت میں تمام نظامی امور کی دیکھ بھال یہ چھوٹی کونسل ہی کرتی تھی

یہی کونسل حکومت کی مشین کا وہ مرکز تھا جس کے گرد تمام نظام گھومتا تھا۔ یہ تمام نظامی امور اور تمام شعبہ جات پر بغیر کسی ادارہ جاتی تقسیم کے حاوی تھی۔ یہی سب سے بڑی مجلس مقننہ تھی۔ سب سے بڑی عدالت عالیہ بھی یہی تھی جس میں کہ بڑے بڑے مقدمہ جات اور تنازعات طے پاتے تھے۔ تمام عاملانہ شعبہ جات بھی اسی کے تحت میں تھے اور تمام ملازمین و عہدہ داران اس کے ماتحت قرار دئے گئے تھے

رفتہ رفتہ مالیات کے متعلق اور محصولات کے قائم کرنے اور وصولیابی کے متعلق اسی کونسل کے مقررہ سشن ہونے لگے۔ یہ شعبہ جاتی تقسیم کی ابتدا ہے۔ جب نظام میں شعبۂ مالیات ایک علیحدہ حیثیت حاصل کر لیتا ہے۔ ۱۱۰۰ء کے بعد اسی چھوٹی کونسل نے ہمیشہ کے لئے محصولات و لگان کے متعلق انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ جب یہ کونسل اس خاص موضوع پر گفتگو کرنے کے لئے رجوع ہوتی تو یہ خاص سشن (Exchequer) کے نام سے موسوم ہوتا۔ نارمن فتح کے بعد ایک صدی کی نمایاں ادارہ جاتی ترقی یہی تھی کہ (Exchequer) یا محصولات کی الگ ایک حیثیت قائم ہو گئی

دوسری زبردست قوت جو برسوں سے پنہاں طور پر کام کر رہی تھی وہ یہ تھی کہ کلیسائی نظام اور تمام نظام عامہ سے بالکل آزاد تھا۔ جیسا کہ بیان کیا گیا سب سے زیادہ دو زبردست عنصر بادشاہ اور جاگیردار تھے۔ بادشاہ نے جاگیرداروں پر بہت فوقیت حاصل کر لی۔ اس میں جو عناصر اوس کے معین ہوئے وہ یہ تھے کہ بادشاہ تمام افواج اور محصولات کا مالک تھا جس سے اوس کی بڑی شان و شوکت تھی۔ اسی کے ساتھ ساتھ یہ خیال کہ بادشاہ نائب خدا ہے بہت کچھ اس کی قوت کے دوبالا کرنے میں معین ہوا۔ یہ عقیدہ تقریباً ہر قوم کے ابتدائی تمدن میں رہا ہے

ولیم فاتح کے لڑکے ولیم رُوفس نے ان مواقع کا جو اس کو نصیب ہوئے بہت بُرا استعمال کیا۔ اس کے بعد اور سلاطین نے بھی استبدادی حکومت کو انتہا تک پہونچا دیا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ جاگیرداروں نے مسلح بغاوتیں کیں اور بادشاہ سے اپنے حقوق تحریری صورت میں لکھوائے جس کا تذکرہ اوپر کیا جا چکا ہے

۱۲۵۸ء میں بادشاہ ہنری کے سامنے یہ مسئلہ درپیش تھا کہ عوام کے دلوں میں تو قانون کی عظمت بہت کچھ موجود

ہے لیکن افسران سرکار اور مرکزی حکومت کے ملازموں میں جو بے ضابطہ کارروائیاں اور بدعنوانیاں پائی جاتی ہیں ان کا انسداد کس طرح ہو؟ اس کے لئے وہی چھوٹی کونسل جو نظامی امور کی ذمہ دار تھی اور عدالتی فرائض بھی انجام دیتی تھی مفصلات کا دورہ کرنے لگی اور ہر ضلع اور دیہات میں جاکر افسران سرکار کے خلاف گواہی سننے لگی اور اسی کے ساتھ ساتھ وہ اُن اطلاعات کو فراہم کرتی تھی جن کی رُو سے محصولات اور لگان شاہی قائم ہوتا تھا

اسی کونسل کے دورے اور عدالتی کارروائیاں انگریزی نظام میں عدالتی اداروں کے ارتقاء کی بہت کچھ ذمہ دار ہیں - اس کی امداد سے نظام اور زیادہ مرکزی ہوگیا کیونکہ اس سے مرکزی نظام کے کارکنان کو عوام الناس سے اتصال کا موقعہ مل گیا - یہاں پر انگریزی دستور کی ایک دھندلی سی تصویر نظر آتی ہے جس میں کہ بادشاہ کی نگرانی نظام کے تمام شعبہ جات پر حاوی تھی

جب ہنری دوم تخت نشین ہوا تو اس نے اصلاحات کی طرف قدم رکھا - سب سے بڑی رکاوٹ اس نے یہ محسوس کی کہ نظام کلیسائی کے عہدہ دار اور متعلقین اس کی عدالتوں سے بالاتر ہیں - زمانۂ (Saxon) میں ایسی کوئی تفریق موجود نہ تھی - پادری اور عام لوگ سب ایک ہی عدالت کے ماتحت تھے لیکن چونکہ کلیسائی قوت اس وقت بہت کافی زبردست ہو چکی تھی اس لئے ہنری دوم مکمل طور سے اس نقص کو دور کرنے میں کامیاب نہ ہوسکا - اور فوجداری کے بھی چند حقوق باوجود اس کے کہ وہ شاہی عدالتوں کے تھے کلیسائی عدالتوں نے غصب کر لئے - حالانکہ وہ تمام مراعات جو کلیسا کو بادشاہ (Stephen) کے زمانہ میں حاصل ہوئی تھیں وہ نہ قائم رہ سکیں لیکن کلیسائی شان و شوکت و اقتدار میں بہت زبردست اضافہ ہوگیا - تیرہویں صدی کا نظام کلیسائی بالکل آزاد اور اسقدر قوی سمجھا جاسکتا ہے جتنا کہ بادشاہ ملک کا - کلیسائی مدد کے لئے سب سے بڑی قوت پوپ کی بھی تھی جو تمام یورپ میں اقتدار دنیاوی اور روحانی قوت کا مظہر بنا ہوا تھا

جب جان کے جابرانہ طرز و انداز سے تنگ آکر جاگیرداروں (Barons) نے بغاوت کی تو تمام حقوق کا فرمان یا (Charter) حاصل ہوا - اور بادشاہت کو محدود کرنے کی پہلی کڑی یہی تھی - یہی فرمان اعظم انگریزی سیاسی اداروں کی حقیقی بنیاد سمجھا جاتا ہے - گو یہ فرمان صرف نظام جاگیری کے استحکام کا ایک معاہدہ ہے اور گو بظاہر اس فرمان میں پارلیمنٹ کا وجود نہ اس میں عوام کی رضامندی - جوری کے سامنے مقدمہ کی سماعت اور (Habeas Corpus Act) کا وجود کہیں نہیں پایا جاتا لیکن سچ یہ ہے کہ یہ سب اسی فرمان کا فیض ہے اور کسی نہ کسی طرح اسی کا نتیجہ ہے - بادشاہ کے اختیارات کی حدود بندی نے ملک کو حریت کی شاہراہ پر لگا دیا - اور پارلیمنٹ صحیح معنی میں پیدا ہوگئی - جوری کے اصول کی بھی تقویم ہوگئی - اور ملک میں قانون کا تسلط ہوگیا - بادشاہ پر قانون کی حرمت بھی لازم ہوگئی - اور یہ طے ہوگیا کہ جو بادشاہ قانون کو پامال کرنے کی

جرات کرے وہ تخت سے اوتار دیا جائے گا۔ چنانچہ فرمان اعظم کے حاصل ہونے کے بعد جتنے بادشاہ تخت نشین ہوئے ان سب کو تاجپوشی کے وقت فرمان کی تکمیل کا حلف اٹھانا پڑتا تھا۔ زمانہ کے ساتھ ساتھ تھوڑی تھوڑی مراعات اور حاصل ہوتی گئیں یا یوں کہئے کہ بادشاہ کے اختیارات اور کم ہوگئے۔ اور بادشاہت کی مخالف قوتیں زور پکڑتی گئیں۔ اور عوام میں ایک اجتماعی احساس پیدا ہونے لگا حالانکہ اس وقت کوئی ایسا قومی جذبہ موجود نہ تھا جس کو موجودہ نیشنلزم سے تعبیر کیا جا سکتا۔ رفتہ رفتہ اختیارات کا احساس بڑھتا گیا۔ اور ہوتے ہوتے بادشاہ قطعاً ایک آئینی بادشاہ ہو گیا جس کا خاکہ ہم نے علیحدہ مضمون میں دیا ہے

تھوڑے زمانہ کے لئے اس ضمن میں خاص طور پر ایک معاہدہ کا ذکر ضروری ہے۔ یہ معاہدہ (provisions of Oxford) کے نام سے مشہور ہے

اس کی رُو سے عمائدین ملک (Barons) نے یہ ایک اور حق حاصل کر لیا کہ ملک کا عدالتی نظام بادشاہ سے الگ کر کے اسی کونسل کے اراکین کے سپرد کر دیا۔ اس فرمان کی رُو سے بادشاہ کی قوت محکمۂ عدل میں قریب قریب معطل ہوگئی اور کمیشن اور تحقیقاتی ادارے جو دورہ کرتے تھے وہ اس کونسل کے ماتحت ہوگئے اس کے بعد ایک سو سال کے اندر (Impeachment) کے طریقہ کا ارتقاء ہوا جس کی وجہ سے وزراء کی کونسل کی ذمہ داری بھی تسلیم کی جانے لگی۔ بنیادی طور پر فرمان اکسفورڈ ایک پیش خیمہ اس اصول کے قائم کرنے کا تھا کہ عوام کی حکومت کا نظام عوام ہی کے ہاتھوں میں ہونا چاہیے۔ اور باشندگان ملک کی خود اختیاری یا (Soverignty of people) کا مسئلہ جو سترہویں صدی میں طے پایا حقیقتاً تیرہویں صدی کی کاوشوں کا ایک مکمل نتیجہ ہے

ہم نے اوپر بتایا ہے کہ پارلیمنٹ صحیح معنوں میں کیسے اور کب ظہور میں آئی۔ ہنری سوم کے دور حکومت کے اختتام سے کچھ قبل ہی پارلیمنٹ کا یہ کام ہو گیا کہ وہ بادشاہت کے خلاف ایک ایسی جماعت بنی رہے جو ملک کے دستور کی حمایت کرے۔ پارلیمنٹ کو جیسا اوپر کہا گیا کونسل اعظم ہی سے بنی ہے۔ گر پہلے کونسل اعظم نظام جاگیری کی ایک مجلس سے زیادہ اہمیت نہ رکھتی تھی اب ایک نمایاں فرق یہ ہونے لگا کہ برخلاف پہلے اصول کے اب پارلیمنٹ میں تاجروں کے مفاد کے تحفظ کے لئے بھی نمائندے آنے لگے۔ اور اسی کے ساتھ ساتھ چھوٹے چھوٹے زمینداروں کے نمائندے بھی اس کے ممبر ہوگئے۔ اس وقت پارلیمنٹ کے رکن صرف یہ خدمات انجام دیتے تھے کہ مفصلات کے لوگوں کے جذبات و آراء کی ترجمانی کرتے تھے۔ گورنمنٹ کو اپنی پالیسی قائم کرنے کے لئے جو رائے عامہ کے متعلق اطلاعات فراہم کرنی پڑتی تھیں وہ ان اراکین کے ذریعہ سے حاصل ہوا کرتی تھی

۱۲۹۵ء میں ایڈورڈ اوّل نے ماڈل پارلیمنٹ قائم کی جس میں ملک کے تمام طبقہ جات کی نمائندگی کا اصول تسلیم کیا گیا ساتھ ساتھ اس میں کلیسا کے عہدہ داران بھی شامل ہوئے مگر وہ بعد میں اس سے الگ ہو گئے رفتہ رفتہ یہ بڑی جماعت دو حصوں میں منقسم ہو گئی۔ کونسل اعظم میں صرف جاگیردار وغیرہ رہ گئے برخلاف اس کے تاجر پیشہ اور درمیانی طبقہ کے نمائندے دیوان عام کے رکن بن گئے

ٹیوڈر خاندان سے قبل جو خانہ جنگیاں جاری رہی ہیں ان سے ملک کو بے حد نقصان پہونچا۔ تجارت صنعت وحرفت، اور سب کاروبار زندگی بند ہو گئے۔ لہٰذا ملک بھر میں یہ عام ضرورت محسوس کی جانے لگی کہ ایک مضبوط بادشاہ تخت پر جلوہ افروز ہو جو مدبران ملک کی خود غرضی کے ہتھکنڈوں سے بچ سکے۔ یہی وجہ ہے کہ ٹیوڈر خاندان کے.... بادشاہوں نے بہ رضا ورغبت اپنے ملک کے لیے نئے سر سے استبدادی اور شخصی حکومت کا دور جاری کیا۔ اس عہد میں پارلیمنٹ بادشاہ کی بہت مطیع تھی اور بادشاہ نے جو چاہا وہ پارلیمنٹ سے پاس کروالیا۔ اون کے بعد خاندان اسٹورٹ آیا اسی زمانہ میں تحریک (Puritan) بہت زور پکڑ گئی تھی۔ (Puritan) ممبران پارلیمنٹ میں بہت کثرت سے آنے لگے۔ اور بادشاہ کے شخصی حقوق کی نہایت پرزور مخالفت ہونے لگی جیمس اول نے تو لے دے کے اپنی حکومت بخیریت گزار دی مگر اس کا لڑکا چارلس اول بہت ضدی تھا۔ وہ اس بات پر تلا ہوا تھا کہ پارلیمنٹ کو نیچا دکھا کر چھوڑے۔ وہ اپنے آسمانی حقوق کی ڈینگ مارنے لگا۔ فطرتاً پارلیمنٹ نے اور مخالفت کی اس نے گیارہ سال تک پارلیمنٹ کو معطل رکھا اور قطعاً مدعو نہ کیا۔ اس وقت اُس نے اپنے وزیروں کی مدد سے حکومت کی۔ مذہبی امور (Land) کے تحت میں ہو گئے اور سلطنت کا سب کام (Strafford) کیا کرتا تھا۔ پارلیمنٹ نے محصول کا وصول کرنا۔ اور دینا جس پر اوس کی رضامندی کی مہر ثبت نہ تھی ناجائز قرار دیا لہٰذا بہت سے لوگوں نے محصولات دینے سے گریز کیا۔ مقدمے عدالت میں ہوئے۔ مگر چونکہ عموماً جج بھی خوشامدی تھے اونھوں نے فیصلہ بادشاہ کے حق میں کیا۔ بہر حال یہ کشمکش جاری تھی ہی کہ ادھر آئرلینڈ کے حالات ناقابل اطمینان ہو گئے اور ادہر اسکاٹ لینڈ لڑائی پر آمادہ ہو گیا۔ بادشاہ کے خزانہ میں ایک پیسہ نہ تھا۔ تب مجبوراً اُس نے پارلیمنٹ کو مدعو کیا۔ پارلیمنٹ نے قبل اس کے کہ کسی ٹیکس کی منظوری دے پہلے اپنے تمام حقوق بادشاہ سے تسلیم کرائے جو (Declaration of Rights ; اعلان حقوق) کے نام سے مشہور ہیں

(۱) اس میں یہ تسلیم کیا گیا کہ بغیر پارلیمنٹ کی رضامندی کے بادشاہ کو محصولات قائم کرنے کا حق نہیں ہے

(۲) پارلیمنٹ کے ممبر گورنمنٹ کے خلاف تقریر کرنے میں گرفتار نہ کئے جائیں گے

اب پارلیمنٹ نے چاہا کہ چارلس اول کے وزرائے سے مواخذہ طلب کرے۔ چارلس نے اس غصہ میں چاہا کہ پارلیمنٹ

کو برخاست کردے مگر اپنے دل پر جبر کرکے اپنے رفیق وزیر (Strafford) کے قتل نامہ پر دستخط کردئے۔ پارلیمنٹ اور بادشاہ کے درمیان میں خلیج اور وسیع ہوتی گئی یہاں تک کہ ۱۶۴۲ء میں سول وار شروع ہوگئی بہت کچھ نشیب و فراز کے بعد بادشاہ کو کرامویل کے ہاتھوں شکست ہوئی اور چارلس کو موت برداشت کرنی پڑی۔ کرامویل نے رفتہ رفتہ تخت پر قبضہ کرلیا اور دستور میں نئی نئی تبدیلیاں کرنی چاہیں اور نئے نئے سیاسی ادارہ جات قائم کئے مگر اس کے انتقال کے ساتھ ساتھ وہ بھی ختم ہوگئے۔ خاندان اسٹوارٹ کے افراد دوبارہ تخت نشین ہوئے لیکن محدود اختیارات کے ساتھ۔ ان کی نسل کا خاتمہ ہونے پر ہالینڈ کے ولیم کو جو شاہزادی میری کا خاوند تھا مدعو کیا گیا اور دونوں کو مشترکہ بادشاہ بنادیا گیا۔ اب پارلیمنٹ نے اپنے حقوق مفصل طور سے تسلیم کرائے اور خارجی امور کو چھوڑتے ہوئے اندرونی انتظام پارلیمنٹ نے اپنے ہاتھ میں منتقل کرلئے اسی زمانہ میں وزراء میں پارٹی بندی شروع ہوگئی جن کا مفصل ذکر علیحدہ مضمون میں کیا جاچکا ہے۔ اس کے بعد ہنوور خاندان کی ابتدا سے وزیر اعظم کے عہدہ کا ارتقار شروع ہوتا ہے۔ جس پر روشنی ڈالی جاچکی ہے۔ غرض صدیوں کی جد وجہد کے بعد آئین کی موجودہ شکل تیار ہوئی اور اوس نے استقامت حاصل کی

جعفری

مجموعۂ استفسار وجواب

ایکہزار صفحات کا گنجینۂ علم وادب طیار ہورہا ہے اور اعلان کیا گیا تھا کہ عہ ۸ جس کی قیمت پیشگی آجائے گی اس کو یہ مجموعہ اسی قیمت میں دیدیا جائے گا۔ چونکہ اعلان کی میعاد ختم ہوگئی ہے اس لئے اب کوئی صاحب عہ بھیجکر اپنا نام درج نہ کرائیں

طیاری کے بعد جو قیمت مقرر ہوگی، اس سے ایکروپیہ کم پر حسب معمول خریداران نگار کی خدمت میں یہ مجموعہ پیش کیا جائے گا

کم از کم پانچروپیہ قیمت کا اندازہ کیا جاتا ہے

مینجر نگار لکھنؤ

بھیّا کی چڑیّاں

(۱)

تاریک اور سنسان جنگل میں جھونپڑی کی تاریک فضا کو نمایاں کرنے کے لئے ایک چراغ کافی ہے ! اور حیات انسانی کو مدارج کمال تک پہونچا دینے کے لئے ذراسی معمولی بات جو دل کو لگ جائے

ایک ذراسی "نظر" ایک چھوٹی سی "بات" ! آہ ! ایک تبسم ! دنیا کی انھیں چھوٹی چھوٹی باتوں میں وہ روحانی قوت بھری ہے جو انسانی جذبات میں تلاطم پیدا کر دیتی ہے اور روح کو بیدار

(۲)

آج رامو کے دل کو کوئی دیکھ سکتا تو سمجھتا کہ اس کا کیا عالم تھا - اور اس کی روح کس درجہ مسرور تھی - رامو پھیری لگانے نکلا تھا کیونکہ مٹی کی زمین پر موم کے کھلونے بنانا اور بیچنا اس کا روز کا مشغلہ تھا

وہ موم کی چڑیاں بناتا اس میں لال پیلا ہرا رنگ بھرتا اور انھیں ایک ڈورے کے سہارے اپنی لکڑی سے جھلاتا ہوا روز صبح کو نکل جاتا اور شام ہوتے ہوتے کچھ نہ کچھ کما لاتا - جس وقت وہ راستے سے گزرتا اور اپنی رسیلی آواز سے کہتا :-

" للا کی چڑیاں ہیں بھیا کی چڑیاں - جن کے ہوویں گے کھیلیا وہی لیویں گے چڑیا

" واہ واہ ری چڑیا "

— تو بچے بیقرار ہو کر دوڑ پڑتے اور چاروں طرف سے اُسے گھیر لیتے

چلتے چلتے رامو نے آواز لگائی - اس کی دلکش رسیلی آواز گاؤں کے گھروں میں گونج اٹھی بچے اچھل پڑے ! کتنے ہی گھروں میں اماں " اوں " " اوں " رونا ، مچلنا مار پیٹ اور دھما چوکڑی مچ گئی - رامو کہتا جا رہا تھا " جس کے ہوویں گے کھیلیا وہی لیویں گے چڑیا - واہ واہ ری چڑیا "

یہ آواز حد درجہ دردناک تھی ان کے لئے جن کے گھر بے نور تھے جو صاحب اولاد نہ تھے یہ دل تڑپا دینے والی صدا تھی ان کے لئے جنکی گودیں بچوں سے خالی ہو چکی تھی - بنا بچے والیوں نے ایک گہری سانس بھری

رامو چلا جا رہا تھا خریدنے والے اسے خود بلاتے ، بھاؤ کرتے - لیتے یا اسے لوٹا دیتے - کتنے ہی بچوں نے اسے بلایا

کتنوں ہی نے اس سے بھاؤ کیا"

وہ ایک چڑیا دو پیسہ میں بیچتا تھا اور اس سے کم میں وہ کسی کو نہ دیتا تھا۔ جو لے سکتے وہ لیتے اور جو نہ لے سکتے وہ جی مسوس کر رہ جاتے"

یکایک کسی نے رامو کو پکارا" ارے او چڑیا والے"۔ رامو لوٹ پڑا

دروازے پر ایک بیوہ کھڑی تھی اور پاس ہی ایک پانچ سال کی بچی ماں کے سہارے سے کھڑی ہوئی تھی رامو کے پہنچتے ہی وہ سسنے لگی، اس کا چہرہ شگفتہ ہو گیا اس نے کہا" نانی وہی وہ ادھر والی لال لال سی"!

" اچھا ٹھہرو تو"! کہتے ہوئے بیوہ ضعیفہ نے رامو سے پوچھا!

" بول بھیا کے کے پیسے یہ چڑیاں دیں!

" دو دو پیسے مائی"؟ رامو بولا

" ٹھیک بتا دُ تو لے لوں ایک اس بچی کے لئے!"

بچی کا دل دھڑ دھڑ کر رہا تھا دل ہی دل میں دعائیں مانگ رہی تھی کہ کاش چڑیا والا مان جائے۔ اُمید و یاس یقین و شک۔ خوشی اور رنج کی لہریں اس کے چہرے پر تیزی سے آ جا رہی تھیں۔ وہ منتظر تھی اور رامو کی طرف متجسانہ نظریں جمائے منتظر تھی کہ دیکھئے وہ کیا کہنے والا ہے! یہ اس کے لئے انتہائی دلچسپ انتظار تھا اور گویا اس کی قسمت کا فیصلہ۔ اس کی نظریں رامو کے ہونٹوں پر جمی تھیں

رامو نے کہا " نہیں مائی کم زیادہ نہ ہوگا دو دو پیسے سبھی کو دیتا ہوں"

بیوہ بولی " اچھا تو تمھاری مرضی دو دو پیسے تو بہت ہیں"

(۳)

رامو لوٹا، لڑکی کا چہرہ اتر گیا۔ وہ نڈھال ہو گئی۔ اس کی روح چلا رہی تھی" مائی دو دو پیسے کیا بہت ہیں"

" رامو کیا تجھے ایک پیسہ کم کرنا مشکل تھا" اس کے جذبات میں ہیجان برپا تھا، معصومیت کے جذبات اس کی خوبصورت بڑی بڑی آنکھوں سے نمایاں تھے، آخر کار وہ مایوس ہو کر مضمحل ہو گئی

ضعیفہ نے بچی کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے تسلی دی اور کہا۔" جانے دے مرا بیٹا مرا لال جانے دے، دوسرا کوئی آوے گا تو تجھے بہت اچھی چڑیا لے دوں گی!

اس بے معنی ڈھارس کو بچی نے سنا اور ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں لئے ہوئے گھر کے اندر چلی گئی

(۴)

آج خدا جانے کیا بات تھی کہ رامو کے قدم آگے نہ اٹھتے تھے۔ اور وہ ایسا محسوس کر رہا تھا جیسے کوئی گنگا کے کنارے

تک جاکر بغیر نہائے لوٹ آئے۔

گو اس نے اس خیال کو بھلانے کی لاکھ کوشش کی لیکن نہ معلوم کیوں وہ خود اپنے آپ کو بھولنے لگا اس کی حالت گرتی جا رہی تھی وہ خود کو سنبھالنا چاہتا تھا ادھر اُدھر کی باتیں سوچتا طرح طرح کے جی بہلانے کے بہانے پیدا کرتا لیکن اس کے دماغ سے وہ معصوم نظریں دور نہ ہوئیں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بچی اپنی پُر نم آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ رہی ہے آج رامو ایک گہری ندی میں ڈوب رہا تھا، اس کی ایسی حالت کبھی نہ ہوئی تھی وہ خود بخود کہہ رہا تھا کہ "نہیں میں ٹھیک نہیں کر رہا ہوں اس بے چاری بچی کے نازک دل پر میں ایک سخت پتھر مار کر چلا آیا ہوں اس کا چہرہ کیسا اتر گیا تھا اور اس کی آنکھ اُف!! کس طرح دیکھ رہی تھی...... نہیں نہیں...... یہ ٹھیک نہیں۔ روزگار کے معنی یہ تھوڑے ہی ہیں کہ میں اس طرح سخت دل ہو جاؤں ایسا بیدرد بن جاؤں ارے رام رام! کیا ہوتا اگر میں ایک ہی پیسے میں اسے دیدیتا...... کوئی گھاٹے کا پہاڑ تو نہ ٹوٹ پڑتا نہ سہی ایک وقت تمبا کو نہ پیتا نہ سہی۔ خیر ساگ ہی روٹی کھا لیتا...... بچوں کا دل توڑنا رام رام بھگوان کی مورت توڑنا ہے جاؤں دے آؤں۔ مگر اب تو اتنی دُور چلا آیا۔ ہو گا بھی۔ دنیا کے یہی کار خانے ہیں۔ روزگار میں رحم سے کام نہیں چلتا۔ کوئی نہیں لے سکتا تو نہ لے"

(۵)

اس خیال نے رامو کی روح کو جھنجھوڑ دیا وہ چونک پڑا اس نے گھبرا کر ایک ٹھنڈی سانس لی۔ اور دل کو مضبوط کر کے پھر وہی آواز لگانے لگا

لیکن اب بھی اسے معلوم ہو رہا تھا کہ دل کے اندر کانٹا سا کھٹک رہا ہے۔ اور اس کے تمام کاروبارانہ دلائل پست ہوتے جا رہے ہیں" اس کی حالت بدل رہی تھی اور وہ اپنے اندر ایک ایسی کیفیت پا رہا تھا جو اب سے پہلے کبھی اس پر طاری نہ ہوئی تھی

رامو نے دیکھا کہ خاموش رہنے سے جذبات کا طوفان اور امنڈتا چلا آ رہا ہے اور جس چیز کو وہ دبانا چاہتا ہے، زیادہ ابھرتی جاتی ہے اس لئے اس نے ہمت کر کے پھر آواز لگائی "للاکی چڑیاں......

اُس کی آواز بیٹھ سی گئی تھی۔ الفاظ اس کے گلے میں پھندا بنے جا رہے تھے۔ اس کا جی بولنے کو چاہتا ہی نہ تھا وہ چاہتا تھا کہ بغیر بولے ہی اس کی چڑیاں بک جائیں۔ تو اچھا۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے اس کے قدم پکڑ لیے ہیں اور اس کا گلا گھونٹ دیا ہے

آخر کار رامو لوٹ پڑا۔ اُس نے سوچا کہ بچوں کے خون سے سینچ سینچ کر وہ اپنا باغ نہیں لگانا چاہتا۔ ان کے دل کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں سے اپنا محل اٹھانا اسے پسند نہیں۔ اُسی دروازے پر پہونچ کر اس نے پکارا مائی۔ مائی!

لے لو چڑیا ؟

گھر کے اندر آواز پہونچی تو بیوہ نے کہا کون ہے !

بچّی کی آنکھیں چمک اٹھیں وہ دوڑ کر باہر گئی پھر دوڑ کر اندر آئی " ارے نانی وہی وہی چڑیا والا ہے - چل چل جلدی چل "

وہ ضعیفہ کی انگلی تھام کر کھینچ لے چلی

" لے لو مائی پیسے ہی پیسے لے لو "

بچّی نے جھپٹ بڑھ کر ایک لال لال سی چڑیا لے لی - کبھی وہ چڑیا کو دیکھتی ، کبھی اپنی نانی کی طرف اور کبھی سوداگر کو - اس کا دل مسرّت سے لبریز تھا

(۶)

" رامو چڑیاں پیسے ہی پیسے کو دے رہا تھا " یہ بات پھیلتے دیر نہ لگی اس کا سب مال دیکھتے ہی دیکھتے بک گیا !

گھر پہونچ کر رامو نے دیکھا کہ نفع تو درکنار لاگت بھی نہیں آئی اور دو آنے کا گھاٹا رہا محنت الگ رہی - لیکن اس کا دل مسرّت سے لبریز تھا اس کی روح بشاشش تھی مسکراتے ہوئے پیسوں کی طرف دیکھ کر وہ کہہ اٹھا - رامو ! تمھارے ایسے خود بکنے والوں سے روزگار نہ ہوگا - اس کے لئے لکڑی کا دل چاہیے اتنے ہی میں اس کا چھوٹا بالک باہر سے دوڑتا ہوا آکر لپٹ گیا - بابو گودی . . . . . . رامو نے اس کا منہ چوم لیا - آج تو بڑا اچھا لگتا ہے میرا للا ! " رامو نے اسے محبت بھری آواز میں کہا

بالک گود میں اور سمٹ گیا اور رامو نے اسے پھر چوم کر لپٹا لیا

بچے کو پیار کر کے جتنی خوشی اسے آج مل رہی تھی ایسی مسرّت اسے کبھی نہ نصیب ہوئی تھی

(ماخوذ از ہندی)　　**عبدالجلیل**　　(دیسرانوی)

دو ادبی شاہکار

شوپنہار - فلسفۂ شوپنہار پر ایک بے مثل تبصرہ ۱۲؍ (علاوہ محصول)

مثنوی زہر عشق - مجلد معہ رنگین تصاویر و تین مقدمات قیمت ۱۲؍ (علاوہ محصول)

مینجر نگار لکھنؤ

یادرفتگاں

(انتخاب کلام میرزا تقی ہوس)

عثمانیہ لائبریری حیدرآباد کے ایک قدیم نسخہ سے

نیاز

گھبرا کے یہاں آئے تھے ہم ملکِ عدم سے	یاں بھی نہ لگا جی ہمیں کیسا خفقاں تھا
جانا بجھے سب نے پہ کسی نے بھی نہ دیکھا	میں گلشنِ ہستی میں نسیمِ گزراں تھا
افسوس کیا دیکھ کے کل ہم نے ہوس کو	کس سوچ میں انگشت تحیر بدہاں تھا

آچکا تھا صاف میرے سادہ بیحجاب	کچھ یونہی اک شرم کا پردہ سا حائل ہوگیا
ای ہوس معشوق سے کچھ خون کا دعویٰ نہیں	تو تو بے مارے موا بے تیغ گھائل ہوگیا

شغلِ شبِ تنہائی کس سے کہیں، ہم اپنا	دو چار گھڑی روکر بہلاتے ہیں غم اپنا
ارمان ہے پیری میں رو رو کے بصد حسرت	لڑکوں سے جوانی کا قصہ کہیں، ہم اپنا

عاشق تو تھا ہوس کہو دیوانہ کب ہوا	لو اٹھ گیا حجاب بڑا ہی غضب ہوا

تم نے ظاہر میں گلے لگنے کا انکار کیا	خواب میں ہم نے تمھیں دیر تلک پیار کیا

نشہ تک تو رہا پردہ تمھیں اب ہم کو بتلادو	خدا کے واسطے جو وقت ہووے بے حجابی کا
تری تصویر سے نسبت نہیں کچھ حسن یوسف کو	یہاں تو لاکھ پردوں میں ہو عالم بے نقابی کا

غم و رنج ہستی بسر ہو چکا — چلو اب وطن کو سفر ہو چکا
کیا ہم کو حیرت نے تصویر وہم — تراوِ ورائے چشمِ تر ہو چکا
کہانی پر اپنی رُلاتے تمھیں — یہ قصہ بھی یاں مختصر ہو چکا
فقیروں کا ماوا و مسکن کہاں — جہاں تھک کے بیٹھے وہ گھر ہو چکا

گو ہوش یارانِ رفتہ کا بہت ماتم کیا — حقِ صحبت یاد کر جو کچھ کیا سو کم کیا
شوقِ دیدِ گل کہاں اور عالمِ پیری کہاں — قصدِ سیرِ باغ ہم نے ہائے بے موسم کیا

اپنے ہاتھوں سے ہوش آپ ہوئے تم بدنام — سب کچھ آیا پہ دل اپنا نہ تمھیں تھام آیا

ہنگامۂ کفر و دیں کا کوئی جائے سیر تھا — میں واں گیا جہاں نہ حرم تھا نہ دیر تھا
کیا جانے دل ہی دل میں وہ کرتا تھا کس کا ذکر — ہر دم زبانِ یار پہ یادش بخیر تھا

وصل مت ڈھونڈھ ہوش تیری تو یہ حالت ہے — دیکھنا چھپ کے اسے تو بھی ہراساں ہونا

دیکھ ہنستے گل کو گلشن میں لگا رونے ہوش — آگیا کیا جی میں بیٹھے بیٹھے تجھ کو کیا ہوا

مرا پہونچا آخری وقت جب مجھے دیکھنے کو وہ آئے تب — لگے کہنے اس کو یہ کیا ہوا کہ یہ کل تلک تو بحال تھا
وہی دن جنوں کے بھلے تھے کچھ کہ مقام دشت میں تھا مرا — نہ کسی کی تھی مجھے کچھ خبر نہ کسو کو میرا خیال تھا

ہم سے وارفتۂ الفت ہیں بہت کم پیدا — ہاتھ سے کھو نہ ہمیں ہوں گے نہ پھر ہم پیدا

آئے تھے مشتاقِ گل مہلت نہ پائی دید کی — ورنہ اس گلشن میں آنے سے ہمیں کیا کام تھا
اس کی دولت چین سے سویا ہوں ہے احسان مرگ — دم کی آمد شد سے میں تو سخت بے آرام تھا

اگرچہ ہجر کا ڈر وصلِ یار میں بھی تھا — پہ کچھ قرار دلِ بیقرار میں بھی تھا

رواں ہیں اشک مرے جس طرح بہ جوش و خروش　　یہی سماں کبھی ابر بہار میں بھی تھا
گزشتگان زمانہ کا تم نہ وصف کرو　　یہی غم و الم اس روزگار میں بھی تھا
ہوس کا دل ترے جانے سے اب ہے منزلِ غم　　کبھی خوشی کا گزر اس دیار میں بھی تھا

بلبل نے کڑھایا نہ غمِ گل نے رُلایا　　ہم کو تو فقط اس کے تغافل نے رلایا

جس سے کل خون میں ڈوبا قفس اے مرغ اسیر　　تو نے پھر آج وہی زمزمہ بُنیاد کیا

کل جو وہ گلرو بر زدہ دامن ناز سے گزرا گلشن میں　　اُڑ گئی رنگ گل کی نزاکت خوب جو میں نے دھیان کیا
برقِ نگہ جانسوزِ عالم خنجرِ ابرو تیرِ مژہ　　قتل کو اِک بیکس کے صاحب اتنا کیوں سامان کیا
وصل میں ڈر ہے ان کا ہر دم ہجر میں روتے رہتے ہیں　　ہم کو تو بیتابیٔ دل نے آہ بہت حیران کیا
آوے گر تو ان کے گھر تو کیا یہ تیرے نذر کریں　　ایک ہوس دل رکھتے تھے سو آگے ہی قربان کیا

مجھ کو کیا اگلے زمانہ کی خبر سچ تو یہ ہے　　کہ ترے عہد میں تجھ سا کوئی پیدا نہ ہوا

یہی آن تھی سب کی کہا سو کہا، سبھی کرتے تھے وعدۂ اپنے وفا　　وہ چلن جو قدیم زمانہ میں تھا ترے عہد میں عہد شکن نہ رہا
کہا لیلی نے میں نے سنا ہے یہی دمِ گرم سے قیس کے آگ لگی　　وہاں جاتے تھے دو گھڑی لگتا تھا جی ہے غضب کہ وہ نجد کا بن نہ رہا

گریہ نے مرے آخر طوفان کیا برپا　　آنسو کا ہر اک قطرہ دلخوں کن یم نکلا
گو جان مری جاوے زنہار نہ آؤں گا　　کوچہ سے ترے میں تو اب کھا کے قسم نکلا

جی اس کے در سوا کہیں لگتا نہیں ذرا　　فرصت دے ناتوانی تو جاویں ہیں ذرا
رویا میں ساری عمر و لے اس نے اے ہوس　　رکھی نہ چشم تر پہ مری آستیں ذرا

ترے ڈر سے میں آہ کا ضبط کیا و لے گریہ کا ضبط تو ہو نہ سکا　　بہے چپکے ہی چپکے نت آنسو مرے پہ میں کھول کے دل کبھی رو نہ سکا

حیراں ہوں کہوں کیا میں عجب حال ہے جی کا　کچھ پوچھو نہ باعث مری افسردہ دلی کا
اتنا نہیں کوئی کہ اُسے جا کے سنا دے　بیٹھا ہے سرِ رہ کوئی وارفتہ کسی کا

کونسی شب میں غمِ ہجر سے گریاں نہ رہا　کس دن آنکھوں پہ مرے گوشۂ داماں نہ رہا

ولولے جب عشق کے تھے اور جنوں کا جوش تھا　گہ میں کچھ کہتا تھا، گہ دو دو پہر خاموش تھا
زورِ کیفیت تھی بزمِ میکشاں میں شب ہوس　ایک کا لغزش کے باعث ایک تھامے دوش تھا

بھولتا ابتک نہیں جی سے وہ اندازِ خرام　دل کو سینے میں مرے جس نے تہ و بالا رکھا

تیرے وحشی سے عبث تجھ کو خفا کرتے ہیں لوگ　سب یہ باتیں جھوٹ ہیں اس بے خبر نے کیا کہا
دی جو قاصد نے خبر اُس کے نہ آنے کی اُسے　رو دیا اور رہا شق خونیں جگر نے کیا کہا

بیخودی سے ہو کے آگے ہم کو آجاتا تھا ہوش　طولِ غش کا اب تو یاں دو دو پہر ہونے لگا
ابتدا میں عشق بازی سہل سمجھی تھی ہوس　آخر آخر جان کا اس میں ضرر ہونے لگا

بیتابیٔ دل قیس کی سنتے تھے سو دیکھا　تھامے ابھی ہاتھوں سے جگر ہمکو ملا تھا
کہتا تھا اسے کوئی ہوس اور کوئی مجنوں　کل دشت میں اک خاک بسر ہمکو ملا تھا

میری زباں میں طاقتِ تقریر ہی نہیں　ظاہر کروں کسی سے میں دردِ نہاں کو کیا
یارانِ رفتہ بھول گئے ہم کو اے ہوس　رہ میں کسی نے لوٹ لیا کارواں کو کیا

سچ بتا دل پہ ہوس تیرے ہوا کیا صدمہ　نیم بسمل کی طرح کیوں تو مری جاں لوٹا

ناحق کو ایک بلا میں مجھے مبتلا کیا　او آرزوئے حسنِ بتاں ہائے کیا کیا

ہم روئے ساری عمر پہ خالی ہوا نہ دل
ایک آدھ اشک نزع کے دم تک بہا کیا
سویا جو میرے گھر کبھی وہ مستِ خوابِ ناز
تلووں سے اُس کے اپنی میں آنکھیں ملا کیا

نقشِ پائے رفتگاں کا سلسلہ جاتا رہا
ہم تو تھک کر رہ گئے اور قافلہ جاتا رہا
ہم گئے تھے اس سے کرنے شکوۂ دردِ فراق
مسکرا کر اس نے دیکھا سب گلہ جاتا رہا

شب کہ پشتِ بام پہ بے پردہ وہ مہ پارہ تھا
جو ستارہ تھا فلک پر دیدۂ نظارہ تھا
جاگنے کے بعد تھیں اسمیں رگیں گل کی عیاں
شب جو وقتِ خواب ہات اسکا تہِ رخسارہ تھا

مشتِ پرِ بلبلِ نالاں کے جو برباد ہیں سب
ہات پر ہات دھرے سوچ میں صیاد ہیں سب
صبر کرتا ہوں جفاؤں پہ صنم اس خاطر
کہ تری پیار کی باتیں بھی مجھے یاد ہیں سب

یہ شب کی درازی ہے تو، ہم کیونکہ جئیں گے
اللہ یہ کس طرح سے ہووے گی بسر رات
کیا پوچھے ہے احوال صنم اب تو ہوس کا
غم میں وہ ترے کر گیا دنیا سے سفر رات

مت اے نسیم برگِ گل یاسمیں اُلٹ
سوتے ہیں اس جبیں سے دوپٹہ کہیں الٹ

بیمارِ محبت کی خبر پوچھتے ہو کیا
ہے صبح سے کچھ اسکے تئیں بیخبری آج

کب تلک یہ وحشتیں آرام کر اب اے ہوس
دو گھڑی رکھ ہات زیرِ سر گریباں چھوڑ کر

شب آنکلا تھا میرے گھر میں وہ رشکِ قمر یارو
مری فریاد و زاری سُن لگا کہنے یہ گھبرا کر
جو روتے روتے مر جاوے گا تو بدنام ہونگا میں
ہوس تجکو مرے سر کی قسم اتنا نہ رویا کر

ق

کس کس کا ماتم کر چکے کس کس کے ہم غمخوار تھے
اب یار اپنا غم کریں، ہم کو کسی کا غم نہیں

اس منزل ہستی میں ہمیں کوئی بتادو   ہم تو سبب عزم سفر بھول گئے ہیں

ہم جنکے غم میں بیخود ہر شام ہر سحر ہیں   افسوس وہ ہماری حالت سے بیخبر ہیں
اس کا خیال ہم کو جاگہ سے لیچلا ہے   معلوم کچھ نہیں ہے اسوقت ہم کدہر ہیں

دل کا ہر حال میں رہتا تھا بہت پاس ہمیں   سو گیا ہات سے اب کچھ نہیں وسواس ہمیں
جوشش اشک برا ہووے تمھارا تم نے   اک پل بھی نہ دیا بیٹھنے اس پاس ہمیں

دامن کشاں چمن میں کون اس روش سے گزرا   جو پتیاں زمیں پر گل کی جھڑی ہوئی ہیں

اب کہو کل کی ملاقات مقرر ہے کہاں   ہے قلق دل کو مرے پر تمھیں باور ہے کہاں
جستجو میں کبھی پھرتا نہ ہوس خانہ خراب   پوچھتا اس سے جو اتنا کہ ترا گھر ہے کہاں

جن کے خاطر اپنے تئیں ہم آپ میں پاتے نہیں   آہ آکر وہ کبھی چھاتی سے لگ جاتے نہیں
دیکھنے سے جنکے سیری ہی کبھو ہوتی نہ تھی   برسوں اب وہ ہمکو صورت اپنی دکھلاتے نہیں
اس کے جانے سے ہوا ہے مضطرب کیسا ہوس   ہجر بھی ہوتا ہے لیکن اتنا گھبراتے نہیں

واماندگی نے ہم کو سب سے جدا کیا ہے   یاران رفتگاں کو بیٹھے پکارتے ہیں

گہ صحرا کو جاتے ہیں اگہ سنگ سے سر ٹکراتے ہیں   کیا کہئے ہم کس کس ڈھب سے اُس بن جی بہلاتے ہیں
عجز کی اپنی حد نہیں باقی وہ ہی بے پروائی ہے   روٹھے ہی جاتے ہیں ہوس وہ جتنا انکو مناتے ہیں

اس گل کی جستجو کو میں واں تلک گیا تھا   میرا ہوس وگرنہ کیا کام تھا چمن میں

جی میں آتا ہے کہ احوال اسیراں دیکھوں   چھپ کے جاؤں طرف روزن زنداں دیکھوں

سوزشِ دل کسے کہتے ہیں ہوس کیا شے ہے   ہات رکھکر میں ترا سینۂ سوزاں دیکھوں ؟

جانا تو واں کا چھوڑ دیا میں نے پر ہوس   اس کا خیال دل سے میں کیونکر جدا کروں

نہیں غفلت کی جا یہ لوگ کم ملتے ہیں ای عیسےٰ   نہ کیجیو کوتہی بیمارِ غم کی غمگساری میں
کسی کا دل نہ رنجیدہ ہوا فریاد سے اپنی   عجب لذت اُٹھائی ہم نے چپکے چپکے زاری میں

بلائیں ہم پہ جو ہجرانِ یار میں آئیں   کسی پہ کاہیکو اس روزگار میں آئیں

اس جنوں کی دل پہ از بس دمبدم سر سائیاں   ہم ہیں اب اور وحشتیں اور بادیہ پیمائیاں
کیا مزے سے اپنی کٹتی تھی بسودائے وصال   ہائے وہ راتیں اندھیری ہائے وہ تنہائیاں

کبھی زلف دن کو جو کھول دی تو نمود تھی شب تار کی   جو نقاب شب کو الٹ دیا تو سحر تھی فصلِ بہار کی

دن جو تھے زندگی کے اپنے مقرر کاٹے   پر کوئی ہنسکے نہ کاٹا بھی رو کر کاٹے

منع کیوں کرتا ہے ناصح آہ و زاری سے ہمیں   ہم سے کس دن خوش تھے وہ جو اب خفا ہو جائیں گے

تو برے کا چلے ہیں داغ ہم دل پر لئے   سامنے نہ آویں حوریں ہاتھ میں ساغر لئے
اب چھپانا لطف کیا ہی ہو چکی رسوائیاں   شوق سے نعرہ کرو ڈرنا تھا جتنا ڈر لئے

لکھتے ہو عبث یار و اب حال مرا اسکو   یاں کام ہی آخر ہے جبتک کہ جواب آوے

نازکی اپنے پہ سو نفتیں دھر لیتا ہے   کبھی انگڑائی جو وہ رشکِ قمر لیتا ہے

گئے ہم جی سے تب اُس شوخ نے یاروں سے کہا — کچھ یہ ہم پر نہ کھُلا کیا اُسے بیماری تھی

نہیں اختیاری سفرِ اجماں لیجلو میں اسیر ہوں — مجھے کام بانگِ درا سے ہے نہ صدائے کوسِ رحیل سے

رو رو کے میری بزم میں مجکو نہ رُسوا کیجئے — دیکھو ہوس کہتا ہوں میں بھلائے نہیں آنکو مجھے

وحشت بتاتے ہو مجھے دیوانہ کہتے ہو مجھے — کہہ دوں نہ مانو گر بُرا فی الواقعی ہے جو مجھے
کچھ دستگیری بھی کرو گر بے نقاب آئے ہو تم — گرتا ہوں میں آتا ہے غش آغوش میں لے لو مجھے

ڈرے کو وعظ سے اے زاہد و ناحق ڈراتے ہو — کرو وہ ذکر جس میں دو گھڑی جی بہلے غم بھولے
بہت دیکھا مجھے آخر کہا شاید ہوس ہے تو — بڑے عرصہ میں پہچانا مجھے بھولے یہ کم بھولے

شادی و غم جہاں میں توام ہے — لیک غم ہے بہت خوشی کم ہے
کچھ دو عالم سے ہم کو کام نہیں — اب ہمارا کچھ اور عالم ہے

رونے میں رات ہجر کی ساری گزر گئی — گزری بری پہ یوں بھی ہماری گزر گئی

مرض عشق کا کیا کوئی معالج ہو کہ ہائے — بچتے دیکھا نہ اس آزار کا بیمار کوئی
ذکر کچھ عشق کا آیا تو لگے کہنے آپ — ہم بھی سنتے ہیں کہ کرتا ہی ہمیں پیار کوئی
پس دیوارِ حرم رات کوئی روتا تھا — یاد کر کر وہ تر اسایۂ دیوار کوئی

کیا کہوں حالتِ ہوس ہجر میں کیا تباہ تھی — چاروں طرف نگاہ تھی زیرِ لب ایک آہ تھی

اس کوچہ سے گزرا میں تو اک لغزش پا تھی — شاید کوئی جھانکے تھا کھڑا روزن در سے

کیا دن تھے وہ جب چھپ چھپ کر تم پاس ہمارے آتے تھے　　کانپتے تھے بدنامی کے ڈر سے آنسو پی پی جاتے تھے

پامال کیا ہم کو ہر اک رہگذری نے　　صدمے یہ دکھائے ہمیں بے بال و پری نے

کیا کیا نہ رنج ہم پہ ترے بن گزر گئے　　اب جلد آ کہیں کہ بہت دن گزر گئے
رخصت کے وقت ہم نے ہوس آہ تو نہ کی　　صدمے ہماری جان پہ لیکن گزر گئے

تنہا نہ سوزِ داغ سے دل ہی فغاں میں ہے　　نے کی صدا ہماری ہر اک استخواں میں ہے

حضرت نیاز کے ادبی شاہکاروں کا نیا مجموعہ

جمالستان

(نگارستان کا دوسرا حصہ حجم ۵۰۰ صفحے)

قیمت فی کاپی مجلد للعہ　　غیر مجلد للعہ　　علاوہ محصول
خریدان نگار سے　　ایک روپیہ کی رعایت

فہرست مضامین حسب ذیل ہے :-

دنیا کا اولین بت ساز　　فریب خیال　　صدائے شکست　　دو گھنٹے جہنم میں
ایک شاعر کی محبت　　میر بیدانہ　　تاریخ عرب کی ایک روایت جمیل　　ایثار
شہید آزادی　　بعد المشرقین　　ہاے بخیر گذشت　　ٹیلی فون نمبر ۶۶
دو خط　　جانعالم اور ملکہ مہر نگار　　چند گھنٹے ایک مولوی کے ساتھ　　شبنمستان کا قطرۂ گوہریں
سودائے خام　　درس محبت　　ازدواج مکرر　　انتظام علی صاحب
سنہ ۲۵ء کا ایک صوفی　　ایک شاعر کا انجام　　آدم وحوا سے پہلے　　شہزادۂ خرم اور ابابیل
زہرہ کا ایک پجاری　　رادھا　　سرزمین دکن کی ایک لنواز شام　　نوجوان شہزادہ
مضطربۂ فلک　　چنگاری　　محلہ کی رونق　　داستان حسن وعشق کا ورق خونیں

غالبؔ کا ایک شعر

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے
میں اُسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

حکیم ٹیگور فرماتے ہیں :-

"میں جاتی ہوں - رات کو
چپکے چپکے - دھیرے دھیرے
چھپ چھپ کر
اکیلی تنہا
یہ کون ؟ میرے ساتھ
قدم ملاتا آتا ہے
آہیں بھرتا رُک رُک کر
خاک اڑاتا پیروں سے
آہ

یہ میرا بدن
میرا ساتھ نہ چھوڑے گا
کہ وہاں جاؤں - اور اُس سے ملوں
اور اس کو دیکھوں - اور اُس کو دیکھوں
اور اُس کو دیکھوں
اکیلی تنہا -"

وہ نہیں چاہتی کہ کوئی اس کے ساتھ ہو - خود اُسے اپنا بدنی چولہ بھی اجیرن ہوگیا ہے - وہ خود اپنے تن من سے الگ -

ہو کر اکیلی اُس کی خدمت میں جانا چاہتی ہے خدارا بتاؤ، وہ کیونکر جائے اور کیونکر ملے، اور کیونکر دیکھے اُس بت کو اکیلی تنہا

جسم خاکی کے تعلق نے گرانبار کیا

کاشش میں راہ میں تیری تن تنہا ہوتا

کیا غالب کا بھی یہی مقصد ہے ؟ نہیں - غالب اس سے بھی بلند جاتا ہے - وہ کہتا ہے

میں اُسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

غیر تو غیر میں خود بھی نہ دیکھوں - نہ میری آنکھیں - نہ میرا دل - نہ میرا کوئی - نہ خود میں - وہ یہ نہیں کہتا " اکیلی تنہا " وہ تو اکیلا بھی اُسے دیکھ نہیں سکتا

یہ کیوں ؟ شاید اس لئے کہ داب حُسن سے مرعوب ہے - شاید اس لئے کہ خود اس کے دل میں اپنی نگاہوں سے رشک کی آگ بھڑک اُٹھتی ہے جو مانع ہے - شاید اُس کے نظارہ سے جو سرور پیدا ہوتا ہے اُسے برداشت نہیں کرسکتا وہ کہتا ہے یہ کم بخت " میں " بھی اُسے کیوں دیکھے - لہٰذا آنکھیں بند کئے پڑا ہے - تصورِ جاناں کئے ہوئے - مگر شاید تصور میں بھی نہ دیکھ سکتا ہو

یہ گتھی سلجھائے کون ؟

اس میں شک نہیں یہ عجیب و غریب رشک ہے جو بغض و حسد کے بھی کان کاٹتا ہے - بلکہ یوں کہئے اپنی ناک کٹا کر دشمن پر فتح پاتا ہے - راوی کہتا ہے کہ صبح سویرے بہتا ہوا خون دیکھنا شگون بد ہے - کسی کاٹھیاواری بزرگ کو اپنے ہمسایہ سے رقابت تھی - رقابت کی آگ تیز ہوتے ہوتے غالب مرحوم کے درجہ تک پہونچ گئی - ایک روز انھوں نے دیکھا کہ صبح تڑکے ہمسایہ سودا لینے منڈی جا رہا ہے - دل میں کہا یہ منڈی کیوں جائے ؟ مگر اُسے روک کیونکر سکتے تھے - بیوی سے چھری مانگی - " چھری لا - چھری لا - ابھی اس کا راستہ روکے دیتا ہوں " چھری لئے دوڑے دوڑے گئے اور ہمسایہ کے سامنے کھڑے ہو کر اپنی ناک کاٹ ڈالی - ہمسایہ بہتا ہوا خون دیکھ کر ڈر گیا - گھر واپس لوٹا کہیں مصیبت نہ آپڑے - یہ بزرگ بھی کٹی ہوئی ناک ہاتھ میں لئے بال بچوں میں تشریف لائے - کامیاب و بامراد

فلسفی کہتے ہیں " میں " کی دو قسمیں ہیں - اصلی مَیں یعنی روح اور نقلی میں یعنی نفس - غالب کے شعر میں یہی اصلی میں شاید نقلی میں پر رشک کرتا ہو کہ یہ اُسے کیوں دیکھے ؟ یہ دیکھنے والا کون ؟ مگر یہ توجیہ درست نہیں - شاعر کہتا ہے - میں اُسے سرے سے نہ دیکھوں - نہ میرا اصلی مَیں نہ میرا نقلی مَیں - نہ میرا کوئی مَیں - میرے دل میں رشک کی جو آگ دہک رہی ہے وہ اجازت نہیں دیتی کہ اُسے دیکھوں - غیر تو غیر خود میں بھی نہ دیکھوں - کسی حال میں نہ دیکھوں کسی رنگ میں نہ دیکھوں

حکیم ہیگو " نائیگرا " کے آبشار دیکھنے امریکا گئے - یہ آبشار دنیا کی سب سے بڑی آبشار ہے جو میلوں کی بلندی سے

پہاڑی چٹانوں پر گرتی ہے۔ دودھ سے زیادہ سفید اور چاندی سے زیادہ چمکیلی شفاف پانی کی چادریں جن پر صبح و شام سورج کی لہراتی ہوئی کرنیں رنگین ساڑیاں پہنے رقص کرتی ہیں اور قوس قزح کی رنگینیوں کو اس حسن سیال کی نیرنگیوں پر نچھاور کرتی ہیں

اس منظر کا سامنے آنا تھا کہ ٹیگور کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو اُبل پڑے اور وہ بے اختیار چلا اُٹھے

"واپس لوٹو۔ میں نہیں دیکھوں گا۔ ہرگز نہیں۔ ہرگز نہیں۔ ہرگز نہیں۔ یہ آبشار۔ یہ منظر

یہ قیامت۔ ہرگز نہیں۔ واپس چلو۔ قسم ہے آبشاروں کے دیوتا کی میں دیکھ نہیں سکتا

مجھ میں یہ قوت کہاں کہ اس حسن و سرور کے سمندر کا تماشا کروں۔ واپس چلو"

میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

اب شعر کی بلاغت ملاحظہ ہو کہ رشک و رقابت کا سارا الزام "قسمت" کے سر رکھا ہوا ہے۔ شاعر خود بری الذمہ ہے۔

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے

"قسمت" کا لفظ گویا اس اقلیم معانی کا جام جمشید ہے جس کے اندر سے حقایق و معارف کی کائنات شیشہ کی طرح روشن نظر آتی ہے۔ غالب یہ نہیں کہتے کہ میں اُسے نہ دیکھوں۔ کیوں نہ دیکھوں ؟ جب وہ جنت نگاہ ہے تو اُسے ضرور دیکھنا چاہیے۔ مگر کیا کروں اس بدبخت "قسمت" کے ہاتھوں دیکھ ہی نہیں سکتا۔ اس سے بڑھکر میرے لئے کیا مصیبت ہو سکتی ہے کہ دیکھ سکوں مگر نہ دیکھ سکوں۔ رشک کی آگ سے جل بھن کر کباب ہو جاؤں

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے
میں اُسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

محمد اسحاق (امرتسری)

(نگار) ہمارے دوست محمد اسحاق صاحب نے غالب کے جس شعر سے متاثر ہو کر اظہار خیال فرمایا ہے، اس میں شک نہیں کہ وہ میرزا کی "رشکیہ" شاعری کی نہایت اچھی مثال ہے، لیکن اس سے بہتر مثال ایک اور ہے جس میں اُس نے صرف لفاظی سے کام نہیں لیا۔ بلکہ ایک حقیقی جذبہ کو حقیقی زبان میں ادا کیا ہے لکھتا ہے :-

قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہمسفر غالب
وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

محبوب کو دیکھ کر خود اپنے آپ پر رشک آنا، محض اک شاعرانہ حسن بیان ہے اور حقیقت سے دُور، لیکن محبوب کا دوسرے کے ساتھ ہونا یقیناً نہایت رشک انگیز بات ہے اور اس لئے دوسرے شعر میں واقعیت کی جھلک پیدا ہو جانے سے اس کا مرتبہ بہت بلند ہو گیا ہے

تغزل میں جن جذبات کا اظہار کیا جاتا ہے وہ دو قسم کے ہوا کرتے ہیں، ایک وہ جن کا تعلق صرف جذباتِ فنادگی سے ہے اور جو خالص عشقیہ کیفیت کے حامل ہوتے ہیں، دوسرے وہ جن میں استدلال و حجت سے کام لے کر عاشق اپنے حقوق ثابت کرنا چاہتا ہے اور اس سلسلہ میں رشک و حسد، طعن و تشنیع سبھی کچھ معرض بیان میں آجاتے ہیں

پھر جس طرح اول الذکر جذبات کے لئے میر و درد کا تغزل معیاری چیز سمجھا جاتا ہے، اسی طرح موخر الذکر بیان کے لئے مومن و غالب کا کلام خاص مرتبہ رکھتا ہے۔ اور اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ ان دونوں میں، فضلیت کس کو حاصل ہے تو میں بلا تامل مومن کا نام لے دوں گا

اس میں کلام نہیں کہ غالب کے یہاں رشک و حسد کی بعض عجیب و غریب مثالیں نظر آتی ہیں، لیکن اس کے بیان میں وہ بالکل نمایاں طور پر جارحانہ انداز سے کام لیتا ہے اور رشک کے جذبہ کو کھلم کھلا رشک ہی کے الفاظ میں ظاہر بھی کرتا ہے، برخلاف اس کے مومن کے یہاں یہ کیفیت نہ جارحانہ ہے اور نہ مدعیانہ، بلکہ اس میں وہی فنادگی پائی جاتی ہے جو "خصوصیات محبت" میں داخل ہے۔ غالب منہ پھوڑ کر صاف صاف کہدیتا ہے کہ

تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

مومن بھی غیر سے محبوب کا تعلق پسند نہیں کرتے، لیکن اس کو ظاہر کرتے ہیں اس انداز سے :-

ہے دوستی تو جانبِ دشمن نہ دیکھنا جادو بھرا ہوا ہے تمہاری نگاہ میں

مقصود تو یہی ہے کہ رقیب کی طرف نہ دیکھو لیکن منع کرتے ہیں اس طرح گویا کہ اس کے بڑے خیر خواہ ہیں اور محبوب کے جذبات کی رعایت ہاتھ سے دینا نہیں چاہتے

رشک کی ایک اور نہایت لطیف مثال ملاحظہ ہو

رشکِ پیغام ہے عناں کش دل نامہ بر راہبر نہ ہو جائے

صورتِ حال یہ ہے کہ مومن نامہ بر کے ذریعہ سے اپنا پیام محبوب کے پاس بھیج رہے ہیں، لیکن اس کے جانے کے بعد جذبۂ رشک اُبھر آتا ہے اور سوچتے ہیں کہ راہبر دل سامنے جائے گا، ان کا نظارہ کرے گا، دو بدو گفتگو کی لذت اُسے حاصل ہوگی - اس خیال کے آتے ہی وہ خود بھی پیچھے پیچھے چل پڑنے کے لئے اپنے آپ کو آمادہ پاتے ہیں - لیکن ان خیالات کو جس خوبی سے ظاہر کیا ہے اور ایک لفظ راہبر لاکر جو لطف پیدا کر دیا ہے وہ اہل نظر سے مخفی نہیں

مومن نے اگر اس جذبہ کو صاف صاف الفاظ میں بغیر کسی تعبیر شاعرانہ کے کبھی ظاہر بھی کیا ہے تو فنادگی عشق کی شان کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا مثلاً :-

ہے نگاہِ لطف دشمن پر تو بند جائیے یہ ستم اے بے مروت کس سے دیکھا جائے ہے

یعنی وہ "جلی کٹی" سے کبھی کام نہیں لیتا اور متاثر ہو کر خود اپنی ہی پامالی پر قناعت کر لینا پسند کرتا ہے ———

جذبۂ رشک کی ایک نہایت پاکیزہ مثال اور ملاحظہ ہو

غیر کے ہمراہ وہ آتا ہے میں حیران ہوں کسکے استقبال کو جی تن سے میرا جائے ہے

میرا مدعا اس تحریر سے غالب کی تنقیص نہیں، بلکہ صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ لوگوں کو مومن کی طرف بھی توجہ کرنا چاہئے جو تغزل کے لحاظ سے اپنا مثل نہیں رکھتا، اور جس کو لوگوں نے بالکل بھلا رکھا ہے

نگار کے گزشتہ سالوں کے پرچے

حسب ذیل قیمت پر معہ محصول مل سکتے ہیں

سنہ ۲۲ء		سنہ ۲۶ء		سنہ ۳۰		سنہ ۳۲ء	
ستمبر	۴ر	مئی	۴ر	اگست	۸ر	جون	۴ر
اکتوبر	۴ر	جون	۴ر	ستمبر	۴ر	جولائی	۴ر
سنہ ۲۳ء		اکتوبر	۴ر	اکتوبر	۴ر	اگست	۴ر
مئی	۶ر	نومبر	۴ر	نومبر	۴ر	ستمبر	۴ر
جون	عمر	دسمبر	عمر	دسمبر	۶ر	اکتوبر	۴ر
سنہ ۲۴ء		سنہ ۲۷ء		سنہ ۳۱		نومبر	۴ر
جنوری	۴ر	مارچ	۴ر	جولائی	۳ر	دسمبر	۴ر
فروری	۴ر	اپریل	۴ر	اگست	۳ر	سنہ ۳۳ء	
مارچ	۴ر	مئی	۴ر	ستمبر	۴ر	فروری	۴ر
اپریل	۴ر	جون	۴ر	اکتوبر	۳ر	اپریل	۸ر
مئی	۴ر	سنہ ۲۸ء		نومبر	۳ر	جولائی	۴ر
جون	۴ر	دسمبر	۸ر	دسمبر	۳ر	ستمبر	۴ر
جولائی	۶ر	سنہ ۲۹ء		سنہ ۳۲ء		اکتوبر	۴ر
اگست	۴ر	مارچ	۸ر	جنوری	۱۲ر	دسمبر	۴ر
ستمبر	۶ر	اکتوبر	عمر	فروری	۴ر		
سنہ ۲۶ء		نومبر	عمر	مارچ	۴ر		
جنوری	۴ر	سنہ ۳۰		اپریل	۸ر		
اپریل	۸ر	مئی	۴ر	مئی	۴ر		

منیجر نگار لکھنؤ

سادھو کی بط

(نذرِ صنفِ نازک)

جنس لطیف کی بے شمار ساحرانہ ادائیں ایک نوجوان تارک الدنیا کے لئے دنیا کی تمام حسین وجمیل چیزوں سے زیادہ دلفریب ہیں - اگر اُس نے اپنی زندگی کے معصوم دَور میں تم کو دیکھ لیا ہوتا تو وہ ضرور مہر و ماہ کی خیرہ کن چمک اور تابناکیوں کو تمھارے حسُن کے آگے ہیچ سمجھتا - جونہی اس کی نگاہ تم پر پڑی اوس کا دل زخمی ہو گیا - اس کو تمھارے حسُن کی قوت کا اعتراف کر لینا پڑا ، جن چیزوں کو دیکھ کر اُس کا معصوم دل پہلے لطف اندوز ہو رہا تھا اُن کی دلفریبی تم کو دیکھنے کے بعد یکسر معدوم ہو گئی ، تمھارا حسُن ان سب پر سبقت لے گیا - مناظر فطرت ، لہلہاتے کھیت ، سرسبز وشاداب مرغزار، خوبصورت چڑیاں ، ان کے مسحور کن نغمے ، پُر شکوہ عمارتیں ، خوبصورت حوض اور فوارے غرض ہر چیز غیر دلچسپ ، بے مزہ ، پژمردہ اور بے اثر معلوم ہونے لگی - صرف تم اور تمھاری صنف ہی تمام شوخیوں ، رعنائیوں اور دل آویزیوں سے معمور نظر آئی گویا تم ایک مرصع تاج ہو - تمھارے ایک جلوے نے اس کے دل کی گہرائیوں میں بلکہ اُس کی روح میں درد ، اثر ، سوز وگداز پیدا کر دیا

یہ نوجوان ایام شیر خوارگی سے جنگل میں پلا اور وہیں بڑا ہوا - اُس کی ماں کے انتقال کے بعد اُس نے اس بچے کو انسانی نظروں سے پوشیدہ کر دیا - اور برسوں معصوم بچے کو خیال تک پیدا نہ ہو سکا کہ جنگل کے علاوہ بھی کوئی دنیا اور ہے؟ اُس کے تصور میں سوائے وحوش وطیور کے کسی اور ذی روح کا وجود تھا ہی نہیں

اس کے والد نے بنی نوع انسان سے قطع تعلق کر کے اپنا مسکن صحرا میں کیوں بنایا ؟ اس کا ایک سبب تو یہ تھا کہ انسانوں سے اُس کو نفرت تھی ، اور دوسرا سبب اُس کی رفیقۂ حیات کی موت تھی - اس کے مرنے کے بعد سے وہ نوع انسان اور انسانی معاشرت کو ملعون تصور کرتا تھا - اور اسی لئے اُس نے ترکِ دنیا کر کے اپنے لڑکے کو رہبانیت کی تعلیم دینے کا دل میں عزم کر لیا اور اپنی ساری دولت تقسیم کر کے ، اپنے شیر خوار بچے کو گود میں لے ، تن بہ تقدیر صحرا کی طرف چل کھڑا ہوا اور جنگل کے ایک نہایت تیرہ وتار حصے میں خلوت گزیں ہو گیا

اس مقام پر اُس نے سینکڑوں باتیں اپنے کم سن بچے سے پوشیدہ رکھیں۔ ہر چند وہ بے رحم و شقی نہ تھا۔ اور اس کا دل پیار و محبت کے جذبات سے معمور تھا، تاہم وہ سختی سے اس امر کا کوشاں تھا کہ اس کے لڑکے کے کان میں کوئی ایسا لفظ نہ پڑنے پائے جس سے یہ پتہ چل جائے کہ کوئی رنگین، دلفریب، مسحور کن دنیا اور بھی ہے اور اس میں کوئی ذی روح مخلوق ایسی بھی ہے جسے "عورت" کہا جاتا ہے۔ اس گوشہ نشینی کی زندگی میں وہ اپنے بچے کے دماغی نشو و نما کے لئے بلحاظِ عمر درس دیا کرتا تھا۔ جب اس کی عمر پانچ سال کی تھی تو اُس کے والد نے پھولوں، جانوروں اور چھوٹے چھوٹے پرندوں کے نام سکھائے۔ موقع و محل کے اعتبار سے وہ کبھی کبھی شیطان کا بھی تذکرہ کرتا تھا جو بقول اُس کے "ایک پرہیبت، ڈراونی شکل کا منحوس جانور" تھا

جب لڑکا دس برس کا ہو گیا تو اُس کو فطرت کی نسبتاً دقیق اور پیچیدہ چیزوں کی تعلیم دی گئی اور بعض ایسی باتیں ذہن نشین کرائی گئیں جن کا تعلق دوسری دنیا سے تھا۔ لیکن صنف نازک کا نام تک اس درس و تدریس کے سلسلے میں کبھی نہ آنے پایا

جب اُس نے عمر کی پندرہ منزلیں طے کر لیں تو وہ تمام باتیں جو اُس کی چھوٹی عقل میں آسکتی تھیں ذہن نشین کر دی گئیں۔ اُس کو دنیا اور دنیا کی ساری اشیاء کے پیدا کرنے والے "خدا" کا نام بتایا گیا۔ لیکن کائنات کی سب سے زیادہ حسین و دلفریب مخلوق، قدرت کی لطیف و نازک پنکھڑی کے متعلق اُس نے اشارتاً یا کنایتاً کوئی لفظ منھ سے نہ نکالا۔ وہ ذکر کرتا کیونکر؟ جنسِ لطیف کا تذکرہ کرنا ایک راہب کے نزدیک جو دنیا اور دنیوی زندگی سے الگ تھلگ، صحرا نشین ہو کر، جوگ میں زندگی بسر کر رہا ہو بیکار تھا۔ اس موضوع پر گفتگو کرنا سراسر فضول تھا۔ اُس کی زندگی زہد و قناعت، استغنا و بے نیازی کی زندگی تھی

لڑکا اب بیس سال کا ہو گیا، اب اس کا والد اُس کو قریب کے شہر میں لے جانا ضروری سمجھتا تھا۔ کیونکہ اُس کو ضعف و نقاہت نے آن گھیرا اور تکمیل ضروریات کے لئے اب چلنا پھرنا دوبھر ہو گیا تھا۔ اسی وجہ سے وہ اس فکر میں کھویا سا رہنے لگا کہ "میرے بعد میرا لڑکا کیا کرے گا؟ وہ دنیا کے لئے اور دنیا اس کے لئے ناآشنا تھی! تنہا کیا وہ اپنا پیٹ پال سکے گا؟ میرا بچہ بھیڑیوں اور وحشی جانوروں کو جانتا ہے، لیکن اُن میں بھلا انسانی ہمدردی کہاں؟" اس کو بخوبی علم تھا کہ اُس کے بعد لڑکے کو جو کچھ ورثہ ملے گا وہ صرف اُس کی ایک جھولی اور ایک عصا ہوگا، جس کا ملنا اور نہ ملنا برابر تھا

شہر میں بہت کم آدمی تھے جو اُس کو ایک آدھ روٹی نہ دیدیتے ہوں۔ اگر وہ حرص و آز کا بندہ ہوتا تو اُس نے ڈھیروں دولت جمع کر لی ہوتی۔ شہر کے سارے چھوٹے بڑے اُس کو جانتے تھے، جب کبھی اُس کا گذر ہوتا تھا تو وہ حلق پھاڑ پھاڑ کر چلایا کرتے تھے "ٹھیرو سائیں ٹھیرو، یہ لیتے جانا!" کیونکہ وہ شہر میں بہت ہر دلعزیز تھا، لوگ اُس پر ترس

کھاتے تھے، اُس سے محبت کرتے تھے۔ لیکن ان ترس کھانے والوں میں کوئی عورت شامل نہ تھی کیونکہ وہ ان سے دُور رہا کرتا تھا

جب اس کو یقین کامل ہوگیا کہ اُس کی تعلیم نے اُس کے بیٹے کے دل و دماغ میں گہرے نقوش اختیار کرلئے ہیں اور اُس کے اثرات زائل نہیں ہوسکتے تو اُس کو شہر لے گیا

یہاں نوجوان راہب کو ایسی ہزاروں چیزیں نظر پڑیں جن کو اُس نے کبھی نہ دیکھا تھا، اور جن سے وہ بالکل ناواقف تھا معصوم نوجوان فرط حیرت و انبساط سے ایک ایک چیز کے متعلق پوچھنے لگا " وہ جو سامنے نظر آرہا ہے کیا ہے ؟" اُس کے والد نے شفقت سے کہا " بیٹا ! اُسے محل کہتے ہیں ! " " اور وہ جو دوسری طرف ہے ؟ " " وہ — فوارہ ہے ! " " یہ ؟ " " بت ہے — بیٹا ! " ان چیزوں کو وہ نہایت شوق سے دیکھ رہا تھا کہ چند حسین وجمیل، کنواری لڑکیاں اُس کی طرف دیکھ کر مسکراتی ہوئی گذریں۔ وہ فوراً اُن کی طرف متوجہ ہوگیا۔ اب اُسے محل حسین نظر نہ آتا تھا، فوارہ کی دلفریبی غائب ہو چکی تھی، بت میں دلآویزی نام کو نہ رہی تھی۔ وہ ان لڑکیوں میں سے ایک لڑکی کو دیکھ کر خوشی سے چلا اُٹھا " ابا وہ کیا ہے، وہ ! جو اچھے اچھے کپڑے پہنے ہوئے ہیں اس کا کیا نام ہے ؟ " ضعیف راہب نے جس کو اس سوال سے ازلی نفرت تھی بدمزہ ہوکر جواب دیا " یہ — یہ ایک پرند ہے بیٹا ! اس کو بطخ کہتے ہیں ! " " کیسی خوبصورت چڑیا ہے ! " نوجوان راہب نے سرور و انبساط کے عالم میں جھومتے ہوئے کہا " اے دل نواز طائر ! مجھے اپنے مسحورکن نغمے سناتا جا ! کیا تو مجھ سے بات نہیں کرے گا ؟ ابا ! پیارے ابا ! اگر آپ کو مجھ سے محبت ہے تو اس طائر کو اپنے ساتھ لے چلئے، میں اس کو خود دانہ پانی دیا کروں گا "

(ژان فانٹین فرانسیسی فسانہ نگار)

احسن (حیدرآبادی)

نگار کی پرانی جلدیں مکمل برائے فروخت

میرے پاس نگار کے جملہ فائل جتنے بھی آج تک شایع ہوئے ہیں موجود ہیں اور ہر ایک سال کا فائل پانچ روپیہ میں دیدونگا پرچے اچھی حالت میں ہیں

پتہ - زین العابدین بتوسط دکان محمد باقر حاجی عبدالظاہر - پتھر گھٹی - حیدرآباد دکن

باب المراسلۃ والمناظرہ

(جناب محمد عطاء اللہ صاحب بسمل۔ سیالکوٹ)

دُنیا کا امن وسکون کہاں ہے۔ مذہب میں یا الحاد میں؟

دراصل یہ اختتامی قسط ہے اس مضمون کی جو زیر عنوان "ملاحظات نگار" خدا لا مذہبیت کے زاویۂ نگاہ سے ماہ اگست میں سپرد قلم کیا گیا ہے پھر ستمبر میں "منکرین خدا کے خیالات پر تبصرہ" کیا گیا ہے اور جو نتیجہ نکلا وہ ہمارے سامنے ہے۔ مولانا! آپ مذہب کے مفہوم کو بدل کیونکر سکتے ہیں۔ "مذہب" ایک نہایت پُرانی شے ہے اس کی تعریف (Definition) مدتوں سے ہوتی آئی ہے۔ بڑے بڑے ارکین مذاہب نے بڑی بڑی معرکۃ الآرا تقاریر وتحاریر میں اُس "مذہب" کا مفہوم سمجھایا ہے جن کے وہ علمبردار ہیں اور یقیناً ان کی شہادت ان کے اپنے مذہب کے متعلق کس قدر وقیع ہے بہ نسبت آپ کے خیالات کے اور بمقابلہ آپ کے مفہوم مذہب کے جسے آپ سمجھانے کی کوشش فرما رہے ہیں۔ اظہر من الشمس ہے

آپ نے بڑی محنت سے ایک تعریف بنا فرمائی ہے کہ "مذہب نام ہے انسان میں احساسِ انسانیت کا" یہ تعریف نیاز فتحپوری کی ساختہ ہے اس لئے کون باور کرے گا کہ واقعی "مذہب" کا مفہوم ہے بھی یہی۔ مولانا! یہ کہہ دینا کہ "اگر میں یہ کہوں کہ مذہب نام ہے صرف خدا کی پرستش ونیائش کا تو آپ کو اس کے تسلیم کرنے میں تامل ہوگا" کسی طرح "مذہب" کے حقیقی مفہوم کو رد نہیں کرسکتا۔ اگر مجھے اجازت دیں تو میں عرض کروں کہ خواہ میں یا آپ "مذہب" کو کچھ ہی سمجھیں دراصل جو "مذہب" والے "مذہب" کو سمجھتے ہیں وہ کیا ہے۔ دیکھئے:۔

جان سٹوارٹ مل (John Stuart Mill) کہتا ہے:۔

"خواہشات اور احساسات کی زبردست تحریک اور ان کا میلان بجانب ایک مکمل اعلیٰ ترین

ہستی کے جسے النفس النفائس تسلیم کیا جائے اور جو خواہشات کی تمام اسفل ہستیوں سے منزہ و بالاتر ہو۔" مذہب" کا نچوڑ اور اس کی روح ہے"

پروفیسر میکس مولر (Max Muller) اپنی کتاب " ابتدائے مذاہب" (Origin of Science) میں لکھتا ہے:۔

" "مذہب" وہ متحرک قوت ہے جس سے انسان لامحدود (خدا) کو پہچانتا ہے "

بنجمن کڈ (Benjamin Kidd) اپنی کتاب " سوشل ایوولیوشن" میں فرماتے ہیں:۔

" ایمان ویقین کی کوئی قسم " مذہب" نہیں کہلا سکتی جب تک کہ اس میں شخصی اخلاق دنیوی کے لئے " وراء البرہان" اجازت نہ پائی جائے "

جیمس مارٹینو (James Martinue) اپنی کتاب " مطالعہ مذہب" (A study of religion) میں فرماتے ہیں:۔

" ایک حی وقیوم خدا پر یعنی ایک ایسے دماغ وارادۂ علوی (جو تمام کائنات پر حکمراں ہو اور انسان سے اخلاقاً منسوب ہے) پر ایمان رکھنے کا نام " مذہب" ہے "

رومانس (Romanes) " مذہب کے متعلق چند خیالات" کے صفحہ ۱۴۱ پر رقمطراز ہیں:۔

" کوئی نظریہ جسے" مذہب" کے نام سے پکارا جا سکتا ہے اس کے اختصاصی خط وخال یہ ہیں کہ وہ اشیا کے مصدر یا مصادر اولین کے متعلق بیان کرے اور پھر وہ اُس مصدر اولیں کو عقل کل۔ قائم بالذات اور ذاتی فطرت سمجھے۔" مذہب وراء العقل" یا" مذہب قانون فطرت" یا" مذہب اخلاق والسانیت" وغیرہ وغیرہ کہنا جس میں کہ" علت اولین" کی ذات متعین نہ ہو محض بے معنی ہے۔ ایسا ہی لایعنی جیسا کوئی" محبت خلت" یا" دلالت استوا" کے متعلق کہے "

پادری جارج ہاجس حکیم الٰہیات امریکہ (Rev. George Hodges. D. D.) فرماتے ہیں:۔

" ایک نادیدہ طاقت (جو کائنات عالم اور انسان پر ہر طرح حاوی وحکمراں ہے انھیں بناتی ہے اور انکی پرورش کرتی ہے) کے احساس کا نام" مذہب" ہے اور پھر اسی" نادیدہ طاقت" کو اپنے اندر بھی محسوس کریں جو ہمارا" نفس حقیقی" ہے اور جو ہماری" ذات طبیعی" سے جدا ہے اور غیر فانی" ہے۔" روح انسانی" اور" ذات الٰہی" کے صحیح رشتے کے تعین کرنے کی کوشش کا نام" مذہب" ہو"

سیموئیل شلمان حکیم الٰہیات (Samuel Shulman. D. D.) جو شہر نیو یارک امریکہ میں جامعہ بیت ایل کے ربی ہیں اور شریعت موسوی کے ایک رکن اعظم ہیں۔ فرماتے ہیں:۔

"مذہب" میں دو عنصر ہیں انسان اور خدا - یہ ہر دو عناصر لاینفک ہیں اگر موخرالذکر (یعنی خدا) کو مٹا دیا جائے تو باقی جو رہ جائے گا وہ ایک "فلسفۂ زندگی" ہوگا نہ کہ "مذہب" " (مولنا غور فرمائیے)

پروفیسر جان آگسٹس رئین حکیم الٰہیات (John Augustus Rayan D.D.) فرماتے ہیں:-

"یقیناً "مذہب" ایک ذاتی رشتہ ہے مخلوق ومحکوم "انسان" اور خالق و آقا "خدا" کے درمیان اس کی تعریف یوں کی جاسکتی ہے کہ انسان کا بے اختیارانہ و مجبورانہ اپنے آپ کو محکومی کے لئے خدا کے سپرد کردینے کا نام "مذہب" ہے یعنی اس ذات علی الاطلاق و فوق الفطرت کے سپرد کرنا جس کے دست نگر ہونیکا انسان کو احساس ہے اور جس کی قوی امداد کی ضرورت کو وہ محسوس کرتا ہے اور اسی ذات کو وہ اپنی تکمیل اور امن و انبساط کا سرچشمہ سمجھتا ہے"

ڈاکٹر چارلس اینن ڈیل ایم اے ایل ایل ڈی (Dr Charles Annandole M.A. LL.D.) مذہب کے لغوی معنی یوں ارشاد فرماتے ہیں:-

"اس احساس تقدس کا نام "مذہب" ہے جو انسان کو حضرت باری تعالےٰ کا ہے"

"خدا کو معبود سمجھنا اس سے محبت کرنا اور اس کی اطاعت کرنا یہی مذہب ہے"

جان سپارگو (John Spargo) اپنی کتاب مارکسیئن سوشلزم (Marxians Socialism) صفحہ ۳۳-۳۴ پر لکھتا ہے:-

"ہم مختصراً کہہ سکتے ہیں کہ انسان کے ایک اعلیٰ ذی الارادہ قوت "خدا" میں ایمان رکھنے اور اس کی پرستش کرنے اور اپنی زندگی کو اُسی خدا کی مرضی یا خواہش یا احکام کے مطابق بسر کرنے کا نام "مذہب" ہے"

چنانچہ اصول "مذہب" یہ ہیں:-

الف = حاکم کائنات "خدا" پر ایمان لانا اور اس کی پرستش کرنا

ب = اس بات پر ایمان لانا کہ انسان کی ایک روحانی ہستی یا روح بھی ہے جو ازلی ابدی اور غیر فانی ہے

ج = اس بات پر ایمان لانا کہ انسان کی انتہائی بہتری اور خوشی ابدی اور اخلاقی اسی میں ہے کہ وہ مرضی ومنشائے خداوندی کے مطابق بسر کرے

د = اس بات پر ایمان لانا کہ چونکہ "اخوت انسانی" "ابوئیت خداوندی" پر منحصر ہے اس لئے

"تمام تمدنی بہتری و بہبودی ارادۂ خداوندی کے سامنے سر اطاعت خم کر دینے میں ہے"

میرا خیال ہے مولینا - میں نے عیسوی اور موسوی "مفہوم مذہب" نہایت بے لوث الفاظ میں آپ کے سامنے رکھدیا ہے اور چونکہ اسلام کی کوئی اپنی نئی شریعت نہیں ہے بلکہ دین موسوی کی تعلیم کو فروغ دینا پیغمبر اسلام کا لاالف مشن تھا تاہم احکام شرعی اسلام میں سے طاعت و عبادت خداوندی نکال دیجئے اور "روح" جسے "امر ربی" کہا گیا ہے اس سے منکر ہو جائیے - لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ کا جھگڑا نہ رہے - نماز - روزہ - حج - زکوٰۃ - قربانی - احکام خداوندی نہ رہیں اور فرایض نہ سمجھے جائیں اب جو کچھ باقی رہے اُسے پھر بھی "مذہب" ہی کہئے گا ؟ معاف رکھنا اگر پھر بھی وہ "مذہب" ہی رہا اور آپ اُسے "مذہب" کہتے رہے تو آپ نے "مذہب" پر لانہایت ظلم روا رکھا یہی نہیں بلکہ "قانونِ اخلاق" کی صورت ہی مسخ کر دی اور سینہ زوری سے اُسے "قانون مذہب" کے نام سے پکارا حالانکہ فلسفہ "اخلاق" اور "مذہب" بالکل جدا جدا قوانین ہیں اور ان میں سے ہر ایک اپنے جدا اختصاصی پہلو رکھتا ہے

علاوہ یہودیت - عیسائیت اور اسلام کے جو در اصل ایک ہی زنجیر کی کڑیاں ہیں ایک دو بڑے بڑے مذاہب اور بھی دنیا میں رائج ہیں مثلاً "ویدک دھرم" جو غلط العوام ہو کر "ہندوازم" (Hinduism) کہلاتا ہے حالانکہ "ہندو" ہونا "مذہب" سے کوئی تعلق نہیں رکھتا بلکہ قومیت سے متعلق ہے مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ۱۹۲۰ء میں جن دنوں میں بغداد میں تھا ایک پارٹی میں ہمارے ایک عرب آشنا نے جب بنگال - مدراس - یوپی اور پنجاب کے باشندے مختلف زبانیں بولتے ہوئے مختلف رنگ و روغن اور وضع و قطع کے دیکھے مگر پھر بھی ان سب میں ایک یگانگت سی پائی تو حیران ہو کر دریافت کیا انت کلکم ھنود ؟ (کیا تم سب ہندوستان کے باشندے ہو) جواب تھا نعم (بیشک) خیر یہ جملہ معترضہ تھا - دیکھئے رگ وید کا پہلا منتر "اگنی پڑے پڑوہتم" سے شروع ہوتا ہے یعنی خدائے وحدہٗ لاشریک کی تعریف کرو اس کی مدح و ثنا کے گیت گاؤ پھر وید کی تعلیم ہے :-

Deva (دیوا), Yasya (یسیہ), Prashisham (پرشی شن), Upasate (اپاستے), Vishva (وشوا), Yasya (یسیہ), Valda (ولدا),

Alamda (آتمدا), ya (یا), Vidhem (ودہیم), Havisha (ہوشہ), Diwaya (دیوایا), Kasmae (کس مئے)

Mritwa (مرتیوا), Yasya (یسیہ), Udatam (اُدتن), Chhaya (چھایا), Jasy (یسیہ)

یعنی اللہ جل شانہٗ ہی ایک ایسا منبع ہے جس سے انسان کی روح کو حقیقی طاقت مل سکتی ہے تمام کائنات اُسی کی پرستش کر رہی ہے اجرام فلکی و اجسام ارضی اسی کے حکم کے مطیع ہیں - اُسی کی پرستش سے نجات مل سکتی ہے اگر ہم اس کی عبادت نہیں کریں گے تو ہم ہلاک ہو جائیں گے

پھر وید کا یہ منتر بھی ملاحظہ ہو :-

اسریہ نام تے لوکا اندھین
Asurya, Namte, Loka, Andhan,

تساورتاہ نام ستے پریتیہ اپی گچھنتی یے کے
Tamsavrita, Namasate, Pretyapi, Jachhanti, Keye

ہنوجنا چاآم
Chatam, Hanajana.

یعنی وہ لوگ جو خدا کی پرستش نہیں کرتے وہ مرنے کے بعد ایسے جہنم میں ڈالے جائیں گے جہاں تاریکی مطلق ہے اور کسی قسم کی راحت نہیں ہے

اسی "ویدک دھرم" کی ایک جدا شدہ شاخ "بدھ مت" ہے "تتھاگت" کے پیرو اس وقت بھی تعداد میں 'مسیح کی بھیڑوں' سے شاید دوسرے درجے پر ہیں۔ گوتم کی تعلیم نہایت سادہ۔ صاف اور عقل انسانی کے قابل قبول ہے مگر باوجود اپنی اس سادگی کے اور باوجود اس فرقہ کی اس قدر بہتات کے "بدھ مت" کو دنیائے مذہب میں "مذہب" کا لقب نہیں دیا گیا۔ اس کو مذہب والوں نے "مذہب" تسلیم نہیں کیا ہم اور آپ خواہ بدھ دھرم کو کچھ ہی سمجھیں مگر مذاہب عالم کے علمبردار کلہم اجمعین اسے "مذہب" کی صف سے خارج سمجھتے ہیں

ڈاکٹر ڈی - جی - برنٹن (D. G. Brinton) جو خود بھی بدھسٹ ہیں فرماتے ہیں :-

"اس سے زیادہ غلطی اور کیا ہو سکتی ہے کہ اگر یہ سمجھا جائے کہ ہر نظریہ مذہب میں کسی خدا یا دیوتاؤں پر اور روح غیر فانی پر اور مملکت روحانی پر ایمان لانا بھی ضروری ہے۔ جبکہ مذہب موجودہ جس کے پیرو دنیا میں آج سب سے زیادہ ہیں یعنی بدھ دھرم متذکرہ بالا ہر ایک اعتقاد کی تکذیب و تردید کرتا ہے"

مگر اس رائے پر علمائے مذاہب کا متفقہ فیصلہ کیا ہے۔ سنیئے وہ فرماتے ہیں :-

"وہ مذہب جو خدا کی پرستش سے معرا ہو 'مذہب' نہیں بلکہ محض "استشہادیت باطلہ" (Anachornism) ہے"

ایک عالم مذاہب جس نے "اسلام" "ویدک دھرم" "عیسائیت" "برہمو سماج" "دیو سماج" کے اصول کی تحقیقات میں اپنی زندگی کے ساٹھ پینسٹھ سال بسر کئے ہیں کہتا ہے :-

"مذہب صرف یہی نہیں کہ موجودہ جسم کے متعلق ان اخلاقیات کی تعلیم کا نام ہے جو ہماری موجودہ زندگی کو ہمارے لئے اور ہمارے اردگرد کے جملہ انسانوں کے لئے مفید اور پرراحت بناتی ہے بلکہ "مذہب" اپنے حلقۂ اثر اور اپنے دائرہ تعلیم میں روح کے مستقبل کے پروگرام

کو بھی شامل کئے ہوئے ہے " (انوار عالم صفحہ ۲۴۶)

خان بہادر میرزا سلطان احمد خاں صاحب (جو علاوہ ایک مسلم فلسفی ہونے کے " تازہ ترین پیغمبر " کے خلف رشید بھی تھے) مذہب کی تعریف یوں فرماتے ہیں :-

" مذہب وہ قانون ہے جو باحفاظ اخلاق یا تصرفات ضمیری ایک اعلیٰ طاقت علت العلل کے

منشا اور ذات تک انسان کی رسائی کرانا چاہتا ہے اور ان ہدایات سے آگاہی بخشتا ہے جو

اس منزل تک اس کی رہنما ہو سکتی ہے "

گورو نانک دیو کا " سکھ دھرم " موجودزمانے کے " مذہب " میں ایک نمایاں ہستی رکھتا ہے مگر کس کو انکار ہے کہ " اک اونکار۔ ست نام ۔کرتا پُرکھ۔ نربھو۔ نرویر۔ اکال مُورت۔ اجُونی سے بھنگ گور پرساد۔ " یعنی ایک وحدہٗ لاشریک خالق کائنات۔ الحق وکردگار۔ بے خوف وبے آزار۔ ازلی۔ ابدی۔ لم یلد ولم یولد۔ حاضر وناظر وجارمی وساری خداوند حکیم کا " جپ " یعنی ورد کرنا ہی انکا اساسۂ مذہب ہے۔ " نام جپنے " کے بغیر نہ نجات ہے نہ مکتی اور نہ کوئی " سکھ " بغیر اس کے اپنے دھرم کا صحیح پیرو کہلا سکتا ہے ۔

میرے مندرجہ بالا بیان کے بعد غالباً بے شک وریب یہ بات تسلیم کرنی پڑے گی کہ اگر " خدا کی پرستش ونیایش " کو " مذہب " سے خارج کر دیا جائے تو باقی خاک بھی نہیں رہ جاتا جسے " مذہب " سے تعبیر کیا جائے

مولینا ! " مذہب " نام ہی ہے صرف " خدا کی پرستش ونیایش کا " ورنہ باقی تو " فلسفہ " اور " اخلاق " ہے ایک " پابند مذہب " فلسفہ اور اخلاق کے قواعد یا شرائط کا بہت سی باتوں میں پابند ہو گا لیکن ایک فلسفی اور ایک حکیم اخلاق " بہت سے امور میں " مذہب " کے خلاف بھی ہو سکتا ہے یا یہ کہ ایک فلسفی یا ایک " حکیم اخلاق " پر یہ لازم نہیں آتا کہ وہ کوئی مذہب بھی رکھتا ہو یا کسی دین اور مذہب کا پابند اور مقلد ہو

اس میں کچھ شبہ نہیں کہ جو کچھ آپ لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں وہ یہی ہے کہ " مذہب " کا مفہوم کچھ اور ہے لیکن یقیناً آپ غلطی پر ہیں۔ جہاں اور ہزار قسم کے صحیح اجتہادات کو آپ کام میں لاتے ہیں اور جس کے باعث بے شمار فتاوائے تعزیری شرعی کے مورد ٹھہرتے ہیں وہاں کیا ضرور ہے کہ اس فرسودہ اصطلاحی لفظ " مذہب " کو خواہی نخواہی غلط طور پر استعمال کیا جائے اور پھر اس کے صحیح مفہوم کو بھی تبدیل کرنے کی کوشش کی جائے۔ حالانکہ درست یہی ہے کہ جس شئے کا نام مذہب ہے وہ محض لغویات وخرافات کا پلندہ ہے اور خارج از عقل وادراک بات ہے اُمید ہے آپ اس پر ایک مرتبہ پھر غور فرمائیں گے

ایک جگہ آپ فرماتے ہیں

" رہ گئی عقلی آزادی سو اس کا ثبوت لا اکراہ فی الدین سے زیادہ اور کیا پیش کیا جا سکتا ہے "

معاف رکھیں مولینا ! یہاں آپ نے جوش عقیدت سے مغلوب ہوکر اس آیت کا حوالہ دیدیا ہے ورنہ ۴ھ ہجری کا واقعہ ہے جب کہ رسول عربی زندہ تھے اور بنو نضیر جلا وطن ہوئے ہیں - ایک قوم مغلوب ہے اپنی آزادی کے لئے ہر جائز و ناجائز وسائل استعمال کرنا اس کا حق ہے چنانچہ وہ ایسا ہی کرتی ہے مگر ان کے لئے "عقلی آزادی" کا راستہ کس انداز سے کھلا ہے - ملاحظہ ہو - یا تو اسلام قبول کرو - یا جزیہ دو - یا قتل ہو جاؤ ورنہ جان کی سلامتی پھر اسی میں ہے کہ جلا وطن ہو جاؤ - چنانچہ جان شیریں بچاکر وہ لوگ چلے گئے اور ان کے تمام گھربار پیغمبر اسلام نے اپنے پیرووں میں تقسیم کرلئے - داد ! داد !! انصاف ! انصاف !! از روئے سیاست یہ سب کچھ بجا اور درست ہوگا مگر از روئے مذہب یہ کہاں تک روا ہے بالخصوص جب کہ لا اکراہ فی الدین کا ڈھول بھی پیٹا جاتا ہو - حضرت یہ سب قال ہی قال ہے حال کا ثبوت نہیں ملتا - یہ مثال اپنی قسم کی واحد ہی نہیں بلکہ تاریخ اسلام بھری پڑی ہے ایسی ایسی مثالوں سے - کیوں نہ ہو جب پیغمبر اسلام نے خود ان باتوں کو روا رکھا اور اسلام کی الہامی کتاب اس کی تائید کرتی ہے تو تابعین تو تابعین تھے اگر وہ ویسا ہی نہ کرتے تو خلفائے راشدین کیونکر ٹھہرتے

اس میں تو شبہ نہیں کہ " الحاد و لامذہبیت " احساس انسانیت کو بیدار نہیں کرسکتے مگر " مذہب " کی تقلید کورانہ اور اس کی ذہنی غلامی سے تو یقیناً نجات دلادیتے ہیں - " قانون اخلاق " جس ملک میں بطور " قانون سیاسی " کے رائج ہوگیا گویا اس ملک کے باشندے منزل مقصود تک پہونچ گئے اور الحاد یقیناً قانون اخلاق کے منافی نہیں ہے اور نہ ہی ملحدین ملک میں اخلاقی قانون کے رواج کے خلاف ہیں پھر کوئی وجہ مایوسی کی نظر نہیں آتی - مجھے افسوس ہے کہ آپ نے اپنے مضمون کو معلق چھوڑ دیا ہے - اتنی طویل بحث کے بعد ایسے مایوسانہ اظہار ناکامی کو سوائے اس کے کہ جرات طلبی پر محمول کیا جاسکے اور کیا کہا جائے - مولینا ؎

آں راز کہ در سینہ نہانست نہ وعظ است | بردار تواں گفت بہ منبر نتواں گفت

حضرت ! اگر وہ راز نہاں واقعی وعظ نہیں ہے اور دار پر ہی کہنے والا ہے تو یا اس کا ذکر ہی نہ کیجئے نام ہی نہ لیجئے یا پھر بیان فرمائیے ؎

یا میرے زخم رشک کو رسوا نہ کیجئے | یا پردۂ تبسم پنہاں اٹھائیے

"حوا کی بیٹیاں ہندوستان میں"

مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ حضرت نیاز سا روشن خیال اور روشن دماغ شخص اس مضمون پر لکھتے ہوئے جادۂ سنجیدگی سے بے راہ ہونے کے علاوہ اپنے قلم کو تعصب سے پاک نہ رکھ سکے - آپ مانتے ہیں کہ " مرد نے ہمیشہ عورت کو اس فریب میں مبتلا رکھا کہ وہ کمزور و ضعیف و ناتوان ہے " اور اس طرح اس کے پیدائشی حقوق مساوات پر

ڈاکہ ڈالتا رہا ہے حتےٰ کہ صدیوں کی یہ کوشش یوں رنگ لائیں کہ عورت "بیکار کھلونا" اور "محض نمائشی سامان زینت" یا "صرف آلۂ ہوس پرستی" رہ گئی۔ جو کچھ مرد نے عورت سے آج تک سلوک روا رکھا ہے کیا اس کا لازمی "ردعمل" یہ نہیں ہے کہ اب وہ "باغی" نظر آتی ہے اور مرد اس کے اس باغیانہ طرز وروش کو دیکھ کر دانت کچکچاتا ہے اور پھر انتہائے بزدلی سے نہایت اخلاق سوز اور انسانیت کُش حملے کرتا ہے

میں کہتا ہوں مردوں کا یہ طعنہ عورتوں کو مجبور کردے گا کہ وہ ایسی بے حیا اولاد پیدا کرنا ہی بند کردیں۔ "برتھ کنٹرول" کا بھی آغاز ہے۔ مردوں کے اخلاقی حملوں کی اگر یہی کیفیت رہی تو معلوم نہیں دنیا کا "حکمران" اور "مطلق العنان" "بے ہمتا" مرد اپنے مایۂ ناز وفخر عالم نپولین۔ اکبر۔ شیکسپیر۔ لینن۔ مصطفےٰ کمال۔ ٹیگور۔ اور گاندھی کہاں سے اور کیونکر پیدا کرے گا۔ کیا مرد کو یہ توقع ہے کہ وہ کسی "خلاف فطرت" عمل جدید میں کامیاب ہوکر عورت سے بے نیاز ہوجائے گا ؟

مرد کی آنکھوں پر ابھی تعصب کی پٹی کس کر بندھی ہوئی ہے ہاں البتہ نیاز ایسی ہستیاں بالکل اندھی نہیں ہورہیں تاہم تعصب کی عینک سے بے نیاز نہیں ہیں۔ مغرب کی "جنس لطیف" بتلائیے تو اور کونسی جنس میں تبدیل ہوگئی ہے ؟ کیا وہاں کی "جنس لطیف" اب ماں۔ بہن اور بیٹی کے لقب سے نہیں پکاری جاتی ؟ کون کہتا ہے کہ "نظام تمدن میں اُس کی کوئی گنجائش نہیں"۔ نظام تمدن کس کا بنایا ہوا ہے ؟ آپ سمجھتے ہیں "نظام تمدن" ایک جامد شے ہے جس میں تبدیلی نہیں ہوا کرتی ؟ "نظامِ تمدن" ہمیشہ بدلتا رہا ہے۔ یہ چیز انسانی اختراع ہے۔ اُس کی اپنی بنائی ہوئی ہے۔ انسان اپنی ضروریات کو پورا کرنے کی غرض سے ہر وقت اس میں تبدیلیاں کرتا رہا ہے اور کرتا رہے گا۔ "نظام" نوع انسانی کے دونوں اصناف پر مساویانہ حاوی رہا ہے اور رہے گا۔ اس "نظام" کی تخلیق وتشکیل وردوبدل میں عورت کا نصف حصہ ہمیشہ محفوظ رہا ہے اور رہے گا۔ اگر آج کے "نظام تمدن" میں بقول آپ کے اس کی کوئی گنجایش نہیں تو کل کے نظامِ تمدن میں یقیناً ہوگی

مردوں کو دانت کٹکٹانے کی ضرورت نہیں ہے اور یہ نامردانہ حملے کسی طرح روا نہیں ہیں۔ دنیائے عالم کی تاریخ شاہد ہے کہ کسی کو کوئی حقوق "دینے" سے نہیں دیئے گئے۔ "حقوق" مانگ کر لینے دینے کی شے نہیں ہے یہ توچھین لینے اور زبردستی منوانے کی چیز ہے۔ عورت نے جو کچھ آج تک حاصل کیا ہے اپنے زور عقل وفطرت سے کیا ہے۔ اور آیندہ جو کچھ لے گی اسی کے بل بوتے پر لے گی اور مرد اگر اسنے اپنی اس اکڑخانی کو نہ چھوڑا تو اسی طرح دست حسرت ملتا رہے گا اور اپنے سلوک نامستحسن سے دن بدن عورت کی نظر میں ذلیل ہوتا رہے گا۔ ضرورت تو اس بات کی ہے کہ "عورت" کی حوصلہ افزائی کریں جو حقوق مانگتی ہے وہ دیں بلکہ جن جن حقوق کے لئے اُس نے استغاثہ بھی نہیں کیا ان کی طرف بھی اُس کی توجہ مبذول کروائیں اور ان کے حصول میں اُس کی ہر طرح مدد کریں۔ یہ مفت کرم داشتن

والی بات ہے اور خواہ مخواہ کا احسان ہے جو مرد عورت کی گردن پر رکھے گا ورنہ عورت کا قدم جس جانب اٹھ چکا ہے اب کوئی طریقۂ جابرانہ اس کو واپس لانے پر مجبور نہیں کر سکتا۔ فتدبروا یا اولا لبصارہ

"بابُ المراسلۃ والمناظرہ"

مندرجۂ بالا عنوان کے ماتحت جناب منظر الحق صاحب رضوی چھبردی کریم جک نے تین سوالات کئے ہیں

(۱) مذہب اور اس کے مقاصد کیا ہیں ؟

(۲) قیام جمہوریت سے مارشل کمال کا مقصد کیا ہے اور ترکی کے اجتہادات جدیدہ کے صلہ میں کفر کا جو تمغہ دینا ہے اسلام نے دیا ہے وہ کہاں تک بجا ہے ؟

(۳) نیاز کا مشن کیا ہے ؟

پہلے اور دوسرے سوال کے جواب میں آپ نے ذرا وضاحت سے کام فرمایا ہے مگر "مذہب" کی تعریف (Definition) آپ کی خود ساختہ ہے نہ کہ وہ جو دراصل ہے۔ میں نے اس کے متعلق کافی ووافی پہلے ہی عرض کر دیا ہے جس کا دہرانا بے جا ہے۔ "مذہب" کا دشمن ہونا بُرا نہیں ہے بالخصوص جبکہ "مذہب" کا مفہوم وہی ہو جو دراصل ہے نہ کہ وہ جو آپ خیال فرماتے ہیں۔ آپ کا فرمانا تو ایک قول بے دلیل ہے۔ ایک مشہور مقولہ ہے "درخت اپنے پھلوں سے پہچانا جاتا ہے" "مذہب" اپنے کارناموں سے پرکھا جانا چاہئے۔ وہ کونسا مذہب ہے جو دوسرے کو بُرا نہیں سمجھتا۔ تبلیغ مذہب۔ اور شُدھی یا (Conversion) جو مذہب کی جان ہے اور جس کے بغیر "مذہب" معدوم ہے خود ایک لعنت ہے۔ ایک مقراض بے پناہ ہے جس نے قبائے انسانیت کے بے دریغ ٹکڑے ٹکڑے کر دئے ہیں۔ کیا آپ کو اس سے انکار ہے ؟

حیران ہوں کہ کس بنا پر آپ نے کہدیا کہ تاریخ عالم کی خونریزیوں سے "مذہب" کا دامن پاک ہے اور وہ کونسا مذہب ہے جو خونریزی اور خون آشامی کی تعلیم دیتا ہے ؟ "مذہب" کی خونریزیوں پر تو ایک ضخیم کتاب لکھی جا سکتی ہے میں اور تو نہیں حضرت کی توجہ سورۃ النساء رکوع ۱۲ آئت سوم کی طرف مبذول کرواتا ہوں "فخذ وھم واقتلوھم حیث ثقفتموھم" کسی چنگیز یا ہلاکو کا حکم ظالمانہ اور ارشاد انسانیت سوز نہیں ہے۔ مولینا یہ حکم خداوندی ہے۔ یہ "الرحمٰن" اور "الرحیم" ہستی کا منشائے مبارک ہے

حضرت دیکھئے سورۃ التوبہ رکوع اوّل آئت "فاذا انسلخ الاشھر الحرام فاقتلوا المشرکین حیث وجدتموھم وخذوھم واحصروھم واقعدوا لھم کل مرصد فان تابوا واقاموا الصلوٰۃ واتوا الزکوٰۃ فخلوا سبیلھم۔ ان اللہ غفور الرحیم"

غفور الرحیم فرماتا ہے :-

"ان چار مہینوں کے بعد ان انسانوں کو جس طرح تمہارا جی چاہے ۔ مار دو بیٹو قتل کرو پکڑو قید کرو جو جی چاہے سو ظالم روا رکھو (حتےٰ کہ یہ مجبور ہو جائیں تمہارا دین اختیار کرنے کو) اور اگر اپنا مذہب بدل ڈالیں تو پھر کچھ تعرض نہ کرو"

یہ غفران اور شان رحیمی ہے

حضرت ملاحظہ فرمائیے سورۃ المائدۃ آیت " اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِیْنَ یُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَیَسْعَوْنَ فِی الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ یُّقَتَّلُوْٓا اَوْ یُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَیْدِیْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ یُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ؕ

یہ لوگ جو خدا اور رسول کے برخلاف جنگ کرتے ہیں (یعنی مسلمانوں کے برخلاف) اور دنیا میں فساد پھیلاتے پھرتے ہیں ان کی یہی سزا ہے کہ ان کو خواہ قتل کرو خواہ پھانسی پر لٹکاؤ خواہ ان کے ہاتھ کاٹ ڈالو خواہ ان کو جلا وطن کردو (تمہارے لئے سب جائز ہے)" حضرت مولانا ۔ یہ مذہب کا حکم ہے اور الہامی کلام ہے ۔ کسی زار روس کا نافذ کردہ حکم نہیں ہے

حضرت غور فرمائیے سورۃ الانفال رکوع دوم آیت " فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ وَمَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰی وَلِیُبْلِیَ الْمُؤْمِنِیْنَ مِنْهُ بَلَآءً حَسَنًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ——— اے مسلمانوں تم نے جو لوگوں کو تہ تیغ کیا ہے ۔ اور تیروں سے ان کی جانیں لی ہیں یہ سب تیغیں اور تیر یوں سمجھو کہ اللہ نے خود چلائے ہیں تم نے نہیں چلائے اور یہ اس لئے کہ تم کو اس کا اچھا انعام صلہ میں دے کیونکہ اللہ سب جانتا سنتا ہے"

یہ وہ قتل و غارت انسانی کا روشن جواز ہے جس کے بھروسے پر مذہب کے قائدین ہی نہیں بلکہ امین الملت یمین الدولہ محمود غزنوی سے لے کر اورنگ زیب اور فرخ سیر تک نے انعامات موعودۂ الٰہی حاصل کئے ہیں ۔ فتدبر !

پھر اور دیکھئے سورۃ البقر رکوع ۲۷ آیت سوم " وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ ...... الی آخرہ ۔ یہ انسانی بائیکاٹ کی تعلیم ہے جو مذہباً جائز قرار دی گئی ہے ۔ مغلوب قوم اپنا رشتہ فاتحین سے جوڑنا اپنے لئے باعث فلاح سمجھتی ہے یہاں مذہب کا حکم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کی عورتیں خواہ کیسی ہی بھلی کیوں نہ ہوں جب تک ان کو اپنے مذہب میں نہ لے آؤ ان سے مت شادی کرو اور نہ ہی مسلمان عورتیں ان میں سے کسی شریف انسان کو دو ۔ گویا وہ عورتیں اور مرد بحیثیت انسان مذہب کی نگاہ میں ہیچ ہیں

مولینا اور لیجئے ۔ سورۃ النساء رکوع اول آیت سوم " وَاِنْ خِفْتُمْ .... الی آخرہ اس آیت میں " مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُكُمْ " کی کوئی تاویل آپ بھی کیجئے ۔ اگر جنگ کے بعد پکڑ کر لائی ہوئی معصوم بیگنہ عورتوں کو بھیڑ بکری کی طرح اپنا جائز مال تصور کر کے ان سے بے غل و غش بغیر نکاح کے لطف صحبت اٹھانا " مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُكُمْ "

کے تحت میں نہیں ہے تو اور کیا ہے اور اگر یہی ہے تو پھر غلامی اور بیع انسانی کی ترویج میں "مذہب" نے نہایت شد ومد سے حمایت کی ہے اور یہ ایک ایسا بدنما داغ ہے مذہب کی پیشانی پر جو کبھی نہیں دُھل سکتا۔ اس سلسلہ میں جو کچھ میں نے لکھا ہے وہ مشتے نمونہ از خروارے ہے اور نہ ہی میری اس تحریر سے یہ مطلب ہے کہ صرف یہی ایک "مذہب" ہے جس میں "انسانیت سوز" احکام مذہباً جائز ہیں۔ نہیں! بھیڑیں سب منہ کالی ہیں، ہر "مذہب" اس قسم کی خرافات سے پُر ہے اور بجا طور پر ہر مذہب کو اپنی اس تعلیم پر فخر بھی ہے کیونکہ وہ ان احکام کو انسانی احکام نہیں بلکہ خدائی حکم اور الہام و وحی سے تعبیر کرتا ہے اور ان کے اٹل اور انمٹ ہونے کا دعویدار ہے۔ آپ ان مسلّمات کو کسی فقیہ کی تنگ نظری سے تعبیر نہیں کر سکتے کیونکہ ان احکام کی پشت پر خود امر الٰہی کی مُہر ہے جو "مذہب" کی بیخ و بُن میں آپ کی کوئی تاویل جو ان احکام کے جواز میں پیش کی جاوے گی وہ "تاویل" سے زیادہ نہ ہوگی آپ (Fact ، واقعے کسی طرح منکر نہ ہو سکیں گے

کوئی ریفارمر سے ریفارمر مولانا یا رکن مذہب یا ربی یا پنڈت الہام و وحی و کلام ربانی کا منکر نہیں ہو سکتا ہاں اگر آپ تمام الہامی کتابوں سے صاف انکار بھی کر جائیں اور انھیں بانیانِ مذاہب کی اپنی اپنی تصانیف بھی ماننے لگ جائیں تو جہاں مذہبی دنیا میں آپ کے لئے کفر کا فتوے ہے وہاں یہ پھر بھی آپ نے مان لیا کہ کم از کم ان احکام کو نافذ کرنے والا اگر خدا نہیں تو بانیانِ مذاہب ضرور ہیں اور ایسے ایسے اخلاق سوز و انسانیت کش احکام صادر کرنا مذہب سے تو ضرور ہی وابستہ ہے۔ ترکی اور اصلاحات میرا مضمون نہیں ہے اور نہ کسی ہندوستانی کو اس کی فکر لازمی ہے کہ ترکی میں کیا ہوا ہے یا ہوگا ع

تجکو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو

نیاز کا مشن کیا ہے؟ واقعی اس کی تصریح نہ ہوئی۔ میری آنکھیں یہ الفاظ دیکھنے کے لئے بے تاب تھیں کہ

نیاز کا مشن مذہب کو فنا کرنا ہے اس کی بیخ و بن اکھیڑنا ہے

مذہب کے لوازمات متعلقہ مثلاً خدا۔ روح۔ الہام۔ وحی۔ معجزہ۔ دوزخ۔ بہشت وغیرہم سب کی سرتاسر تکذیب کرنا اور ان کو محض فریب باطل قرار دینا اور ثابت کرنا ہے۔ صحیح اخلاق اور انسانیت کی ترویج کے لئے ہر ممکن کوشش کرنا ہے

ہندو۔ مسلم۔ سکھ۔ عیسائی۔ بدھ۔ یہودی اور زردشتی کی تفریق کو یکسر مٹا ڈالنا اور ان سب کو انسان بنا دینا ہے بس "انسان" نہ اس سے کم نہ بیش

تمام انسانوں کو بلا تخصیص و بلا امتیاز رنگ و روغن ایک ایسے جھنڈے تلے لا کر کھڑا کرنا ہے جس پر جلی حروف سے لکھا ہو سہ

بنی آدم اعضائے یک دیگر اند ہمہ نخل راشاخ و برگ و بر اند

مگر افسوس آنکھیں ترستی ہی رہیں اور یہ الفاظ ڈھونڈے سے نہ پائے گئے۔ "مذہب" کی گمراہ کن اصطلاح کی آڑ میں نیاز نے اپنا مشن کچھ کچھ دبی دبی زبان سے پیش کیا ہے مگر مولینا! جن لوگوں کو سقراط۔ نپولین۔ ہنی بال۔ سکندر اعظم۔ اور لینن کی صف میں کھڑا ہونا ہوتا ہے وہ یوں اصطلاحی آڑوں میں نہیں اُلجھے رہا کرتے۔ وہ اپنا پیغام برملا کہتے ہیں اور شخصی لیاقت و ذہانت ان کے پروگرام کی تکمیل کی ذمہ دار ہوا کرتی ہے۔ آپ اپنے مشن کا پروگرام ایک ہاتھ میں اور سرِ ہمت مردانہ دوسرے ہاتھ پر لے کر ذرا شان جانبازی سے میدان میں تو تشریف لے آئیے پھر جانئے مادرِ ہند کے بے شمار سپوت اس پیغام حق پر لبیک کہنے کو سرفروشانہ بڑھیں گے کیونکہ اکثر ہیں جو اس مذہبی تعصب کی قبائے تنگ سے تنگ آئے ہوئے ہیں اور ع

ہاتھ رکھے ہوئے بیٹھے ہیں گریبانوں پر

(نگار) فاضل مراسلہ نگار نے چند باتیں لکھی ہیں

ایک یہ کہ مذہب کا مفہوم ہمیشہ سے یہی چلا آیا ہے کہ صرف خدا کی پرستش کی جائے اور اس سے متجاوز ہونا "فلسفہ و اخلاق" کے حدود میں آجاتا ہے جو مذہب سے بالکل علیحدہ چیز ہے، یعنی ہو سکتا ہے کہ ایک مذہبی انسان واقعی کسی مذہب کا حامل کہلائے اور "فلسفہ و اخلاق" کا پابند نہ ہو،

دوسرے یہ کہ مذہب اسلام کے متعلق یہ کہنا کہ اس نے جبر و اکراہ سے کام نہیں لیا غلط ہے، اس کے احکام اور واقعات تاریخی سے ثابت ہوتا ہے کہ اس نے مذہب کے لئے لوگوں کو قتل تک کر ڈالا ہے چہ جائیکہ معمولی جبر و اکراہ

تیسرے یہ کہ سوائے "الحاد و لامذہبیت" کے بہ حالات موجودہ کوئی دوسری صورت احساس انسانیت پیدا کرنے کی نہیں ہے

چوتھے یہ کہ عورتوں کی ترقی و آزادی ان کا فطری حق ہے اور اس کی مخالفت نازیبا ہے۔ اور پانچویں یہ کہ مجھے پوری ہمت مردانہ کے ساتھ اپنا مشن لے کر نکل آنا چاہیئے کیونکہ مادرِ ہند کے بے شمار سپوت اس پیغام حق پر لبیک کہنے کے لئے سرفروشانہ بڑھتے ہوئے نظر آئیں گے

اب میں مختصراً اپنے خیالات پیش کرتا ہوں:۔

(۱) یہ بالکل درست ہے کہ مذہب سے پرستش خدا کے خیال کو منفک نہیں کر سکتے، لیکن اس پرستش کی غایت سے درستی اخلاق کو علیحدہ کر دینا یقیناً اس منشا و مقصود کی مخالفت کرنا ہے۔ جو فی الحقیقت مذہب کا ہونا چاہیئے

اگر کوئی شخص یہ سوال کرے کہ ذہن میں سب سے پہلے مذہب کا خیال پیدا ہوا یا درستی اخلاق کا تو ہم کو کہنا پڑے گا کہ مذہب زیادہ متقدم العہد ہے، کیونکہ حوادث طبیعی کے راز نہ سمجھ سکنے سے جو کیفیت خوف و ہراس کی انسان پر طاری ہوئی اسی نے سب سے پہلے "خدا" کا خیال انسان کے دل میں پیدا کیا اور اسی نے پرستش یا عبادت کی بنیاد دنیا میں ڈالی، لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی ماننا پڑیگا

کہ جب رفتہ رفتہ انسانی دماغ زیادہ ترقی یافتہ ہوا اور سماجی زندگی کے اصول مرتب کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی تو سرداران قوم نے اسی قدیم مذہبی خیال کی زمین پر تحفظ قومی کے اصول کی داغ بیل ڈالی، کیونکہ انسان کی فطرت ہے کہ وہ ہمیشہ مادی اثرات و نتائج کی طرف جلد متوجہ ہو جاتا ہے اور اُس وقت کا مذہب بھی مادی خدا کی پرستش کے علاوہ کچھ اور نہ تھا ———

جب یہ ابتدائی دَور بھی ختم ہو گیا تو فکر و تعقل کا وہ دَور شروع ہوا جس نے مذاہب کو زیادہ ترقی یافتہ شکل میں پیش کیا اور ہرچند مقصود وہی تحفظ قومی تھا، لیکن خدا کے مفہوم میں مادیت کا عنصر کم کر دیا گیا۔ اور مذہب میں ایک ہلکی سی جھلک فلسفہ کی پیدا ہونے لگی ——— یہاں تک کہ ظہور اسلام ہوا۔ اور خدا کا تصور اتنا صاف اور ستھرا ہو گیا کہ اس میں قبول فلسفہ کی صلاحیت پیدا ہو گئی اور وقت آیا کہ سماج کا مفہوم ایک محدود قوم و ملک سے متجاوز ہو کر نوع انسانی تک وسیع ہو، لیکن قبل اس کے کہ اس وسیع خیال کی عملی تکمیل ہوتی، بانیِ اسلام کی ساری عمر ابتدائی دشواریوں کے دُور کرنے میں صرف ہو گئی اور اسلام کی یہ اہلیت بروئے کار نہ آسکی

یہ بالکل صحیح ہے کہ بانیٔ اسلام نے جنگ کی، کفار کو قتل کیا، لیکن ان بلوتوں کا تعلق مذہب کی اُس صحیح تعلیم سے نہ تھا جو "لا اکراہ فی الدین" میں پنہاں تھی، بلکہ تحفظ قومی کے اُس خیال سے وابستہ تھا جس کا استوار ہو جانا اصل مقصد کی تکمیل سے قبل ضروری تھا، اور اسی لئے کہا جاتا ہے کہ بانیٔ اسلام کے زمانہ میں جتنی جنگیں ہوئیں وہ سب دفاعی تھیں اور جارحانہ۔ ہرچند یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر موافق و مخالف دونوں گفتگوئیں ہو سکتی ہیں، لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اسلام کی وہ تعلیم جس کا تعلق محض درستی اخلاق سے ہے وہ تمام نوع انسانی پر حاوی ہے اور اس کا مقصود سوسائٹی کا ایک ایسا نظام قائم کرنا تھا جو تفریق مذہب و ملت کو مٹا کر اخوت عامہ کے مرکز پر سب کو یکجا کر دے ——— اس لئے اب سوال یہ نہیں ہے کہ اسلام نے کیا کیا بلکہ دیکھنا یہ چاہئے کہ وہ کیا کر سکتا ہے اور اس کا مقصد کیا ہے۔ میرے سامنے بالکل یہی حقیقت ہے اور اسی حقیقت کو پیش نظر رکھ کر میں اسلام کا وہ مفہوم پیش کرتا ہوں جو "لامذہبیت" تک منجر ہو سکتا ہے

میرے نزدیک اسلام نام ہے اُن اصول کے مجموعہ کا جو بہترین تہذیب اور انتہائی دماغی و ذہنی ترقی کے حصول کے لئے ہر وقت بدلتے رہتے ہیں اور اسی لئے نہ ہم کو اسلام کی گزشتہ تاریخ سے استشہاد کی ضرورت ہے نہ اگلے وقت کے اصول معاشرت سے

الغرض جو چیز آپ کے سامنے ہے، وہی میرے سامنے بھی ہے، فرق یہ ہے کہ آپ مذہب کے خیال ہی کو لغو قرار دے کر تمام مذاہب کو بُرا کہتے ہیں اور میں تمام مذاہب کے مقاصد کو صحیح و درست سمجھ کر اُن سب کو متحد کرنا چاہتا ہوں اس بات پر کہ اصل مذہب نام ہے تفریق مذاہب کے مٹا دینے کا اور اسلام کا مفہوم یہی ہے

(۲) عورتوں کے باب میں آپ نے میرے جس نوٹ کا ذکر کیا ہے وہ لاہور کے ایک جلسۂ خواتین کے متعلق تھا اور معاف فرمائے اگر میں یہ کہوں کہ آپ نے اس کے سمجھنے میں غلطی کی ہے۔ میں نے کبھی عورت کو مرد سے فروتر نہیں سمجھا، میں نے کبھی یہ

نہیں کہتا کہ وہ ترقی نہ کرے اور مردوں کی غلام ہی رہے، لیکن یہ ضرور جانتا ہوں کہ سوسائٹی میں مرد عورت دونوں کے فرائض علیحدہ علیحدہ ہیں اور علمی یا ذہنی ترقی کے یہ معنی نہیں کہ مرد عورت کے فرائض انجام دینے لگے اور عورت مرد کے

اس وقت سب سے زیادہ ترقی یافتہ، سب سے زیادہ حقوق طلب اور سب سے زیادہ مدعی مساوات، مغرب کی عورت ہے، جس کی پیروی ہندوستان کی عورتیں بھی کرنا چاہتی ہیں، لیکن عورت کی موجودہ رفتار ترقی نے مغرب کی سوسائٹی کو جس قدر نقصان پہونچایا ہے وہ کسی سے مخفی نہیں

اس لئے میں یہاں کی عورت کو ترقی یافتہ حالت میں، تو دیکھنا چاہتا ہوں لیکن اس کو پسند نہیں کرتا کہ وہ مرد بننے کی کوشش کرے، جبکہ عورت، عورت ہونے ہی کے لحاظ سے زیادہ قابل احترام چیز ہے۔ اور سوسائٹی کا توازن بھی اسی طرح قائم رہ سکتا ہے

(۳) تیسری بات جو آپ نے میری ہمت مردانہ کے متعلق لکھی ہے سو اس کا جواب کیا دوں۔ کیونکہ اس کا تعلق بہت کچھ میری ذاتیات اور ذاتی حالات سے ہے۔ میرا مشرب کام کرنا اور کام کو کسی نہ کسی طرح جاری رکھنا ہے، ہلاک ہو کر اس کو ختم کرنا نہیں۔ شہید ہونا مجھے پسند نہیں، غازی رہنا چاہتا ہوں اور جنگ کے تمام اُن اصول کو سامنے رکھ کر جہاں مصلحت کے سوا کسی اور کی حکومت نہیں

تین شباب افزا اور صحت بخش دوائیں

عنبریں

مقوی اعضاء رئیسہ اور بے نظیر مفرح معجون ہے اسکے استعمال کے بعد خواہ کتنا ہی دماغی کام کیجئے بالکل تکان نہیں ہوتا ہے جسمانی و دماغی تکان دور کرکے فوراً فرحت پیدا کرتی ہے۔ رقت و سرعت اور ضعف باہ کا یقینی شفا بخش علاج ہے۔ دماغ، دل اور اعصاب کو طاقت دیتی ہے مقوی، ممسک، مہبی اور مفرح ہے قیمت فی تولہ تین (۳) روپے

ہضمین

معدے کو قوی کرکے بغیر بھوک بڑھاتی اور غذا ہضم کرتی ہے۔ احتباس ریح، قراقر، بدہضمی اور بادی بواسیر کی شافی دوا ہے۔ مقوی معدہ ہاضم، ملین اور خوش ذائقہ ہے

قیمت ۱۳۰ گولیاں ایک روپیہ (عہ)

حاذق پلز

جریان و احتلام، رقت و سرعت، دائمی قبض اعضا شکنی اور ضعف باہ کو دور کرنے اور قوت بڑھانے کے واسطے اس سے ارزاں اور زود اثر دوا نہیں مل سکتی ہے قبض کشا اور مقوی معدہ و جگر ہیں۔ مضر اور نشیلے اجزاء سے پاک ہیں۔ قیمت ۴۰ گولیاں ایک روپیہ (عہ)

عالی جناب سید وحید صاحب اڈیٹر علیگڈھ میگزین کی رائے:۔ مجھے عنبریں اور ہضمین بہت پسند ہے۔ دماغی قوت کے لئے ایسی اچھی چیز بہت کم جگہ ملے گی
عالیجناب مولوی سید مہدی حسن صاحب وکیل بہار شریف کا ارشاد:۔ میں نے حاذق پلز، ہضمین اور عنبریں استعمال کیں۔ زود اثر اور فائدہ بخش ثابت ہوئیں
عالیجناب حکیم سید حسن محی الدین صاحب متعلم اعظم سنگار یڈی حیدرآباد دکن فرماتے ہیں:۔ عنبریں بہترین مقوی دوا ہے بڑی بات یہ ہے کہ زود اثر ہے
ایک کارڈ لکھ کر آج ہی "رسالہ اکسیر دماغ" مفت منگائیں۔ دماغی کام کرنے والوں کے لئے بہترین تحفہ ہے

پتہ: عنبریں فارمیسی ۹ جلال آباد (مظفرنگر) یو۔ پی

مطبوعات موصولہ

پردیس کی باتیں

سفرنامہ میں جناب مرزا حسین احمد بیگ ناظم عدالت حیدرآباد کا جو ممالک اسلامیہ اور یوروپ کے دورانِ سیاحت میں مرتبہ کیا گیا ہے

ادب میں تاریخ و سفرنامہ کو تقریباً ایک ہی مرتبہ حاصل ہے، لیکن چونکہ سفرنامہ میں صرف ذاتی تجربات ایک خاص اسلوب سے بیان کئے جاتے ہیں اس لئے اس میں نسبتاً زیادہ شگفتگی پائی جاتی ہے۔ اور لوگ اسے زیادہ شوق سے پڑھتے ہیں علی الخصوص اس وقت جب سیاح نے اسے شگفتگی کے عالم میں مرتب بھی کیا ہو

مرزا صاحب کا یہ سفرنامہ میرے نزدیک اسی تحت میں آتا ہے اور مفید ہونے کے ساتھ ساتھ کافی دلچسپ بھی ہے۔ تصاویر وغیرہ بھی جابجا نظر آتی ہیں اور طباعت دکتابت بھی بنہایت پسندیدہ ہے۔

مکتبۂ ابراہیمیہ حیدرآباد سے باختلاف جلد تین روپیہ اور چار میں مل سکتا ہے

گاندھی نامہ

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے مہاتما گاندھی کے سوانح حیات پر مشتمل ہے لیکن نظم میں۔ اس کے مصنف میاں محمد رفیق ایم۔ اے۔ اُن لوگوں میں سے ہیں جو ملک و قوم کے خدمات کا سچا درد اپنے دل میں رکھتے ہیں اور اسی جذبہ کے ماتحت انھوں نے اس تصنیف کو حد درجہ عقیدت و ارادت کے ساتھ پیش کیا ہے

اس میں مہاتما گاندھی کے بعض اہم سوانح حیات کو سامنے رکھ کر فاضل مصنف نے ایسے ایسے پہلو درس بصیرت کے پیش کئے ہیں کہ ایک شخص داد دینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

مجھے حیرت ہے کہ مصنف ایسی خشک باتوں کو کیونکر ایسی پاکیزہ نظموں میں منتقل کر سکے۔ نظمیں مختلف بحروں میں ہیں اور طرز ادا کے تنوع نے ان میں بہت دلکشی پیدا کر دی ہے

راون کی رُوح کا گیت ملاحظہ ہو:-

انجمن حیات میں | محفل کائنات میں
عالم ممکنات میں
میرے شرار سے تپش | میرے نفس سے جوش ہے
شعلۂ بیقرار سے | ولولہ و خروش ہے

دہر کی ہر جمیل شے مجھ سے نمو پذیر ہے　　بن کی اجودھیا پری مجھ سے خراج گیر ہے
مجھ سے نجوم تابدار تابشِ مستعار لیں　　پھول جمال و حُسن کا خرقۂ زرنگار لیں

شاخِ نہال گلفشاں　　مجھ سے بہار در بہار
حُسن فروغ در فروغ　　عشق شرار در شرار

خونِ رگِ حیات ہوں
میں نہ ہوں گر تو کچھ نہ ہو

نرگسِ خوابناک کو مژدۂ قُم مری صدا　　غنچۂ ناشگفتہ کو موجِ نسیمِ جانفزا
مجھ میں جہانِ زیست میں رابطۂ خلِ جان و تن　　ہے مرا تار و پودِ کار شاہدِ حق کا پیرہن

سوز درونِ خاک اگر　　ایک شرر بھی کم ہوا
پھر ہے دل کی راکھ سے　　اخگرِ تازہ دم ہوا

برقِ دلِ حیات ہوں
میں نہ ہوں گر تو کچھ نہ ہو

اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ نظم و شعر کے لحاظ سے، اس مجموعہ کا کیا مرتبہ ہے۔ تقریباً ۲۰۰ صفحات کا یہ بیش بہا رسالہ عہر میں فاضل مصنف سے باغبانپورہ لاہور کے پتہ پر مل سکتا ہے

نغمۂ روح جناب اختر انصاری بی۔ اے بدایونی کے کلام کا مجموعہ ہے ——— جناب اختر انصاری کے کلام سے ہمارے ناظرین نا آشنا نہیں۔ ان کے قطعات گاہے گاہے نگار میں شائع ہوتے رہتے ہیں

جناب اختر ملک کے ان چند نوجوانوں میں سے ہیں جن کی موجودہ فکر سے اُن کے درخشاں مستقبل کا پتہ چلتا ہے۔ پاکیزہ خیال کے ساتھ پاکیزہ زبان استعمال کرنا۔ یہ ہے خاص معیار نظم کی خوبی کا اور ہمیں یہ دیکھ کر بہت مسرت ہوتی ہے کہ جناب اختر کے کلام میں دونوں کی کمی نہیں

اس مجموعہ میں قطعات بھی ہیں اور منظومات بھی، غزلیں بھی ہیں اور متفرق اشعار بھی، لیکن ایک ذہن خلاق اور فکر صحیح کے آثار ہر جگہ نمایاں ہیں۔ چونکہ اختر فطرتاً حسن پرست واقع ہوئے ہیں اس لئے آرٹ کی پسندیدگی کے ساتھ ساتھ جو جذبات قلب انسانی میں پیدا ہوئے ہیں وہ بہ کثرت ان کے کلام میں نظر آتے ہیں ——— ذیل کے چند اشعار سے اُنکے رنگِ تغزل کا پتہ چل سکتا ہے:۔

کون ہے بے قرار میرے لئے　　آج کچھ بیقرار سا ہوں میں

ہائے مدہوش رات کا افسوں میں زمیں پر ہوں روح تلووں میں

وہ راز کہ اغیار سے کہہ بھی نہیں سکتے سینے میں بھی اللہ چھپایا نہیں جاتا

غم کے جرعات ملتے ہیں جوں جوں عیش کی پیاس بڑھتی جاتی ہے

مٹ گئے وہ نظارہائے جمیل لیکن آنکھوں میں عکس چھوڑ گئے

ہر چند جناب اختر کا موجودہ رنگ کوئی مستقل رنگ نہیں کہلایا جاسکتا اور یقیناً مطالعہ و تجربات کے بعد اس میں کچھ نہ کچھ تغیر ہوتا ہے، لیکن ہمیں ان کی فطرت سے توقع ہے کہ یہ تغیر مائل بہ پستی نہ ہوگا۔ ابتدا میں دو صفحات کا ایک مختصر سا دیباچہ بھی بہ اتباع آسکر وائلڈ درج کیا گیا ہے۔ جس میں آرٹ پر آسکر وائلڈ ہی کے نقطۂ نظر سے روشنی ڈالی گئی ہے ——— اس کتاب کی قیمت عمر ہے اور مولوی محمد افضل خاں صاحب سے محلہ ناہر خاں بدایوں کے پتہ پر مل سکتی ہے

شہرستان و گلبانگ یہ دونوں رسالے مجموعہ ہیں جناب فہمی ترمذی کی ادبی و اخلاقی، قومی و وطنی نظموں اور غزلوں کے۔ جناب فہمی گو ادبی دنیا میں وسیع شہرت نہ رکھتے ہوں، لیکن اُس مخصوص حلقہ میں جہاں وہ زندگی بسر کرتے ہیں یا ان لوگوں میں جنھوں نے ان کے کلام کا بامعان نظر مطالعہ کیا ہے بہت عزت و احترام کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں ——— مجھے خود جناب فہمی سے ملنے اور ان کا کلام سننے کا بارہا اتفاق ہوا ہے، اس لئے اگر میں اُن کا اور اُن کے کلام کا معترف ہوں تو اس کو میرا شاعرانہ مبالغہ نہ سمجھنا چاہیے، کیونکہ فہمی جن صفات کا انسان ہے وہ واقعتاً بہت کم لوگوں میں پائی جاتی ہیں اور جو پاکیزہ قوت فکر انھیں نصیب ہوئی ہے، وہ کم لوگوں کو میسر آتی ہے

فہمی "ولولہ و جوش" کی شاعری نہیں کرتے، بلکہ غور و تامل، فکر و تدبر کو پیش کرتے ہیں۔ اور چونکہ انسانی اخلاق کا بلند پہلو ہمیشہ اُن کے سامنے رہتا ہے اسی لئے ان کے کلام میں ابتذال کا کہیں پتہ نہیں۔ ان کے کلام کی ایک اور خصوصیت یہ بھی ہے کہ فنی غلطیاں بھی بہت کم پائی جاتی ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ وہ کہتے ہیں، بہت سوچ سمجھ کر کہتے ہیں۔ فہمی اپنی فطرت کے لحاظ سے اس قابل تھے کہ سرزمین بھوپال سے باہر ان کا نشو و نما ہوتا اور قدرت کی اس پاکیزہ ودیعت سے بہتر کام لینے کے لئے انھیں زیادہ بلند سوسائٹی نصیب ہوتی، لیکن افسوس ہے کہ معیشت و معاشرت کی مجبوری نے انھیں بھوپال سے باہر قدم نہ نکالنے دیا اور اس طرح ان کا مستقبل تباہ

ہو کر رہ گیا

یہ دونوں مجموعے علے الترتیب عہ اور ۶؍ میں جامعہ ملیہ دہلی سے مل سکتے ہیں

نقش آخر ڈرامہ ہے جناب اشتیاق حسین قریشی کا جسے جامعہ ملیہ دہلی نے شایع کیا ہے۔ جناب اشتیاق کے متعدد ڈرامے اس وقت تک شایع ہو چکے ہیں اور نگار میں ان پر ریویو بھی ہو چکا ہے۔ میں اشتیاق صاحب کی ڈرامہ نگاری کا معترف ہوں اور چاہتا ہوں کہ اور لوگ بھی جو اس فن سے دلچسپی رکھتے ہیں انھیں کی طرح اس کو اختیار کریں

"نقش آخر" ان کا تازہ ترین ڈراما ہے جس میں تعلیم جدید کے نقائص کو نمایاں کیا گیا ہے۔ ہر چند میں نے اسے بالاستیعاب نہیں دیکھا، لیکن چونکہ اس سے قبل ان کے بعض ڈراموں کو دیکھ چکا ہوں اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ اس کے متعلق بھی وہی رائے نہ قائم کروں، جو دوسرے ڈراموں کے متعلق قائم کر چکا ہوں —— اس کی قیمت ۱۰؍ ہے

اسلامی تاریخ کی سچی کہانیاں حصۂ دوم جناب محوی لکھنوی نے ان کہانیوں کو مرتب کیا ہے اور اس میں شک نہیں کہ ان کا مطالعہ بچوں کے لئے فائدہ سے خالی نہیں گو زبان کے لحاظ سے اس میں ہنوز ترقی و اصلاح کی گنجایش باقی ہے اور صحت تاریخی کے لحاظ سے بھی حذف و اضافہ ہونا چاہئے، تاہم ناشر و جامع کی نیت و خدمت سے انکار نہیں ہو سکتا۔ یہ کتاب جامعہ ملیہ دہلی سے ۱۲؍ میں مل سکتی ہے

بچوں کی نظمیں جناب سعید انصاری نے مختلف شعرار کی منظومات اس نام سے مرتب کی ہیں۔ اور انتخاب میں اس بات کا لحاظ رکھا ہے کہ بچے متاثر ہوں —— شاعری کے لحاظ سے بعض نظمیں یقیناً قابل انتخاب نہ تھیں، لیکن فاضل جامع نے شاید اس کا لحاظ نہیں کیا اور صرف موضوع کی شگفتگی کو کافی سمجھا

اخیر میں مشکل الفاظ کے معنی بھی درج کرائے گئے ہیں۔ قیمت ۵؍ ہے اور ملنے کا پتہ جامعہ ملیہ دہلی

نفسیات مذہب یہ مختصر سا مقالہ ہے جو سید وہاج الدین صاحب پروفیسر عثمانیہ کالج اورنگ آباد نے جامعہ ملیہ دہلی کے جلسۂ اردو اکاڈمی میں پڑھا تھا اور اب کتابی صورت میں شایع کیا گیا ہے

فاضل مقالہ نگار نے جس خوبی کے ساتھ اس موضوع پر اظہار خیال کیا ہے وہ لائق صد ہزار تحسین ہے۔ کیونکہ انھوں نے اس بحث میں مطلقاً تنگ نظری سے کام نہیں لیا اور "حاسۂ مذہبی" کی ضرورت کو جس انداز سے ثابت کیا ہے۔ وہ دوسروں کے "حاسۂ مذہبی" کا بھی احترام پیدا کرنے والا ہے

ہر چند مجھے اصولاً اکثر مباحث سے اختلاف ہے، لیکن پھر بھی میں فاضل مصنف کی کاوش و جستجو کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ سب سے زیادہ نمایاں خصوصیت اس تصنیف کی اس کی زبان ہے۔ جس نے ایسے خشک علمی مسئلہ کو "ادب و شعر" کی طرح دلچسپ بنا کر پیش کیا۔ اس کی قیمت ۸؍ رکھی گئی ہے

جمال الدین افغانی

یہ مقالہ بھی جامعہ ملیہ کے اُردو اکاڈمی کے جلسہ میں پڑھا گیا تھا۔ قاضی عبد الغفار صاحب اس کے مرتب ہیں اور مکتبۂ جامعہ ملیہ ناشر۔ موضوع نام سے ظاہر ہے۔ قیمت ۸ر

فروغ اُردو

اسلامیہ کالج لاہور میں ایک بزم "فروغ اُردو" کے نام سے ۱۹۳۲ء سے قایم ہوئی ہے جس کے جلسوں میں پروفیسر اور طلبہ اپنے اپنے مقالے پڑھتے ہیں۔ انھیں مقالات کا مجموعہ اب اس نام سے شایع کیا گیا ہے۔ اس مجموعہ میں گیارہ مضامین ہیں جن کی فہرست یہ ہے:-

اقبال اور وطنیت ——— اُردو شاعری میں ہجو ——— ریختی ——— اُردو میں سیاسی شاعری ——— حسرت موہانی غالب کی قنوطیت ——— اردو شاعری میں حفیظ کا پایہ ——— غالب کی رجائیت ——— سائنس کے جدید نظریے تجزیۂ نفسی ——— خود تاثری ——— اس فہرست کے مطالعہ سے معلوم ہو سکتا ہے کہ ادبی مقالات کے ساتھ ساتھ علمی مضامین بھی بزم میں پڑھے گئے ہیں اور میرے نزدیک اُردو کی صحیح خدمت یہی ہے

مقالات اچھے ہیں اور ان کا مطالعہ فائدہ سے خالی نہیں۔ یہ مجموعہ سکرٹری بزم فروغ اُردو اسلامیہ کالج لاہور سے دستیاب ہو سکتا ہے۔ قیمت ۱۲ر زیادہ نہیں ہے

افسانہائے عشق

سات افسانوں کا مجموعہ ہے جنھیں حامد علی خاں صاحب بی۔ اے جائنٹ اڈیٹر ہمایوں نے دوسری زبانوں سے منتقل کیا ہے۔ ان سات افسانوں میں سے تین ٹگور سے لئے گئے ہیں، دو فسانے سنتا دیوی اور سیتا دیوی کے ہیں اور ایک زونا گیل کا

ترجمہ کی خوبی یہ ہے کہ اصل زبان کا زور بیان باقی رہے اور ترجمہ بھی نہ معلوم ہو۔ اور اس باب میں حامد علی خاں صاحب کو جتنی کامیابی حاصل ہوئی ہے وہ مشکل ہی سے کسی دوسری جگہ نظر آسکتی ہے

کتاب نہایت خوبصورت سائز میں شایع ہوئی ہے اور کتابت و طباعت کے لحاظ سے بھی نہایت پاکیزہ ہے۔ جابجا تصاویر کے اضافہ نے اور حسن پیدا کر دیا ہے

یہ مجموعہ عہر میں دفتر ہمایوں لاہور سے مل سکتا ہے

لاش اور دوسرے ہیبتناک افسانے

حجاب اسماعیل کے چھ افسانوں کا مجموعہ ہے جسے دار الاشاعت پنجاب لاہور نے بہترین طباعت و کتابت کے ساتھ مجلد شایع کیا ہے

حجاب اسماعیل ہندوستان کی مشہور اہل قلم خواتین میں سے ہیں اور مُلک کے مختلف رسائل میں اُن کے افسانے شایع ہوتے رہتے ہیں۔ زبان و تخئیل دونوں حیثیت سے وہ کامیاب فسانہ نگار ہیں اور اتنی کامیاب کہ اس وقت ہندوستان میں بھی صرف چند اس مرتبہ کے ملیں گے۔ یہ مجموعہ عہر میں مل سکتا ہے

پردیسی کی فریاد

اے موجِ صبا کچھ حال سُنا اُس دیس کے رہنے والوں کا

وہ دیس جہاں کی خاک بھی ہے آنکھوں سے لگانے کے قابل
وہ دیس جہاں کا ہر ذرہ، ہے ایک عبادت خانۂ دل
وہ میرے خیالوں کی جنت، وہ میری امیدوں کا حاصل
وہ میری مرادوں کا مرکز، وہ میرے ارادوں کی منزل

اے موجِ صبا کچھ حال سُنا اُس دیس کے رہنے والوں کا

وہ دیس، جہاں طفلی کی بہاریں رقصاں رقصاں گزری ہیں
وہ دیس، جہاں غم کی گھڑیاں، صد رنگ بداماں گزری ہیں
وہ دیس، جہاں میری راتیں، سرشار و غزلخواں گزری ہیں
وہ دیس، جہاں میری صبحیں، مسرور و درخشاں گزری ہیں

اے موجِ صبا کچھ حال سنا اُس دیس کے رہنے والوں کا

وہ دیس، جہاں ندی کے کنارے پہروں کھیلا کرتا تھا
کس شوق سے پانی کی لہروں کے رقص کو دیکھا کرتا تھا
مہتاب سُلانے آتا تھا، خورشید جگایا کرتا تھا
ہستی کے ستم سے ناواقف، جینے کی تمنا کرتا تھا!

اے موجِ صبا کچھ حال سُنا اُس دیس کے رہنے والوں کا

وہ دیس، فضاؤں میں جس کی سرشار جوانی آئی تھی
وہ دیس جہاں دل میں اُلفت کی پہلی کرن تھرائی تھی
وہ دیس، جہاں اِک شوخ نظر پیغامِ جراحت لائی تھی
رگ رگ میں نہاں اِک درد سا تھا، اِک چوٹ سی دل پر کھائی تھی

اے موجِ صبا کچھ حال سُنا اُس دیس کے رہنے والوں کا

وہ دیس جہاں بیکار تھیں سب ہستی کی ستم پرور گھاتیں		دلچسپ وہ باغوں کی سیریں؟ دلکش وہ سہانی برساتیں
گھنگھور گھٹاؤں کا اُٹھنا، ساغر کی کھنک، سرخوش باتیں		اللہ کدھر پنہاں ہیں وہ دن، اللہ کہاں ہیں وہ راتیں

اے موجِ صبا کچھ حال سنا اس دیس کے رہنے والوں کا

ہاں کچھ تو سنا اے روحوں کو پیغامِ طرب دینے والی		مانا کہ فضائے گیتی میں ہے کھیل دلوں کی پامالی
مانا کہ زمانہ ہے یکسر انوارِ محبت سے خالی		مانا کہ نہیں دنیا میں گراں یاروں پہ کسی کی بے حالی

اے موجِ صبا کچھ حال سُنا اُس دیس کے رہنے والوں کا

للہ بتا! مجھ بیکس کو یارانِ وطن کیا بھول گئے		پردیس کا عالم ہوتا ہے کس درجہ غم افزا بھول گئے
مدت سے ہے اک آوارہ وطن محروم تمنا بھول گئے		آتا ہوں کسی کو یاد بھی ہیں سب مجھ کو وہاں یا بھول گئے

اے موجِ صبا کچھ حال سُنا اُس دیس کے رہنے والوں کا

کہنا کہ تمھارے ساتھی کو دنیا کے ستم نے لوٹ لیا		پردیس میں پیہم ناکامی کے رنج والم نے لوٹ لیا
ہستی کی متاعِ عشرت کو بے مہریٔ غم نے لوٹ لیا		اُمید کو نا اُمیدی کے احساسِ الم نے لوٹ لیا

اے موجِ صبا کچھ حال سُنا اس دیس کے رہنے والوں کا

گھنگھور گھٹائیں آتی ہیں، وہ منہ اشکوں سے دھوتا ہے		غنچے متبسّم ہوتے ہیں، وہ سر دُھنتا جاں کھوتا ہے
تم محوِ فغاں پاؤگے اُسے، جب ذرہ ذرہ سوتا ہے		روتوں کو ہنساتا تھا جو کبھی، دن رات پڑا اب روتا ہے

اے موجِ صبا کچھ حال سُنا اس دیس کے رہنے والوں کا

علی اختر (حیدرآباد دکن)

اعتبار

تجھے پاسِ عشق نہیں نہیں
مگر آہ مجھ کو یقیں نہیں

تری ہر نگاہ غرور سے ؟
کششِ نمودِ غرور ہے
تری ہر نمائشِ تمکنت
کہیں عرش ہے کہیں طور ہے
ہیں گواہ تیری خموشیاں
کہ تو سنگدل بھی ضرور ہے
یہ سہی کہ میری ہر اک نظر
ترے التفات سے دور ہے

تو ہزار مجھ سے خفا سہی
تو ہزار مجھ سے جدا سہی
تو عدوئے ذوقِ وفا سہی
مگر آہ مجھ کو یقیں نہیں

تجھے ایک نغمۂ بے اثر
ہے شکستِ بربطِ آرزو
ترے ابتسام سے شکوہ گر
خلشِ جراحتِ بے رفو
ترے لالہ زارِ نشاط میں
نہیں سوزِ مہر و وفا کی بُو
یہ سہی کہ تیری نگاہ میں
نہیں آنسوؤں کی کچھ آبرو

تجھے بیکسوں کی دعا سے ضد
تجھے التجائے وفا سے ضد
تجھے رسم و مہر و ولا سے ضد؟
مگر۔ آہ! مجھ کو یقیں نہیں

روِش (صدیقی)

نگار

رسالہ ہر مہینے کی ۱۵ تاریخ تک شائع ہوتا ہے

رسالہ نہ پہونچنے کی صورت میں ۲۵ تاریخ تک دفتر میں اطلاع ہونی چاہئے ورنہ رسالہ مفت نہ روانہ ہوگا

سالانہ قیمت پانچ روپیہ (صہ) ششماہی تین روپیہ (عہ)

بیرون ہند سے آٹھ روپیہ سالانہ پیشگی مقرر ہے

شمارہ ۶	فہرست مضامین جون ۱۹۳۴ء	جلد ۲۵

ملاحظات		۲
فلسفہ کی تعلیم اور اس کی اہمیت	میر ولی الدین ایم اے، پی ایچ ڈی (لندن) معلم فلسفہ کلیہ جامعہ عثمانیہ (حیدرآباد)	9
رجوتی	احتشام رضوی	۲۹
انسان کی لازوال عظمت	عبد الحفیظ	۳۷
مکتوبات نیاز		۴۶
بیراگ کا بروگ		۵۱
میکدۂ اسلام		۵۷
باب الانتقاد		۶۲
باب المراسلۃ والمناظرہ		۶۷
باب الاستفسار		۷۰
لکھنؤ کی شاعری	ہوش	۷۲
کلام اختر	اختر	۷۶
اشک بیتاب	شیدا	۷۷
ہمدا ۔ مطالبات	بنی احمد ۔ کوکب	۷۸

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد ۲۵	جون سنہ ۳۴ء	شمار ۶

ملاحظات

خدا نے دنیا کو کیوں پیدا کیا

یہ ایک سوال ہے جو ایک ہندو سوسائٹی نے مجھ سے کیا ہے ؟

یہ سوال خالص مذہبی ہے ، یعنی یہ جستجو اسی شخص میں پیدا ہو سکتی ہے جو خدا کے وجود کا قایل ہے اور ایشور کا پایا جانا تسلیم کر چکا ہے ، لیکن جو منکرِ خدا ہے وہ کون اور کس نے سے گفتگو نہیں کرتا ، بلکہ اس کی تلاش یہ ہوتی ہے کہ یہ عالم کیونکر ظہور میں آیا - اور اس کے اندر انسان کی حیثیت کیا ہے ؟

ایک پابندِ مذہب انسان چونکہ خدا کو بالکل اسی طرح کا صناع و خلاق مانتا ہے جس طرح ایک کمہار یا بڑھئی کہ جو برتن اسکے جی میں آیا بنا دیا ، جسطرح کی چوکی چاہی اسنے طیار کر دی ، اسلئے اصولاً اس کے سامنے کیونکر کا سوال نہیں آسکتا ، کیونکہ ایک قادرِ مطلق اور مختارِ کل ہستی کو ہر وقت قدرت و اختیار حاصل ہے کہ جب چاہے ، بغیر کسی ذریعہ و سبب کے اپنے ارادہ سے ہیزدہ ہزار عالم پیدا کر دے اور جب اس کے جی میں آئے آناً فاناً محو کر دے - لیکن ایک منکر چونکہ دنیا کی پیدایش کو کسی ہستی کے ارادہ سے

متعلق نہیں سمجھتا بلکہ اس کو مخصوص اسباب سے وابستہ جانتا ہے اور تدریجی ارتقا کا قایل ہے اس لئے لامحالہ اُسے غور کرنا چاہئے کہ اصولِ آفرینش کیا ہیں اور کن اسباب کے ماتحت کائنات نے موجودہ شکل اختیار کی ہے

بہرحال اس باب میں ایک مذہبی انسان کا نقطۂ نظر، مُنکر کے نقطۂ نظر سے بالکل علیحدہ ہے اور اس لئے اگر مندرجۂ عنوان سوال دونوں کے سامنے پیش کیا جائے تو ظاہر ہے کہ دونوں کا جواب بالکل ایک دوسرے سے مختلف ہوگا۔ لیکن گفتگو اس میں ہے کہ کیا واقعی دونوں اس سوال کا جواب دینے کے اہل ہیں۔ ایک مذہبی شخص جو پیدایش عالم کے لئے کسی علت وسبب کے وجود کو ضروری نہیں سمجھتا وہ نتیجہ وغایت پر غور کرنے کا مستحق کیونکر قرار دیا جاسکتا ہے۔ یعنی جب اس نے یہ تسلیم کرلیا کہ خدا قادرِ مطلق ہے، اس سے کوئی سوال نہیں کیا جاسکتا، وہ جو چاہے پیدا کردے اور جب چاہے فنا کردے، تو پھر کیوں کا سوال کیسا، یہ "چون وچرا" تو اسباب وعلل سے متعلق ہوا کرتا ہے اور جب وہاں سرے سے اسی کا انکار کیا جاتا ہے تو استفسار کیوں؟۔ البتہ ایک منکر کے متعلق خیال ہوسکتا ہے کہ اس نے اس پر غور کیا ہوگا، لیکن اگر انصاف سے پوچھئے تو یہ کہنا پڑے گا "کیوں" کا جواب نہ خدا کا اقرار کرنے والا دے سکتا ہے نہ انکار کرنے والا، کیونکہ جس طرح مذہب آجتک غایتِ آفرینش کو نہیں سمجھ سکا، اسی طرح سائنس بھی اس معمہ کو حل نہیں کرسکی، یعنی اگر ایک پابند مذہب شخص یہ نہیں بتا سکتا کہ کائنات کے پیدا کرنے سے خدا کا کیا مقصود ہے تو بڑے سے بڑا سائنس داں بھی نہیں کہہ سکتا کہ مادّہ وقوت کے اس ہیجان کا نتیجہ کیا ہونا ہے۔ لیکن کس قدر حیرتناک امر ہے کہ باوجود اس نااہلی کے دونوں اس کا جواب دینے کی کوشش کرتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک اصرار کرتا ہے کہ وہی حق پر ہے، درانحالیکہ ان میں سے کسی کے پاس کوئی ادنیٰ دلیل بھی اس دعوے کے لئے موجود نہیں —— اہل مذاہب میں ایک جماعت تو علماء ظواہر کی ہے جو اپنے آپ کو مخصوص شریعت کا پابند کہتے ہیں اور جو مذہب کو صرف اُن کتابوں سے سمجھنا چاہتے ہیں جو ان کے اسلاف لکھ گئے ہیں اور جن کی بناء پر سوسائٹی کا.... نظام مقرر کیا گیا تھا، دوسری جماعت اہل تصوف کی ہے جنھوں نے اپنے مسلک کا نام شریعت نہیں بلکہ طریقت رکھا ہے اور جو تمام مسایل کو روحانیت سے سمجھنا اور سمجھانا چاہتے ہیں —— مسلمانوں میں اوّل الذکر جماعت کے پاس اس سوال کا کھلا ہوا جواب موجود ہے اور ان کو زیادہ سوچنے کی ضرورت نہیں، کیونکہ قرآن نے کھلے ہوئے الفاظ میں اس سوال کا جواب ان الفاظ میں دیا ہے کہ "ماخلقت الانس والجن الا لیعبدون" یعنی، ہم نے انسان و جنات کو صرف اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ عبادت کریں۔ اس لئے اگر آج عبادت کی کیفیت وہیئت متعین ہوجائے تو ایک مسلمان کے پاس اس سوال کا جواب دینا مشکل نہیں —— عام طور پر عبادت کا مفہوم نہ صرف اسلام بلکہ تمام دیگر مذاہب میں وہی ہے جسے پوجا یا پرستش سے ظاہر کیا جاتا ہے، لیکن چونکہ دنیا میں کوئی فعل ارادہ ونتیجہ سے بے نیاز نہیں ہوسکتا، اس لئے ہر شخص کا (خواہ وہ کسی مذہب سے متعلق ہو) فطری حق ہے کہ وہ ان دونوں باتوں پر غور کرے۔ یعنی ایک یہ کہ وہ کس ارادہ ونیت سے خدا کی پوجا کرتا ہے اور دوسرے یہ کہ جو غرض وغایت اس نے

سمجھ رکھی ہے وہ عبادت سے کس حد تک پوری ہوتی ہے ——— مذہبی اقوام میں بلا استثنا، کوئی قوم ایسی نہیں ہے جو اس ارادہ و نیت سے عبادت نہ کرتی ہو کہ اس سے خدا خوش ہوگا اور وہ ہماری مشکلات کو دُور کرے گا، پھر اگر واقعی کبھی کسی کے مصائب دور ہو جاتے ہیں تو وہ اسکو اسی عبادت کا نتیجہ خیال کرتا ہے اور اگر ایسا نہیں ہوتا تو وہ اپنے آپ پر الزام قائم کرتا ہے کہ جو حق عبادت کرنے کا تھا وہ ادا نہ ہوا اور خدا کی خوشنودی حاصل نہ ہو سکی ——— اس میں کلام نہیں کہ جس حد تک انسان کے جذبات و تاثرات کا تعلق ہے اس خیال سے اس کو کافی تسکین ہو جاتی ہے اور وہ مایوسی کا مقابلہ آسانی سے کر سکتا ہے، لیکن جب جذبات کی دنیا سے علٰحدہ ہو کر سوال صرف علمی تحقیق کا ہوتا ہے یا کسی ایسے شخص کی تسکین کا ہوتا ہے جو کسی معلول کا وجود بغیر علت کے ماننے کے لئے طیار نہیں، تو لامحالہ غور کرنا پڑتا ہے کہ عبادت سے خدا کا خوش ہونا کیا معنی رکھ سکتا ہے۔ اور خدا کی خوشی یا رضامندی کا ہمارے دُنیاوی حالات و اسباب سے کیا تعلق ہے ——— اس سلسلہ میں سب سے پہلے "حقیقتِ خدا" کا مسئلہ آتا ہے یعنی یہ کہ جب تک ہم کو پہلے یہ نہ معلوم ہو جائے کہ خدا کیا ہے، اسکے وجود کی حقیقت کیا ہے، اس وقت تک نہ ہم عبادت کی کوئی علمی توجیہ کر سکتے ہیں اور نہ اس سے کسی نتیجہ کے پیدا ہونے پر حکم لگا سکتے ہیں ——— خدا کے متعلق انسان کا اولین تصور بالکل وہی ہے جو دنیا کے کسی مستبد بادشاہ و حکمران کے متعلق ہو سکتا ہے یعنی خوشامد و تملق سے خوش ہونا، تحائف و نذرانہ قبول کرکے نظر التفات صرف کرنا، اور سرتابی و نافرمانی سے غضب آلود ہو کر سزائیں دینا، اس میں شک نہیں کہ رفتہ رفتہ نفس خدا کی ماہیت و حقیقت پر بعض مذاہب کے خیالات زیادہ بلند و لطیف ہو گئے ہیں، لیکن جس حد تک پرستش کا تعلق ہے، خدا کی ہستی اب بھی وہی خوش یا ناخوش ہو جانے والی بتائی جاتی ہے اور اپنے بندوں کو سزا یا انعام دینے سے بدستور وہی دلچسپی اس کو باقی ہے

ایک طرف تو یہ بتایا جاتا ہے کہ خدا زمان و مکان سے علٰحدہ، احساس و تاثیر سے بیگانہ، اور بے نیاز مطلق ہے، اور دوسری طرف یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ برہمی و خوشنودی کا محل ہے۔ اور انعام و انتقام کا جذبہ اسکے اندر پایا جاتا ہے۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ ایک ہی وقت میں خدا کو دو متضاد صفات کے ساتھ متصف کرنا کیونکر ممکن ہے۔ اور اس کی خوشنودی یا برہمی کیا معنی رکھ سکتی ہے، جبکہ وہ خود نہ کسی چیز سے متاثر ہوتا ہے اور نہ اُسے پوجا یا پرستش کی ضرورت ہے ——— بعض اہل مذاہب کہتے ہیں کہ عبادت سے خدا کو خوش کرنے کا مفہوم صرف یہ ہے کہ خود عبادت کرنیوالا اس سے فائدہ اٹھائے، یعنی خدا کی پرستش کا مقصود خود اپنی اصلاح ہے۔ بالکل درست۔ لیکن یہاں یہ امر غور طلب ہے کہ عبادت سے جو اپنی اصلاح وابستہ ہے وہ ہمارے اعمال و افعال سے بھی کوئی تعلق رکھتی ہے یا نہیں، یعنی محض ہمارا عبادت کر لینا کافی ہے یا اسی کے ساتھ اپنی زندگی میں بھی تبدیلی پیدا کرنے کی ضرورت ہوتی ہے؟

ظاہر ہے کہ محض عبادت خواہ وہ کسی صورت میں ہو بیکار ہے اگر وہ ہمارے اخلاق و اعمال پر اثر انداز نہیں ہوتی اس لئے نتیجہ یہ نکلا کہ عبادت کا مدعا اپنے اندر تبدیلی پیدا کرنا ہے اور اسی کو خدا کی خوشنودی سے تعبیر کیا گیا تاکہ لوگوں کو اس طرف توجہ ہو اور وہ اسے ترک نہ کر بیٹھیں ——— بظاہر یہ بیان بہت قرین عقل و صواب معلوم ہوتا ہے لیکن اگر غور کیجئے تو معلوم ہوگا۔ کہ انسان کی گمراہی و شقاوت کا بڑا سبب یہی ہے ——— چونکہ اہل مذاہب نے ہمیشہ یہی لوگوں کو سمجھایا کہ خدا

عبادت سے خوش ہوتا ہے اور خدا کی خوشنودی ہی حاصل کرنا عین مدعا ہے، اس لئے یہ بات کبھی اُن کے ذہن میں نہ آئی کہ عبادت کا تعلق خود اپنی اصلاح اعمال سے ہے اور اگر ہم اپنی زندگی میں کوئی تغیر نہ پیدا کریں تو عبادت بیکار ہے ـــــ اس کا نتیجہ ایک طرف تو یہ ہوا کہ عبادت نام قرار دیا گیا صرف چند مخصوص حرکات و مراسم کا۔ اور دوسری طرف لوگوں کے اخلاق پر یہ خراب اثر پڑا کہ خدا کو عبادت سے خوش رکھنے کے اعتماد پر وہ دنیاوی معاملات میں ہر قسم کی بے عنوانی پر آمادہ ہو گئے اور اخوت و ہمدردی کا جذبہ جو نظام تمدن کی جان ہے ان کے اندر ضعیف ہونے لگا

اگر ابتدا ہی سے اس امر پر زور دیا جاتا کہ خدا تمھاری عبادت سے خوش نہیں ہوتا بلکہ تمھاری اصلاح و ترقی سے خوش ہوتا ہے اور عبادت کا مدعا بھی یہی ہے تو شاید دنیا کی حالت آج دوسری ہوتی ـــــ ہر چند بعض مذاہب نے عبادت کی ماہیت و غایت بیان کرتے ہوئے اس حقیقت کا اعلان بار بار کیا ہے، لیکن چونکہ عبادت پرستش میں حیات بعد الموت کی راحت کا خیال بھی شامل کر دیا گیا ہے اس لئے اس دنیاوی زندگی میں اس کا نتیجہ خاطر خواہ برآمد نہیں ہوتا اور عام طور پر لوگ یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ اصل زندگی تو مرنے کے بعد ہی شروع ہوگی اور چونکہ اسکے متعلق عبادت کے بعد اطمینان ہو ہی گیا ہے اس لئے اس دو روزہ زندگی کی اصلاح میں کیا سر کھپایا جائے ـــــ میری رائے میں مذاہب کی سب سے زیادہ خطرناک تعلیم یہی ہے کہ دنیا فانی ہے، انسان فانی ہے اور بقا اس زندگی کو حاصل ہے جو مرنے کے بعد شروع ہوگی اور اسی کو سنوارنے کی ضرورت ہے۔ گویا انسانوں کا یہ اجتماع سرائے کے مسافروں کا اجتماع ہے جسے صبح یا شام منتشر ہو جانا ہے، پھر ظاہر ہے کہ جب تعلیم یہ ہوگی تو باہم کر کیا ہمدردی پیدا ہو سکتی ہے اور دنیاوی زندگی کی ترقی و اصلاح کے لئے کون سا جذبہ کام کر سکتا ہے ـــــ مسلمانوں میں نماز کا طریق عبادت اس میں شک نہیں کہ بڑی حد تک اجتماعی کیفیت لئے ہوئے ہے، لیکن چونکہ وہاں بھی وہی آخرت و معاد کا خیال ساتھ ساتھ ہوتا ہے، اس لئے اگر مسلمان یکجا جمع ہوتے ہیں تو صرف انفرادی طور پر اپنی اپنی عاقبت سنوارنے کے لئے اور اجتماعی زندگی کی اصلاح و ترقی کا کوئی سوال ان کے سامنے نہیں ہوتا ـــــ چنانچہ آپ کسی بڑی سی بڑی مسجد کا اجتماع جا کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ بہت سے جانور کسی احاطہ کے اندر جمع کر دیے گئے ہیں۔ اور ایک ہی صف میں پاس پاس بیٹھنے والوں کو بھی ایک دوسرے کے درد دُکھ کی خبر نہیں ہے ـــــ اگر مسجدوں کا یہ اجتماع، بجائے روزانہ پانچ مرتبہ کے ہفتہ میں صرف ایک ہی بار ہو اور سجدہ و رکوع کی جگہ وہ آپس میں بیٹھ کر تبادلۂ خیال کریں، اور اپنے اپنے محلہ کے بچوں کی تعلیم، بیواؤں کی پرورش، ضعیفوں اور بیماروں کی نگرانی مفلسوں اور ناداروں کی امداد، جماعتی تنظیم، اقتصادی مشکلات، اور سیاسی مسایل پر گفتگو کر کے لائحۂ عمل بھی طیار کرتے رہیں تو کتنا عظیم فائدہ مترتب ہو سکتا ہے ـــــ ایک وقت تھا کہ مسلمانوں کی مسجدیں ان کے دار الاجتماع تھے، جہاں قوم کے تمام معاملات پر گفتگو ہوتی تھی، لیکن آج مولوی کہتا ہے کہ مسجد میں بیٹھ کر کوئی بات دنیا کی نہ کرو۔ یعنی صرف اُس دنیا کی بات کرو جس کا علم تمھیں تو نہیں ہے لیکن اُس مولوی کو ضرور ہے جو خدا کے "خلوتیان راز" میں سے ہے اور جس کے ہاتھ میں ہے خواہ تم کو جہنم میں ڈال دے یا فردوس بریں میں بھیج دے ـــــ علماء ظواہر کے مفہوم عبادت نے جو مذموم صورت اختیار کی اس کا حال

تو آپ کو اس بیان سے واضح ہو گیا ہو گا، اب رہ گئے اہل باطن جو بجائے شریعت کے طریقت پر کاربند ہیں، سو اس میں شک نہیں کہ جس حد تک خدا کے تصور کا تعلق تھا وہ زیادہ کامیاب ثابت ہوئے اور انھوں نے عقیدہ "ہمہ اوست" سے "خدا" کی تعبیر بڑی حد تک قابل قبول صورت میں پیش کی، لیکن عبادت کے مسئلہ کو وہ بھی نہ حل کر سکے اور چونکہ معاد و آخرت کی زندگی اُن کے یہاں بھی اصل چیز تھی اس لئے باوجود گانے بجانے کا شوق رکھنے کے بھی وہ عبادت کے مسئلہ میں علماء ظواہر کی پابندیوں سے علیحدہ نہ ہو سکے اور شریعت کے مقابلہ میں انکی طریقت اپنا کوئی مستقل ادارہ جداگانہ قائم نہ کر سکی ——— الغرض مسلمانوں کی طرف سے اس سوال کا یہ جواب دینا کہ خدا نے انس و جن کو اس لئے پیدا کیا کہ وہ اس کی عبادت کریں، عام متبادر معنی کے لحاظ سے نوع انسانی کے لئے مفید ثابت نہیں ہوا ——— دنیا میں ترقی یافتہ مذاہب دو طرح کے ہیں، ایک وہ جنھوں نے زندگی یا مذہب کا کوئی فلسفہ پیش کیا اور دوسرے وہ جنھوں نے صرف عملی زندگی کو سامنے رکھ کر چند اصول سوسائٹی کے مرتب کرنے پر اکتفا کی ہر چند اول الذکر مذاہب کی تعلیم کا بھی حقیقی مقصود وہی سوسائٹی کی اصلاح تھا لیکن جس طرح براہ راست عملی زندگی کا درس دینے والے مذاہب حیات بعد الموت کے قایل ہو کر مراسم و شعائر میں الجھ کر رہ گئے، اسی طرح فلسفہ پیش کرنے والے مذاہب بھی نفسیاتی گتھیوں کے سلجھانے میں محو ہو کر ایسے دُور از کار قیاسات میں مبتلا ہو گئے کہ سوسائٹی کا مفاد نظر انداز ہو گیا اور ان کی فلسفیانہ عقل آرائیاں، مادی حقیقتوں سے فائدہ اٹھانے کا کوئی لائحہ عمل بنی نوع انسان کے سامنے پیش نہ کر سکیں ——— اگر تھوڑی دیر کے لئے مان لیا جائے کہ مذہب کا تعلق کسی قومی عروج و ارتقا سے نہیں ہے جس کیلئے تیغ و تفنگ کا جارحانہ یہ مدافعانہ استعمال ضروری ہے، بلکہ صرف فلسفۂ حیات پر غور کرنے اور خاموشی سے رموزِ زندگی حل کرنے سے ہے، تو بتائیے کہ ہندوؤں کے فلسفۂ "ویدانت"، "نروان"، "اہمسا" اور "مکتی" نے دنیا کو کیا فائدہ پہونچایا - یعنی اگر تلوار ہاتھ میں لیکر دنیاوی جاہ و حشم کو اپنے لئے مخصوص کر لینے سے دنیا کو نقصان پہونچا تو بودھ کی طرح کاسۂ گدائی لیکر در در کی بھیک مانگنے سے نوع انسانی کو کیا نجات حاصل ہوئی ——— اگر کسی قوم نے اُسے تلوار سے مجروح کیا تو دوسری نے اُسے اپاہج بنایا، اگر ایک نے نفس پرستی و خود غرضی کو رواج دیا تو دوسری نے نفس مدعا و غرض مشترک کو محو کر کے انسانی عزائم کو سرد کر دینے میں کوئی دقیقہ کوشش کا نہ اٹھا رکھا ——— الغرض نوع انسانی کو نہ ان مذاہب سے کوئی فائدہ پہونچا جو یکسر عمل ہونے کے مدعی ہیں اور نہ اُن مذاہب سے جو صرف فلسفہ پیش کرنا منتہائے نظر سمجھتے ہیں ——— غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا بڑا سبب مسئلۂ "روحانیت" یا "مابعد الطبیعت" ہے جس نے انسان کی دنیاوی زندگی کو بالکل پس پشت ڈالدیا اور حقیقی زندگی کو اس عالم سے متعلق ہی نہ رکھا - اگر یہاں کی زندگی کو اہمیت دی جاتی تو اس کی اصلاح کی طرف توجہ بھی کی جاتی لیکن چونکہ بلا استثنا، تمام مذاہب نے مادی حیات کی تخفیف کی اور اسکو ناقابل اعتنا سمجھا، اس لئے اصولاً کوئی مذہب دنیاوی لحاظ سے کامیاب نہ ہوا اور انسان کے نفسیاتی میلان نے جو ہنگامہ یہاں برپا کر رکھا ہے اس کا کوئی علاج کسی کی سمجھ میں نہ آیا

یہی تلخ تجربہ تھا جس نے دنیا میں مادہ پرست جماعت پیدا کر دی اور دُنیا کو دنیا کے اصول سے سمجھنے اور کاربند ہونے پر مجبور کر دیا ——— پھر ہر چند ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ مادئین نے جو کچھ سمجھا وہ بالکل درست ہے یا اُن کے مقرر کئے ہوئے اصول

دنیا کے امن و نجات کے ضامن ہو سکتے ہیں، لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ ان کا مقصود بالکل برمحل ہے اور قضیۂ زمین بر سرِ زمین کے اصول پر کاربند ہونے سے وہ انسانی دماغ کی بہت سی تشویشوں کو دور کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں اُن کے سامنے نہ ایسے خدا کا سوال ہے جس نے قادرِ مطلق اور فعال لمایرید ہونے کی حیثیت سے انسان کو دنیا میں عضوِ بیکار بنا رکھا ہے اور نہ وہ اپنا وقت اس مسئلہ پر غور کرنے میں ضائع کرتے ہیں کہ دنیا کیوں پیدا کی گئی ——— وہ صرف یہ دیکھتے ہیں کہ دنیا پیدا ہو چکی ہے، اور اسی میں ہم کو زندگی بسر کرنا ہے، اس کے بعد کچھ نہیں ہے اس لئے ہمکو ہر ممکن کوشش کے ساتھ اس سے فائدہ اٹھانا چاہئے۔ اور ترقی کی جتنی راہیں ہیں ان پر چل کر دنیا کو اپنے لئے جنت بنا لینا چاہئے

اس میں بشک نہیں کہ یہ مادی تحریک اخلاق کی ضامن نہیں ہے، اور اس سے خود غرضی کا جذبہ قوی ہو کر ایک قوم کا دوسری قوم کو ہلاک کر دینا مستبعد نہیں، لیکن اگر صرف اسی دلیل پر اس تحریک کو رد کر دیا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ مذہب کی حمایت کی جائے، جبکہ اس نے بھی یہی کیا اور اس کے ہاتھ بھی ہمیشہ خون سے رنگین نظر آئے۔ فرق اگر ہے تو صرف یہ کہ ایک نے خدا کا نام لیکر تلوار اٹھائی اور دوسرا خدا کو بدنام نہیں کرتا اور اپنی ہی اغراض کو اس کا ذمہ دار قرار دیتا ہے

علاوہ اس کے ایک مسئلہ اور اس جگہ قابلِ غور ہے، وہ یہ کہ مادئین کا مذہب ہنوز ارتقار کی حالت میں ہے اور بالکل ممکن ہے کہ آیندہ کوئی صورت ایسی پیش آئے کہ انسان خونریزی سے باز رہنے پر مجبور ہو جائے ——— بحالتِ موجودہ نظامِ تمدن نے جو ہمیشہ مادی ترقی پر قایم ہے، وسیع ہو کر ایسی عجیب و غریب صورت اختیار کر لی ہے کہ آہستہ آہستہ تمام قومیں، تمام جماعتیں بلکہ جملہ افراد ایک دوسرے سے وابستہ ہوتے جاتے ہیں، یعنی اغراض کی تکمیل روز بروز باہمی تعاون پر منحصر ہوتی جا رہی ہے، پھر کیا یہ امر خلافِ عقل ہے کہ ایک وقت ایسا آئے جب باہمی تصادم کی تمام صورتیں مسدود ہو جائیں اور تمام نوعِ انسانی ایک نظام سے وابستہ ہو کر ایک قوم، ایک جماعت، ایک ہیئت اور ایک تشکیل میں بدل جائیں یہانتک باہمی جنگ و خونریزی کا امکان ہی باقی نہ رہے ——— اس وقت جس چیز نے دنیا میں ہنگامہ برپا کر رکھا ہے وہ سرمایہ داری اور اشتراکیت کی جنگ ہے، یعنی دنیا اب اس کو برداشت نہیں کر سکتی کہ انسان انسان میں تفریق صرف اس بنا پر قایم ہے کہ ایک کے پاس دولت کا انبار ہے اور دوسرا اس سے محروم ہے۔ دولت انسان ہی کی پیدا کی ہوئی ایک مفروضہ قوت ہے جس سے اسوقت تک کام لیا جا سکتا ہے، جب تک سب یکساں طور پر اس سے مستفید ہوتے رہیں، لیکن اگر یہ مساوات مفقود ہو جائے اور دولت انسانیت کو پامال کرنے میں صرف ہونے لگے تو اس کو مٹ جانا چاہئے۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ اس وقت یورپ کا ہر ملک اس جذبہ سے متاثر ہو رہا ہے اور تمام وہ حکومتیں جو سرمایہ دارانہ استبداد و استعمار پر قایم تھیں ایک ایک کر کے اشتراکی اصول پر کاربند ہونے کے لئے مجبور ہو رہی ہیں پھر اگر ساری دنیا میں اشتراکیت پھیل جائے اور دولتمندی و افلاس کا مفہوم ہی بالکل بدل جائے تو کیا آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس وقت بھی ایک انسان ...... دوسرے انسان سے اور ایک جماعت دوسری جماعت سے برسرِ پیکار ہو گی؟ ہرگز نہیں۔ کیونکہ سارا اختلاف تو اسی وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ

فلاں سرمایہ دار ہے اور فلاں تہی دست لیکن اگر یہ اختلاف مٹ کر تمام انسان ایک سطح پر آجائیں تو مخالفت کی کوئی وجہ باقی نہیں رہتی اور دنیا اس امن وسکون کو حاصل کر سکتی ہے جسے مذاہب عالم اس وقت تک حاصل نہیں کر سکے

اس لئے بہ حالات موجودہ ہمارا یہ سوچنا کہ خدا نے کائنات کو کیوں پیدا کیا، حد درجہ تضیع اوقات ہے، سوچنے کی بات صرف یہ ہے کہ جب ہم اس دنیا میں آگئے ہیں تو ہم کو زندگی کیونکر بسر کرنا چاہیئے اور اپنا وقت کس طرح صرف کرنا چاہیئے

خدا کی حقیقت کیا ہے، دنیا سے اس کا کیا تعلق ہے، اس تعلق کی بناء پر ہم کیا کر سکتے ہیں۔ اور کیا نہیں، یہ سب ایسے دُوراز کار سوالات ہیں کہ نہ اس وقت تک ان کا کوئی شافی جواب دیا جا چکا ہے اور نہ آیندہ ممکن ہے ــــــ انسان واقعات وحوادث کا بندہ ہے، اسباب وعلل کی دنیا میں زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے، اس لئے اُسے انھیں باتوں پر غور کرنا چاہیئے جن سے اُس کی زندگی متعلق ہے ــــــ اگر خدا دنیا میں آکر ہمارے کاموں میں ہمارا ہاتھ نہیں بٹاتا تو ہم کو کیا حق حاصل ہے کہ اس کے متعلق گفتگو کر کے اپنا وقت ضائع کرتے رہیں، اگر اُس نے "کُن" کہہ کر دفعۃً عالم کو پیدا کر دیا تو کیا، اور تدریجی ارتقاء کے ساتھ عالم کو سنوارا تو کیا ــــــ انسان کے درد دُکھ کا علاج ان میں سے کسی اعتقاد سے متعلق نہیں ــــــ پھانس اگر چبھی ہے تو اس کی تکلیف اس کے نکالنے ہی سے دُور ہو سکتی ہے نہ کہ اس بات پر غور کرنے سے کہ پھانس کی حقیقت کیا ہے اور وہ کیونکر گوشت کے اندر پہونچ گئی

ــــــ گھر میں جس وقت آگ لگتی ہے تو اس کا سبب دریافت کرنے سے پہلے اس کے بجھانے کی فکر ہوتی ہے

اس لئے وہ لوگ جو حقیقی معنی میں نوع انسانی کے خیر خواہ ہیں، ان کو نہ خدا کی حقیقت پر غور کرنے کی ضرورت ہے اور نہ یہ سوچنے کی کہ اس نے دنیا کو کیوں پیدا کیا، بلکہ صرف ان تدابیر پر غور کرنے کی کہ تمام انسان باہم مل کر صلح وآشتی کی زندگی کیونکر بسر کر سکتے ہیں

مذاہب عالم تو اس تجربہ میں ناکام رہے، اس لئے لامحالہ ہمیں اُن سے ہٹ کر کوئی دوسری راہ اختیار کرنا پڑے گی، خواہ وہ اشتراکیت ہو یا کچھ اور ــــــ پھر اب دیکھنے کی بات صرف یہ ہے کہ زمانہ کا رُخ کیا ہے، سیلاب کا بہاؤ کس طرف ہے۔ اگر ہم نے اس کا ساتھ دیا تو بیشک ہم کو نجات حاصل ہو سکتی ہے۔ ورنہ خس و خاشاک کی طرح بہ جانا یقینی ہے اور مذاہب کا تنکا ہماری کوئی مدد نہیں کر سکتا ــــــ

نگار کی خریداری جاری رکھئے

تاکہ جنوری ۳۵ء کا نگار جو دنیائے صحافت میں بالکل پہلی چیز ہوگا آپ کو مفت حاصل ہو سکے ــــــ جنوری ۳۵ء کا نگار کیسا ہوگا اس کے لئے اس ماہ کے رسالہ کا صفحہ ۹، ۷، ۸۰ ملاحظہ فرمائیے

منیجر نگار لکھنؤ

فلسفہ کی تعلیم اور اس کی اہمیت

فلسفہ ؟ وہی تجریدات کا گورکھ دھندہ ؟ وہی لم و لانسلّم کا دعویٰ ؟ وہی اثیری تخیلات جو منت کش معنی نہیں ؟ الجھن شاید سب ہی کو پیدا ہوتی ہے کہ آخر فلسفہ صرف بحث و مباحثہ ہی کا نام ہے جہاں بحث صرف بحث ہی کی خاطر کیجاتی ہے یا اس بحث کا کوئی موضوع بھی ہوتا ہے جو واضح، صریح، متعین ہو ؟ سب جانتے ہیں کہ علم ہیئت میں اجرام سماوی سے بحث کی جاتی ہے تو ارضیات میں زمین اور چٹانوں سے، نفسیات کا موضوع ذہن یا نفس ہے جہاں احساس ارادہ اور عقل کی ماہیت پر غور کیا جاتا ہے، خود البتناس کے حکیمانہ ہدایت پر عمل کرتے ہوئے ہم پوچھتے ہیں کہ جذبات کا زور مرد افگن کیوں ہوتا ہے، عقل ان کے شر و شور پر کہاں تک غالب ہو سکتی ہے، شعور کے کیا معنی ہیں، تسلسل ذات سے کیا مراد وغیرہ وغیرہ - بہر حال یہ تمام علوم واقعات کے ایک متعین دائرہ سے بحث کرتے ہیں، یہ واقعات نہایت اہم و دلچسپ ہیں، علمی و عملی لحاظ سے ان کا فائدہ مسلّم ہے - لیکن فلسفہ میں کس چیز سے بحث ہوتی ہے، اس کا مبحوث عنہ کیا ہے ؟ استدلالیوں کی یہ چناں و چنیں، یہ لم و نسلّم آخر کس چیز کے متعلق ہے ؟ کیا ہم نے نہیں سنا کہ

پائے استدلالیاں چوبیں بود
پائے چوبیں سخت بے تمکیں بود؟

سوال بالکل جائز ہے اور ہمیں ابتدا ہی میں اس کے جواب کی کوشش کرنا ضروری ہے - آپ سچ بتلائیے کہ آپ میں سے کوئی ایسا بھی ہے جو زمین اور چٹانوں، اجرام سماوی اور اعمال ذہنی اور دوسرے مخصوص و متعین حالات کے مطالعہ سے کبھی نہ کبھی بیزار یا پریشان نہ ہو گیا ہو اور یہ کہتے ہوئے کہ ع صد کتاب و صد ورق در نار کن - یہ نہ پوچھا ہو کہ آخر یہ سب کچھ کاہے کے لئے ؟

اس جھگڑے کا انجام ؟ اس کی قدر و قیمت ؟ اس کے معنی و مقصود ؟ پس فائدہ در جہاں بفائدہ چیست ؟

جب آپ اس محدود دنیا کے مخصوص و متعین واقعات سے پریشان ہو کر خود دنیا کے معنی و مقصود، اس کی قدر و قیمت و اہمیت اور فرد و عالم کے تعلق کے بارے میں سوال کرتے ہیں تو آپ اسی بدعت کے مرتکب ہوتے ہیں جس کے ارتکاب پر آپ فلسفیوں کو "آوارہ و مجنوں رسوا سر بازار" قرار دیتے تھے -

براؤننگ کہا کرتا تھا کہ زندگی کچھ معنی رکھتی ہے اور اسی معنی کا دریافت کرنا میری غذا، میرا اکل و شرب ہے۔ براؤننگ فلسفی تھا۔ فلسفہ کی یہی تعریف ہے کہ یہ " معانی اور قیمتوں کا مطالعہ ہے " " یہ حیات کی توجیہ و تعبیر " ہے

فلسفی حیات من حیث کل کا ثابت قدمی کے ساتھ مطالعہ کرتا ہے، اس کا نقطۂ نگاہ وسیع ہوتا ہے، وہ کسی خاص محدود نقطۂ نظر سے زندگی پر غور نہیں کرتا بلکہ بقول فلاطوں کے " تمام زمان و مکان کا ناظر ہوتا ہے " کسی شئے پر فلسفیانہ طور پر نظر کرنے کے معنی یہ ہیں کہ نگاہ میں وسعت ہو، اس شئے کو دوسری تمام اشیاء کے ساتھ رکھ کر دیکھیں، تناسب کا پورا خیال ہو۔ ہم اس کی توجیہ میں ڈاکٹر جانسن کی زندگی کا ایک واقعہ پیش کریں گے۔ جس کو باسول نے بیان کیا ہے۔ باسول نے ایک روز جانسن اور ان کے چند رفقاء کی اپنے مکان پر دعوت کی۔ دعوت کے ایک روز قبل باسول کے لانڈ لارڈ نے اس کو اپنی انتہائے بدمذاقی سے مکان پر زیادہ آدمیوں کو مدعو کرنے کی اجازت نہیں دی۔ باسول نہایت آزردہ خاطر ہوا اور جانسن کو اس واقعہ سانحہ کی اطلاع دی۔ جانسن نے یہ سن کر خندہ پیشانی کے ساتھ اپنے انداز میں کہا کہ " جناب ذرا سوچئے تو سہی یہ واقعہ کوئی بارہ مہینے بعد کس قدر حقیر معلوم ہوگا! " جانسن فکر و نظر کی رو سے نہ سہی کردار و عمل کے لحاظ سے پکا فلسفی تھا، اس نے فوراً یہ دیکھ لیا کہ انسان کی زندگی میں اس قسم کے بے شمار واقعات پیش آتے ہیں اور گزر جاتے ہیں، ان میں صرف ایک پر تمام توجہ کو مرکوز کرنا ان کے تناسب کو نظر انداز کرنا ہے۔ نگاہ میں تنگی پیدا کرنا ہے۔ فلسفی واقعاتِ عالم کو اپنے اپنے تناسب یا کل ہی کے لحاظ سے دیکھتا ہے، کل میں ہر ایک کو مناسب جگہ دیتا ہے، جانب داری، تعصب، تنگی، اس کی نگاہ میں نہیں پائے جاتے، بالفاظ دیگر وہ زندگی کو " ابدیت کی روشنی " میں دیکھتا ہے

بعض دفعہ فلسفہ کی تعریف اس طرح کی گئی ہے کہ " یہ حکیمانہ طریقوں کی مدد سے اس دنیا کو سمجھنے کی کوشش کا نام ہے جس میں ہم اپنی زندگی بسر کرتے ہیں "

ہماری اس مانوس دنیا کو جس میں، ہماری بود و باش ہوتی ہے علوم مخصوصہ کے تمام نتائج و تعمیمات کی مدد سے پوری طرح سمجھنا طالیس ... کے زمانہ سے جو یونان کا پہلا فلسفی سمجھا جاتا ہے، اب تک فلسفہ کی غایت رہی ہے۔ دنیا بہت مانوس تو نظر آتی ہے لیکن آخر " دنیا " سے مراد کیا ہے؟ یونان کے اہلِ نظر دنیا یا کائنات کو ہم معنی سمجھتے تھے۔ اور ہر زمانہ کے فلسفیوں نے نہایت ہمت و جرأت کے ساتھ اس عظیم الشان کائنات کی کنہ یا ماہیت کے پتہ لگانے کا کام اپنے سر لیا۔ کسی فلسفی شاعر ہی نے تو یہ کہا تھا کہ ارض و سما کہاں تیری وسعت کو پاسکے، میرا ہی دل ہے جہاں تو سما سکے، تو پھر کائنات کی وسعت و مرور یعنی مکان و زماں کی نوعیت کیا ہے، اس نامتناہی زمان و مکاں والی کائنات کے خالق کا نشان کہاں، اس کا مقصد و غائت کیا، اس کا مآیہ خمیر کیا، اس کا حضرت انسان، اس کی روح اور اس کے منتہا سے تعلق کیا ہے، یہ وہ انتہائی و ابدی سوالات ہیں جن کے جواب کی تلاش میں دیمقراطیس اور فلاطون اور ارسطو سینٹ اگسٹس، برونو، ڈیکارٹ، سپنوزا، کانٹ، ہیگل اور ہربرٹ اسپنسر اور دیگر اکابر فلاسفہ نے اپنی جانیں دیں اور یہی عظیم الشان سوالات اب تک قابل غور ہیں اور وارفتگان

عقل کے لئے ہمیشہ رہیں گے

موجودہ زمانہ میں ہمارا نقطۂ نظر زیادہ تر انفرادی و انسی واقع ہوا ہے، ہم دنیا پر طبعی نگاہ سے غور نہیں کرتے بلکہ معاشری، سیاسی، ادبی، اخلاقی اور مذہبی نگاہ سے اس کی تحقیق و تدقیق کرتے ہیں - قدما یونان کو ثبات و تغیر عالم کا مسئلہ پریشان کیا کرتا تھا، لیکن تغیر سے ان کی مُراد مادی تغیر تھی یعنی مادی ذرات یا اجزا کی حرکت یا نشو و نما، زوال و فنا کے مظاہر، چنانچہ پارمینڈیز کا خیال تھا کہ قدرت کے کارخانہ میں تغیر محال ہے، حواس کو بظاہر جو تغیر دکھائی دیتا ہے وہ محض فریب و التباس ہے، لیکن ہرقلیتوس کا یقین تھا کہ ثبات و سکونت، کائنات کی کسی شے میں نہیں، دنیا سرتاپا تغیر، تجدد، تنوع ہے - یہ اور اس قسم کے مسائل اس میں کوئی شک نہیں کہ اب تک لاجواب ہیں لیکن ہماری دلچسپی دنیا کے کسی اور طرح کے تغیر سے وابستہ ہو گئی ہے، ہم معاشری رسوم، سیاسی علایق، اخلاق و ادب، مذہب اور ادبی معیارات کے تغیرات سے زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں - لیکن اس قسم کی تغیر پذیر دنیا بھی توجیہ کی اسی قدر محتاج ہے جیسی کہ اجزائے مادی کو تغیرات والی دنیا، لہٰذا فلسفہ کی ضرورت یقینی، فرق صرف اتنا ہے کہ اب فلسفۂ حیات اس کی قدر و قیمت، اس کی بدایت و نہایت و غرض و غایت کی توجیہ کرتا ہے اس لئے ارتقا، ترقی، ذہن کے طریقے، کردار و معاشرت کے مسائل زیادہ نمایاں اور پیش پیش ہو گئے ہیں - لیکن یہ ہمیشہ کے لئے صحیح ہے کہ فلسفہ اس دنیا کو سمجھنے کا نام ہے جس میں ہم اپنی زندگی بسر کرتے ہیں

شاید حاضرین میں سے بہت کم ایسے ہوں گے جن کے ذہن نے کبھی نہ کبھی اس قسم کے سوالات کو نہ اٹھایا ہوگا: کیا خدا کا وجود ممکن ہے یا سوائے مادہ اور (Energy) کے کوئی شے نہیں؟ مادہ کا مایۂ خمیر کیا ہے؟ کیا درد سے زیادہ کوئی چیز حقیقی ہو سکتی ہے؟ اگر جلوہ فرمائی صرف مادہ کی ہے، تو درد کیا چیز ہے، کیا یہ ذہن میں نہیں پایا جاتا تو کیا ذہن مادہ سے جدا نہیں؟ میرا غور و فکر کرنا، درد و الم سہنا کیا صرف مادی جسم ہی سے تعلق رکھتا ہے، مادی جسم ہی کا وظیفہ ہے یا اس سے جدا شے ہے؟ میں زندہ ہوں - حیات کیا ہے؟ یہ مے کیا ہے جو بقول اقبال "تلخ تر او نکو ترست"؟ ایک روز مجھے موت آئے گی، موت کیا ہے؟ کیا یہ انسانی شخصیت کا خاتمہ ہے؟ ابو العتاہیہ نے حیرت کے عالم میں کیا خوب پوچھا تھا ؎

الموت باب و کل الناس یدخلہ[1]

یالیت شعری بعد الباب ما الدار

ہم آزاد نظر آتے ہیں، کیا یہ صحیح ہے؟ میر کا خیال تھا کہ ناحق ہم مجبوروں پر تہمت ہے مختاری کی اما فظ کا خیال تھا کہ

درپسِ آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند!

واقعہ کیا ہے؟ مجھ سے آپ سے ہر طرح کے افعال سرزد ہوتے ہیں، بعض ان میں کے صائب ہیں اور بعض خطا پذیر، صواب

---

[1] موت ایک دروازہ ہے جس میں ہر شخص داخل ہوتا ہے، اے کاش یہ مجھے معلوم ہوتا کہ اس دروازے کے بعد مکان کونسا ہے'

خطا کے کیا معنی ؟ ان کے معیار کیا ؟ ہم میں سے بعض تلاش زر میں سرگرداں ہیں ، بعض شہرت کے خواہاں ، اور بعض لذت کے دلدادہ اور "خوش باش دمے کہ زندگانی این ست" کے پیرو ۔ کیا یہ درحقیقت اعلیٰ قیمتیں ہیں ؟ یا ان سے اعلیٰ و ارفع نصب العین موجود ہیں ؟ مثلاً رواقیہ نے " طمانیت نفس " کو خیر برتر قرار دیا تھا ، .... دنیا کی کوئی مصیبت ، دنیا کی کوئی خوشی ' اطمینان خاطر ' کو صدمہ نہیں پہونچا سکتی ، چنانچہ بی تھی اس (Betheius) نے روما کے جیل خانہ میں " فلسفہ کے تسلی بخش لذات " پر ایک طویل مقالہ لکھا تھا ۔ کیا اسی طرح محبت ، فرض ، تلاش حکمت ، فنون لطیفہ کا ذوق وغیرہ اعلیٰ قیمتیں قرار نہیں دی جاسکتیں ؟ ہم یہ تمام سوالات اٹھا سکتے ہیں ، کیا ان کا جواب دینا ممکن ہے ؟ علم انسانی کے حدود کیا ہیں ؟ اس کی اڑان کتنی ؟ علاوہ ازیں فطرت و صنعت میں خوبصورت اشیاء میرا محاصرہ کئے ہوئے ہیں ، اکثر بدصورت بھی ہیں ، حسن کیا ہے ؟ ایک خوبصورت عمارت میں ، ایک حسین چہرہ میں ، موسیقی کے ترنم میں وہ کیا چیز ہے جس سے ہم کیف اندوز ہو رہے ہیں ؟ اگر آنکھیں نہ ہوتیں ، .... ذہن نہ ہوتا تو کیا پھر بھی فطرت پوشاک حسن میں ملبوس ہوتی ؟ یہ سب فلسفیانہ سوالات ہیں ، ان کا پیش کرنا انسان کی فطرت کا تقاضا ہے ، ان پر غور و فکر کرنا ، حکیمانہ طور پر ، تدقیق و تحقیق کے ساتھ ان کا مطالعہ کرنا ، ان کے جواب فراہم کرنے کی سعی کرنا —— گو یہ سعی لاحاصل سہی —— فلسفہ ہے ، یا جیسے فلسفہ کے ایک شیدائی ولیم جیمس نے کہا ہے ، " فلسفہ واضح طور پر فکر کرنے کی ایک غیر معمولی و مستقل کوشش کا نام ہے " یہ کام اللہ کا نہیں حیوان مطلق کا نہیں انسان کا ہے ، ہر انسان کا خواہ وہ حیوانیات کا پروفیسر ہو یا تاریخ کا !

ان سوالات کا مبدء تجسس و استعجاب ہے ، انسان کی حیوان سے وجہ امتیاز یہی تجسس کا جذبہ ہے اور اسی کو افلاطون نے فلسفہ کا مبدء قرار دیا ہے ، افلاطون کے ہم وطنوں نے اپنی زندگی فلسفہ کے لئے وقف کردی تھی ، لیکن ہمارے مقابلہ میں ان کا کائنات کے متعلق نقطۂ نظر سادہ اور طفلانہ تھا ، تاہم ان کی طبیعت میں تعجب زیادہ تھا ، وہ دنیا کی ہر شے ہر منظر پر استعجابانہ نظر ڈالتے تھے اور بہت جلد ان کے اس استعجاب و تحیر نے ان کو فلسفہ کی راہ پر لگایا ، اس زاویہ نگاہ سے ، ہم فلسفہ کی اس طرح تعریف کرسکتے ہیں کہ " یہ وہ استعجاب ہے جو سنجیدہ و متین فکر کی صورت اختیار کرلیتا ہے "

ایک چھوٹی لڑکی دریچہ سے منہ نکال کر غور و خوض کے ساتھ راہروؤں کے وارفتہ حرکات دیکھ رہی تھی ، ایکدم وہ پلٹی اور اپنی ماں کے منہ سے منہ ملا کر پوچھنے لگی " اماں میری یہ سمجھ میں نہیں آتا ، تم ہی بتلاؤ کہ یہ دنیا کہاں سے آئی ؟ " اس معصوم جان کا اس طرح فکر کرنا فلسفہ ہے ! ہم میں سے بہت سارے ، بچے اور بڑے ، دنیا کے متعلق کچھ استفسار نہیں کرتے ، جیسی بھی ہو قبول کرلیتے ہیں ، لیکن بعض غور و فکر کرنے والے ہوتے ہیں ، انھیں دنیا ایک کہنہ کتاب سی معلوم ہوتی ہے جس کا آغاز و انجام نامعلوم ، ع اول و آخر ایں کہنہ کتاب افتاد است وہ اس کی

ہدایت و نہایت کا حال معلوم کرنا چاہتے ہیں اور خود اپنے متعلق پوچھتے ہیں کہ ؎

عیاں نہ شد کہ چرا آمدم وکجا بودم
دریغ و درد کہ غافل زکار خویشتنم!

فلسفہ کا لفظ یونانی الفاظ سوفیا اور فیلوس سے مشتق ہے جن کے معنی "محبتِ حکمت" کے ہیں۔ سقراط انکسار کے ساتھ اپنے آپ کو "فلسفی" کہتا تھا یعنی "طالب حکمت" جو انسان کی غرض وغایت وجود اور اس کے فرایض کی تلاش میں جان تک کو عزیز نہ رکھتا تھا۔ ارسطو کے نزدیک انسانی عقل حکمتِ الٰہی کا ایک جزو ہے، خدا کا علم کلی ہے؛ ہماری عقل کا یہ پیدائشی حق ہے کہ یہ بھی کلی علم کی تلاش کرے، لیکن فلاطون و ارسطو دونوں اپنے آپ کو "طالب حکمت" کہتے تھے، اور فلسفہ کے اس لفظی معنی کے لحاظ سے ہر عاشق حکمت فلسفی کہلایا جاسکتا ہے

شعر اور فلسفہ

شعر اور فلسفہ کے مقابلہ سے فلسفہ کے نئے معانی پر روشنی پڑ سکتی ہے۔ اکابر شعرا میں سے بعض زندگی کو محض بیان کرنے پر قانع نظر آتے ہیں لیکن بعض اس کی توجیہ و تعبیر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کی ہدایت و نہایت، غرض و غایت نوعیت و ماہیت کی تشریح کرتے ہیں، یہی فلسفی شعرا ہیں۔ روما کا مشہور شاعر لکری شیس فلسفی تھا، اپیکیورس نے فلسفہ کو اپنے شعر میں ادا کیا، اللہ کا انکار، حیات بعد الموت کا انکار، طمانیت خاطر اور مسرت "ماہیت فطرت" والی شہرۂ آفاق نظم کے ہر شعر سے ظاہر ہے۔ خیام فلسفی شاعر ہے، اسرار ازل، ماہیت کائنات، غایت وجود، راز مسرت کے متعلق اس کے خیالات گو عقل کے نہیں تاہم تخیل کے لئے نہایت خوشگوار ہیں

اسرارِ ازل را نہ تو دانی نہ من — ایں حرفِ معما نہ تو خوانی و نہ من
هست از پس پردہ گفتگوے من و تو — چوں پردہ برافتد نہ تو مانی و نہ من

در چرخ بانواع سخنہا گفتند — ایں بے خبراں گوہر دانش سفتند
واقف چو نگشتند باسرارِ فلک — اول ... زدند و آخر خفتند

خیام اگر بادہ پرستی خوش باش — با لالہ رخے اگر نشستی خوش باش
چوں عاقبتِ کار جہاں نیستی ست — انگار کہ نیستی چو ہستی خوش باش

ڈانٹے برترین فلسفی شاعر ہے۔ وہ اپنی (*Divine Comedy*) میں ہمیں کائنات کی شکل و صورت سے انسان کی ہدایت و غایت سے، شر کی ابتدا اور اس کے علاج سے واقف کرتا ہے۔ "فردوس" (*Paradise*) کے

تابناک اشعار میں ہم پڑھتے ہیں کہ قلب کائنات سے حُبِ الٰہی کی مستنیر شعاع پیدا ہوتی ہے جس کا مقصد انسان کو معصیتوں سے پاک کرنا ہوتا۔ جرمنی کا زبردست شاعر گیٹے بھی مفکر اور فلسفی ہے۔ اس کی شاعری کا موضوع بھی نجات انسانی ہے، لیکن اس کے نزدیک یہ زہد و تقوے سے نہیں تجربہ سے حاصل ہوتی ہے۔ ورڈسورتھ کو " اس ناقابل فہم عالم کے بارگراں " نے عاجز کر رکھا تھا اور براؤننگ " نباض قلب " خدا، صداقت و محبت سے ہمیں تشفی بخشتا ہے:۔

ان فلسفی شعرا کی حیرت ناک دلکشی اس امر کا انکشاف کرتی ہے کہ انسان کے سینہ میں " اسرار ازل " کو دریافت کرنے اور اس " حرف معمہ " کو پڑھنے کی کتنی زبردست خواہش موجود ہے اور ہم ان شعرا کے کلام سے کس قدر تسلی و آرام حاصل کرتے ہیں اور بعض دفعہ شاعری جزویست از پیغمبری، کہہ اٹھتے ہیں۔ ایجی کس، سوفوکلیس یوری پدیس سب کے سب پیغامبر، معلم اخلاق و مفکر تھے اور اپنی قوم کو انھوں نے اپنے پیغامات سے جگا دیا

زمانۂ حال میں، ہم دیکھ رہے ہیں کہ ڈرامہ کس قدر فلسفیانہ بنتے جا رہے ہیں۔ ڈرامہ نویس حیات کے عمیق مسائل سے الجھ کر انھیں سلجھانے کی کوشش کرتا ہے۔ اِبسن اس نئے ڈرامہ کا منبع ہے۔ جہاں بجائے شاعر و صناع کے مفکر و معلم کام کرتا ہے۔ ابسن قدامت کے ازکار رفتہ و مضر روایات سے نجات پانا چاہتا ہے اور اس کے ڈرامہ کے پڑھنے والوں یا دیکھنے والوں میں جو احساسات پیدا ہوتے ہیں وہ اس قدر جمالیاتی نہیں ہوتے جس قدر کہ تفکری۔ برنارڈ شا کے ڈراموں میں جمالیاتی عنصر صرف نام ہی کو رہ گیا ہے اور سوائے وعظ و تفلسف کے کچھ نہیں۔ اِبسن و شا، گالس ورتی اور روسی اسکول کے مصنفین کی تصانیف میں جو حیرت ناک دلچسپی لی جا رہی ہے اس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ ہم اپنے شکوک کو رفع کرنے، زندگی کے اسرار کو پانے کے کس قدر خواہاں ہوتے ہیں، بقول ایک فلسفی کے ہم مابعد الطبیعیاتی حیوان ہیں، ہم دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ کشمکشِ حیات کے باطنی اصول کیا ہیں یہ تنازع ہمیں کس جانب لے جا رہا ہے، کیا انتخاب فطرت کورانہ ہے یا کوئی " ست غیب " اس کے تحت رہنمائی کر رہا ہے۔ بہرحال شاعری کا یہ فلسفیانہ رجحان اس امر کا بیّن ثبوت ہے کہ فلسفے اور اس کے مسائل میں، جو زندگی کے مسایل ہیں، ہمیں اب بھی گہری دلچسپی ہے اور روز بروز افزوں ہوتی جا رہی ہے

فلسفہ اور سائنس

کہا جاتا ہے کہ فلسفہ اور سائنس کے درمیان ہمیشہ جنگ رہی ہے، ہم موجودہ نقطۂ نظر سے ان کے باہمی تعلق پر روشنی ڈالیں گے، اختصار ہمارے پیش نظر ہوگا۔ فلسفہ اور سائنس میں نہایت قریبی تعلق ہے، دونوں کا مبدء و ماویٰ وہی ایک ہے، " حُبِ علم " ان کی ابتدا اور " علمِ حقیقت " ان کا منتہا ہے۔ اب خیال صحیح نہ رہا کہ فلسفیانہ نظامات بغیر مادی علوم کی احتیاج کے تشکیل پا سکتے ہیں۔ فلسفہ اور سائنس کا تعلق اس قدر قریبی ہے کہ فلسفہ کا طالب علوم مخصوصہ خصوصاً ریاضیات، طبیعیات، کیمیا، حیاتیات اور نفسیات کے کسی قدر علم کو لابدی سمجھتا ہے۔ لیکن ان علوم کا دائرہ ہر

روز وسیع ہوتا جا رہا ہے اور ان تمام پر عبور حاصل کرنا کسی کے لئے آسان نہیں۔ اسی لئے فی زمانہ فلسفہ اپنی توجہ زیادہ تصورات کلیہ کی ناقدانہ تحلیل اور قیمتوں اور معانی کے مطالعہ پر مبذول کر رہا ہے۔ تاہم آئیڈیل فلسفی تو وہی ہوگا جو تمام علوم مخصوصہ پر مہارت رکھتا ہو

سائنس (یا حکمت)، لاطینی لفظ ہے "جو علم" کے ہم معنی ہے، حکیمانہ علم" متیقن، صحیح، اور پوری طرح مربوط و منضبط ہوتا ہے" فلسفہ بھی دنیا کے متعلق علم حاصل کرنا چاہتا ہے۔ لہٰذا فلسفہ اور سائنس دونوں کا ایک ہی مقصد ہوگا۔ لیکن ان دونوں میں فرق ضرور ہے اور بعض دفعہ اس فرق کو اس طرح ادا کیا گیا ہے کہ سائنس کا کام واقعات کا "بیان" (Describe) "اور فلسفہ کا کام ان کی "توجیہ و تعبیر" (Interpret) ہے اور تھامسن نے پیرسن اور دوسرے علمائے سائنس کا تتبع کرتے ہوئے سائنس کی اس طرح تعریف کی ہے کہ

"سائنس واقعات تجربہ کا سادہ سے سادہ الفاظ میں کامل و متوافق بیان ہے"

مظاہر عالم کے ایک مجموعہ کا عالم سائنس کا مطالعہ کرتا ہے، وہ سب سے اول متعلقہ واقعات کو جمع کرتا ہے، پھر ان کی تحلیل کرتا ہے، پھر ان کا اصطفاف کرتا ہے، پھر ان شرائط یا (علل) کا مطالعہ کرتا ہے جن کی تحت یہ وقوع پذیر ہوتے ہیں، ان کی یکسانیتِ عمل کا تعین کرتا ہے یعنی ان کے قوانین کو دریافت کرتا ہے اور آخر میں ان کو ایک مربوط و مرتب مقالہ کی صورت میں پیش کرتا ہے اور یہاں پر اس کا کام بحیثیت عالم سائنس کے ختم ہو جاتا ہے یعنی اس نے واقعات تجربہ کا سادہ الفاظ میں کامل و منضبط بیان پیش کر دیا۔ ان کے طرز وقوع و طریقہ عمل کو سمجھا دیا

اب فلسفہ بھی سائنس کی طرح اسی علم کا متلاشی ہے جو متیقن صحیح اور مربوط و منضبط ہو، لیکن وہ محض اسی علم پر قانع نہیں، وہ اس علم کا جویا ہے جو جامع ہو مظاہر کے غیر مبدل توالیات یا قوانین کا تعین ذہن انسانی کو پوری طرح تشفی نہیں کر سکتا وہ اشیا، یا واقعات کی انتہائی توجیہ و تعبیر کا خواہاں ہوتا ہے یعنی وہ ان کی علتِ اولی، ان کی بدائیت، وغائیت، ان کے معنی یا قدر و قیمت کا جویا ہوتا ہے۔ سائنس محض واقعات کے وقوع کے شرائط کا بیان پیش کرتی ہے۔ لیکن فلسفہ ان کی انتہائی توجیہ یا تشریح کرنا چاہتا ہے، زمانۂ حال کے ایک زندہ سائنٹفک فلسفی نے اسی چیز کو اچھی طرح ادا کیا ہے:- "فلسفہ مختلف علوم و سائنس کے نتائج کو لیتا ہے اور ان کے ساتھ انسان کے مذہبی و اخلاقی تجربات کے نتائج کو ملاتا ہے اور پھر ان پر بہ حیثیت مجموعی غور و فکر کرتا ہے۔ امید یہ ہوتی ہے کہ ہم اس طریقہ سے کائنات کی کنہ و ماہیت، ہماری حیثیت و منزلت کے متعلق بعض عام نتائج حاصل کر سکیں،

اس میں شک نہیں کہ فلسفہ کے اس عظیم الشان مقصد کے حصول کی خواہش پر اس کے عالمگیر وسعت ہی کی بنا پر علما، سائنس کی جانب سے اعتراضات وارد ہوتے ہیں کہ یہ کام خداؤں کا ہے، ضعیف البنیان انسان اس کو حاصل نہیں کر سکتا۔ اس کا تفصیلی جواب ہم آگے چل کر پیش کریں گے۔ لیکن یہاں صرف اتنا کہنا ضروری ہے

کہ "کل" کو سمجھنے کی کوشش بذاتِ خود موردِ اعتراض نہیں بن سکتی، کیونکہ انسان کو اس سے ہمیشہ دلچسپی رہی ہے اور انسانی دلچسپی کا ہر معروض حکیمانہ تحقیقات کا موضوع بن سکتا ہے بشرطیکہ حکیمانہ طریقے استعمال کئے جائیں۔ اعتراض تو اسی وقت وارد ہو سکتا ہے جب غلط طریقے استعمال کئے جائیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اوائل میں منطقی طریقوں کا استعمال فلسفہ کے مطالعہ کے وقت نہیں کیا گیا۔ لیکن ہم آگے چل کر بتائیں گے کہ خود سائنس کے مطالعہ میں ہی منطقی طریقوں کا استعمال گزشتہ زمانوں میں نہیں کیا گیا، فکلا ہما سوا،

بہر حال طریقوں کی بحث چھوڑ کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ فلسفہ کے دو جداگانہ مقاصد ہیں اور دونوں سائنس کے عمل سے مختلف ہیں اور دونوں فکرِ انسانی کی جائز ضروریات ہیں۔ اولاً دنیا من حیث کل پر اور خصوصاً اس کے معنی، مقصد یا غائت اور قدر و قیمت پر۔ ثانیاً ان تصورات کلی کا ناقدانہ امتحان جو سائنس اور فہم عام کے استعمال میں آتے ہیں۔ پہلے کو فلسفہ نظری کہا گیا ہے اور دوسرے کو فلسفہ انتقادی

مقصدِ اول کے متعلق ہمیں یہ خوب یاد رکھنا چاہئے کہ ذہنِ انسانی کی یہ عمیق ترین خواہش ہے کہ دنیا و زندگی کے متعلق وہ نقطۂ نظر حاصل کیا جائے جو فلسفہ کے لئے مخصوص ہے، ہمیں دنیا کا محض ایک کمی نقطۂ نظر یا محض اس کے ریاضیاتی علائق ہی کا علم درکار نہیں بلکہ اس کی ماہیت یا کیفی و باطنی خصوصیت (اسرارِ ازل) کا علم مطلوب ہے اس زمانہ میں سائنس کے دائرہ میں جتنی بھی ریسرچ ہو رہی ہے۔ ان سب میں کمی علائق پر زور دیا جا رہا ہے، سب کیف کے جواب سے قاصر ہیں، کمیت کی ناپ تول، تحقیق تدقیق جاری ہے۔ حکیمانہ نقطۂ نظر سے سائنس کی یہ تحدید کوئی نقص نہیں کہ وہ کیفیت، معنی و قیمت کے سوال کو اپنے دائرہ بحث سے خارج سمجھتی ہے، لیکن اس کا تکملہ فلسفہ سے کیا جانا چاہئے۔ ممکن ہے کہ دنیا میں نہ مقصد ہو نہ غائت، اور نہ اس کی قدر و قیمت ہی کچھ ہو لیکن اس نتیجہ تک بھی ہم فکر و نظر کی ایک غیر معمولی و مستقل کوشش ہی کے بعد پہونچ سکتے ہیں اور اسی غور و فکر کا نام فلسفہ ہے

مقصدِ دوم (تصورات کی ناقدانہ تحلیل) کے متعلق ہم یہاں صرف اتنا کہنا چاہتے ہیں کہ سائنس اور فہم عام کے بعض ایسے کلی تصورات ہیں جن کی وہ پوری طرح جانچ پرتال نہیں کرتے بلکہ محض عملی تعریف کرنے کے بعد اپنے عملی مقاصد کے حصول کے لئے ان کا استعمال شروع کر دیتے ہیں۔ اس قسم کے تصورات کی مثال مکان و زماں، کیفیت و کمیت، علیت و قانون، خیر و شر، وغیرہا سے دی جا سکتی ہے۔ اب فلسفہ کا یہ مخصوص کام ہے کہ ان تصورات کلیہ کا پوری طرح امتحان کرے، ان کی ناقدانہ تحلیل کرے، اور ان کے معانی و روابط کو بالاستیعاب سمجھنے کی کوشش کرے۔ برٹرنڈ رسل وغیرہ نے اسی کام کو فلسفہ کا واحد وظیفہ قرار دیا ہے۔ ان دنوں یہ نہایت ٹکنکل چیز ہو گئی ہے اور ہم سر دست اس میں داخل ہونا نہیں چاہتے

فلسفہ اور مذہب ——— ہم فلسفہ اور مذہب کے باہمی تعلق پر اس لئے غور کر رہے ہیں کہ فلسفہ کی اہمیت

اور اس کی افادیت اور زیادہ واضح اور اجاگر ہو جائے۔ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ فلسفہ اور مذہب میں بیر ہے، واقعہ اس کے خلاف ہے، مندرجہ ذیل مختصر واقعات سے آپ خود اس کا اندازہ کر سکیں گے

فلسفہ اور سائنس میں جس قسم کا تعلق بتلایا گیا اس سے فلسفہ اور مذہب کا تعلق جداگانہ ہے۔ فلسفہ کائنات من حیث کل کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے، یہ دنیا کے متعلق سائنس سے زیادہ جامع، کامل اور وحدت بخش علم حاصل کرنا چاہتا ہے۔ لیکن مذہب کو اس سے بھی زیادہ کامل وحدت کی تلاش ہے، فلسفہ ایک ایسے تصور کی تلاش کرتا ہے جو ہماری مضطرب عقل کو دنیا کے معنی سمجھا دے۔ لیکن مذہب فرد و عالم کے حقیقی وحدت و وفاق کو جاننے کی کوشش کرتا ہے، مذہب میں ہماری کوشش مبدء عالم سے ایک ہو جانے کی ہوتی ہے، ہم اس میں محو ہو جانا چاہتے ہیں اور اس طریقہ سے اس کی معرفت حاصل کرنا چاہتے ہیں

کہا گیا ہے کہ مذہب کا کام انسان کو دنیا میں طمانیت نفس و جمعیت خاطر بخشتا ہے، لیکن سائنس اور فلسفہ بھی ہمارے علم میں پہنائے عالم، پیدا کرنے اور لذت و قوت بخشنے کی وجہ سے قلب میں ایک خاص قسم کی طمانیت پیدا کرتے ہیں۔ سائنس، فلسفہ اور مذہب یہ تینوں دنیا کو جاننا اور سمجھنا چاہتے ہیں۔ یہ ان کی غایت مشترکہ قرار دی جا سکتی ہے، لیکن اس علم سے ان کی غرض جدا جدا ہے۔ سائنس کی غرض علم کو علم ہی کی خاطر حاصل کرنا ہوتی ہے، لیکن زیادہ تر یہ علم کو عملی و معاشی اغراض کی تحت رکھتی ہے۔ فلسفہ کی غرض محبت علم اور اس سے پیدا ہونے والی ذہنی طمانیت و لذت ہوتی ہے۔ مذہب کائنات کو اس لئے سمجھنا چاہتا ہے کہ روح انسان کو جمعیت، چین اور نجات حاصل ہو۔ بعض وقت فلسفہ اور مذہب ان ہی تصورات سے بحث کرتے ہیں مثلاً روح، اس کی بدایت و غایت، خدا اور تخلیق لیکن یہاں بھی ان دونوں کے اغراض جدا جدا ہوتے ہیں۔ اول الذکر میں یہ نظری اور عقلی ہیں اور ثانی الذکر میں یہ جذبی و شخصی!

فلسفہ انفرادی ذہن کی پیداوار ہے، صنمیات یا مذہب مجموعی ذہن کی۔ فلسفہ کسی فلسفی کی ذہنی کوششوں کا نتیجہ ہوتا ہے، بغیر فلسفی کے فلسفہ ناممکن، اسی وجہ سے ہم ہر فلسفہ کو کسی فلسفی کے نام سے موسوم کرتے ہیں مثلاً فلاطونی فلسفہ، اور ارسطاطالیسی فلسفہ، وغیرہ اس کے برخلاف صنمیات یا مذہب احادیث الطوائف (Folk lore) اور زبان کی طرح کسی فرد کے عمل شعوری کا نتیجہ نہیں بلکہ پوری قوم کا آفریدہ۔ جس طرح زبان کا کوئی موجد نہیں اسی طرح صنمیاتی و مذہبی عقائد کا کوئی موجد نہیں، ان کی ابتدا زبان و شاعری سے جا ملتی ہے۔ کیا ان دنوں کوئی مصری یا یونانی مذاہب کے بانیوں کا ذکر کرتا ہے؟ اس میں شک نہیں کہ عیسائی و اسلامی مذاہب کے بانی ضرور گزرے ہیں (صلواۃ اللہ علیہم) لیکن غالباً انھوں نے کسی ایسے نئے تصورات کی تخلیق نہیں کی جو پہلے معلوم نہ تھے، انھوں نے مروجہ خیالات میں اصلاح کی جس کا مقصد نظری سے زیادہ عملی تھا

فلسفہ نظر و فکر کرنے والے ذہن کا نتیجہ ہوتا ہے ہر فرد اس میں "فکر" کی وجہ سے حصہ لیتا ہے، لیکن مذہب پر وہ "ایمان" رکھتا ہے، یہ اس کا اپنا ذاتی معاملہ ہے، کسی کو اس میں دخل دینے کی ضرورت نہیں

لیکن آخر مذہب کیا ہے؟ اگر اس کی تعریف ناممکن ہے تو کسی قدر معنیٰ کا تعین تو ضرور ہو سکے گا۔ مذہب پر جب آپ غور کرتے ہیں تو شاید اختلاف کی وجہ سے مسجد و حرم، دیر و کلیسا، مصلیٰ و ناقوس، تسبیح و زاہد خیال میں آتے ہیں لیکن ظاہر ہے کہ یہ چیزیں ضروری طور پر مذہب تو نہیں۔ اب مذاہب عالم پر نظر غائر ڈالیں، ان کے اجزائے مشترکہ پر غور کریں تو ہم مذہب کی کسی تعریف تک پہونچ سکیں گے شاید وہ کچھ اس قسم کی ہو: "مذہب غیب کی اُن قوتوں پر آسرا کرنے کے احساس کا نام ہے جن کی قدرت میں ہماری قسمت کی باگ ہے، ساتھ ساتھ ان قوائے غیبی سے صادقانہ تعلقات قائم کرنے کی خواہش بھی ہوتی ہے" یا "مذہب ایک غیر مری روحانی نظام سے ہمارے عملی تعلق کا شعور ہے"

"مذہب ہمارے باطن کے اعلیٰ ترین جوہر کے ساتھ وفاشعاری کا احساس ہے" ایمرسن نے خوب کہا ہے کہ "میں، ناقص میں، اپنے کامل نفس کی پرستش کرتا ہوں" ان تعریفات سے معلوم ہوتا ہے کہ مذہب کی بنیاد اعلیٰ قیمتوں کے عمیق جبلی احساس پر ہوتی ہے۔ ہماری ذات میں جو الہیت کا جوہر مکنون و مستتر ہے وہ اُس جوہر الٰہی کی طرف بڑھتا ہے جو ہم سے ماوراء سارے عالم پر محیط ہے، جس کا سارا عالم خارجی اظہار ہے۔ یا مذہب ان ہی اعلیٰ و انتہائی قیمتوں کی طرف اس خاک و باد کی دنیا اور اس کے آرام و لذائد سے بلند ہو کر دیکھنا اور ان کی طرف باطنی ہمدردی اور شناخت کی وجہ سے کھنچ جانا ہے۔ اسی بنا پر ونٹ نے کہا ہے کہ "ہم ان احساسات یا تصورات کو مذہبی کہیں گے جو ایک نصب العینی وجود کی طرف اشارہ کرتے ہیں" اسی وجہ سے مذہب کے اسمار، علائم، و اشخاص پاک و مقدس سمجھے جاتے ہیں، یہ برترین قیمتیں ہیں، دنیا کی معمولی و ادنیٰ چیزوں سے ماوراء ہیں، اور اسی لئے مذہبی پہلو وفاشعاری، تحریم، تواضع و زہد کا ہوتا ہے

مذہب کی اس تعریف کے لحاظ سے روح، روحانی یا روحانیت کے الفاظ میں کسی قسم کا سترو غموض نہیں پایا جاتا یہ ان چیزوں کے طرف اشارہ کرتے ہیں جن کی اعلیٰ قیمتیں ہوتی ہیں، چنانچہ جارج سنٹیانا کہتا ہے کہ روحانی ہونے سے مراد "نصب العین کے حضور میں زندگی بسر کرنا ہے" ڈریک نے اپنی کتاب "مسائل فلسفہ" میں روحانیت کے معنی اور مذہب سے اس کے تعلق کو بڑی اچھی طرح ظاہر کیا ہے

"قلب و ارادہ کا وہ میلان جس کی وجہ سے انسان اعلیٰ چیزوں کی پرواکرتا اور رفق و ملائمت و طمانیت باطنی کے ساتھ زندگی بسر کرتا اور حیات کے سطحی واقعات سے متاثر نہیں ہوتا اپنی باطنی ماہیت کے لحاظ سے روحانیت کہلاتا ہے، اور جب یہ خارجی صورتوں اور اداروں میں رُونما ہوتا ہے اور بتمام جماعتوں میں پھیل جاتا ہے تو ہم اس کو مذہب

کہتے ہیں" (مسائل فلسفہ ص ۲۳۳)

اس طرح پر سمجھا جائے تو پھر مذہب کوئی غامضانہ، تحکمانہ، یا پُر اسرار شئے نہیں رہتا بلکہ وہ ایک حاجت مندروح کی جبلی آواز بن جاتا ہے۔ مذہب انسان کی جبلیت میں داخل ہے، وہ ایسی چیز نہیں جس کی صداقت پر ہم معترض ہوں یا اس کی شہادتیں تلاش کی جائیں۔ اس کی بنیاد تو اس امر پر ہے کہ ہم اعلیٰ اقدار یا قیمتوں کے دائرہ حکومت کو تسلیم کرتے ہیں اور ان سے ایک قسم کی جبلی ہمدردی رکھتے ہیں اور ان کے آرزومند ہوتے ہیں۔ اور چونکہ مذہب ان اعلیٰ اقدار کو ہمیشہ ہماری نظروں کے سامنے رکھتا ہے اور انھیں دنیا کے لذائذ و رغائب کے باوجود فراموش ہونے نہیں دیتا اس لئے مذہب انسان کی زندگی میں سب سے زیادہ خوبصورت شئے ہے

مذہب اور فلسفہ کا تعلق کتنا قریبی ہے وہ اس بیان سے واضح ہوگیا ہوگا۔ کیونکہ اگر مذہب کی یہ تعریف کی جائے کہ یہ ان روحانی اقدار یا قیمتوں کا استحکام ہے جو روح انسانی میں ہمیشہ موجود ہوتی ہیں لیکن بعض اوقات خفتہ حالت میں ہوتی ہیں تو پھر فلسفہ کا یہ کام ہوگا کہ وہ ان قیمتوں کی تحقیق کرے، ان کے مبدء و ماخذ کا پتہ چلائے، ہم نے ابتداء میں فلسفہ کی تعریف ہی یہ کی تھی کہ فلسفہ "معانی اور قیمتوں کے مطالعہ کا نام ہے" اور اگر مذہب روح انسانی کا کائنات کی اعلےٰ قوتوں کو لبیک کہنا ہے تو فلسفہ کا کام یہ ہوگا کہ ان الٰہی قوتوں کے وجود کے دلائل و براہین پیش کرے۔ یا اگر مذہبی پہلو کے لئے اس امر کا یقین کرنا کسی طرح ضروری ہے کہ اشیاء کے پس پردہ کوئی ایسی قوت ہے جو فطرت انسانی سے کوئی نہ کوئی شئے مشترک رکھتی ہے جس کو ہم نہایت احتیاط کے ساتھ شخصی کہہ سکتے ہیں تو فلسفہ کا یہ فریضہ ہوگا کہ اس امر کا تعین کرے کہ سائنس یا مابعد الطبیعیات میں کوئی ایسی چیز تو نہیں جو ہمیں اس شخصی قوت کے وجود پر یقین کرنے سے باز رکھے، یا اگر سائنس یا مابعد الطبیعیات میں کوئی وجہ اس پر یقین کرنے کی ملتی ہے تو وہ کیا ہے؟

یہ اکثر دریافت کیا جاتا ہے کہ فلسفیانہ تعلیم کا مذہب پر کیا اثر پڑتا ہے؟ ہمارے خیال میں یہ اثر نہایت مفید ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ ابتداءً فلسفہ کا مطالعہ ہمارے بعض مذہبی عقائد و خیالات میں کسی قدر خلل پیدا کرے خصوصاً جب ہمارے یہ عقائد بالکل کوتاہ، ناقابلِ مصالحت یا شدید الحقد...... ہوں۔ لیکن اگر یہ وسیع کشادہ اور سادہ ہوں تو فلسفہ ان کی تائید کرتا اور انہیں تقویت بخشتا ہے۔ بیکن نے کہا ہے کہ "یہ صحیح ہے کہ تھوڑا سا فلسفہ انسان کے ذہن کو الحاد کی جانب مائل کرتا ہے۔ لیکن فلسفہ میں تعمق انسان کے ذہن کو مذہب کی طرف رجوع کر دیتا ہے" در اصل فلسفہ کا یہ کام ہے کہ وہ ہمارے اساسی مذہبی اذعانات کو عقل کی "بنیانِ مرصوص" پر مستحکم طور پر قائم کردے تاکہ جبلی تنفیات "دین العجائز" مادیت و الحاد کے طوفان میں غرق نہ ہو جائیں۔ بعض دفعہ ہمارے ان جبلی احساسات مذہبی میں ارتعاش ہوتا ہے اور ہمیں خوف ہوتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ "نجس" سائنس ہمارے ان اذعانات کو برباد نہ کردے۔ فلسفہ ہمیں پہاڑ کی چوٹی پر لے جاتا ہے اور ہم وہاں سے شک و ریب کی وادی پر نظر ڈالتے ہیں، علم سے ہمیں قوت حاصل ہوتی ہے، خوف رفع

ہوتا ہے، جس چیز کو ہم نے بدترین سمجھا تھا، وہ اپنے پورے خدوخال، پورے تناسب میں کچھ بری نہیں معلوم ہوتی، پھر ہمیں جو طمانیت وسکون حاصل ہوتا ہے وہ ابدی ہوتا ہے

فلسفہ کے امکان کا سوال

فلسفہ کو شاعری، سائنس اور مذہب کے تقابل سے آپ نے کسی قدر تفصیل کے ساتھ دیکھا، "فلسفیانہ مسئلہ" یا موضوع کو مشکل کیجئے تو اس کی وسعت سے آپ کو ایک قسم کا خوف یا تحیر ہوگا۔ حقیقت کی کنہ یا ماہیت، کائنات کے معانی ومقصود، اس کی بدایت وغائت، حیات کی قدر وقیمت یہ ایسے عظیم الشان سوالات ہیں کہ ان کا بالاستیعاب مطالعہ کرنا۔ کسی قسم کا حل پیش کرنا بڑی ہمت کا کام ہے! عالم سائنس جو دنیا کے ایک گوشہ کو لیتا اور اس کو پوری طرح سمجھنے میں اپنی تمام قوتوں کو صرف کردیتا ہے وہ فلسفی کے دائرہ بحث کے توسع وکشادگی کو دیکھ کر اٹھتا ہے کہ یہ کام دیوتاؤں کا ہے انسان کا نہیں کیونکہ ؎

من می نگرم زمبتدی تا استاد

عجز ست بدست ہر کہ از مادر زاد (خیام)

لیکن خود یہ عالم سائنس جانتا ہے کہ اس کا دائرہ بحث کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو دوسرے علوم کے دائرے کچھ اس طرح مربوط ہے کہ خواہی نخواہی اس جزکے کامل علم کے لئے "کل" کا مطالعہ ضروری ہے اور اس طرح وہ مجبوراً فلسفہ ہی کے دائرہ میں قدم زن ہوتا ہے یا کم ازکم فلسفی پر اعتراض کرنا ترک کردیتا ہے

تاہم مفکرین کے بعض گروہ ایسے گزرے ہیں جنھوں نے فلسفیانہ مسائل کی وسعت سے گھبراکر اس کے مطالعہ ہی سے انکار کردیا ہے، ان میں سے ہم دو کا اختصار کے ساتھ ذکر کریں گے۔ ان میں سے ایک ایجابیت اور دوسری ارتیابیت ہے

ایجابیت:۔

فرانس کے فلسفی اگست کامت (۱۷۹۸ء تا ۱۸۵۷ء) نے دنیا کے متعلق اپنے نقطہ خیال کا نام ایجابیت رکھا ہے، گو حقیقت میں یہ خود فلسفی ہے جو فکر کی مستقل اور غیر معمولی کوشش کے بعد دنیا کے متعلق ایک خاص نقطہ نظر تک پہونچا ہے لیکن وہ فلسفہ کے نام سے بیزار ہے۔ اس کا یقین تھا کہ علت العلل یا علت اولیٰ، آخری یا انتہائی حقیقت اور اس قسم کی ساری چیزوں کی تلاش محض فضول ہے۔ انسان کے ذہن کی رسائی ان حقایق تک نہیں ہوسکتی، وہ تجربہ کے واقعات یا مظاہر اور ان کی یکسانیت عمل یا قوانین ہی تک محدود رہتا ہے۔ ظواہر کے پس پردہ کیا ہے اور اشیاء کماہی کی حقیقت وماہیت کیا ہے یہ سب مابعد الطبیعیاتی تجریدات ہیں۔ ان سے احتراز ہی مفید ہے، فلسفہ کا کام ظواہر کے باہمی تعلقات اور ان کے غیر متبدل طریق رفتار کا دریافت کرنا ہے نہ کہ تجریدی تصورات کے گورکھ دھندوں

میں اُلجھنا!

کامٹ کی ساری دلچسپی عمرانیات سے تھی وہ اپنے کو اس علم کا موجد سمجھتا تھا۔ اس کا نصب العین سوسائٹی کی اصلاح تھی، اس نصب العین کا تحقق معاشرت کے قوانین کے علم ہی سے ہو سکتا ہے لہٰذا کامٹ معاشرت کا سائنٹفک طریقوں سے مطالعہ کرنا چاہتا تھا اور اسی کو وہ " فلسفۂ جدید قرار دیتا تھا۔ اس لئے ایجابیت کا مطلب صرف اتنا ہوا کہ سائنس فکر انسانی کی آخری منزل ہے، اور سائنس کا مقصد وحید واقعات تجربہ کے باہمی مستقل علایق اور انکے قوانین دریافت کرنا ہے، اور یہ مشاہدہ اور تجربہ ہی سے ممکن ہے، سائنس ان چیزوں سے بحث کرتی ہے جو تیقن، مفید اور قطعی ہوتے ہیں اور خصوصاً جو ہمارے معاشری اداروں کی تکمیل کے لئے مفید ہوتے ہیں، یہ علم ایجابی ہے، اسی کی تدوین ایجابیت کا کام ہے

سائنس کی قدر و قیمت کے متعلق ہر شخص کا کامٹ کے ساتھ اتفاق ہوگا اور نہ ہر کسی کو علم معاشریہ کی اہمیت کے متعلق اعتراض ہو سکتا ہے، لیکن کیا ہم اس کے اس خیال کے ساتھ اتفاق کر سکتے ہیں کہ فلسفہ کے وسیع مسائل کا مطالعہ فضول ہے اور مابعد الطبیعیات پر وقت صرف کرنا رائگاں؟ اس کی تحقیق آگے آتی ہے

ارتیابیت

دوسرا گروہ جو ہمیں فلسفہ کی منزل مقصود کی طرف قدم اٹھانے سے باز رکھتا ہے وہ ارتیابیہ کا ہے، خیام کی زبان میں کچھ اس طرح ہم اس مسلک کو ادا کر سکتے ہیں

دورے کہ درد آمدن و رفتنِ ماست — اورا نہ نہایت و بدایت پیداست
کس می نزند دمے دریں معنی راست — کیں آمدن از کجا و رفتن بکجاست

ارتیابیت کا ظہور پہلے یونان میں سوفسطائیہ کے دور میں ہوا۔ " غورجیاس کی تعلیم سفسطہ " کا نمونہ ہے۔" کسی شی کا وجود نہیں اگر وجود ہے تو ہمیں اس کا علم نہیں؛ اگر اس کا علم بھی ہے تو یہ دوسروں تک نہیں پہونچایا جا سکتا "ہستی کا انکار، علم کا انکار، اس سے زیادہ انکار وارتیاب کیا ہو سکتا ہے؟ چند دن بعد یونانی رومی دور میں ارتیابیت فلسفہ کا ایک مستقل " اسکول " بنگئی جس کا بانی " پرہو " تھا۔ تعجب تو یہ ہے کہ گو ان مفکرین نے سقراط، افلاطون، ارسطو، دیمقراطیس جیسے جلیل القدر فلسفیوں کے بعد جنم لیا، اور گو اہل یونان نے اب تک مابعد الطبیعیات اخلاقیات، منطق، ریاضیات میں شاندار کامیابیاں حاصل کی تھیں۔ تاہم انہوں نے " پردۂ عمل " تک پہونچنے میں مایوسی کا اظہار کیا۔ ان کا خیال تھا کہ اب تک فلسفہ ادعائی تھا، ذہن انسانی نے ملکۂ علم کی تنقید کے بغیر یہ مان لیا تھا کہ حقیقت کا علم ممکن ہے۔ لہٰذا یہ اکابر فلاسفہ کے مختلف و متضاد خیالات و نظریات کا ایک دوسرے سے مقابلہ کرتے اور ان کا مذاق اُڑایا کرتے اور کہتے کہ عقدۂ کائنات لاینحل ہے، صداقت کلی ناقابل حصول۔ ہاں

" انسان (فرد) ہر چیز کا معیار ہے " "جتنے آدمی اتنے ذہن" ہماری رائوں میں یکسانیت ممکن نہیں، لہٰذا علم کلی کا امکان بالکل نہیں - فرد علم کے معاملہ میں اپنا قانون آپ ہے، اس نظری ارتیابیت سے اخلاقی ارتیابیت بہت زیادہ دُور نہیں تھی - جب علم ہی کا امکان نہیں تو صواب و خطا کا علم کہاں، کلی طور پر صواب و خطا کا وجود نہیں، جو چیز تمھارے لئے اچھی ہو ضروری نہیں کہ وہ میرے لئے بھی اچھی ہو - ضمیر شخصی معاملہ ہے - یہی حال جمال کا ہے، اس میں بھی کوئی مشترک معیار نہیں - کیا تمھیں اس حبشی کا قصہ یاد نہیں جو اپنے بادشاہ کے اس حکم کی پیروی میں کہ سب سے زیادہ حسین بچے کے گلے میں موتیوں کا ہار پہنایا جائے بہت سی تلاش کے بعد اپنے ہی بچہ کے گلے میں پہنا دیا اور عرض کیا کہ جہان پناہ میری نگاہ میں اس حبشی زادے سے زیادہ خوبصورت آپ کی ساری وسیع مملکت میں کوئی بچہ نہیں!"

(۱۵۹۶ء تا ۱۶۵۰ء) ———— زمانہ جدید میں یونان کی سی ارتیابیت بالکل مفقود ہے - ارتیابیت کا سب سے آخری حامی اڈنبرا کا مشہور عالم مفکر ہیوم تھا - لیکن اس کی ارتیابیت ایسی تباہ کن اور انتہائی نہ تھی جیسی کہ یونانی ارتیابیت بلکہ حدودِ علم کی ایک ناقدانہ تحقیق و تدقیق تھی - جس کا نتیجہ یہ تھا کہ ہمارے علم کا مبدا تجربہ ہے، اس کی انتہا عالم مظاہر، اور ایک قسم کی "لا ادریت" کہ علل انتہائی، روح، الغوا وغیرہ کی حقیقت کے متعلق ہمیں کوئی علم نہیں

موجودہ زمانہ کی اسپرٹ تو یہ ہے کہ ہر جدید مسئلہ کا امید و رجا کے ساتھ بہیم طور پر مقابلہ کیا جائے، فلسفیوں کا باہمی اختلاف ممکن، علم انسانی کی غلطی ممکن، ہمارے حواس کا التباس ممکن، لیکن ہم یہ ضرور دریافت کر کے رہیں گے کہ کونسا فلسفی صحیح ہے، حواس کا دھوکہ کس طرح دُور کیا جا سکتا ہے، علم کی غلطی کیسے رفع ہو سکتی ہے - زمانہ جدیدہ کی روح جرأت و جوش سے مملو ہے، قطب جنوبی کی دریافت کا بیڑا اٹھایا، تلاش میں جانیں گئیں - لیکن باوجود ہر طرح کے آفات و مصائب کے اس کو دریافت کر ہی لیا - مونٹ ایورسٹ کی چوٹیاں ابھی زیر قدم نہیں آئی ہیں - لیکن اہل ہمت اس کی طرف بڑھے جا رہے ہیں - ایک نہ ایک روز یہ زیرِ قدم آ رہیں گی - یونیورسٹی کی شرکت کے وقت طلباء ان مضامین کو زیادہ پسند کرتے ہیں - جن میں مسائل زیادہ دریافت طلب ہوں - موجودہ فکر و تفلسف میں شک ضرور پایا جاتا ہے - لیکن یہ ہمیں لوری دے کر بستر راحت پر نہیں سلا رہا ہے بلکہ اقبال کی زبان میں کہہ رہا ہے ؎

ضمیر کن فکاں غیر از تو کس نیست — نشانِ بے نشاں غیر از تو کس نیست
قدم بیباک تر نہ در رہ زیست — بہ پہنائے جہاں غیر از تو کس نیست!

براؤننگ کہتا ہے کہ "شک کی میں قدر کرتا ہوں، حیوانات میں یہ نہیں پایا جاتا، ان کی محدودیت میں اس شعاع مستنیر کی تابناکیاں کہاں؟" برٹرنڈ رسل اس رہاکن و آزادی بخش "شک" کا ذکر کرتا ہے جو ادعائیت کو پست ہمت کرتا اور ہمیں راہ عمل میں جری بناتا ہے - وہ کہتا ہے کہ "فلسفہ ان لوگوں کی متکبرانہ ادعائیت کو دور کرتا ہے جو آزادی بخش شک کے دائرہ میں قدم زن ہوتے ہیں، یہ مانوس اشیا کو غیر مانوسیت کے جامہ میں پیش کر کے ہمارے احساس تحیر

کو ہمیشہ زندہ رکھتا ہے" ان جری روحوں کو ان بزدلوں سے کسی قسم کی ہمدردی نہیں ہوسکتی جو محض اس خیال سے کہ چونکہ فلسفیانہ سوالات کے جواب نہیں دئے جاسکتے لہذا ان کو اٹھایا ہی نہ جائے اور نہ ان کے حل کی کوشش کی جائے فلسفہ کی راہ میں طالب علم کو شک بلکہ دہشت ہوتی ہے ضرور، لیکن شک کا پیدا کرنا، صداقت کی تلاش میں آوارہ و سر گرداں ہونا اور اس کے حصول کی امید رکھنا ———— یہ روحِ انسانی کا عظیم الشان کارنامہ ہے!

ان دنوں، ہم ارتیابیت کی بجائے "لاادریت" کا زیادہ ذکر سنتے ہیں۔ اس لفظ کو سب سے پہلے ہکسلی نے رواج دیا لیکن یہ ہربرٹ اسپنسر کے نام سے زیادہ وابستہ ہے اس کے لفظی معنی ہیں "علم کا نہ ہونا" لاادری، یعنی میں نہیں جانتا۔ اسپنسر کا یقین تھا کہ علم میں ایک قسم کی اضافیت پائی جاتی ہے، لہذا علمِ مطلق کا امکان نہیں سارا علم اضافی ہے قانونِ اضافیت کے معنی یہ ہیں کہ کسی شئے کا علم دوسرے خارجی اشیاء کے امتیاز سے حاصل ہوتا ہے جو اس کی تحدید کرتے ہیں، نیز یہ شئے ذہن کی اضافت ہی سے معلوم ہوسکتی ہے، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ ہمیں مظاہری، محدود، اضافی اور مشروط موجودات کا علم ہوگا، لامحدود اور مطلق یا غیر مشروط ہمارے دائرہ علم سے ماورا، غیر معلوم و ناقابل علم ہوگا۔ چنانچہ اسپنسر کے نزدیک ہمارا علم مادہ حرکت قوت اور شعور وغیرہ جیسے واقعات کے ماورا نہیں پہونچ سکتا اور یہ تمام ایک "ناقابل علم ہستی مطلق" کے شئون و احوال ہیں

قانونِ اضافیت پر تھوڑی دیر کے لئے غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قانون خود ذات مطلق کے تصور کو ضروری سمجھتا ہے، یعنی اضافی کے تصور میں مطلق کا تصور استلزامی طور پر موجود ہوتا ہے اور خود ہربرٹ اسپنسر نے اس کو تسلیم کرلیا ہے، صاف ظاہر ہے کہ اگر دنیا محض ظہور ہے تو یہ ضرور کسی ہستی کا ظہور ہوگی، ظہور خود حدِ اضافی ہے جو کسی مطلق ہستی کے وجود کو مستلزم ہے، اسپنسر کا کہنا صرف یہ تھا کہ مطلق کے وجود کے سوا ہمیں اس کے متعلق کسی شے کا علم نہیں، لیکن اسپنسر کی اس غلطی کو ہیگل نے پہلے ہی رفع کردیا تھا۔ چونکہ تمام محدود اشیاء و اذہان مطلق کے ظہور ہیں لہذا وہ ان ہی میں اور ان ہی کے ذریعہ قابل علم ہے، اس میں شک نہیں کہ مطلق کی ماہیت ہمارے محدود ذہن میں پوری طرح نہیں آسکتی لیکن ہمیں اس کو ایک حد تک ضرور جزی طور پر سمجھ سکتے ہیں اور اس کے کچھ صفات سے واقف ہوسکتے ہیں۔ لہذا لاادریت کا یہ دعویٰ کہ جس قسم کے علم کی فلسفہ کو تلاش ہے وہ ناقابل حصول ہے، شک سے بڑھ کر لاادریت کی حد تک پہونچ جاتا ہے، لہذا یہ سائنس اور فلسفہ ہردو کی اسپرٹ کے خلاف ہے جو ان تھک اور دائمی تلاش کا نام ہے، فلسفی یا "عاشق حکمت" "آزارِ جستجو" ہی کو اپنی غائت سمجھتا ہے اور اقبال کی زبان میں کہتا ہے ؎

شادم کہ عاشقاں را سوزِ دوام دادی
درماں نیافریدی آزارِ جستجو را

اور "در قلزم آرمیدن ننگ است آبجو را" کہتا ہوا "رمز کائنات" کا ہمیشہ جویا و متلاشی رہتا ہے!

فلسفیانہ نقطۂ نظر کی ضرورت :-

سچ تو یہ ہے کہ آج سے دو ہزار سال سے بھی زیادہ پہلے ارسطو نے اس بحث کا تصفیہ کر دیا تھا کہ آیا ہم فلسفہ کا مطالعہ کریں یا نہ کریں، اس نے کہا تھا کہ " ہم فلسفیانہ غور و فکر کریں یا نہ کریں، ہمیں فلسفیانہ غور و فکر کرنا تو ضرور پڑتا ہے " شوپنہار نے انسان کی طبیعت کا پتہ لگا کر اسی لئے کہا تھا کہ انسان " مابعد الطبیعیاتی حیوان ہے " اڈون والکس نے نہایت عقلمندی سے کہا تھا کہ " ہر شخص خواہ شعوری طور پر ہو یا غیر شعوری طور فرد و کائنات کے رشتہ باہمی کے متعلق کوئی نہ کوئی نظریہ ضرور قائم کر لیتا ہے اور اسی پر اس کی ساری زندگی و عمل کا انحصار ہوتا ہے " اسی خیال کو پاکسن نے یوں ادا کیا ہے کہ ہر شخص کا فلسفہ ہوتا ہے ۔ عہد فطرت میں بسنے والے وحشی کا یہی فلسفہ ہوتا ہے اور یہی اس کے اعمال و کردار کا مرکز ہوتا ہے ! اور اسی معنی کے لحاظ سے چسٹرٹن کہتا ہے کہ " آدمی میں سب سے زیادہ اہم اور سب سے زیادہ عملی چیز کائنات کے متعلق اس کا نقطۂ نظر ہے " یعنی اس کا فلسفہ !

آپ نے اوپر دیکھا تھا کہ فلسفی کائنات کی ماہیت و غائت کے متعلق ایک نظریہ حاصل کرنا چاہتا ہے ۔ عالم سائنس کے کمی علم کی تکمیل کیفی علم سے کرنا چاہتا ہے ۔ اس کو چند ایسے مفروضات تسلیم کرنا پڑتے ہیں جن کی تصدیق بالکلیہ تجربہ و مشاہدہ و اختیار سے نہیں ہو سکتی ۔ حواس جن چیزوں کی شہادت دیتے ہیں ان کی تکمیل وہ تخیل یا وجدان سے کرتا ہے یہ ضروری نہیں کہ وہ اپنی مرضی یا ارادہ ہی سے ایسا کرے بلکہ بقول ارسطو خواہی نخواہی اس کو کرنا پڑتا ہے، وہ کامت کی طرح اپنے کو " ایجابی " کہہ سکتا ہے اور احتجاج کر سکتا ہے کہ وہ صرف واقعات ہی کی حد تک محدود رہنا چاہتا ہے یا اسپنسر کی طرح وہ کہہ سکتا ہے کہ وہ " لا ادریہ " ہے اور اشغیا، کماہی کے علم سے نا واقف، لیکن وہ ان احتجاجات کے باوجود چند مفروضات کو تسلیم کرتا ہے اور خواہی نخواہی فلسفی ضرور ہے، معاذ اللہ عجائب ! بڑے سے بڑا لا ادری، بڑے سے بڑا شکی، یا ارتیابی، اپنے عقائد و انکارات مخفی نہیں رکھ سکتا، اس کو زندگی کے کارزار میں جانب داری کرنی پڑتی ہے ۔ باوجود ایجابیت و لا ادریت کی لن ترانیوں کے، باوجود ماورائی غنان سے اس امر کا یقین دلانے کے کہ حقیقت نا قابلِ علم ہے اس کو زندگی اس طرح بسر کرنی پڑتی ہے گویا کہ اس نے ان خوفناک استبعادات کے ایک نہ ایک پہلو کو قبول کر لیا ہے جن پر فلسفہ مشتمل ہوتا ہے ۔ اس کو اس امر کا تصفیہ کر لینا پڑتا ہے کہ آیا یہ زمین جس پر اس کی زندگی بسر ہو رہی ہے ایک ذی غائت عقل کی صنعت گری کا نتیجہ ہے یا ذرات یا سالمات کی کورانہ کشمکش کا آفریدہ یعنی خدا کے متعلق اس کا کوئی نہ کوئی نظریہ ہونا چاہیے خواہ یہ خدا کے وجود کے انکار ہی کی خاطر کیوں نہ ہو ۔ اس کو اپنے ذہن میں اس امر کا تصفیہ کر لینا چاہیئے کہ آیا وہ ایک خود رفتار مشین یا کل ہے جو دوسری مشین سے اہم مجبع ہوتا ہے تاکہ چھوٹے مشین پیدا ہوں یا ایک قوتِ حیات کا ظہور، تخلیقی قوت و اختیار کا حامل یا نورِ الٰہی کی گریزپا شعاع ! اس کو اپنے ذہن میں اس امر کا بھی فیصلہ کر لینا چاہیئے کہ آیا عقل کی غیر یقینی قوتیں یا وجدان کی شاہانہ بداہت حقیقت کی رہنما ہو

صداقت کا معیار ہے - اسی طرح اخلاقی اقدار کے متعلق، اس کو اس امر کا تصفیہ کر لینا چاہئے کہ وہ اپنی بیوی کے ساتھ وفادار رہے گا یا اپنی قوتِ مردانگی کو میتی طور پر تقسیم کرے گا! اس کو اپنے نزدیک اس امر کا فیصلہ کر لینا چاہئے کہ آیا مرنے کے بعد اس کا بالکل خاتمہ ہو جاتا ہے "خاکی است دنخاکش ہمی دہند" یا "چو دانہ خاک شگا فدگی تراست" ایک اعلےٰ وارفع زندگی میں داخل ہوتا ہے!

یہ تمام نہایت اہم مسائل ہیں اور فلسفہ موت وحیات کا معاملہ ہے اور ان تمام مسائل کے متعلق فلسفے کا کٹر سے کٹر مخالف اپنے ذہن میں کچھ نہ کچھ فیصلہ کر لیتا ہوتا ہے مثلاً وہ فرض کر لیتا ہے کہ مادیت صحیح ہے، حقیقت کی تمام صورتیں شجر وحجر، لطف وکرم دعا و عبادت ——— سب مادی ہیں، ان کی مادی پیمائش ہو سکتی ہے - یہ ایک شاندار مفروضہ ہے جس کی اختیاری تصدیق بالکل ناممکن، یہی مفروضہ اس کو فلسفی بناتا ہے اور اپنے اس فلسفہ کو وہ قابل تعریف سادگی کے ساتھ پیش کرتا ہے - وہ فرض کر لیتا ہے کہ دنیا ایک قسم کی میکانیت ہے، اور وہ خود ایک مشین ہے جو میکانکی اور غیر شعوری طور پر شعور کے زاید از ضرورت اور فضول ارتقا پر غور کر رہا ہے، دنیا کی ماہیت کے متعلق یہ بھی ایک نظریہ ہے جو اب تک ناقابل ثبوت ہے، اور جب اس کو دیمقراطیس، بالکری ٹیس یا ہابس یا لامتری پیش کرتے ہیں تو فلسفے کے نام سے پکارا جاتا ہے - وہ تسلیم کرتا ہے کہ حیات میں خود اختیاری نہیں، ہر ایک ہستی کا ہر فعل اس ابتدائی ضبابہ (Nebula) نے متعین و مقرر کر دیا ہے جو سائنس کی صنمیات میں "باغ عدن" کی جگہ ہماری سامعہ نوازی کرتا ہے - وہ تسلیم کرتا ہے کہ ذہن مادہ ہے اور بقول وباستنا دنیٹشے (نعوذ باللہ) خدا ایک عرصہ ہوا کہ مر چکا اور اس کی متعدد قبریں مساجد و منادر میں بنائی جا چکیں!

یہ سب ممکنہ مفروضات ہیں - ہر فلسفی ان کو یا ان مخالف مفروضات کو تسلیم کرنے کا حق رکھتا ہے - ہم تمام کو ان مفروضات کو تشکیل دینا اور ان کو تسلیم کرنا پڑتا ہے - زندگی ہمیں مجبور کرتی ہے کہ ہم اشیاء کی ماہیت اور انسان کی غایت کے متعلق مفروضات کو تسلیم کریں، ہم ہمیشہ مفروضات کی تشکیل میں حصہ لیتے ہیں، مطلق کا "آذارِ جستجو" ہمارا "آرام جان" ہوتا ہے، اس کی دلکشی ہمیں ہمیشہ اپنی طرف جذب کرتی ہے - علاوہ دوسرے وجوہات کے یہ بھی ایک وجہ ہے کہ فلسفہ سائنس سے زیادہ دلچسپ اور دلکش ہوتا ہے، وہ دیارِ نامعلوم کا سفر ہے - لامحدود کی تلاش میں کو بکو کوچہ بکوچہ سرگرداں ہونا ہے، اس کے مقابلہ میں سائنس کی دلچسپی ضرب کی تختی میں جو دل فریبی ہے اس سے زیادہ نہیں!

لہٰذا ہم سب فلسفی ہیں، مابعد الطبعیاتی حیواں ہیں، ایک جو اعلاناً فلسفی ہے دوسرا جو اقرار" ایجابی ہے ان دونوں میں فرق صرف اتنا ہے کہ اول الذکر ہی اس معاملہ میں راست باز و راست گو آدمی ہے

فلسفہ کی ترقی پہ اعتراض :-

فلسفہ پر ایک اعتراض عام طور سے یہ کیا جاتا ہے کہ فلسفیانہ مباحث میں جس دروازے سے ہم داخل ہوتے ہیں

اسی دروازے سے باہر بھی ہوتے ہیں، ہر فلسفی دوسرے فلسفی کے خیالات کا نقیض پیش کرتا ہے، تاریخ فلسفہ ان ہی متناقضات و نظری آرائے کا مجموعہ ہے جو کامیابی کے لحاظ سے مادی علوم مخصوصہ کی ترقی سے کسی طرح مقابلہ نہیں کر سکتی

حقیقت میں فلسفیانہ مباحث کے دوران میں یا تاریخ فلسفہ کے مطالعہ کے وقت اگر ہم اپنا دماغ دروازہ کے باہر چھوڑ کر جائیں تو بیشک اسی دروازہ سے نکل آئیں گے جس دروازے سے کہ ہم داخل ہوئے تھے! اکابر فلاسفہ کا سرسری مطالعہ کرنے کے بعد بھی ہزار ہا اہم مسائل کے متعلق ہم اپنے خیالات بدلے بغیر رہ نہیں سکتے۔ ہم خود فلاسفہ کے تناقضات کے متعلق بھی اپنی رائے بدلنے پر مجبور ہوں گے اور پائیں گے کہ بنیادی مسائل کے متعلق تقریباً تمام اکابر فلاسفہ کا اتفاق تھا، اختلافات محض اپنے اپنے زمانہ کے اصطلاحات و حدود کے فرق کی وجہ سے دکھائی دیتے ہیں۔ اور نیز اگر ہم تاریخ سائنس کے طالب علم ہیں تو ہمیں بادی النظر ہی میں یہ معلوم ہو جائے گا کہ فلسفہ سے زیادہ سائنس میں نظریات ...... اعتقادات سینما کے متحرک تصاویر کی طرح بدلتے رہتے ہیں۔ سائنس کی تاریخ ہزار ہا مسترد نظریات کی تاریخ ہے۔ مثال کے طور پر ہم چند عالمگیر اہمیت کے نظریات کا ذکر کریں گے:۔

آج سے پچاس پچپن سال پہلے کائنات کے ابتدائی توجیہ لاپلاس کے مفروضہ ضبابیہ "Nebula Hypothesis" سے کیجاتی تھی۔ کانٹ فلسفی نے اس نظریہ کو سب سے پہلے پیش کیا تھا، لاپلاس نے اس کی توضیح کی تھی، آج کل شکاگو یونیورسٹی کے پروفیسر چیمبرلین اور مولٹن نے اس کی توجیہہ "Planetesimal Hypothesis" پیش کی ہے جو اول الذکر نظریہ کی تردید کرتی ہے

پچاس پچپن سال پہلے ڈارون کی "Origin of species" (اصل انواع) ارتقائی انجیل سمجھی جاتی تھی آج کل یہ دنیا بھر کے اعتراضات کا نشانہ ہے اور اس کی وقعت کا حال سب کو معلوم ہے! عمل ارتقائی توجیہ تغیرات "Variation" کے بجائے "تحولات" (mutation) سے ہونے لگی، اب مسٹر کیامریر کے ساتھ ہم لامارک کے نظریہ کو پھر قبول کرنے لگے ہیں۔ ہمیں تفاوت راہ! نیوٹن نے حرکت کے بعض قوانین بنائے دنیائے سائنس نے ان کو قبول کیا، اب آئنسٹائن ان کی تردید کر رہا ہے۔ مے یر، رمفورڈ، ڈے وی، اور صدہا دیگر علمائے سائنس نے مادہ کی غیر فنا پذیری اور بقائے توانائی کو ثابت کیا اور ساڈی رذرفورڈ بینکارے جدید سائنس کے ان انتہائی عقاید میں شک پیدا کر رہے ہیں۔ پیرسن، ماخ وغیرہ ہم سے کہہ رہے ہیں کہ سائنس کا علم تخمینی احتمالات کا موجمیاں ہے، اور فطرت کے عدیم التغیر و ابدی قوانین مادہ کے مشاہدہ کردہ عادات کے اوسط کے سوا کچھ اور نہیں! بھلا ہم ایسی سائنس کی شان میں کیا کہیں جو فلسفہ کی طرح غیر یقینی ہو گئی ہے اور فطرت کے علم کا کیا دعویٰ کریں جس کے قوانین اعداد و شمار کی سی وقعت رکھتے ہوں! کسی زمانہ میں ریاضیات کو تیقن اور غیر خطا پذیر صداقتوں کا مجموعہ سمجھا جاتا تھا کہ ناگہاں ابعاد ثلثہ صاحب اولاد ہو گئے، جزء کل کے اتنا بڑا ہو گیا اور آئنسٹائن نے ثابت کر دیا کہ

دو نقاط کے درمیان ایک خطِ مستقیم بڑے سے بڑا فاصلہ ہے! فرانسس گالٹن اور کارل پیرسن کی تحقیقات کی رُو سے ماحول کا اثر توارث سے زیادہ تھا .... مسٹر دگم نے اس کے برخلاف بڑی شان سے دنیا کو یہ ثابت کر دکھلایا کہ توارث کا اثر ماحول کے اثر سے زیادہ ہے، اب ڈاکٹر واٹسن دو سو بچوں کا معائنہ کرنے کے بعد ہمیں اطلاع دے رہے ہیں کہ جنین اور بچہ کا ماحول اس کی سیرت در تاریخ کے تعین کا اہم جز ہے اور توارث کا اثر نہایت خفی ہے اور آسانی سے نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ آئے دن ہر ایمان دار تاریخ داں ثابت کر رہا ہے کہ تاریخ "جھوٹ کا دریا ہے" ہر ایمان دار "Egyptologist" سنین وسلسلہ ملوک کی ایک نئی فہرست پیش کرتا ہے جو دوسری فہرستوں سے چند ہی ہزار سال کا فرق رکھتی ہے!

سائنس کے نظریات کے عدیم التغیر ہونے کے ثبوت میں یہ مثالیں اہلِ بصیرت کے لئے کافی ہیں، اعمال نامے کو طول دینے کی ضرورت نہیں، فلسفی کی نظروں کے لئے تو یہ خوش کُن سرکس ہے! بحیثیت فلسفی، ہمیں اعتراف ہے کہ فلسفہ بعض جگہ تاریک ہے لیکن یہی حال شلی کی نظم کا ہے، یہی حال سائنس کا ہے، یہی حال جنس لطیف کا ہے، یہی حال ہر دلچسپ شے کا ہے! اس سے بدتر، ہم ماننے پر تیار ہیں کہ فلسفہ بعض دفعہ کذاب بھی ہے۔ ہم اپنے قلب کے عزیز تعصبات کو، بڑی ہی عورتوں کی دینیات کو خارجی یقینی عقل کے لباس میں ملبوس کرتے ہیں۔ اسی بنا پر ایک مشہور فلسفی براڈلے نے مابعد الطبیعیات کی اس طرح تعریف کی ہے کہ "مابعد الطبیعیات (فلسفہ) ان چیزوں کے لئے جن میں ہم جبلی طور پر یقین کرتے ہیں خراب حجتوں کا دریافت کرنا ہے، لیکن ان حجتوں کا دریافت کرنا بھی کچھ کم جبلی نہیں" لیکن باوجود ان تمام نقائص وخرابیوں کے سائنس کی طرح فلسفہ کی رفتارِ ترقی بھی متعین اور شاندار ہے، گزشتہ پچیس سال میں فلسفہ نے اسی سرعت وشان کے ساتھ ترقی کی ہے جس طرح کہ سائنس نے۔ ولیم جیمس جیسے محتاط وسائنٹفک فلسفی کے الفاظ میں، ہم کہہ سکتے ہیں کہ:-

"بعض حیثیتوں کے لحاظ سے تو "سائنس" نے "فلسفہ" سے کم ترقی کی ہے۔ یعنی اس کے اکثر کلی تصورات سے نہ ارسطو کو حیرت ہوگی اور نہ دیکارٹ کو اگر بفرض محال انھوں نے زمین کی سیر کا ارادہ کیا۔ اشیاء کا عناصر سے مرکب ہونا۔ انکار ارتقا، بقائے توانائی، ایک کلی لزوم یا جبر کا تصور، یہ سب انھیں معلوم ومعتاد چیزیں نظر آئیں گی۔ ہاں چھوٹی موٹی چیزیں مثلاً خوردبین، بجلی کی روشنی، ٹیلیفون، اور سائنس کی دیگر جزئیات ان کو ضرور مرعوب کریں گی۔ لیکن اگر یہ ہمارے مابعد الطبیعیات کی کتابیں کھولیں یا فلسفہ کے لکچر روم میں آئیں تو ہر چیز انھیں اجنبی سی معلوم ہوگی۔ ہمارے زمانہ کا سارا "تصوری" یا "انتقادی" پہلو انھیں نیا معلوم ہوگا اور ان کے سمجھنے میں انھیں دیر لگے گی" (بعض مسائل فلسفہ صفحہ ۲۴)

شاید اس تفصیلی بحث کے بعد آپ کو فلسفیانہ تعلیم کے فوائد کا بھی اندازہ ہوگیا ہوگا۔ فلسفہ آپ کو سب سے پہلے وحدت

فراہمی عطا کرتا ہے، ہم آپ سب فکر کے عمل میں غیر محتاط اور متناقص ہوتے ہیں، ہمیں کسی حد تک توافق و وفاق کی ضرورت ہے۔ فلسفیانہ تعلیم ہمیں وحدتِ فکر بخشتی ہے، اس وحدتِ ذہن یا وحدتِ فکر سے ہمارے خواہشات میں وحدت پیدا ہوتی ہے، اور اس کی وجہ سے سیرت میں وحدت پیدا ہوتی ہے جو شخصیت کا دوسرا نام ہے اور سیرت کی وحدت کی وجہ سے زندگی میں وحدت پیدا ہوتی ہے جو مسرت کا راز ہے اور جو ہم سے تماموں کی غایت قصوی ہے۔ اپیکورس شہنشاہِ خوش باشاں نے دو ہزار سال قبل اپنے ایک دوست کو خط لکھا تھا جس میں وہ کہتا ہے

"کسی شخص کو بھی جب تک وہ جوان ہے فلسفیانہ تعلیم حاصل کرنے میں دیر نہ کرنی چاہیئے، اور اگر وہ ضعیف ہے تو اس کو اس تعلیم کے حصول میں تھکن نہ ظاہر کرنی چاہیئے، کیونکہ وہ کون شخص ہے جو اپنی روح کی صحت کا علم حاصل کرنے میں وقت کی موزونیت و ناموزونیت و تاخیر کا خیال کرے گا؟ اور جو شخص یہ کہتا ہو کہ فلسفہ سیکھنے کا ابھی وقت نہیں یا وہ وقت گزر چکا، تو اس کی مثال اس شخص کی سی ہے جو یہ کہتا ہو کہ ابھی مسرت کا وقت نہیں آیا یا وہ گزر گیا!"

فلسفیانہ تعلیم سے انسان اپنی جذبات کی غلامی سے آزاد ہوتا ہے، جذبات کی غلامی سے آزادی حاصل کرکے دوسروں کی غلامی سے نجات پاتا ہے۔ روما کے ایک جادو بیان کے الفاظ میں ہم فلسفہ کو مخاطب کرکے کہہ سکتے ہیں:۔

"اے فلسفہ کی روح، اے ہماری زندگی کی رہنما، نیکی کی دوست اور بدی کی دشمن، تیرے بغیر ہم کیا اور ہماری زندگی کیا!"

میر ولی الدین ایم۔ اے (جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن)

اولی الالباب سے خطاب

جناب مولوی سعید الدین صاحب ایم۔ اے۔ ایل ایل بی سب جج بریلی کا وہ مشہور رسالہ جو کئی سال قبل شایع ہوکر ہاتھوں ہاتھ نکل گیا۔ اس میں صاحب موصوف نے قرآن کی اہمیت اور اس کو سمجھ کر پڑھنے پر نہایت دلکش انداز میں روشنی ڈالی ہے ـــ اس کا مطالعہ خواتین کے لئے از بس ضروری ہے ـــ ۵ ر کے ٹکٹ بھیج کر حاصل کیجئے

منیجر نگار لکھنؤ

رجونتی

یوں تو برسات کی ہر شام خوشگوار ہوتی ہے لیکن جب کئی روز تک مسلسل بارش ہونے کے بعد فطرت کا جوش کچھ کم ہوتا ہے تو کھیتوں اور میدانوں کی کشش دو چند ہو جاتی ہے، درخت اور پودے نہا دھو کر نیا روپ اختیار کر لیتے ہیں اور شام کی تابناک شفق ہر چیز کو اپنے ساحرانہ لمس سے زرکار بنا جاتی ہے

سئی ندی کے کنارے کشن پور کا چھوٹا مگر خوبصورت گاؤں آباد تھا - اور دوسری جانب مقابل میں رسول آباد کا بازار تھا، جہاں دوشنبہ اور جمعہ کو جب خاص طور پر بازار لگتا تھا اچھی خاصی چہل پہل ہو جاتی تھی، برسات کے علاوہ ہر موسم میں دریا اس قدر پایاب رہتا تھا کہ لوگ آسانی سے ادھر ادھر آجا سکتے تھے البتہ جب بارش ہوتی تو سئی ندی میں چھوٹی چھوٹی کشتیاں چلنے لگتیں

کشن پور میں سیتل اور شنکر دو ملاحوں کے مکان تھے، مچھلیوں کے علاوہ برسات میں یوں بھی کچھ آمدنی ہو جاتی تھی، شنکر کے کئی لڑکے اور لڑکیاں تھیں جنمیں سرجو سب سے بڑا تھا اس کی عمر اکیس سال کے قریب تھی اس کی شادی ابھی کہیں نہیں ہوئی تھی کیونکہ قرب و جوار میں کسی اور ملاح کا مکان ہی نہ تھا، سیتل کے صرف ایک لڑکی رجونتی تھی جس کی عمر سولہ سترہ برس کے قریب تھی سیتل اور شنکر ماجھی نے تو خیر آپس میں طے ہی کر لیا تھا لیکن عام طور پر بھی سارے گاؤں میں یہ خبر مشہور تھی کہ سیتل ماجھی کی کنول جیسی خوبصورت لڑکی کا بیاہ سرجو کے ساتھ ہوگا - سرجو اپنے کام میں بہت ہوشیار تھا لیکن رجونتی اور زیادہ قابل ستائش تھی کہ ماں کے مرنے کے بعد ہی گھر کا سارا کاروبار اس نے سنبھال لیا تھا - چھوٹے چھوٹے گاؤں میں ہر شخص کسی نہ کسی خاص بات میں ایک امتیازی شان رکھتا ہے، اور چونکہ لوگ کم ہوتے ہیں - اس لئے ہر شخص ایک دوسرے سے اچھی طرح واقف ہوتا ہے - سرجو بہت ہونہار اور محنتی لڑکا سمجھا جاتا تھا - اور رجونتی بھی فراوانی حسن کے ساتھ ساتھ فرمانبرداری کا اعلیٰ نمونہ خیال کی جاتی تھی

کئی دن تک مسلسل بارش ہوتی رہی اور لوگ گھر پر پڑے پڑے کاہلی اور سستی محسوس کرنے لگے، علاوہ اُن لوگوں کے جن کی ضرورتیں نہایت اہم تھیں تمام لوگوں نے اپنا اپنا کام بارش کے بند ہو جانے پر اٹھا رکھا تھا، سنیچر کے روز سے پانی برسنا شروع ہوا تھا گاؤں کے بڑے بوڑھوں نے نہایت سنجیدگی اور یقین کے ساتھ حکیمانہ انداز

میں پیشینگوئی کردی تھی کہ پانی سنیچر کے پہلے بند ہو ہی نہیں سکتا...... اور ہوا بھی یہی! جب لوگ اتوار کی صبح کو سو کر اٹھے تو آسمان صاف تھا اور یہ معلوم ہو رہا تھا کہ کوئی حسین دوشیزہ بڑی التجاؤں کے بعد نقاب اٹھا کر مسکرا رہی ہے

سیتل کئی روز سے بیمار تھا اُس کا ارادہ تھا کہ وہ کشتی نہ کھوے گا لیکن دوشنبہ کے دن اس قدر زیادہ لوگ رسول آباد بازار جانے کو تیار ہوئے کہ اس نے رجونتی کو بُلا کر کہا۔ "میرے کوئی بیٹا ہوتا تو آج میں بھی اطمینان سے بیٹھتا۔ آج آمدنی کی بہت امید ہے اور میرے بازوؤں میں دریا کی موجوں سے لڑنے کی قوت نہیں، دو چار کھیوے تو ہی اُس پار پہونچا دے میں آج کل تیرے بیاہ کے لئے کوڑی کوڑی جمع کر رہا ہوں" رجونتی نے سر جھکا لیا اور چلی گئی اس نے ایک منٹ وقت بھی ضایع نہ کیا، باپ کے لئے تھوڑا بہت کھانا تیار کرکے وہ گھاٹ کی طرف روانہ ہو گئی۔

رجونتی کو بانسری بجانے سے بڑا اُنس تھا، اور اُس کی فرصت کے لمحے اسی مشغلہ میں صرف ہوتے تھے، بانسری اُس کی زندگی کا ایک جزو بن گئی تھی، وہ اکثر شام کے وقت سئی کی رنگین لہروں پر اپنی کشتی تیرا دیتی اور بانسری کے نغموں سے شام کی غمگینی کو طرب ناک بنا دیتی، ہوا میں سکون ہوتا اور کشتی کے ہلکے ہلکے ہچکولوں سے دریا میں چھوٹی چھوٹی موجیں اٹھتی تھیں تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ رجونتی کے گیت سطح آب پر رقص کر رہے ہیں، اندھیری رات میں تو کم مگر شبِ ماہ میں اکثر مشتاق کان رجونتی کے گیتوں سے محظوظ ہوتے تھے، سرجو بھی کبھی کبھی کشتی میں بیٹھ کر اُسی وقت دریا میں تفریحاً نکلتا تھا اور اکثر دبی زبان سے یہ بھی کہہ دیتا تھا

"رجون! ہمیں تمھارے گیت بہت بھلے معلوم ہوتے ہیں" اس جملہ میں نہ جانے کس قدر ہمت افزا اثر ہوتا کہ رجونتی اور زیادہ انہماک سے بانسری بجاتی اور اپنے سب سے زیادہ مسحور کُن گیت گاتی

باپ کے کہنے کے مطابق رجونتی نے کشتی کھولی اور بہت سے لوگوں کو رسول آباد پہونچا آئی جب تک لوگ بازار کی خرید و فروخت میں مشغول تھے رجونتی اپنی کشتی میں بیٹھی ہوئی اُس کا پانی جو تختوں کے اندر سے آگیا تھا نکال کر باہر پھینکتی رہی، سئی ندی سے ایک نالا نکل کر گاؤں کے اندر ہی کچھ دُور تک چلا گیا تھا، اُسی پر ایک پُل بنا ہوا تھا جہاں شام کے وقت لوگ تفریح کی غرض سے آتے تھے، بازار کی مشغولیت کی وجہ سے سوا دو چار بچوں اور لڑکوں کے پُل پر کوئی نہ تھا کہ یکایک کسی چیز کے پانی میں گرنے کی آواز آئی، بازار میں کافی شور و غل تھا اور یہ آواز کسی کو اپنی جانب متوجہ نہ کر سکی، چھوٹے لڑکوں نے شور مچانا شروع کیا کچھ لوگ دوڑ پڑے لیکن سب سے پہلے جو شخص دریا کے بہاؤ میں تیرتا ہوا نظر آیا وہ ایک عورت تھی۔ برسات کی وجہ سے نالے میں بہت زور تھا۔ لیکن رجونتی نے کچھ

ہی دُور پر لڑکے کو پانی کی متلاطم موجوں سے چھڑا لیا اور اطمینان سے پیرتی ہوئی کنارے پہونچ آئی

بچے کے پانی میں گرنے کی خبر بات کی بات میں رسول آباد کے گوشے گوشے میں گونج گئی، پردہ نشین ماؤں نے گھر کے اندر اور دروازوں کی آڑ سے اپنے بچوں کا جائزہ لیا، باہر نکلنے والی عورتیں چشم زدن میں پُل پر جمع ہو گئیں، لڑکے کا باپ مہادیو اور بڑا بھائی کوشل بھی پہونچ گئے، لڑکے کی حالت خطرناک نہ تھی صرف غشی طاری تھی جو دو تین دیہاتی ترکیبوں سے جاتی رہی۔ جب بچے کی حیات کی طرف سے اطمینان ہو گیا تو لوگ رجونتی کی طرف مخاطب ہوئے۔ وہ ایک سیاہ ساری میں لپٹی ہوئی خاموش کھڑی تھی۔ اس کے سیاہ بال حسین چہرے پر بکھرے ہوئے تھے، اس کا لباس پانی میں تر ہو کر اس کے جسم سے لپٹ گیا تھا اور اُس کے تناسب اعضاء کو اور نمایاں کر رہا تھا، سارا بازار لوٹ پڑا تھا اور سب اسی کو دیکھ رہے تھے، وہ ساکت کھڑی تھی۔ اور سیکڑوں نگاہیں، استفسارانہ انداز میں اُس پر پڑ رہی تھیں، لوگوں کے دو چار سوالات کا جواب دیکر رجونتی اپنی کشتی کی طرف چل دی، مجمع کا ایک حصہ اس کے ساتھ ساتھ وہاں تک بھی گیا، اس نے اپنی ساری کا پلو نچوڑا اور کشتی میں لوگوں کی نگاہوں کا مرکز بن کر بیٹھ گئی، اُس کی شہرت میں اضافہ ہو گیا، کسی نے اس کی ہمت کی تعریف کی، کسی نے اس کی قوت کو سراہا، کسی نے اس کی پیراکی پسند کی، لیکن ان سب سے زیادہ لطیف اور مؤثر وہ ادا تھی جس کی دیکھنے والی صرف ایک نگاہ اور جس سے متاثر ہونے والا ایک ہی دل تھا

ہر ایک نے رجونتی کو اس لئے دیکھا کہ وہ عورت ہو کر اس قدر ہمت دکھا سکی لیکن کوشل نے اُسے اس لئے دیکھا کہ اس کی نگاہوں نے حسن و نسائیت کا اتنا مکمل امتزاج کبھی نہ دیکھا تھا۔ لوگوں نے اُسے تحیر کی نگاہوں سے دیکھا لیکن کوشل نے اُسے اپنی نگاہوں میں جذب کر لینے کے لئے دیکھا، لوگوں نے اُسے ظاہری نگاہوں سے دیکھا اور شام ہونے کے پہلے ہی چلے گئے لیکن کوشل دریا کے کنارے پر کھڑا ہوا کشتی کے چلے جانے کے بعد تک اسے دیکھتا رہا، دیکھنے والوں نے دو گھنٹے بعد اُسے بھلا دینے کے لئے دیکھا تھا لیکن کوشل نے اُسے ہمیشہ یاد رکھنے کے لئے دیکھا...... رجونتی نے آفتاب کے غروب ہوتے ہوتے اپنے تمام گاہکوں کو اس پار پہونچا دیا اور ساری کمائی بیمار باپ کے ہاتھ میں لا کر ڈال دی۔

کوشل بنارس ہندو یونیورسٹی کا ایم۔ اے کا طالبعلم تھا، صحت کے لحاظ سے وہ ہمیشہ کمزور اور نازک رہا، محنت کی وجہ سے اس کی تندرستی خراب ہو گئی تھی۔ اور ڈاکٹروں نے ایک سال تک سلسلۂ تعلیم بالکل منقطع کر دینے کی رائے دی تھی، مکان پر رہ کر کوشل کی صحت درست ہونے لگی تھی۔ اب وہ روزانہ شام کو اُس طرف ٹہلنے جاتا جس طرف سے رجونتی کے آنے کی اُمید ہوتی، یوں تو کبھی کبھی لیکن دوشنبہ اور جمعہ کو اکثر رجونتی کشتی لے کر

رسول آباد آتی تھی، کوشل اُسے جس قدر بھی دیکھ سکتا تھا دیکھا کرتا، اُس کی خاموش محبت کوئلے کے نیچے دبی ہوئی چنگاری کی طرح اس کے سارے وجود پر چھائی جا رہی تھی اور وہ وقت قریب تھا جب محبت کے شعلے بھڑک کر کوشل کو جلا دیں

رجونتی جب بانسری بجاتی اور اپنے محبت سے بھرے ہوئے نغمے چھیڑتی تو وہ خود تصور میں کسی ایسی ہستی کو ڈھونڈھتی جس پر پریم سے بھرے ہوئے گیت صادق آئیں۔ جب وہ سرجو کے پسندیدہ گیت گاتی تو تنہائی میں بھی سرجو کی حریص نگاہیں اپنی آنکھوں سے ملتے ہوئے دیکھتی تھی، ادھر جب سے کوشل بار بار اُسے نظر آیا تھا اُسے یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے تمام گیت اُسی کے حضور میں پیش کر رہی ہے

ایک روز رجونتی اپنی ذاتی ضرورت سے کشتی لے کر رسول آباد آئی، کوشل حسب معمول آج بھی منتظر تھا، محبت میں عزائم کی تیاری اور شکست، منصوبوں کا بندھنا اور ٹوٹ جانا، تاویلات کا قائم ہونا اور مٹ جانا معمولی باتیں ہیں، جب تک محبوب نگاہوں کے سامنے ہے۔ اُس وقت تک دل، دماغ اور آنکھیں سب محو نظارہ ہیں، لیکن وہ نگاہوں سے اوجھل ہوا اور دل و دماغ فکر میں مشغول ہوئے، کوشل نے کئی دفعہ ارادہ کیا کہ رجونتی کی کشتی میں بیٹھ کر تھوڑی دیر دریا کی تفریح کرے۔ لیکن اُسے کوئی قوت روکتی نظر آتی تھی، آج جبکہ بالکل سناٹا تھا کوشل ہمت کر کے ساحل آب کی طرف اضطراری طور پر بڑھا، قریب پہونچ کر ٹھہر گیا، جب تک رجونتی کشتی باندھتی رہی وہ اپنے جملے درست کرتا رہا جن کے ذریعہ سے وہ رجونتی سے مخاطب ہوگا، رجونتی کشتی باندھ کر کوشل سے ایک گز کے فاصلہ سے گذر گئی اور کوشل ایک بت کی طرح کھڑا رہ گیا، جب رجونتی بازار کی گلیوں کے پیچ و خم میں غائب ہو گئی اُس وقت کوشل نے مڑ کر جانے والی کی طرف نگاہ کی

مایوسی کا انتظار تکلیف دہ ہوتا ہے اور امیدوں کا انتظار ایک شیریں خواب کی طرح پُر کیف، کوشل کو اطمینان سا تھا کہ رجونتی ابھی واپس آئے گی، اس نے اس کے جذبات کی کوئی حد نہ تھی، وہ دریا میں اٹھتی ہوئی لہروں کو اپنے خیالات کے مد و جزر کے مقابلہ میں ہیچ سمجھ رہا تھا. . . . . دُور سے رجونتی آتی ہوئی نظر آئی اور کوشل کے تمام منتشر خیالات سمٹ کر صرف اس آرزو میں تبدیل ہو گئے کہ رجونتی کے ساتھ دریا کی سیر کر لے، وہ آئی اور کشتی میں بیٹھ گئی، ڈانڈ اٹھا کر چلنا ہی چاہتی تھی کہ کوشل کی تمنا اضطراری طور پر اُلجھے ہوئے الفاظ میں یوں نکل گئی۔ "میں بھی چلوں گا" بعض اوقات الفاظ احساساتِ عشق کے اظہار سے بالکل قاصر ہوتے ہیں محبت کی زبان ہی کچھ اور ہے اس کا راز گفتگو سے زیادہ خاموشی میں ظاہر ہوتا ہے پھر بھی رجونتی نے کوشل کا مقصد پا لیا، اُس نے ڈانڈ ہاتھ سے رکھ دیا کشتی سے اتر کر ساحل پر آگئی اور ایک طرف سر جھکا کر کھڑی ہوگئی کوشل بغیر کچھ کہے ہوئے کشتی میں سوار ہو گیا اس کے بعد رجونتی بھی آئی اور کشتی ایک طرف روانہ ہوئی،

ہوا مخالف چل رہی تھی اور کچھ عرصہ سے تند و تیز بھی ہو گئی تھی لہذا رجونتی کی زیادہ تر توجہ اُسی جانب تھی، اس کا چہرہ بار بار سُرخ ہو جاتا تھا، ہوا اس کے بالوں کو منہ پر لاکر منتشر کر دیتی تھی۔ اور اس کی ساری کا آنچل بار بار سر سے ڈھلک جاتا تھا۔ کوشل دیکھ رہا تھا اور مست رہا تھا، وہ چاہتا تھا کہ رجونتی کو کسی طرح یقین آجائے کہ وہ اس کی پرستش کرتا ہے اور پھر اس کے بعد کشتی دریا کی لہروں سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جائے تاکہ پھر محبت میں ناکامی کی کوئی امید ہی باقی نہ رہے۔ اس نے آہستہ آہستہ گفتگو شروع کی، گذشتہ بارش کے متعلق اظہار خیالات ہوتا رہا، فصل اور زراعت کے متعلق بات چیت ہوتی رہی اور وہی کوشل جسے فلسفہ کی کاہش میں اور نفسیات کی کتابوں کے سوا کوئی بات ہی پسند نہ آتی تھی۔ آج رجونتی سے دیہات کی معمولی باتوں پر زیادہ جوش اور مسرت کے ساتھ محو گفتگو تھا، وہ اس وقت محبت میں گم ہو کر خود کو تمام خیالات سے بیگانہ بنائے ہوئے تھا، اپنے بھائی کے بچائے جانے پر اُسے اب تک اظہار شکر کا موقعہ نہ ملا تھا۔ اس نے جی کھول کر شکریہ ادا کیا، اظہار قبولیت میں رجونتی کی جھکی ہوئی آنکھیں اور زیادہ ہیجان پیدا کر رہی تھیں، اگرچہ کہنے کی ضرورت نہ تھی لیکن کوشل نے کہدیا کہ میں تجھ سے محبت کرتا ہوں صرف اس لئے نہیں کہ تو خوبصورت ہے بلکہ اس لئے کہ تو صحیح معنوں میں عورت ہے، رجونتی کے خیالات کے عمق کا پتہ کون لگا سکتا ہے لیکن اس کی قوت گھٹتی ہوئی، اور کشتی دریا کے چڑھاؤ پر رُکتی ہوئی نظر آتی تھی، ایک طرف امواج آب میں تلاطم تھا دوسری طرف کوشل اور رجونتی کے پریم کی لہریں ضبط اور صبر کا باندھ توڑ کر باہر نکلی جا رہی تھیں، اظہار محبت کے لئے یہی ٹھیک وقت تھا کیونکہ ہر چیز محبت میں ڈوبی ہوئی نظر آرہی تھی، ہر طرف محبت کی بارش ہو رہی تھی........ رجونتی نے یکایک کشتی رسول آباد کی طرف پھیر دی اور بہت تیز چلانے لگی۔ کوشل نے گھبرا کر پوچھا "کیا واپس چل رہی ہو؟" رجونتی نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا "ہاں" کشتی دھارے پر تیزی سے روانہ ہوئی اور وہ وقت جسے کوشل ختم ہوتا ہوا نہ دیکھنا چاہتا تھا اور تیزی سے کٹنے لگا، گھبراہٹ میں کوشل کچھ بات چیت بھی نہ کر سکا۔ رجونتی نے وعدہ کیا کہ وہ اکثر ملا کرے گی۔ کشتی کنارے پر آگئی، کوشل اتر گیا اور جیب میں ہاتھ لے جاکر مزدوری نکالنا چاہتا تھا لیکن رجونتی کشتی لے کر کنارے سے دور جا چکی تھی، کوشل کے پکارنے پر اس نے صرف مڑ کر دیکھا اور بغیر کچھ کہے ہوئے کشن پور چلی گئی۔

اب کوشل اکثر رجونتی کے ساتھ سطح آب پر نظر آتا تھا دن گذرتے جاتے تھے اور دونوں میں محبت کے عہد و پیمان مستحکم ہوتے جاتے تھے........ رجونتی کی زندگی کا باب محبت قابل غور ہے، اُسے سرجو سے عشق تھا۔ اور کوشل سے محبت کرتی تھی، دونوں میں سے کسی ایک کو بھی وہ رنجیدہ دیکھنا نہ چاہتی تھی، اُسے یقین تھا کہ عنقریب اُس کی شادی سرجو سے ہو جائے گی۔ لیکن اس خیال نے کوشل کے التفات میں فرق نہ آنے دیا، وہ سرجو کو اپنا رفیق حیات سمجھتی تھی

اور کوشل کو محبت کئے جانے کے قابل جانتی تھی، لیکن اس نے کبھی یہ غور نہ کیا تھا کہ اگر سرجو اور کوشل ایک ہی وقت میں اس کے قریب ہوئے تو خود اس کی کیا حالت ہوگی یا اُن دونوں کے احساسات کا کیا عالم ہوگا۔ اس کے لئے اُسے زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا اور ایک روز جب رجونتی سرجو کے ساتھ سی ندی کے کنارے پر نہایت محبت سے مچھلیوں وغیرہ کے متعلق گفتگو کر رہی تھی کوشل بھی آگیا، سرجو نے تو اسی روز کہدیا۔ "رجون، تمھاری بات میرے ساتھ ہوچکی ہے اب تم کسی اور سے اس طرح نہ ملو نہیں تو لوگ کیا کہیں گے" یہ سنکر رجونتی چونک پڑی۔ اور دوسرے روز جب کوشل نے اُسے تنہا پاکر سرجو سے نہ ملنے کے لئے کہا تو رجونتی کے دل پر چوٹ سی لگی، اُسے محبت کرنا تو آتا تھا لیکن محبت کی ان پیچیدگیوں سے ناواقف تھی کہ وہ ایک ہی وقت میں دونوں کو خوش نہیں رکھ سکتی، اس احساس نے اُسے تڑپا دیا لیکن مجبور تھی، دونوں کا دل رکھنے کے لئے اُس نے دونوں سے وعدہ کرلیا

سیتل کی بیماری نے طول پکڑا اُس نے شنکر کو بلا بھیجا اور رجونتی کی شادی جلد کردینے پر زور دیا، رجونتی کو سوا اس کے کہ کوشل کو اس خبر سے تکلیف ہوگی اور کوئی رنج نہ تھا، سرجو کے ساتھ شادی ہونا اس کی دیرینہ تمنا تھی، شادی ہوگئی اور رجونتی قریب قریب ایک مہینے تک رسول آباد نہ جاسکی، کوشل اس واقعہ سے بالکل بے خبر تھا اُسے معلوم تھا کہ رجونتی کی شادی سرجو ہی کے ساتھ ہوگی لیکن اس کے اس قدر جلد ہوجانے کا یقین نہ تھا۔ ایک مہینہ بعد رجونتی کشتی لے کر رسول آباد آئی کوشل سے ملاقات ہونے پر رجونتی نے نہایت معصومیت سے اس کا اقرار کرلیا کہ وہ اب سرجو کی ہوگئی ہے، لیکن کوشل کو یہ بھی یقین دلانے کی کوشش کی کہ اس کی محبت میں کوئی کمی نہیں۔ کوشل اسے اپنی محبت کی ناکامی سمجھ رہا تھا اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کے قطرے چمکنے لگے۔۔

۔۔۔۔ یکایک اس نے رجونتی کا ہاتھ مضبوط پکڑ لیا اور اُسے گھور کر دیکھنے لگا رجونتی سہم گئی اور اُس نے مترحم نگاہوں سے کوشل کو دیکھا، ہاتھ کی گرفت ڈھیلی ہوگئی اور آنسوؤں کے وہ قطرے جو اب تک پلکوں پر آکر تھرتھرا رہے تھے گر کر زمین میں جذب ہوگئے۔ ٹھیک اُسی وقت سرجو بھی آگیا اُس نے دونوں کو خونناک نظروں سے دیکھا لیکن رجونتی کی حالت ہی کچھ عجیب تھی، جس طرح دو موٹر ایک ہی رفتار سے مخالف سمتوں میں گذر جائیں تو دونوں کے درمیان کی گرد اور سوکھی ہوئی پتیاں اپنی جگہ پر کانپ کر ساکت رہ جائیں گی اسی طرح رجونتی دونوں طرف کھنچ رہی تھی لیکن اُس کا سر پیچھے سے اوپر نہ ہوتا تھا۔ سرجو نے بڑھکر اس کا بازو تھام لیا اور ندی کی طرف کھینچ لے گیا، کوشل اپنی جگہ پر ایک جسد بے روح کی طرح کھڑا رہ گیا، دور پہونچ کر رجونتی نے ایک دفعہ مڑکر اُسے دیکھا اور پھر ایک وفا شعار بیوی کی طرح سرجو کے قدموں میں گر کر رونے لگی

سیتل کا انتقال ہوگیا، باپ کی موت نے رجونتی پر بڑا اثر کیا وہ سُست رہنے لگی، سرجو اب خودکشی ہے کر جاتا تھا اس نئے رجونتی کو بہت کم تکلیف دی، دونوں کی ازدواجی زندگی نہایت پُر مسرت تھی، اسی اثنا میں کوشل پر مرض کا سخت غلبہ ہوگیا، اس کی کمزوری بہت بڑھ گئی اور ڈاکٹروں کے مشورہ سے وہ کچھ دنوں کے لئے پہاڑ چلا گیا، جب سردی ناقابلِ برداشت ہوگئی تو وہ واپس آیا اور دو چار مہینے ادھر اُدھر رہ کر پھر منصوری چلا گیا، رسول آباد میں اس کا کوئی ایسا رازدار دوست نہ تھا جس سے رجونتی کے متعلق کچھ معلومات حاصل ہو سکیں اس لئے وہ ادھر سے بالکل بے خبر تھا لیکن یہ ضرور ہے کہ کبھی رجونتی کے خیال سے غافل نہیں رہا

کشن پور میں سخت طاعون پھیلا، موت کا شکار ہونے والی ہستیوں میں سب سے زیادہ عبرتناک سرجو کی ذات تھی، اس کی جوانی کی موت نے سارے گاؤں کو صدمہ پہونچایا، رجونتی پر سخت اثر ہوا، اس کا دماغ ماؤف ہوگیا اس نے گاؤں میں رہنا ترک کر دیا اور دن رات سئی کے کنارے گذارنے لگی، وہ گیت جن سے کسی وقت سرجو پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی اور بعض اوقات وہ جوشِ محبت میں رجونتی کو سینے سے لگا لیا کرتا تھا..... وہی گیت اب اس کے جنون کو کچھ دیر کے لئے پسِ پشت ڈال دیتے اور وہ تصور میں سرجو کے گلے میں باہیں ڈال دیتی جب تھک جاتی تو آہستہ آہستہ کسی سے باتیں کرتی۔ یہی اس کا دن بھر کا مشغلہ تھا، سرجو کے چھوٹے بھائی بہن کبھی کبھی کھانے پینے کے لئے کچھ لاتے تھے۔ اور وہ دوسرے تیسرے دن کچھ کھا لیتی تھی، جب لوگوں نے اُسے گھر میں آکر رہنے پر مجبور کیا تو ایک روز وہ کہیں غائب ہوگئی

کوشل تندرست ہوکر رسول آباد آیا اور سب سے پہلی فرصت میں کشن پور پہونچا۔ رجونتی کے متعلق تو کچھ دریافت نہ کر سکتا تھا لیکن اُس نے لوگوں سے سرجو کا حال دریافت کیا، اُسے مفصل کیفیت معلوم ہوئی، رجونتی کے پاگل ہو کر کہیں غائب ہو جانے کے خیال سے وہ کانپ اٹھا، محبت کی پہلی توہین بھول چکا تھا۔ اور وہ تمنائیں جو کوہستان کی محبت آمیز فضا میں اس کے سینہ میں پیدا ہوئی تھیں یک بیک مُردہ ہوگئیں اُسے خوب معلوم تھا کہ رجونتی سرجو کی ہے لیکن اُس چہرہ پر ایک نظر ڈال لینا ہی کافی تھا

گرمی بھی گذر گئی اور کوشل پھر بنارس واپس ہوا کہ اپنی تعلیم مکمل کرے۔ اُسے محبت کی دنیا میں سناٹا نظر آرہا تھا، اُس کی آنکھیں ہر وقت کسی کی جستجو میں سرگرداں رہتی تھیں، جس روز طبیعت زیادہ اُداس ہوتی تھی اُس دن وہ گنگا کے کنارے بیٹھ کر اپنا وقت اُن دنوں کی یاد میں کاٹ دیتا جن میں رجونتی اس کے احساسات محبت کو لطیف سے لطیف تر بنایا کرتی تھی، دریا خوب بڑھا ہوا تھا، کوشل کو اس کی موجوں کی طرح سکون نہ

تھا، وہ کنارے کنارے ہی کنارے پر دُور تک چلا گیا، واپس ہونا چاہتا تھا لیکن اس کے قدم آگے ہی کی طرف اُٹھ رہے تھے ...... دُور سے اُسے بانسری کی آواز سُنائی دی، وہ دیوانوں کی طرح بڑھتا چلا گیا اور آواز اُس کے وجود کے ہر ذرّے میں سرایت کر گئی، اب وہ غلطی نہ کر سکتا تھا، یہ رجونتی کی آواز تھی اور اُسی کے گیت! کوشل درختوں اور جھاڑیوں کی آڑ سے نکل کر رجونتی کے پیچھے آ گیا، رجونتی نے مڑ کر دیکھا اور پھر اپنے گیتوں میں منہمک ہو گئی، دو چار آدمی قریب کے کھیتوں میں کام کر رہے تھے لیکن کوئی بھی خاص طور پر رجونتی کی طرف مخاطب نہ تھا۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ عرصہ سے اس کو اسی حال میں دیکھ رہے ہیں۔ کوشل نے خوشی اور تعجب سے ملی ہوئی آواز میں "رجونتی" کو آواز دی رجونتی پر کوئی اثر نہ ہوا، کوشل بیٹھ گیا اور پوچھنے لگا "مجھ کو نہیں پہچانتی؟ رجونتی! میں نے تجھ کو کہاں کہاں ڈھونڈھا" رجونتی نے کہا "پہچانتی کیوں نہیں" کوشل کی اُمیدیں بیدار ہونے لگیں اُس نے پوچھا "اچھا بتاؤ میرا نام کیا ہے؟"

"میں نہیں جانتی، نہیں، نہیں، میں نہیں جانتی" رجونتی نے چیخ کر کہا کوشل گھبرا گیا اور کہنے لگا "رجونتی کیا کوشل کو بھلا دیا؟" رجونتی بہت زور سے ہنسی اُس کے قہقہے میں دردناک ترنم تھا۔ اس نے کہا "کوشل! کوشل بھی مر گیا اور سرجو بھی —— دونوں —— ہاں کوشل بھی، سرجو بھی — کوشل اور سرجو"

"رجونتی مجھے پہچان میں کوشل ہوں!"

"نہیں نہیں جھوٹ ہے۔ کوشل اور سرجو دونوں وہ ہیں" اُس نے پانی کی طرف اشارہ کیا۔ اور فوراً دریا کی موجوں سے ہم آغوش ہو گئی، کوشل بھی فوراً ہی کود پڑا لیکن گنگا کی لہریں اُسے دُور بہا لے گئیں، لوگ دوڑے اور بڑی کوششوں سے دونوں کو نکالا رجونتی سرجو سے مل چکی تھی اور کوشل بیہوش تھا

کوشل اب بیمار اور سُست رہتا ہے اور گنگا کی پرستش صرف اس لئے کرتا ہے کہ رجونتی اُس کی گود میں ہے

احتشام (رضوی)

گلہائے جعفری

یعنی مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی کے کلام کا انتخاب از نیاز فتحپوری۔ ابتدا میں جناب نیاز نے مختصراً لکھنوی شاعری پر تبصرہ بھی کیا ہے۔ ۵ر کے ٹکٹ بھیج کر حاصل کیجئے

منیجر نگار لکھنؤ

انسان کی لازوال عظمت

"جب میں آکاش پر غور کرتا ہوں جو تیری قدرت کی کاریگری ہے، اور جب چاند اور ستاروں
پر نظر ڈالتا ہوں جو تو نے منظم کیے ہیں، تو سوچتا ہوں کہ انسان کیا ہے جو تجھے اس کا خیال ہو،
اور ابن آدم کیا ہے جو تو اس کو باریابی بخشے،
تاہم تو نے اس کو اپنے سے دوسرے درجہ پر فائز کیا ہے، اور اس کو عزت و فضیلت سے سرفراز
فرمایا ہے" (انجیل، حمد ۸: ۳: ۵)

قدیم عبرانی حمد کی یہ پاکیزہ شاعرانہ عبارت انسان کی بے بضاعتی اور نیز اُس کی عظمت کا خیال نہایت واضح الفاظ میں ظاہر کر رہی ہے۔ جب انسان رات کے وقت عالم بالا کی حیرت انگیز اور لامتناہی وسعت پر نظر ڈالتا ہے اور اس فضائے بسیط میں چاند اور ستاروں کو اس شان و شوکت کے ساتھ درخشاں دیکھتا ہے تو اس پر اپنی بے بضاعتی اور مناظر فطرت کے رعب و جلال کی ایسی کیفیت ... طاری ہو جاتی ہے کہ بے ساختہ اپنے عجز و نیاز کا اس طرح اقرار کرتا ہے۔ "انسان جو ایک ذرۂ بے مقدار ہے اس کا تجکو کیوں خیال ہو، اور تو کیوں ابن آدم کو باریابی بخشے" یہ اُس کا جذبۂ اولین ہے، لیکن اس کے بعد ہی کوئی چیز اس کو اپنی طرف کھینچتی ہے جس سے اس کی یہ ظاہری بے بضاعتی اور کم مائگی ستاروں کی عظمت سے بھی زیادہ معلوم ہونے لگتی ہے اور وہ اس طرح اپنے خیال کا اظہار کرتا ہے " تاہم تو نے اُس کو اپنے سے دوسرے درجہ پر فائز کیا ہے، اور اس کو عزت و فضیلت سے سرفراز فرمایا ہے"

قدرت کی عظمت اور بالخصوص عالم بالا کی غیر محدود وسعت اور شان و شوکت کے مقابلہ میں انسان کی بے بضاعتی کا خیال ہر زمانہ میں زبان زد خلایق رہا ہے اور آج بھی ہے۔ آج جبکہ فلکیات کے متعلق جدید انکشافات نے فضائے بسیط کی وسعت و عظمت میں غیر معمولی اضافہ کر دیا ہے جس کا عہد عتیق کے مفکرین تصور بھی نہیں کر سکتے تھے اسوقت سے انسان کی بے بضاعتی اور زیادہ متوثق ہو گئی ہے

جس وقت قدیم عبرانی مصنف نے آسمان کی طرف نظر اُٹھائی تو کیا دیکھا؟ ایک وسیع فضا جس کو وہ آسمان کہتا تھا، جو خیمہ کی طرح زمین پر چھایا ہوا تھا جس میں سورج، چاند اور ستارے کسی پُراسرار طریقہ سے جڑے ہوئے تھے، جن کی

علت غائی صرف یہ بھی کہ وہ انسان کو موسموں کی تبدیلی کے نشانات بتلائیں اور زمین کو روشنی دیں، سب زمین کے چاروں طرف گھومتے تھے، اور زمین کے مقابلہ میں بہت ہی چھوٹے تھے اور عبرانی مفکر کے علم میں زمین کائنات کی سب سے بڑی چیز تھی اور وہ بھی اس کے تصور کے مطابق ہماری آج کی زمین کے مقابلہ میں بہت ہی محدود تھی

علم ہیئت کی جدید ترقی نے ان تمام خیالات میں ایک انقلاب پیدا کر دیا ہے - کیونکہ نہ تو وہ اجرام فلکی کا مرکز ہے اور نہ کائنات میں سب سے بڑی چیز ہے بلکہ برعکس اس کے جسامت کے اعتبار سے موجودات میں اس کی نسبتی حیثیت ایک ذرہ سے زیادہ نہیں - خاموش پُراسرار اور تغیر پذیر چاند ایک زرد آسمانی چراغ کے بجائے کرۂ میں تبدیل ہوگیا، سورج زمین کے چاروں طرف گردش کرنے کی بجائے قایم ہوگیا اور زمین معہ دیگر سیاروں کے اُس کے گرد گھومنے لگی، ستارے مشعل شب کی بجائے عظیم الجثہ کرّوں میں منتقل ہوگئے جن کے گرد بڑی بڑی دنیائیں چکر لگا رہی ہیں - اگرچہ خود ہمارے نظام شمسی کی وسعت بھی کچھ کم نہیں ہے لیکن وہ بھی خلاء کے ایک قلیل ترین گوشہ میں واقع ہے جبکہ اُس کے گرد وپیش لاتعداد اور لامحدود نظام شمسی پھیلے ہوئے ہیں

پھر اگر دنیائے قدیم کے انسان کو اپنی اس قلیل کائنات کے مقابلہ میں اپنی بے بضاعتی اور عجز کا اقرار تھا تو دُنیائے جدید کے انسان کے بارہ میں کیا کہا جا سکتا ہے جو جدید علم ہیئت کی ظاہر کردہ کائنات کے درمیان رہتا ہے اور جس کو قدیم عبرانی کائنات سے وہی نسبت ہے جو آفتاب کو ذرہ سے ہے

پھر جس طرح اس عہد میں انسان اپنی بے بضاعتی کا احساس کرتا تھا بالکل اسی طرح آج بھی وہ سوال کر سکتا ہے کہ کیا لامتناہی کائنات خالق اور ان تمام ستاروں اور کہکشاؤں کا تعمیر کنندہ انسان کی پرواہ کرتا ہے! کیا اس بات کے فرض کرنے کی کوئی معقول وجہ ہے کہ خدا کے نزدیک ہماری ننھی ننھی جانیں قطرۂ شبنم یا حباب دریا سے زیادہ وقیع، اہم اور مفید ہیں

میں سمجھتا ہوں کہ ہم میں سے ہر ایک کو اس قسم کا تجربہ ہوا ہوگا - آپ آدمیوں کی ایک بڑی جماعت کے درمیان سے گذرتے ہیں جن میں سے آپ نے نہ تو پہلے کسی کو دیکھا ہے اور نہ آیندہ دیکھنے کی توقع ہے - آپ اپنے سے سوال کرتے ہیں کہ یہ کون لوگ ہیں اور ان کی زندگی کا کیا مقصد ہے اور یہ کھیتوں پر اڑنے والے پرندوں کے گروہ سے یا دھوپ میں مجتمع ہونے والے جراثیم سے کس بات میں ممتاز ہیں؟ اگر کرۂ قمر سے جو دوسرے کرّوں کے مقابلہ میں دنیا سے سب سے زیادہ نزدیک ہے خواہ کتنی ہی طاقت کی دُوربین لگا کر باشندگان زمیں کو دیکھا جائے - تو کوئی بھی نظر نہیں آسکتا اور یہ فاصلہ پرند، جراثیم اور انسان سب کو مساوی القامت بنا دیتا ہے

آپ کسی شہر میں ایک بلند مقام سے جہاں تک آپ کی نظر جائے اُن ہزارہا آدمیوں کو دیکھیے جو چاروں طرف پھر رہے ہیں تو وہ آپ کو فرش پر رینگنے والی چیونٹیوں سے زیادہ بڑے نظر نہ آئیں گے - اور وہ شہر آپ کو دیمک کا ٹیلہ معلوم

ہوگا۔ اسی طرح سے آپ دوسرے تمام شہروں، قصبوں، اور دیہات کو قیاس کر سکتے ہیں کہ ان میں مختلف الاقسام چیونٹیاں آباد ہیں جو کسی دوسرے کرہ سے نہیں بلکہ اسی کرہ پر صرف چند میل کے فاصلہ سے ناقابلِ امتیاز ہیں

نسل انسانی کو اپنے ان کارناموں پر بہت بڑا فخر ہے جو اس نے اس دنیا میں کئے ہیں۔ اس کو اپنی زراعت پر، تجارت پر، براعظموں کا احاطہ کرنے والی ریلوں پر، سمندروں کو عبور کرنے والے عظیم الشان جہازوں پر، سر بفلک کشیدہ عمارتوں والے شہروں پر، چشم زدن میں گرد زمین خبریں پہونچانے والے لاسلکی پیغامبروں پر اور بلند پرواز طیاروں پر ناز ہے۔ لیکن اگر مریخ اور زہرہ پر آبادی ہے تو وہاں کے کسی باشندہ کو ان تمام باتوں میں سے ایک بات کا بھی علم نہیں۔ پس اس طرح سے ہماری دنیا کے اہم ترین واقعات صرف ہم ہی تک محدود معلوم ہوتے ہیں اور فضائے بسیط میں ہمارے قریب ترین ہمسایوں کو اُن کی پرچھائیں بھی نظر نہیں آتی

پھر اگر ہم ایک ہی نظام کے دیگر اراکین سے اسقدر بے تعلق ہیں کہ جو کچھ ہم کرتے ہیں وہ نہ تو ان کو معلوم ہوتا ہے اور نہ اُن کے واسطے کوئی اہمیت رکھتا ہے، تو ان تمام دیگر نظاموں کے بارہ میں کیا کہا جا سکتا ہے جو ہمارے مختصر نظامِ شمسی کے حدود سے باہر یا غیر محدود فاصلوں پر واقع ہیں اور شب تار میں اقصائے عالم کو منور کر دیتے ہیں؛ اور پھر اس بے نیاز ہستی کے متعلق کیا خیال کیا جا سکتا ہے جو ان سب کا خالق اور حاکم ہے؟ ایسے ایسے اہم اور غیر مختتم انتظام کی موجودگی میں اس خالق اکبر کو انسان جیسی بے ثبات مخلوق کا کیا خیال ہو سکتا ہے جو اس خاکریزہ پر آباد ہے جس کو دنیا کہتے ہیں اور جو آفرینش کے ایک دُور افتادہ اور حقیر گوشہ میں ایک دُھندلے نشان سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی؟ کیا یہ فرض کر لینا حقیقت میں ایک نامناسب خود ستائی نہ ہوگی کہ ہم اُس کی توجہ کو اپنی طرف منعطف کرنے کی توقع کر سکتے ہیں! علاوہ بریں کیا ایک ہم جیسی بے وقعت مخلوق کے لئے موت کے بعد ایک حیات ابدی کا خواب دیکھنا ایک بہت بڑا گستاخانہ قیاس نہ ہوگا،

اسی طرح سے علم ہیئت کے جدید انکشافات بہت سے دماغوں پر انسان کی ذلت وحقارت کا نقش جما دیتے ہیں اور اس سے قبل انسان کائنات میں جو کچھ اپنی وقعت اور اہمیت سمجھتا تھا اس کا استیصال کر کے اس کی بے بضاعتی اور مایوسی میں اضافہ کر دیتے ہیں۔ لیکن اس کا ہمارے پاس کیا جواب ہے

یہ مسئلہ محض قیاسی نہیں ہے بلکہ بہمہ وجوہ عملی ہے۔ دنیا میں اس قسم کے سوالات آج ہزاروں جگہ پوچھے جاتے ہیں اور ہمارے چاروں طرف پوچھے جا رہے ہیں اور بہت سے ذی فہم اور سنجیدہ لوگ ان کا جواب دینے سے قاصر ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ بہت سی زندگیاں حقیقتاً تاریک ہو جاتی ہیں۔ اور کیا در حقیقت خود ہم میں سے بعض لوگوں پر ایسے لمحے نہ گذرے ہوں گے۔ جب اس قسم کے خیالات ان پر مسلط ہوئے ہوں۔ اس لئے ہمیں اس تاریک پردہ کو اٹھا کر حقیقت کے چہرے کو بے نقاب کرنے کی کوشش کرنا چاہیے۔

اس مسئلہ پر کئی پہلوؤں سے روشنی ڈالی جاسکتی ہے - اوّل یہ کہ کسی چیز کی اہمیت کا دارمدار محض جسامت پر نہیں ہوتا - ہماری دنیا کسی دوسری لاکھوں گنی بڑی دنیا سے لازمی طور پر اہمیت میں کسی طرح کم خیال نہیں کی جاسکتی اور انسان بھی محض اپنی جسمانی قلت کے باعث مادی حیثیت سے بھی لازمی طور پر غیر اہم تصور نہیں کیا جاسکتا - ہاتھی انسان سے بہ لحاظ جسامت کے بہت بڑا ہے لیکن اس کی جسمانی حیثیت اس کی اہمیت اور وقعت کو نہیں بڑھاتی دنیا کے بہت سے چھوٹے چھوٹے ممالک اپنے سے سیکڑوں گنا بڑے ملکوں سے اہمیت اور وقعت میں کہیں زیادہ ہیں ہزار ہا ریگستانوں کے مقابلہ میں یونان کا چھوٹا سا ملک زیادہ وقیع ہے - اور لندن جو روئے زمین پر ایک خال کی مانند ہے قطبین کے ایک درجن بڑے عظموں سے افضل ہے - ایک تنہا افلاطون، یا شکسپیر، یا ایسٹرع، یا بودھ دنیا کی تاریخ میں افریقہ کی تمام وحشی نسلوں سے اسی طرح زیادہ قابل قدر ہے جس طرح ایک ہیرے کا ٹکڑا ایک کوہ پیکر تودۂ خاک سے زیادہ قیمتی ہے - اسی طرح مختلف دنیاؤں کا موازنہ کرنے میں یہ بات بعید از قیاس نہیں ہے کہ چھوٹی دنیا بڑی دنیا سے بدرجہا زیادہ ترقی یافتہ ہو - ہمارا سورج باعتبار مادیت زمین سے تین لاکھ سولہ ہزار گنا زیادہ ہے اور بلحاظ جسامت کے بارہ لاکھ بچاس ہزار گنا بڑا ہے تاہم زمین پر اعلےٰ قسم کی زندگی پائی جاتی ہے جبکہ سورج میں غالباً کسی قسم کی حیات موجود نہیں ہے اور گمان غالب ہے کہ فضائے بسیط میں جس قدر بڑے ثوابت ہیں - وہ عام طور پر اپنے سیاروں سے بہت کم ترقی یافتہ ہیں

اس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ نسل انسانی محض ایک ناچیز کرہ پر آباد ہونے کے باعث لازمی طور پر ناچیز اور غیر اہم نہیں ہے - کیونکہ ایک ایتھنز جیسے چھوٹے مقام پر رہنے والا انسان محض اس وجہ سے حقیر نہیں سمجھا جاسکتا کہ وہ تاتار جیسے وسیع ملک میں رہنے کی بجائے ایتھنز جیسی چھوٹی جگہ میں رہتا ہے - اعلیٰ فطرت والی ممتاز ہستیاں چھ فٹ کے جسم میں بھی اس خوبصورت چھوٹی سی دنیا پر اسی احسن پیرایہ میں بسر کرسکتی ہیں جس طرح کہ چھ ہزار فٹ کے جسم میں کائنات کے بڑے سے بڑے کرہ پر کرسکتی ہیں

بہر نوع اگر ایک طرف یہ بات مسلم ہے کہ علم ہیئت کی موجودہ تحقیقات انسان کو ایک مورِ ضعیف ثابت کر رہی ہے تو دوسری طرف اس بات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ طبیعیات کے دیگر اکتشافات کا فیصلہ بالکل اس کے برعکس ہے - سطح انسانی سے نیچے ایک اور مکمل اور منظم کائنات معرض ظہور میں آرہی ہے - جو کائنات بالائی سے کسیطرح کم حیرت انگیز نہیں ہے، اسلئے اگر ایک علمی تحقیقات نے انسان کا رتبہ کم کردیا ہے تو دوسری علمی تحقیقات نے اسکو اسی قدر بلکہ اس سے بھی زیادہ کردیا ہے - پس اسطرح سے دُوربین نے انسان کی قدر و منزلت میں جو کچھ کمی پیدا کردی تھی خوردبین نے اسکا ازالہ کردیا ہے

تحت الانسان کائنات کی ترتیب و عظمت کے متعلق بعض حقایق کا انکشاف دلچسپی سے خالی نہ ہوگا - اگر موسم گرما میں ایک تیتری کو پکڑ لیں تو اُس کے پروں سے ایسے ذرات چھوٹ کر ہمارے ہاتھ پر لگے رہ جائیں گے

جن کو ہم معمولی خاکریزوں سے تعبیر کریں گے اور چشم عریاں سے نہایت غور کے ساتھ مشاہدہ کرنے کے بعد بھی ہم ان کو خاکی ذرات سے متمیز نہ کرسکیں گے۔ لیکن اگر ہم ایک خوردبین سے اُن کا معائنہ کریں تو عجیب و غریب مناظر دکھائی دیں گے اب ہم کو یہ معلوم ہوگا کہ وہی خاکریزے مختلف الالوان و اوضاع پروں سے ایسے مکمل نظام کے ساتھ منظم ہیں جیسے کسی پرندکے پر ہوتے ہیں اور اس قدر چھوٹے.... کہ ایک مربع انچ میں ایک لاکھ آسکتے ہیں

ایک قطرہ آب کی کیا بضاعت ہے لیکن یہی قطرۂ آب ایک جداگانہ دنیا ہے۔ ایک مکعب انچ آب ساکن میں قریب دس ارب کے متحرک اور زندہ مخلوق پائی جاتی ہے۔ نیویارک کے ایک ممتاز ماہر علم الحیات کا بیان ہے کہ "میں نے تھوڑا سا انڈی کا صاف اور جوشیدہ پانی ایک شفاف شیشی میں بھر کر کپڑے کے برش کے چند بال توڑ کر اس میں ڈال دیئے، چار روز کے بعد شیشی بے شمار اور ناقابلِ تجزیہ زندہ مخلوق سے بھر گئی اور بلا خوف تردید یہ دعوے کیا جاسکتا ہے کہ دو آؤنس کی شیشی میں اُن کا شمار اُن تمام انسانوں کی مجموعی تعداد سے زیادہ تھا جو زمانۂ آدم سے اس وقت تک پیدا ہو چکے ہیں"

اہرنبرگ ایک مشہور جرمن ماہر حیاتیات، کا قول ہے کہ بوہیمیا میں آٹھ فٹ کی گہرائی تک چالیس مربع میل میں سلیٹ کا ذخیرہ موجود ہے جس کے ہر ایک مکعب فٹ میں خوردبینی پیمائش کے ذریعہ سے اکتالیس ارب کا پسماندہ دریافت کیا گیا ہے۔ جہاں چشم عریاں کو حیات کے آثار تک نظر نہیں آتے وہاں خوردبین کے ذریعہ سے نئی نئی دنیائیں آباد معلوم ہوتی ہیں۔ جہاں کل تک ایک ذی حیات بھی موجود نہ مانا جاتا تھا وہاں آج جدید سائنس نے ایسے حیرت انگیز عالمِ حیات پیش نظر کر دیے جیسے دُوربین کے ذریعہ سے فضائے بسیط میں نظر آتے ہیں، اور جن میں انسان سے اسی قدر چھوٹی مخلوق آباد ہے جس قدر انسان ان اجرام فلکی سے چھوٹا ہے

درخت ایک کائنات ہے اور برگ درخت اس کی ایک دنیا ہے۔ آپ کی عریاں اور غیر مانوس آنکھ کچھ نہیں دیکھ سکتی، لیکن اگر آپ ایک خردبین لیکر کسی ماہر طبیعیات کو اپنا رہبر بنائیں تو وہ آپ کی آنکھوں سے حجاب اٹھا کر ایسے ایسے عجیب و غریب رازہائے سربستہ کو بے نقاب کردے گا کہ آپ کو اپنے گرد و پیش کھلے ہوئے دروازے نظر آئیں گے۔ جن میں داخل ہوکر آپ قدم قدم پر ایسی ہی لاانتہا اور تعجب خیز چھوٹی چھوٹی دنیائیں مشاہدہ کریں گے جیسی کہ دوربین کے ذریعہ سے فضائے بسیط میں نظر آتی ہیں

خود انسان کا جسم بھی ایک کائنات ہے۔ انسانی خون کے ہر قطرہ میں دو کروڑ سے زیادہ جراثیم حیات پائی جاتی ہیں۔ اس طرح سے تمام قطرہائے خون ملا کر انسان ایک کائنات ہے اور اس کی شرائیں کہکشاں ہیں جن کے حلقوں میں ان سیارہائے احمر کے گروہ اپنے غیر مختتم دور لگا رہے ہیں

الغرض اگر ہم انسان کی روحانی حیثیت سے بھی کوئی سروکار نہ رکھیں اور اس کو محض ایک کرم مادی ہی تصور

کریں تب بھی وہ خدا کی مخلوق میں درجۂ متوسط کا مستحق ہے۔ اگر بالائے انسان اُس سے بدرجہا بڑے عالم، نظام اور کہکشاں موجود ہیں تو زیریں انسان اور اندرونی انسان میں بھی اس سے بدرجہا چھوٹے عالم، نظام اور کہکشاں موجود ہیں اگر ایک طرف فضائے بسیط کی بے پایانی اس کی وقعت کو گھٹاتی ہے تو دوسری طرف برگ درخت، قطرۂ خون اور خود اس کے مادۂ ترکیبی کی لاانتہائی اس کی منزلت کو بڑھاتی ہے۔ اس لئے اگر کوئی جسامت کی بنا پر ہماری تحقیر کرے اور انجم زار آسمان کی طرف اشارہ کرکے یوں طعنہ زن ہو کہ کیا آپ کا یہ اعتقاد ہے کہ ان بعید از شمار دنیاؤں کا خدا آپ کی پرواہ کرتا ہے تو ہم اس کو ایک قطرۂ آب کے کروروں کیڑوں کی طرف اشارہ کرکے یہ جواب دے سکتے ہیں کہ وہ خدا جو ان کو فراموش نہیں کرتا ہم کو کیونکر فراموش کر سکتا ہے۔

یہاں یہ بات بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتی کہ انسان کی حقیقی عظمت مادی لحاظ سے نہیں ہے بلکہ روحانی اعتبار سے ہے۔ انسان کی جو کچھ وقعت ہے۔ وہ اس کے دماغ کی وجہ سے ہے نہ کہ جسم کی وجہ سے، اس لئے اگر اس کے رہنے کی دنیا چھوٹی ہے تو کیا اور بڑی ہے تو کیا۔ کیا ایک مادی عرض وطول سے محدود کوہ تمثال تودۂ خاک ایک عرض وطول سے مبرا اور مادی حدود سے منزہ نفس کا مقابلہ کر سکتا ہے؟ کیا مادہ کے ایک سر بفلک کشیدہ ڈھیر کے مقابلہ میں روح مجحوب و سرنگوں ہو سکتی ہے؟ کیا ایک پہاڑ کو خیال سے بڑا کہہ سکتے ہیں؟ کیا ایک بڑے سے بڑا اسمندر اس انسانی دماغ پر تفوق حاصل کر سکتا ہے جو اس کو اپنے تصور میں محصور کر لیتا ہے، اس کو شاہروں میں منقسم کر دیتا ہے، اس کے ایک کنارہ سے دوسرے کنارہ پر اس طرح پر گفتگو کر سکتا ہے گویا کہ اس کے ہزارہا میل محض چند انچوں کے برابر ہیں، اور اس کی خوفناک ترین لہروں کو اپنا غلام بنا لیتا ہے؟ اور کیا وہ تمام دوربین سے ظاہر کی ہوئی غیر شعوری دنیا میں ایک شعوری دماغ کے مقابلہ میں کوئی حیثیت رکھ سکتی ہیں؟

فلکیات جدیدہ کے انکشافات اجرام فلکی کے درمیان اس دنیا کی قدیم اہمیت کو خواہ کتنا ہی گھٹا دیں لیکن وہ اس وقت تک انسان کی عظمت کو کوئی ٹھیس نہیں لگا سکتے جب تک اُس میں قوتِ شعور موجود ہے۔ انسان کی عظمت اس کی فطرت میں ودیعت کی ہوئی طاقت کی بدولت ہے۔ اس لئے وہ سائنس کی تمام امکانی مادی تحقیقاتوں سے غیر متاثر ہے وہ محض اس لئے بڑا ہے کہ وہ جان سکتا ہے، استنباط کر سکتا ہے، حق و باطل میں تمیز کر سکتا ہے، امید کر سکتا ہے محبت کر سکتا ہے عبادت کر سکتا ہے اور یہ چیزیں وہ اس لئے کر سکتا ہے کہ وہ روح ہے۔ لیکن دُوربین کی ظاہر کی ہوئی بڑی سے بڑی دنیا محض ایک تودۂ مادی ہونے کے باعث ان میں سے ایک کام بھی کرنے سے ایسی ہی معذور ہے جیسے کہ ایک ہوا میں اُڑنے والا حقیر کیڑا یا خاک ریزہ معذور ہے اور اسی سے انسان کی اُس لاحدود اور لازوال فضیلت کا اندازہ ہو سکتا ہے جو اس کو فضائے بسیط میں عظمت و شان سے چمکنے والے تمام لاتعداد اور عظیم الجثہ کرّوں پر حاصل ہے

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ انسان کا فضائے بسیط میں منتشر ستاروں کو دیکھ کر حیرت زدہ ہو جانا اس کی حقارت کی

علامت نہیں ہے بلکہ بزرگی کا نشان ہے ۔ ایک سنگریزہ یا ایک مٹی کا ڈھیلا کیا حیرت زدہ ہو سکتا ہے محفل ثوابت و نزم سیارگاں کو دیکھ کر ایک وحشی درندہ میں کوئی حس تک پیدا نہ ہوگی ۔ وحشی درندہ اس لئے بےحس ہے کہ اس میں قوتِ شعور نہیں ہے اور انسان اس لئے حمد و ثنا کرتا ہے کہ وہ جانتا ہے ، سمجھتا ہے ، محسوس کرتا ہے ، اور اس کی لطیف روح عالم قدس کے ساتھ التزام رکھتی ہے ۔ دنیا کا تصور دنیا سے بہتر ہے اور ستاروں کا علم ستاروں سے برتر

سورج جسامت میں بہت بڑا ہے اور اُس کی جسامت کے مقابلہ میں زمین بالکل بےحقیقت شے ہے ، لیکن اس سے انسان کی حقیقی عظمت پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا ۔ کیا سورج باوجود اس قد و قامت کے خود اپنی پیمائش کر سکتا ہے اپنا وزن جان سکتا ہے ، فضائے بسیط میں اپنے دائرۃ البروج کا اندازہ کر سکتا ہے یا اُن قوانین قدرت میں سے جن کی وہ کورانہ پابندی کر رہا ہے ایک قانون کو بھی سمجھ سکتا ہے ، لیکن انسان یہ سب کچھ کر سکتا ہے اور اس لئے وہ باوجود قد و قامت میں چھ فٹ ہونے کے سورج سے بڑا ہے

علم ہیئت ہم کو ستاروں کا بہت کچھ حال بتاتا ہے لیکن کیا ہم کبھی یہ توقع کر سکتے ہیں کہ وہ ہم کو اسی قدر انسان کا حال بھی بتلا سکتا ہے ۔ انسان کا دماغ یہی نہیں کہ علم الافلاک کی روز افزوں ترقی کا ساتھ دینے کی قابلیت رکھتا ہے بلکہ وہ اس کی ترقی کا سبب ہے ۔ اگر سموات خداوند تعالےٰ کی قدرت کے مظاہرات ہیں تو وہ اسی قدر انسانی روح کی عظمت کے بھی نشانات ہیں کیونکہ انسان محض اپنی روحانی فضیلت ہی کے باعث کائنات کے ذرہ ذرہ میں قدرت کے جلوؤں کا مطالعہ کرتا ہے

کائنات کی تخلیقی طاقتیں خیال اور محبت ہیں اور چونکہ انسان ان دونوں صفات سے متصف ہے اس لئے وہ خالق ہے

چیننگ کا قول ہے کہ تمام نفس ایک ہی سلسلہ سے ملحق ہیں ۔ اگر یہ حقیقت ہے تو میرا وجود بھی وجود حقیقی سے متصل ہے ۔ اس قادر مطلق نے میری ہستی کو محض پیدا ہی نہیں کیا ہے بلکہ میرا اس کے ساتھ رشتۂ قرابت ہے کیونکہ میری روح روحِ حقیقی سے مشتق ہے ۔ میں بھی اسی طرح جانتا ہوں جس طرح سے وہ جانتا ہے اور اسی طرح سے محبت کرتا ہوں جس طرح سے وہ محبت کرتا ہے ، اس لئے مجھے جس طرح اُس "نور السموات والارض" کے مشاہدۂ جمال کا حق حاصل ہے ۔ اسی طرح یہ کہنے کا بھی حق حاصل ہے کہ تو میرا حقیقی باپ ہے اور میں کوئی تیری از دست افتادہ چیز نہیں ہوں بلکہ تیرا بچہ ہوں اور تیری برگزیدہ فطرت مجھ میں موجود ہے

انسانی عظمت کے مستحکم ترین ثبوتوں میں سے ایک ثبوت قطعی اور نئے ذریعہ سے حاصل ہوا ہے اور وہ ذریعہ "جدید نظریۂ ارتقاء" ہے ۔ اس سے قبل انسان کا خیال بالکل مختلف تھا اور "ارتقاء" ایک خوفناک شے معلوم ہوتا تھا کیونکہ وہ انسان کی پیدائش کو عمل فطرت سے منسلک کرتا تھا اور اس کی موجودہ نمو یافتہ ہیئت کذائی

کو ادنیٰ قسم کی حیات سے مستلزم کرتا تھا اور اس لئے وہ تذلیل انسانیت کا باعث سمجھا جاتا تھا، لیکن اب یہ سب باتیں بدل گئی ہیں اور بڑے بڑے ارباب فکر اس حقیقت کو تسلیم کرتے جاتے ہیں کہ نظریۂ ارتقا نے انسان کی عظمت میں غیر محدود اضافہ کر دیا ہے - چونکہ انسان لاریب تمام سابقہ مدارج ارتقا کی حد کمال ہے اس لئے وہ اس تمام عمل فطرت کی معقول ترین اور مناسب ترین توجیہہ پیش کرتا ہے - عمل ارتقا اپنی آتشی حالت کی ابتدا سے دور دراز راستے طے کرکے اس منزل پر پہونچا ہے جو آج ہماری پیش نظر ہے لیکن اس نے ہمیشہ آگے ہی کو قدم بڑھایا ہے جس کی معراج انسان ہے - غیر ذی حیات سے ذی حیات تک، ادنیٰ قسم کی حیات سے اعلیٰ قسم کی حیات تک اور حیوان سے انسان تک سلسلہ بسلسلہ گامزن ہوا ہے اور اس طرح انسان آفرینش کی بلند ترین منزل پر پہونچ گیا ہے جو آفرینش کا نصب العین اور منزلِ مقصود ہے - جس وقت مادی جسم اپنی امکانی حد تک پہونچ گیا اس وقت نفس کی ابتدا ہوئی جس نے اسی وقت سے حکمرانی شروع کر دی اور مُدرک انسان کو وہ شرف حاصل ہوا جو صرف مدرک مطلق کی عظمت سے دوسرے درجہ پر ہے

ہمیں اس بات کا علم نہیں ہے کہ کائنات کی دوسری کتنی دنیاؤں میں عمل ارتقار ترقی کی اس منزل پر پہونچ گیا ہے جس پر کہ وہ ہمارے یہاں پہونچا ہے - لیکن اگر کسی جگہ ایسا ہوا ہے تو وہاں بھی اُس نے کسی نہ کسی شکل میں انسان ہی کا روحانی مثنیٰ پیش کیا ہوگا یعنی کوئی اس قسم کی ہستی پیدا کی ہوگی جس میں انسان کی طرح ایسی قوت ادراک وشعور پائی جاتی ہو جو " الٰہی خیالات کو اسی کی طرح خیال کر سکے " جیسا کہ انسان کر سکتا ہے، جو اس جہان میں " عمل ارتقار " کا ویسا ہی شاندار تکملہ ہو جیسا اس جہان میں انسان ہے اور جو بدیں سبب کسی صحیح مفہوم میں وہاں پر خدا کا ایسا ہی ہمشکل اور ہم رشتہ ہو جیسا انسان یہاں پر ہے

اس بنا پر یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ مادۂ اولین کی پہلی حرکت سے لیکر اس وقت تک کائنات کا تمام " عمل ارتقا " اس دنیا میں اور نہ معلوم کتنی اور دنیاؤں میں اسی اُدھیڑ بن میں مصروف رہا کہ انسان یا اُس کا مماثل پیدا کرے پھر اگر کائنات اس تمام " عمل ارتقار " کے مصائب و مصارف برداشت کرنے کے بعد ایسی اعلیٰ فطرت کا انسان بنانے میں کامیاب ہوئی ہے تو کیا اس کا انجام بھی اسی مناسبت سے اعلیٰ اور افضل نہ ہونا چاہیئے اور کیا اس کی حیات بعد الممات عارضی مکان وزماں کی قیود سے آزاد نہ ہونی چاہیئے ؟ کیا ان تمام موجودات کا خالق اکبر اور صانع حقیقی ایسا غیر معقول ہے کہ وہ اپنی کامل ترین مخلوق کو پایۂ تکمیل تک پہونچاتے ہی نیست و نابود کر دے گا ؟ اگر انسان الٰہی الاصل ہے اور اعلیٰ الٰہی صفات سے مشرف ہوا ہے تو کیا وہ فنا ہو سکتا ہے اور کیا اس کو ایک ایسی ہی بقا کا وارث نہ ہونا چاہیئے جو بقائے الٰہی کے متوازی ہو ؟

لوگ دوسری دُنیاؤں، نظامون اور ہجوم سیارگاں کو انسان کی تذلیل وتحقیر کے لئے بطور دلیل کے پیش

کرتے ہیں، لیکن کیا یہ ممکن ہے کہ ادنیٰ اعلیٰ پر سبقت لے جائے؟ کیا کوئی مادی شے، خواہ وہ جسامت میں کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو، روح پر فایق یا نفس پہ غالب ہو سکتی ہے؟

کائنات خدا کا ایک نادر محل ہے۔ لیکن کیا محل اولاد سے زیادہ قیمتی ہے؟ کیا کوئی باپ ایسا ہے جس کے پاس ایک ایسا محل ہو جس کی وسعت شمال سے جنوب تک ہو، جس کی چھت کہکشانی نقش و نگار سے منقش ہو اور جس میں لاکھوں آفتاب جگمگا رہے ہوں، اور بے ساختہ نہ پکار اٹھے کہ مجکو اپنا بچہ ان تمام چیزوں سے زیادہ عزیز ہے؟

اس لئے جب میں تنہا رات کے وقت آسمان کے نیچے چلتا ہوں اور اس چرخ نیلوفری کے محیر العقول اور غیر محدود نقش و نگار کو دیکھتا ہوں تو میں عرش دوام سے یہ آواز آتی ہوئی سنتا ہوں کہ اے وہ انسان جس کو میں نے اپنی ہی شکل پر بنایا ہے۔ تو میری نظروں میں تمام موجودات سے زیادہ عزیز ہو سورج اور ستاروں کی پیدایش سے بھی قبل میں تجھ سے محبت کرتا تھا، جبکہ تو دور افتادہ مقامات پر آتشی کرّوں کے گہوارہ میں کھیلتا تھا۔ میں اس وقت بھی تیرا نگراں تھا، تیرا اور میرا انجام ایک ہے، کبھی تجکو کوئی چیز مجھ سے جدا نہیں کر سکتی۔ اور جب عالم بالا کی آواز خاموش ہو جاتی ہے تو میں ویسی ہی ایک اور صدائے لاہوتی اپنی روح کے تخنگاہ وجدانی سے آتی ہوئی سنتا ہوں۔ کہ اے میری زندگی کے مالک خدا میں تجھ پر بھروسہ کرتا ہوں اور میں جس وقت تیرے اس نگارخانۂ قدرت کے خوبصورت دنیوی محل میں داخل ہوا تو تیرے ہی پاس سے آیا، یہاں تو نے مجکو صرف چند سال قیام کی اجازت دی ہے تاکہ میں تیرے ساتھ رہ کر اور تیری امداد سے قدرت کی ان صنعتوں اور نیز اپنی رُوح .... کے عجائبات کا مطالعہ کروں، تجربات زندگی حاصل کروں، حتے الوسع اپنے ہم جنسوں کی مدد کروں اور اپنے دیگر فرائض منصبی کو انجام دوں۔ میں ایسی زمین پر عارضی قیام کے واسطے تیرا شکرگذار ہوں۔ میں بہت جلد یہاں سے کسی نامعلوم مقام کو روانہ ہو جاؤں گا جس کا مجکو علم ہے۔ مگر میرے لئے یہی امر باعث تسکین ہے کہ میں جہاں کہیں رہوں گا تیرے ہی ساتھ رہوں گا۔ موت صرف تیرے غیر محدود مکان کے دوسرے دروازے کھول دے گی۔ اس لئے مجکو کوئی ہراس نہیں جہاں تو ہے وہ جگہ خوبصورت ہے حتے کہ دوزخ بھی تیرے ساتھ۔ میرے لئے بہت محفوظ مقام ہے

عبد الحفیظ (علیگ) میرٹھ

(جے۔ بی سنڈرلینڈ)

دو ادبی شاہکار

شوپنہار۔ فلسفۂ شوپنہار پر ایک بے مثل تبصرہ عہ (علاوہ محصول)

مثنوی زہر عشق۔ مجلد معہ رنگین تصاویر و تین مقدمات قیمت عہ (علاوہ محصول)

منیجر نگار لکھنؤ

مکتوبات نیاز

آرام جاں

کل میاں نثار کا خط ملا اور اس صحبت کا حال معلوم ہوا جو وہاں برپا ہوئی تھی - جلیل صاحب نے جو کچھ فرمایا وہ اصولاً صحیح ہو یا نہ ہو، لیکن چونکہ حسب حال ہے اس لئے بہت پسند آیا، میاں ذاکر نے جن الفاظ میں میرا ذکر کیا، ان پر مجھے فخر ہو یا نہ ہو، لیکن رسم تشکر ادا کرنے کو ضرور جی چاہتا ہے - تم لاکھ کہو کہ مجھے علم نہیں میرا کوئی اشارہ شامل نہیں، لیکن میں تو جانتا ہوں کہ

کارِ زلفِ تست مشک افشانی اما عاشقاں
مصلحت را تہمتے بر آہوئے چیں بستہ اند

بہرحال یہ حقیقت نہ ہو - تو بھی مصلحتاً یا رعایتاً سر جھکا لو - اور مجھ سے یہ پندار نہ چھینو کہ دنیا میں جو کوئی مجھے اچھے نام سے پکارتا ہے، وہ حقیقتاً تمھاری ہی آواز ہے

خاں صاحب

حیران ہوں کہ آپ کی وضع عاشقانہ کی داد دوں، یا آپ کے اخلاق کریمانہ کی، یعنی میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جو کچھ آپ نے ارشاد فرمایا وہ صرف بربنائے محبت تھا جو میرے لئے مخصوص ہے یا یہ کہ اس نوع کا لطف فرمانا آپ کی فطرت ہے، تعیین و تخصیص سے بے نیاز !

خونی مجرم کو بھی ایک بار اظہارِ حال کا موقعہ دیا جاتا ہے نہ کہ میں جس کا جرم اس سے زیادہ نہیں کہ رات کو رات نہیں کہتا اور دن کو دن سمجھتا ہوں - بہرحال مجھے مسرت ہوئی کہ آپ نے میری طرف سے اپنی بیزاریوں کا اعلان کر کے برسوں کی پڑی ہوئی گتھی کو سلجھا دیا اور اب میرے لئے وہ الجھن باقی نہ رہی، کہ آپ کو کس صف میں جگہ دوں

مانا کہ مجھے آپ کے جذبات پر اقتدار حاصل نہیں، لیکن خدارا، یہ کہاں کا انصاف ہے کہ میں اپنے جذبات

کا خون صرف اس لئے کر دوں کہ آپ اُن سے متفق نہیں

میں غریب ہوں اور غریب الدیار بھی، جاہل بھی ہوں اور لاچار بھی، لیکن کیا کروں۔ یہ بات کبھی سمجھ میں نہیں آتی کہ عقل آپ کی اور اعتماد میرا! جینے کا آخر یہ کونسا طریقہ ہے ـــــ بہرحال اگر جنس ناکارہ سمجھ کر میرے وجود کو نظر انداز کرنا آپ کے لئے ممکن نہیں تو

سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے

حبیب مکرم

پھلوں کے بھیجنے کی زحمت نہ اختیار کیجئے۔ کیونکہ اوّل تو میں اتنا شائق نہیں، دوسرے یہ کہ بغیر آپ کی معیت کے وہ ہضم بھی نہ ہوں گے۔ ہاں ایک صورت مفاہمت کی ہے اور وہ یہ کہ پہلے میں آپ کو یہاں سے شریفے بھیجوں اور جب آپ اپنی پسندیدگی کا اظہار فرماتے ہوئے میرا شکریہ ادا کریں تو میں جواب میں لکھوں کہ حضرت محض شکریہ سے کام نہیں چلتا، سفیدہ اور دسہری بھیجئے ـــــ ہرچند میں پھر بھی زیر بار احسان رہوں گا، لیکن کم از کم یہ اطمینان تو مجھے رہے گا کہ جو کچھ کھا رہا ہوں اس کے حصول میں تھوڑی بہت قوتِ بازو میں نے بھی صرف کی ہے ـــــ آپ باور کیجئے کہ یوں مجھے خاک مزا نہ آئے گا

اس لئے کہ فضول خط و کتابت میں دقت نہ ضایع ہو۔ اس عریضہ کے ساتھ ۳۰ سیر شریفوں کی بلٹی ملفوف کرتا ہوں۔ اس جوار کا یہ پھل اتنا ہی مشہور و لذیذ ہے جتنا اودھ کا سفیدہ، گو مزہ کے نوعیت کو دیکھتے ہوئے دونوں کا تقابل درست نہ ہو ـــــ اور ہاں، یہ کہنا بھول گیا کہ یہ پھل آپ کے لئے نہیں بھیجتا۔ بلکہ اپنے بھتیجوں اور بھتیجیوں کے لئے بھیج رہا ہوں۔ بھابھی کو بھی یہ چکھنے کی اجازت نہیں

کرم گسترا

کس منہ سے شکر کیجئے اس لطفِ خاص کا

کہ پائے سخن بھی درمیان ہے اور سر چارہ فرمائی بھی! ـــــ یعنی خود بھی لطف فرماتے ہیں اور دوسروں کو بھی آمادہ کرتے ہیں ـــــ حیران ہوں کہ وہ خدا جس کے بندے اسقدر بندہ نواز ہوں، وہ خود اتنا بے نیاز ہو! بے نیازی سے میری مراد مستغنی اور بے پرواہ ہونا ہے کہ میں مر رہا ہوں اور اسے فکر نہیں، میں ایڑیاں رگڑ رہا ہوں اور ادھر سے کوئی تسکین نہیں ـــــ شاید خدا اور خداوند میں یہی فرق ہوگا اور اس لئے مجھے کہنے دیجئے کہ

تم خداوند ہی کہلاؤ خدا اور سہی

یہ تو خیر سب کچھ ہوگیا، لیکن یہ فرمائیے کہ میری "طبع اندوہگیں" کا کیا علاج ہے - اگر باوجود ان تمام الطاف و عنایات کے میری سوگواریاں بدستور قائم رہیں تو پھر میں کیا کروں گا - اس لئے خدا کے لئے کوئی شکل تو ایسی رہنے دیجئے کہ میں آپ کو صورت دکھا سکوں ——— باور کیجئے میں ہرگز مستحق نوازش نہیں، مجھ پر احسان کرنا مجھے ہلاک کرنا ہے ——— نمرود کی خدائی میں رہتا ہوں اور اسی میں جان دینا پسند کرتا ہوں - آپ کیوں اپنا دل دکھائیں

جانِ نیاز

قاصد پہونچا، اور دفعۃً آپ کا باندہ چلا آنا معلوم ہوا ——— اتنی بڑی قربانی اور میرے لئے! اُف آپ کی جس محبت سے جان بچا کر میں یہاں چلا آیا تھا، وہ اب اس خطرناک حد تک پہونچ گئی!

دلے دارم خراب از التفات چشم بیمارت
ہمہ از جور می ترسند و من از لطفِ بسیارت

میری مجبوریاں آپ سے مخفی نہیں، اس لئے اب آپ ہی بتائیے کہ ان حالات میں کیا کر سکتا ہوں - یہ تو ہو سکتا ہے کہ میں وہاں آکر آپ پر سے قربان ہو جاؤں، لیکن یہاں آپ کو بُلانا امکان سے باہر ہے، اگر آپ کا اچ گڈھ سے چلا آنا بغیر اجازت کے ہوا ہے تو بھی واپسی میں حرج نہیں، زیادہ سے زیادہ دو چار اشک ندامت کافی ہوں گے - اور اگر اجازت حاصل کر لی گئی ہے تو پھر کوئی جھگڑا ہی نہیں -

اول تو مجھے یقین نہیں کہ مہاراج کو حقیقت کا علم ہو گیا ہے اور اگر تھوڑی دیر کے لئے اس کو صحیح باور کر لیا جائے تو بھی "حقیقت سے انکار" آپ کے لئے چنداں مشکل نہیں - آنسو بہا کر نہ سہی، بپھر کر، بگڑ کر، تیوریوں پر بل ڈال کر سہی

میں خود باندہ آکر آپ سے زبانی گفتگو کرتا، لیکن وہاں میرا آنا مناسب نہیں اس لئے اب چارۂ کار بجز اس کے کیا ہے کہ پھر وہیں واپس جائیے، اور مجھے اطلاع دیجئے کہ کیا رنگ ہے - ممکن ہے رخصت ختم ہونے پر میں بھی حاضر ہو جاؤں گو بظاہر اس کی امید کوئی نہیں

ظالم، اب کیا پوچھتے ہو کہ یہ سب کیونکر ہوا ———

شام کا وقت ہے، ہلکی ہلکی خنک ہوا چل رہی ہے، محل کے پائیں باغ میں روشوں پر ٹہل رہا ہوں، مہاراج کی طلبی کا انتظار ہے ——— دفعۃً سامنے ایک مجسمۂ حُسن و رعنائی نظر آتا ہے ——— ذی حیات، متحرک، نگراں،

خنداں ! ٹھیک اس وقت چوبدار آتا ہے اور میں چلا جاتا ہوں ——— لیکن یہ دو چیزیں اپنے ساتھ لے جاتا ہوں۔ ہلکے سانولے رنگ میں شفق کا انعکاس، اور طاؤس کی سی مستی رفتار!

اے جمال تو بہ تاراج نظر ہا گستاخ

اے خرام تو بہ پامالی سر ہا گستاخ

بسنت کی صبح ہے، دربار میں رسم گلبازی کی طیاریاں ہو رہی ہیں، گلاب اور گیندے کے سرخ و زرد پھولوں سے آنچل معمور ہیں، مہاراج برآمد ہوتے ہیں اور درباری راگنی کے ساتھ ہی یہ رسم شروع ہو جاتی ہے۔ تم کبھی آؤ گے تو دکھاؤں گا کہ اس پھول کی پنکھڑی اب تک میرے پاس محفوظ ہے جو میرے سینہ پر پڑ کر ہمیشہ کے لئے ایک زخم چھوڑ گیا ——— آہ،

کتانِ خویشتن می شویم بہ مہتاب

خیر یہ تو وہ باتیں تھیں جن کا ذکر کچھ افسانوں ہی میں اچھا معلوم ہوتا ہے، لیکن قہر تو یہ ہے کہ میں اس سے زیادہ کچھ لکھ بھی تو نہیں سکتا

رگِ سنگم شرارے می نویسم

کفِ خاکم غبارے می نویسم

رہا انجام و نتیجہ سو اب اس کے متعلق کیا عرض کروں

غالب نے ایک جگہ بنارس کا حال بیان کرتے ہوئے وہاں کی "قیامت قامتاں مژگاں درازاں" کا ذکر اس طرح کیا ہے

ز رنگیں جلوہ ہا غارتگرِ ہوش

بہارِ بستر و نوروزِ آغوش

سو اگر مجھے یہ ڈر نہ ہوتا کہ تم رشک و حسد سے مر جاؤ گے تو میں بھی اس شعر کا دوسرا مصرعہ پڑھ کر خاموش ہو جاتا ——— لاحول ولا قوۃ، میں بھی کس قدر لغو و مہمل ہوں کہ ایک جھوٹ ختم نہیں ہوتا اور دوسرا شروع کر دیتا ہوں یقین کرو کہ یہ سب افسانہ نوازی کے سوا کچھ نہیں ——— تم میری "سازگاری بخت" سے اچھی طرح واقف ہو، اگر حقیقتاً ایسا ہو بھی تو یقین کرنے کی بات نہیں

لاحول ولا قوۃ، تم بھی کس درجہ پست ہمت واقع ہوئے ہو۔ صبح بہار میسر نہیں، تو شب ماہ میں کیا برائی ہے، جلوۂ سیرت کا فقدان ہے تو ہونے دو۔

خمِ زلف و شکنِ طرفِ کلاہ ہے درباب

تُف ہے تمھاری جوانی پر اور حیف ہے تمھارے شباب پر۔ گفتگو اصولی شروع ہو جائے گی اور غالباً ذاتیات تک پہونچ جائے، اس لئے خاموش رہتا ہوں، ورنہ کہتا میرے شیب و انحطاط سے اپنا شباب و عروج بدل لو، یا پھر اپنا نصیب مجھے دیدو، کہ کوئی ایک تو مکمل ہو جائے —— مجھے فرصت نہیں ورنہ وہاں پہونچ کر بجائے مقال کے عمل سے اس نظریہ کی اہمیت ثابت کر دیتا

ہمارے "سلیم چشتی" کیسے ہیں —— اگر ملاقات ہو تو کہدینا کہ "نفحات" کا نسخہ میرے پاس سے کہیں گم ہو گیا، مولانا جامی کے دستخط اگر اس پر ثبت نہ ہوتے تو بھی افسوس کرنا چاہئے تھا، لیکن اگر آج ملک الموت میری ہی روح قبض کرنے آجائیں تو کیا وہ مجھے بچا سکتے ہیں

بحمد اللہ، میں صحیح و تندرست ہوں اور اسی لئے آپ کی صحت و عافیت کا طالب، ورنہ یوں بیمار پڑ جانے تو میں چاہتا ہوں کہ ساری دنیا میری طرح کراہنے لگے

آپ کی پرسشِ حال کا شکریہ، لیکن یہ آپ سے کس نے کہا کہ میری حالت اس قدر سقیم ہے، اور پھر یہ کہ آپ کو میرا اتنا بڑا ہمدرد کیونکر جان لیا کہ ساری دنیا میں آپ ہی پر اس کی نظرِ انتخاب پڑی

اگر یہ صرف بہانہ ہے اجراءِ مراسلت کے لئے، تو خیر، ورنہ میں اس شخص کا نام معلوم کرنے پر اصرار کروں گا، جس نے یہ شگونِ بد منہ سے نکالا

عزیز یہاں نہیں ہیں، پرسوں اجمیر گئے ہیں۔ اگر جلد واپس آگئے تو آپ کا پیام پہونچا دوں گا، اور کوشش کروں گا کہ وہ آپ کو مایوس نہ کریں —— لیکن اگر ان کی واپسی میں تاخیر ہوئی تو مجھے معذور سمجھئے کیونکہ میں خود آیندہ ماہ کی ابتدا میں یہاں سے باہر چلا جاؤں گا اور غالباً دو ماہ کے بعد واپسی ہو

منظومات کا مجموعہ نہ چھپا ہے اور نہ اس کے چھاپنے کا ارادہ۔ شعر کہنے سے قبل شعر سمجھنے کا سلیقہ نہ تھا اور جب یہ سلیقہ پیدا ہو تو وہ زمانہ گزر گیا۔ میرے بعد لوگوں کو اختیار ہے

مذاکراتِ نیاز۔ یعنی حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات و تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے۔ ایک بار اس کو شروع کر دینا اخیر تک پڑھ لیتا ہے اس کتاب کی بہت کم جلدیں باقی رہ گئی ہیں قیمت ۱۲ار (علاوہ محصول)

فلاسفۂ قدیم۔ اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے تین علمی مضامین شامل ہیں (۱) چند گھنٹے فلاسفۂ قدیم کی روحوں کیساتھ (۲) مادئین کا مذہب (۳) حرکت کے کرشمے نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے قیمت عمر (علاوہ محصول)

منیجر نگار لکھنؤ

بیراگ کا بروگ

(۱)

راجکماری آئینہ کے سامنے ہلکے بنفشئی رنگ کی ساری پہنے بیٹھی ہوئی تھی، کنیزیں اسے سنوار رہی تھیں۔ لمبے لمبے بال سلجھائے جا رہے تھے اور ان کی باتوں پر جو وہ کبھی ہنس پڑتی تھی تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آئینہ کے اندر بجلی کی سی لہر دوڑ گئی۔ وہ اس وقت محل کے اس حصہ میں تھی جو اس کی خلوت و آزادی خلوت کے لئے مخصوص تھا

اس کا نام کملا تھا اور اس میں شک نہیں کہ وہ ایک کنول ہی کی طرح ——— اُس کنول کی طرح جو سطح آب سے اونچا ہو کر پتلی سی شاخ پر کھلتا ہے۔ نازک اور لچیلی تھی

اس نے پشت کی طرف کرسی پر اپنی ہنس کی سی گردن ڈال دی، موتیوں سے مانگ بھرنے کے لئے کنیز نے اپنا زریں ظرف سنبھالا اور راجکماری گنگنانے لگی۔ اس کی آواز میں ایسی جھنکار تھی جیسے چاندی کے برتن پر کوئی ضرب لگا دی جائے۔ سچے موتیوں کے باریک باریک ذرے اور مقیش کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے اس کے بالوں کے اندر ایسے نظر آتے تھے جیسے اندھیری رات میں جگنو چمک رہے ہوں ———

اس نے ایک آہ کے ساتھ گردن اٹھائی اور آئینہ کے سامنے بکھرے ہوئے بالوں کو سمیٹتی ہوئی، سینہ کے ہار کو سنبھالتی ہوئی بولی :——— "تم نے تو آج مجھے تھکا دیا" کنیزیں پیچھے خاموش کھڑی ہوئی مسکرا رہی تھیں ——— راجکماری نے دفعتہً پلٹ کر دیکھا اور ان سب کو مسکراتے ہوئے دیکھ کر خود بھی ہنس پڑی۔ کسی نے جلدی سے ساری کا آنچل سنبھال کر اس کے شانہ پر ڈالا، کسی نے ماتھے پر سُرخ بندی لگا دی اور کسی نے زرکار اطلس کی جوتی پاؤں میں پہنائی اور کملا آئینہ میں ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈال کر اٹھ کھڑی ہوئی

کملا راجہ جگدیس پور کی لڑکی تھی اور راجپوتانہ بھر میں کوئی راجکماری اس کے حسن و جمال کو نہ پہونچتی تھی لوگ کہا کرتے تھے کہ راجکماری کملا کے اندر تو سرسوتی دیوی نے جنم لیا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ مُلک کے نوجوان جو کوئی توقع اس کی طرف سے قایم نہ کر سکتے تھے، یہ نہ کہتے تو کیا کرتے

(۲)

بلداؤجی کا مندر رتن گڈھ کا تاریخی مندر ہے اور اپنی وسعت تعمیر کے لحاظ سے بھی خاص شہرت رکھتا ہے۔ ہر سال یہاں پھاگن کی پورنماشی کو بڑا میلہ لگتا ہے اور دُور دُور سے لوگ جاترا کرنے آیا کرتے ہیں۔ مندر کے چاروں طرف فقیروں اور سادھوؤں کے قیام کے لئے مسلسل کوٹھریاں ہیں۔ اور ان کے سامنے چاروں طرف برآمدہ بنا ہوا ہے، جہاں تپسیا کرنے والے اور دنیا کو تج دینے والے سادھو گیان دھیان میں مصروف نظر آتے ہیں

صبح کا وقت ہے اور سیکڑوں عورتیں تھالیوں میں رنگ برنگ کے پھول رکھے ہوئے پوجا کے لئے آجا رہی ہیں۔ مندر کی پشت پر جہاں نسبتاً بہت کم ہجوم ہے، راجکماری کملا اپنی دو کنیزوں کے ساتھ کھڑی ہوئی آنے جانے والوں کو دیکھ رہی ہے، متعدد تھالیاں پھولوں سے بھری ہوئی صحن کے گوشہ میں رکھی ہوئی ہیں۔ اور اس بات کا انتظار ہو رہا ہے کہ ہجوم کم ہو تو یہ پھول بھی شیوجی کے استھان پر چڑھا دئے جائیں۔ کملا کا معمول تھا کہ وہ کبھی کبھی شہر کی دوسری عورتوں کی طرح یہاں آتی اور آزادی کے چند لمحے بسر کر کے چلی جاتی۔ ہر چند بعض پجاریوں اور پنڈتوں کو اس کا علم تھا، لیکن آج تک وہ کبھی یہ نہ معلوم کر سکے تھے کہ وہ کب آتی ہے اور کب چلی جاتی ہے

راجکماری کملا تھک کر وہیں فرش پر بیٹھ گئی اور رُکمنی اور لیلاوتی سے آہستہ آہستہ باتیں کرنے لگی۔ راجکماری کملا نے مسکراتے ہوئے کہا " لیلا، سچ بتا جس وقت تو شیوجی پر پھول چڑھاتی ہے تو تیرے دل میں کیا آرزو ہوتی ہے "

لیلا — " راجکماری، میں کیا اور میری آرزو کیا "

رکمنی — " اور آرزو ہو بھی تو کیا، کبھی پوری ہوتے تو دیکھی نہیں "

کملا — (ہنستے ہوئے) " رکمنی، خوب کہا۔ لیکن کیا میں سُن سکتی ہوں کہ تیری کیا آرزو ہے جو شیوجی نے آج تک پوری نہیں کی "

رکمنی — (افسردگی کے ساتھ) " راجکماری، کچھ نہیں، میں نے تو یونہی ایک بات کہدی۔ لیکن یہ جانتی ہوں کہ جو ہونا ہوتا ہے وہ بغیر پھول چڑھائے بھی ہو جاتا ہے اور جو بات ہونے والی نہیں، وہ کسی طرح نہیں ہوتی، چاہے کوئی لاکھ سر رگڑا کرے "

لیلا — (پیشانی پر تیوریاں ڈال کر) " کیوں ایسی بات زبان سے نکالتی ہے، پرمیشر اگر سُن لے تو نہ جانے کیا کرے "

اسی وقت دو عورتیں قریب سے گزریں۔ ایک دوسری سے کہہ رہی تھی۔ " بڑے گیانی سادھو ہیں، چرن چھوتے ہی میرا سب دُکھ جاتا رہا، یہ معلوم ہوتا تھا گویا آنکھوں میں تبندسی بھری جا رہی ہے۔ تم بھی چلو کل صبح چل کر درشن

کرو، وہیں تم سے قریب ہی رام گوبھا میں رہتے ہیں"

کملا رانی دیر تک خاموش کچھ سوچتی رہی اور بغیر پھول چڑھائے ہوئے واپس چلی گئی

(۳)

مہاراجہ —— "مجھے سوامی جی کا حال بالکل نہیں معلوم، لیکن تم ان سے ملنا چاہتی ہو تو میں انھیں یہیں بُلاتا ہوں اچھا ہے میں بھی مل لوں گا"

کملا —— "مہاراج، جو لوگ دنیا چھوڑ چکے ہیں اُن سے دنیاوی جاہ و جلال کے ساتھ ملنا مناسب نہیں میں ان پر یہ ظاہر کرنا نہیں چاہتی کہ میں کون ہوں"

مہاراجہ —— (مسکرا کر) "تمھاری اس آزاد طبیعت سے جگدلیس پور والے بھی کچھ واقف ہو چلے ہیں۔ اور تمھیں معلوم ہے کہ وہ کیسے پُرانے خیال کے لوگ ہیں۔ صرف ایک مہینہ باقی ہے کہ تم انھیں کے بس میں ہوگی اس لئے مناسب نہیں کہ ان کو تمھاری طرف سے کسی بُرے خیال قائم کرنے کا موقع ملے۔ محلوں کی ذرا سی بات بھی کوٹھوں کوٹھوں پھرتی ہے"

یہ سنکر راجکماری کملا کے چہرہ پر انفعال و برہمی کی ملی ہوئی کیفیت کا ایک خاص رنگ پیدا ہوگیا۔ اور تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد جو حقیقتاً اس کے انتہائی ضبط و تامل کو ظاہر کر رہا تھا

بولی —— "سچ ہے مہاراج، لڑکی ہر جگہ لڑکی ہے، خواہ وہ راجہ کے گھر میں پیدا ہو، یا کسان کے جھونپڑے میں، عورت کی کمزوری، قدرت کی وہ بے اعتمادی ہے جس کا علاج اس دنیا میں ممکن نہیں، بہتر ہے میں نہ جاؤں گی، لیکن سوامی جی کو بھی یہاں آنے کی تکلیف نہ دیجئے اور رتن گڈھ کو جگدلیپور نہ بنائیے"

یہ کہکر راجکماری کملا جانے ہی والی تھی کہ اس کے باپ نے اس کو روک لیا اور بولا کہ "کملا میرا مطلب یہ نہ تھا کہ تم وہاں نہ جاؤ، میں نے تو یوں ہی ایک بات کہہ دی تھی، تم آزردہ نہ ہو۔ میں تمھاری خوشی کے لئے دنیا کی ہر مصلحت کو قربان کر سکتا ہوں بشرطیکہ رتن گڈھ کی عزت پر حرف نہ آئے"

(۴)

یوں تو رتن گڈھ کوہستان بندھاچل کے دامن میں واقع ہے لیکن اس کی آبادی پہاڑ کی بلندی تک پھیلی ہوئی ہے۔ جہاں قلعہ اور رنواس کی عمارتیں بھی نظر آتی ہیں۔ سب سے بلند مقام رام گوبھا کے نام سے مشہور ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جب سری رام جی نے لنکا پر فوجکشی کی تھی تو اسی راستہ سے گذرے تھے اور یہاں ایک رات دن قیام کیا تھا

صبح کا وقت ہے، اور گو آفتاب کافی بلند ہو گیا ہے، لیکن موسم کی خنکی کی وجہ سے ابھی تک زیادہ چہل پہل کہیں نظر نہیں آتی

رام گوپھا ایک وسیع کھوہ ہے جس نے ایک وسیع کوٹھری کی صورت اختیار کر لی ہے اور قدرت نے اس کے آگے ایک بڑی چٹان کی چھت قائم کرکے اچھا خاصہ برآمدہ بھی بنا دیا ہے، جگہ نہایت صاف، ستھری ہے اور چاروں طرف سبز جھاڑیوں کی وجہ سے گرمی میں بھی یہ جگہ کافی خنک رہتی ہے۔ قریب ہی ایک سنگستانی چشمہ ہے جو ہمیشہ جاری رہتا ہے اور بہت متبرک سمجھا جاتا ہے۔ یہ گوپھا عرصہ سے غیر آباد تھا، لیکن چند دن سے سوامی رام ناتھ، بنگال کے مشہور سنیاسی فقیر یہاں آکر ٹھہر گئے ہیں

سوامی رام ایک دولتمند باپ کے بیٹے اور تعلیم یافتہ خاندان کے فرد تھے۔ ان کی ابتدائی زندگی ایسے ماحول میں بسر ہوئی تھی جسے نہ مذہب سے کوئی سروکار تھا اور نہ سنیاس سے، لیکن چونکہ وہ فطرت کی طرف سے نہایت سنجیدہ اور سوچنے والا دماغ لے کر آئے تھے۔ اس لئے وہ اپنے ماحول اور عیش و تنعم کی فضا سے بہت کم متاثر ہوئے تھے اور ان کی زندگی کافی سادہ بسر ہوئی تھی، جب ان کا مطالعہ وسیع ہوا تو اُن کی یہ فطری سادگی اور زیادہ ظاہر ہونے لگی، یہاں تک کہ آخر کار ایک گیروے رنگ کی چادر کے سوا اُن کے جسم پر کوئی کپڑا نہ رہ گیا

ہر چند ان کے باپ جو رنگ پور کے مشہور سر برآوردہ زمیندار تھے، اپنے بیٹے کی اس زندگی سے خوش نہ تھے اور انھوں نے بارہا اس موضوع پر گفتگو بھی کی، لیکن رام ناتھ کا وہ گہرا سکوت جس میں عجیب طرح کی کیفیت مقاومت پنہاں تھی، ایک ایسا فیصلہ کُن جواب ہوا کرتا تھا کہ آخر کار یہ تعرض چھوڑ دیا گیا اور وہ اپنی عمر کے چوبیسویں سال تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد دفعتہً گھر سے غائب ہو گئے

رام ناتھ گھر سے نکلنے کے بعد کہاں گئے، کہاں کہاں کی خاک چھانی، اور کس کس جگہ گیان دھیان میں مصروف رہے، یہ ان کی زندگی کی وہ باتیں ہیں جن کا علم صرف انھیں کو حاصل تھا، جس وقت وہ رتن گنڈھ آئے ہیں ان کی عمر ۲۸ سال کی تھی اور سوائے کتابوں کے انبار کے کوئی اور سامان اُن کے ساتھ نہ تھا

صورت و شکل کے لحاظ سے ان میں کوئی غیر معمولی بات نہ پائی جاتی تھی، لیکن چونکہ ابھی شباب کا زمانہ تھا اور شباب بھی ایک سنیاسی کا، اس لئے ان کی صورت میں ایک عجیب قسم کی کشش پائی جاتی تھی، اور آنکھوں کی کشش کا تو یہ عالم تھا کہ آنکھ میں آنکھ ڈال کر ان کا باتیں کر لینا۔ بڑے بڑوں کے قدم اکھاڑ دیتا تھا ان کا رنگ کھلا ہوا گندمی تھا، اور قامت و اعضار کے لحاظ سے ایک چھریرے سڈول جسم کے انسان تھے

کملا جس وقت رُکمنی کے ساتھ وہاں پہونچی تو سوامی جی اپنے مطالعہ میں مشغول تھے اور کوٹھری کے اندر بیٹھے ہوئے تھے ——

رکمنی نے دستک دی اور تھوڑی دیر میں وہ باہر نکلے، لیکن اس شان سے کہ ہاتھ میں کوئی کتاب تھی اور ان کی بڑی بڑی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ کملا نے ان کو دیکھتے ہی نگاہیں نیچی کرلیں اور وہ اپنی جگہ ٹھٹک کر رہ گئے۔ سوامی جی عورتوں کی آمد و رفت کبھی پسند نہ کرتے تھے اور حتے الامکان اس سے بہت گریز کرتے تھے کہ عورتوں سے انھیں خطاب کرنا پڑے، اس لئے دستک سننے کے بعد جب وہ باہر نکلے اور انھوں نے دو عورتوں کو کھڑا ہوا دیکھا تو وہ گھبرا سے گئے۔ لیکن چونکہ وہ باہر آگئے تھے اس لئے اب واپس بھی نہ جاسکتے تھے۔ ملاچار کونہ میں ایک جگہ بیٹھ گئے اور ان کو بھی بیٹھ جانے کا اشارہ کیا

رکمنی نے بڑھ کر اُن کے پاؤں چھونا چاہے، لیکن انھوں نے روک دیا اور بولے کہ "دیوی، میرے چرنوں میں کیا رکھا ہے، ہندو دھرم میں غیر کی پوجا حرام ہے"

رکمنی ——"سوامی جی، یہ تو پرمیشر کی پوجا ہے آپ کے چرنوں کی نہیں"

سوامی جی ——"پرمیشر کہاں ہے جس کی پوجا کرتی ہو، انسان خود پرمیشر ہے، اور اس کو خود اپنی ہی پوجا کرنا چاہئے"

کملا سوامی جی کے منہ سے یہ باتیں سُنکر حیران رہ گئی اور اس نے اپنی زندگی میں سب سے پہلے اس آواز کو سُنا جو زمانۂ نامعلوم سے اس کے دل و دماغ میں گونج رہی تھی لیکن لب تک نہ آسکتی تھی۔

اس نے کہا ——"سوامی جی، اپنی پوجا کا کیا طریقہ ہے"

سوامی جی —— (مسکراتے ہوئے) "تم نے اپنی صورت کبھی آئینہ میں دیکھی ہے؟"

کملا —— (انفعال کے ہلکے رنگ کے ساتھ) "جی ہاں، روز ہی دیکھتی ہوں"

سوامی جی ——"تمھیں وہاں کیا نظر آتا ہے"

کملا ——"ایک صورت نظر آتی ہے"

سوامی ——"کس کی"

کملا ——"اپنی"

سوامی ——"وہ چیز جسے تم "اپنی" کہتے ہو کیا ہے، کہاں ہے، کیا "میں" نام خوبصورت چہرہ کا ہے، بڑی بڑی آنکھوں اور گورے گورے رنگ کا ہے؟ یہ تمام باتیں تو چند دن میں مٹ جانے والی ہیں، تو کیا "میں" بھی ان کے ساتھ فنا ہو جاتا ہے"

کملا ——"بظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے، گو ہونا تو نہ چاہئے"

سوامی ——"کبھی سمندر تم نے دیکھا ہے"

کملا ——"جی ہاں، دیکھا ہے"

سوامی ——— " کیا تم سمجھتی ہو کہ وہ قطروں کا مجموعہ نہیں، لیکن سمندر نام قطرہ کا تو نہیں - قطرہ جب تک سمندر میں شامل ہے خود بھی سمندر ہے، اور جب اس سے علیحدہ ہو گیا تو وہ ایک فانی قطرہ ہے، درانحالیکہ سمندر بدستور اسی طرح قائم ہے - اسی طرح " میں " نام نہ تمھاری صورت کا ہے اور نہ میری صورت کا، نہ تمھاری ایک ذات کا، نہ میری تنہا ہستی کا، بلکہ اس کُل کا جو " ہم سب " کے پردہ میں ظاہر ہوا ہے، درانحالیکہ وہ " ہم " نہیں ہے - اسی کُل کا دوسرا نام " پرمیشور " ہے اور جب تک ہم اس میں شامل ہیں، خود بھی " پرمیشور " ہیں اور اس لئے اپنی پوجا کرنا پرمیشور کی پوجا کرنا ہے

کملا ——— " مہاراج، یہی تو میں پوچھتی ہوں کہ اپنی پوجا کیونکر کی جائے "

سوامی ——— " تم نے کبھی آدھی رات کو جنگل کا سناٹا دیکھا ہے، جبکہ کہیں کسی طرف سے کوئی آواز نہیں آتی "

کملا ——— " جی ہاں، دیکھا ہے "

سوامی ——— " پھر تم نے کبھی غور کیا ہے کہ اس انتہائی سکوت کی بھی ایک آواز ہوتی ہے، اس گہری خاموشی میں بھی ایک خاص قسم کی سرگوشی سی پائی جاتی ہے - انسان بھی اگر دھیان سے کام لے کر خود اپنی خلوت میں ڈوب جائے، تو وہ بھی خاص قسم کی آواز اپنے اندر سے پیدا ہوتے ہوئے سُن سکتا ہے اور محسوس کر سکتا ہے کہ وہ آہستہ آہستہ کائنات میں وسیع ہوتا جا رہا ہے اور پرمیشور کی طرح سب پر چھایا جا رہا ہے "

کملا ——— " اگر ایسا ہو بھی جائے تو اس سے نتیجہ کیا ہے "

سوامی ——— " نتیجہ کا سوال، منزل کا سوال ہے، اور منزل کا سوال قطع جستجو کا "

سوامی جی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، اور سر جھکا کر خاموش ہو گئے - کملا بھی اپنے جسم میں ایک خاص قسم کی جھرجھری محسوس کر رہی تھی اور جس وقت رخصت ہوتے وقت سوامی جی نے اس کو اپنی اشک آلود آنکھوں سے دیکھا تو وہ کانپنے لگی اور اس طرح گھر کی طرف لوٹی گویا اس کی کوئی چیز کھو گئی ہے اور وہ سمجھنا چاہتی ہے کہ وہ کیا چیز ہے　　(باقی)

نیاز

فراست التحریر مکمل یعنی اُردو، انگریزی رسم الخط اور انداز تحریر دیکھ کر ایک شخص کی سیرت، چال چلن مستقبل اور تمام حالات معلوم کرنے کا فن - اُردو میں بالکل پہلی کتاب قیمت ۸؍ (علاوہ محصول)

منیجر نگار لکھنؤ

میکدۂ اسلام

اور

اڈیٹر سہیل یمن کی بہکی بہکی باتیں

لکھنؤ سے ایک شیعی رسالہ "سہیل یمن" جناب ظفر مہدی صاحب کی ادارت میں برسوں سے شائع ہو رہا ہے اور اسی ذہنیت کے ماتحت جو اخبار "النجم" کی ہے۔ یعنی شیعہ سنیوں کے درمیان تفریق و اختلاف کی خلیج کو وسیع کرتے رہنا اور کبھی کوئی ایک بات بھی سمجھ کی ایسی نہ کرنا جسے صحیح معنی میں دینی یا انسانی خدمت کہا جائے

"میکدۂ اسلام" ایک مختصر سا رسالہ ہے۔ جو انھیں کی قوت فکر و اجتہاد کا نتیجہ ہے اور خصوصیت کے ساتھ میرے پاس اس لئے بھیجا گیا ہے کہ اس میں جا بجا میرا اور نگار کا بھی ذکر آیا ہے

اس رسالہ کا مقصود اس مسئلہ پر گفتگو کرنا ہے جو جناب امیر کی شراب نوشی سے متعلق ہے اور جس کا ذکر مولانا شبلی نے بھی کیا ہے۔ مجھ پر یہ الزام ہے کہ میں نے بھی اس کی تائید کی

میکدۂ اسلام میں شبلی کی تحقیق کو غلط ثابت کرتے ہوئے جن جن دور از کار مباحث و مسائل پر خامہ فرسائی کر کے ذوق سب و شتم کو پورا کیا گیا ہے، اُن سے اعتنا کرنا میرا فرض نہیں، کیونکہ وہ سب شیعہ و سنی کی اُس دیرینہ نزاع سے متعلق ہیں جس کا خیال بھی میرے لئے حد درجہ تکلیف دہ ہے چہ جائیکہ اس کی حمایت یا مخالفت میں قلم اٹھانا لیکن چونکہ صاحب رسالہ نے میرے خلاف ایک نہایت لغو و غلط الزام مولانا شبلی کی تائید کا قائم کیا ہے اس لئے اس کو رفع کر دینا ضروری سمجھتا ہوں

۱۹۲۷ء میں ایک صاحب نے استفسار کیا کہ رسالۂ سہیل یمن میں جناب عمر کے متعلق "شراب صلب" کا پینا کتب اہل سنت سے ثابت کیا گیا ہے، سو اس کی کیا اصلیت ہے" میں نے اس کا جواب دیتے ہوئے ایک جگہ

یہ ظاہر کیا تھا کہ

"سہیل یمن کے اس مضمون کا ماخذ عقد الفرید ہے یا عقد الفرید کے حوالہ سے "ابن قتیبہ" لیکن مقالہ نگار نے دیانت سے کام لے کر نہ عقد الفرید کی پوری بحث پیش کی اور نہ ابن قتیبہ کی عبارت نقل کی، کیونکہ اگر ایسا کیا جاتا تو اصل مقصود فوت ہو جاتا اور حضرت عمر پر بادہ خواری کا الزام اسقدر صفائی سے عائد نہ ہو سکتا"

اسی سلسلہ میں میں نے ایک جگہ یہ بھی لکھا تھا

"یہ بالکل صحیح ہے کہ آیت "یسئلونک عن الخمر ——" نازل ہونے سے پہلے عام طور پر لوگ شراب کے عادی تھے اور اس آیت کے نازل ہونے پر بھی سب نے اسے ترک نہیں کیا تھا، لیکن ایک مرتبہ جب یہ واقعہ پیش آیا کہ کسی صحابی نے (اور بعض کے نزدیک خود حضرت علی نے) نماز مغرب بہ حالتِ سُکر پڑھائی اور قرات میں غلطی ہو گئی تو آیت "لاتقربوا الصلوٰۃ وانتم سکاریٰ" نازل ہوئی ......"

میرے اس جواب میں (جو مئی ۲۸ء کے نگار میں درج ہوا ہے) ایک بات تو مدیر سہیل یمن کو یہ ناگوار ہوئی کہ میں نے اُن پر مناظرانہ دیانت سے انحراف کرنے کا الزام قایم کیا تھا اور دوسری یہ کہ بہ حالتِ سُکر نماز پڑھانے والے صحابی کا ذکر کرتے ہوئے۔ میں نے یہ بھی لکھ دیا تھا کہ بعض کے نزدیک یہ صحابی خود حضرت علی تھے

اب کامل سات سال گزرنے کے بعد ظفر مہدی صاحب "میکدۂ اسلام" شایع کرتے ہیں اور اس میں اپنی دیانت کے مسئلہ کو نظر انداز کرتے ہوئے صرف جناب امیر کے واقعۂ شراب نوشی کو لے کر مجھے بھی مولانا شبلی کی طرح موردِ الزام قرار دیتے ہیں، درانحالیکہ حقیقت بالکل اس کے خلاف ہے

میں نے صرف اتنا لکھا تھا کہ بعض کے نزدیک خود حضرت علی نے بہ حالتِ سُکر نماز مغرب پڑھائی تھی، لیکن اس سے میرا مدعا یہ ظاہر کرنا نہ تھا کہ میں بھی اُن "بعض" سے متفق ہوں، جس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے۔ کہ اس سے قبل میں صراحۃً اس باب میں مولانا شبلی کے خلاف اظہارِ خیال کر چکا تھا ——

اگست و ستمبر ۲۵ء کے مسلسل دو اشاعتوں میں جناب سید وصی احمد صاحب بلگرامی کا ایک مضمون "ملکِ خطا کے شہزادے" کے عنوان سے نگار میں شایع ہوا تھا اور پہلا اعتراض مولانا شبلی پر انھوں نے یہی کیا تھا کہ

"آیت لاتقربوا الصلوٰۃ کی شان نزول میں ابوداؤد سے جو روایت انھوں نے نقل کی ہے اور حضرت علیؓ واقعۂ بادہ نوشی کا ذکر کیا ہے، صد درجہ قابل ملامت ہے۔ اور وہ حدیث اس قابل نہ تھی کہ اس سے استدلال کیا جاتا ......"

میں نے اس پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھا تھا کہ

" اس مسئلہ میں کئی باتیں غور طلب ہیں

(۱) ابوداؤد کے علاوہ کسی اور ذریعہ سے بھی یہ حدیث روایت ہوئی یا نہیں

(۲) اس کے راوی مجروح ہیں یا نہیں

(۳) آیۂ لاتقربوا الصلوٰۃ کی شان نزول یہی واقعہ ہے یا کوئی اور

(۴) مفسرین کی اس باب میں کیا رائے ہے

ابوداؤد کے علاوہ ترمذی میں بھی یہی واقعہ موجود ہے۔ لیکن ذرا اختلاف کے ساتھ۔ ابوداؤد کے الفاظ یہ ہیں

" عن علی ابن ابی طالب ان رجلاً من الانصار دعاہ (علی) وعبدالرحمٰن بن عوف فسقاہما قبل ان تحرم الخمر فامہم علی فی المغرب وقرا قل یاایہا الکفرون، فخلط فیہا، فنزلت لاتقربوا الصلوٰۃ الخ "

یعنی شراب حرام ہونے سے قبل حضرت علی اور عبدالرحمٰن بن عوف کو کسی انصاری نے مدعو کیا۔ اور ان کو شراب پلائی۔ پھر مغرب کی نماز میں حضرت علی نے امامت کی اور اثنائے قرأت میں " قل یاایہا الکفرون " غلط پڑھ گئے، جس پہ آیۂ " لاتقربوا الصلوٰۃ " نازل ہوئی (ابوداؤد کتاب الاشربہ صفحہ ۱۶۱ جلد دوم مطبوعہ نولکشور)

ترمذی کے الفاظ یہ ہیں:-

" عن ابن ابی طالب صنع لنا عبدالرحمٰن بن عوف طعاماً ودعانا وسقانا من الخمر فاخذت الخمر منا وحضرت الصلوٰۃ فقدمونی فقرأت قل یاایہا الکفرون ولا اعبد ماتعبدون ونحن نعبد ماتعبدون قال فانزل اللہ تعالیٰ یاایہا الذین آمنوا لاتقربوا الصلوٰۃ وانتم سکاریٰ الخ "

(ترمذی جلد دوم صفحہ ۱، مطبوعۂ مصر)

ابوداؤد نے یہ واقعہ مسدد سے روایت کیا ہے اور ترمذی نے سوید سے۔ ابوداؤد کی روایت سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ کسی انصاری نے حضرت علی اور عبدالرحمٰن بن عوف کی دعوت کی تھی۔ اور ترمذی کی روایت سے عبدالرحمٰن بن عوف کا دعوت کرنا پایا جاتا ہے۔ ابوداؤد میں مغرب کے وقت کی تصریح ہے۔ اور ترمذی میں کسی وقت کا ذکر نہیں بخاری اور ابن ماجہ میں یہ روایت نہیں پائی جاتی۔ نسائی میں اس آیت کی شان نزول کے متعلق ایک اور واقعہ نقل کیا ہے جو ابوداؤد میں بھی ہے لیکن حضرت علی کی شراب نوشی اور دعوت کا کوئی ذکر نہیں ہے

انوار التنزیل میں " لاتقربوا الصلوٰۃ " کی جو شان نزول بیان کی ہے۔ وہاں بھی حضرت علی کا کوئی ذکر نہیں ہے اس میں لکھا ہے کہ :-

" عبدالرحمٰن بن عوف نے جس زمانہ میں شراب حرام نہیں ہوئی تھی۔ کسی صحابی کو مدعو کیا اور بہتے

مل کر کھانا کھایا، اور شراب پی یہاں تک کہ خوب سیر ہوگئے، اور نماز مغرب کا وقت آگیا۔ ان میں سے کوئی نماز پڑھانے لگا۔ اور اثنار قرأت میں " اعبد ما تعبدون " پڑھ گیا، جس پر آیۂ " لاتقربوا الصلوٰۃ " نازل ہوئی "۔ [۱]

اسی طرح علامہ زمخشری اور امام رازی وغیرہ نے اس واقعہ کو بیان کیا ہے۔ لیکن حضرت علی کی شراب نوشی کا کہیں ذکر نہیں ہے۔ امام رازی نے آیۂ " لاتقربوا الصلوٰۃ " کے متعلق حضرت ابن عباس کی ایک اور روایت نقل کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قبل حرمت خمر صحابہ شراب پی کر مسجد میں آتے تھے۔ اور نماز پڑھتے تھے۔ پس اللہ نے ان کو اس آیت کے ذریعہ سے منع کیا

دُر منثور میں ایک جگہ سبب نزول وہی واقعہ حضرت علی کا نقل کیا ہے اور دوسری جگہ ضحاک اور ابن عباس سے سکر نوم یعنی نعاس سبب نزول قرار پایا ہے

بہر حال آیۂ " لاتقربوا الصلوٰۃ " کی شان نزول میں مفسرین کا اختلاف ہے اور چونکہ ابوداؤد اور ترمذی میں حضرت علی کے واقعہ بادہ نوشی ہی کو اس آیت کا سبب نزول قرار دیا ہے اور دوسری روائتیں اس کی معارض واقع ہیں۔ اس لئے ہمارے نزدیک حدیث قابل اعتبار نہیں ہے۔ اور اس پر اعتماد کرکے، ہم حضرت علی کے متعلق یقینی طور پر یہ نہیں کہہ سکتے کہ انھوں نے شراب پی۔ اور مولانا شبلی نے یقیناً اس معاملہ میں کاوش نہیں کی اور ابوداؤد کی اس حدیث کو صرف اس بنا، پر کہ اس کے راوی غیر مجروح ہیں اختیار کر لیا

یہ تھے میرے خیالات اس خاص واقعہ کے متعلق جو میں فروری ۲۶ء کے نگار میں ظاہر کر چکا تھا، لیکن سہیل یمن کے وہ فاضل و مجاہد مدیر جو حضرت عمر پر شراب نوشی کا الزام عاید کرتے ہوئے عقد الفرید کی پوری عبارت نقل کرنے میں خیانت سے کام لے سکتا تھا وہ میرے باب میں کیوں دیانت سے کام لیتا اور کیوں میرے اصل خیال کو پیش کرتا ــــــــ

یہ ہے ہمارے مناظرہ کرنے والے مولویوں کی ذہنیت و قابلیت کا حال، اور یہ ہیں ان کی مبلغا..... راستبازیاں، جن سے وہ سپید کو سیاہ ثابت کرنے کی کوشش میں کام لیتے رہتے ہیں ــــ اصل موضوع کے متعلق جناب ظفر مہدی صاحب نے اس " میکدۂ اسلام " میں کیا لکھا ہے، اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ میں نے حضرت عمر کے شراب نوشی کے متعلق جو کچھ ۲۷ء میں لکھا تھا۔ اس میں کسی ایک بات کا بھی جواب جناب ظفر مہدی صاحب سے بن نہ پڑا اور سات سال کی مسلسل فکر و کاوش کے بعد بھی سوائے چندان مزخرفات

---

[۱] انوار التنزیل جلد دوم صفحہ ۸۸ مطبوعہ مصر و مفاتیح الغیب الرازی جلد دوم صفحہ ۴۴۸ مطبوعہ مصر

کے جو متعصب مولویوں کی طرف سے اکثر و بیشتر ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔ وہ کوئی ایک بات بھی لایق اعتناد پیش نہ کر سکے

حضرت نیاز کے ادبی شاہکاروں کا مجموعہ

جمالستان

(نگارستان کا دوسرا حصّہ حجم ۵۸۰ صفحات)

قیمت فی کاپی مجلد للعہ غیر مجلد للعہ علاوہ محصول

خریداران نگار سے ایک روپیہ کی رعایت

کتب فروشوں کو ۲۵ فی صدی کمیشن

فہرست مضامین حسب ذیل ہے:-

دنیا کا اولین بت ساز	فریب خیال	صدائے شکست	دو گھنٹے جہنم میں
ایک شاعر کی محبت	میر بیدانہ	تاریخ عرب کی ایک روایت جمیل	ایثار
شہید آزادی	بعد المشرقین	وے بخیر گزشت	ٹیلی فون ہے؟
دو خط	جالنعالم اور ملکہ مہر نگار	چند گھنٹے ایک مولوی کے ساتھ	شبنمستان کا قطرہ گوہریں
سودائے خام	درس محبت	ازدواج مکرر	انتظام علی صاحب
۱۸۵۷ء کا ایک صوفی	ایک شاعر کا انجام	آدم وحوا سے پہلے	شہزادۂ خرم اور ابابیل
زہرہ کا ایک پجاری	رادھا	سرزمین دکن کی ایک لنواز شام	نوجوان شہزادہ
مطربۂ فلک	چنگاری	محل کی رونق	داستان حسن وعشق کا ورق خونیں

منیجر نگار لکھنؤ

باب الانتقاد

تعلیمات قرآن اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے جسے مولانا اسلم جیراجپوری نے مرتب کر کے ان لوگوں کے لئے جو قرآن کو قرآن ہی سے سمجھنا چاہتے ہیں بڑی آسانیاں پیدا کر دی ہیں

قرآن کی تعلیم کا اسلوب زمانۂ دراز سے اس وقت تک یہی چلا آرہا ہے کہ چند مخصوص تفاسیر کو سامنے رکھ کر اس کے مطالب سمجھائے جاتے ہیں۔ نہ مدرس خود غور و تامل سے کام لیتا ہے، نہ طلبہ کو اس طرف مایل کیا جاتا ہے گویا قرآن سے پہلے تفاسیر پر ایمان لے آنا ضروری ہوتا ہے اور چونکہ تفاسیر کا ماخذ بالعموم کتب احادیث ہیں جن میں کثرت سے موضوع روایات پائی جاتی ہیں، اس لئے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قرآن سمجھنے کی صحیح اہلیت طلبہ میں پیدا ہی نہیں ہوتی اور کورانہ تقلید اُن کی قوت فکر و اجتہاد کو یکسر محو کر دیتی ہے

عام طور پر مسلمانوں میں یہ غلط خیال پیدا ہو گیا ہے (جو یقیناً مولویوں ہی کی تعلیم کا نتیجہ ہے) کہ قرآن کو سمجھنا ہر شخص کا کام نہیں اور اسلاف جو کچھ بتا گئے ہیں اس سے انحراف کرنا قرآن و رسول سے منحرف ہو جانا ہے

یہ خیال خود قرآنی تعلیم کے منافی ہے، کیونکہ وہاں تو ہر جگہ ہر انسان کو غور و فکر تدبر و تامل کی تعلیم دی جاتی ہے۔ لیکن مولوی کہتا ہے کہ نہیں تفکر و تعقل کا دور گزر چکا اور اب ہمارے لئے چارۂ کار سوائے اس کے کچھ نہیں کہ جو کچھ ہمارے اسلاف لکھ گئے ہیں اُن پر آنکھ بند کر کے ایمان لے آیا جائے

اس تعلیم نے یہ نقصان پہونچایا کہ مسلمانوں میں ذہنی غلامی پوری طرح سرایت کر گئی اور وہ اس دورِ علم و حکمت میں ناکارۂ محض ہو کر رہ گئے

مولانا اسلم ملک کے اُن چند روشن خیال مولویوں میں سے ہیں، جو کورانہ تقلید کے مخالف ہیں اور قرآن میں غور و فکر کرنا ہر شخص کا فطری حق خیال کرتے ہیں،

اور اسی کو پیش نظر رکھ کر انھوں نے یہ کتاب مرتب کی ہے۔ اس جلد میں اللہ اور اس کے صفات، مخلوق، دین، رسالت، کتاب، اور معاد کے متعلق جو کھُلی ہوئی آیات قرآن میں پائی جاتی ہیں ان کو یکجا

کر دیا ہے اور اس اسلوب سے یکجا کیا ہے کہ ایک آیت خود دوسری آیت کی تفسیر کرتی ہے

ہر چند اعظم گڈھ کا قدامت پرست شبلی اسکول جس کی "سیرۃ نبوی" پر مولانا اسلم نے آزادانہ تنقید کر کے اس کے نقائص ظاہر کئے ہیں، اور مولویوں کی دوسری جماعتیں جو اسی کور ذہنیت کی مالک ہیں، مولانا اسلم کے اس اقدام کو پسند نہ کریں گی اور ممکن ہے کہ وہ اس کے خلاف کافی پروپاگنڈا کریں لیکن مولانا اسلم یاد رکریں کہ اُن کی اس خدمت کی قدر کرنے والے اب مُلک میں کافی پیدا ہو گئے ہیں اور انھیں اس تالیف کے دوسرے حصّوں کو بھی جلد از جلد مکمل کر دینا چاہئے

مہ نور می فشاند و سگ بانگ می زند

یہ کتاب نہایت اچھی طباعت و کتابت کے ساتھ ۲۲۸ صفحات پر شایع ہوئی ہے اور مولانا سے جامعہ ملّیہ قرول باغ دہلی کے پتہ پر دو روپیہ میں مل سکتی ہے

جنسی امراض اور ان کا علاج

یہ کتاب ڈاکٹر کرنل بھولاناتھ آئی۔ ام۔ اس۔ نے لکھی ہے اور تین حصّوں پر منقسم ہے۔ پہلا حصّہ تعلقات جنسی اور امراض و علاج سے متعلق ہے جسے خود کرنل صاحب نے لکھا ہے۔ دوسرا حصّہ حکیم مظفر حسین صاحب کا مرتب کیا ہے اور اس میں ویدک و یونانی نسخے درج کئے گئے ہیں۔ تیسرا حصّہ برتھ کنٹرول کے لئے وقف ہے۔ کتاب بہ حیثیت مجموعی مفید ہے اور بہت ایسی معلومات کی حامل ہے جن سے ہر شخص کو واقف ہونا چاہئے

اس دَور میں دیگر علوم و فنون کے ساتھ ساتھ "جنسیات" پر بھی خاص توجہ کی جا رہی ہے اور کوشش ہو رہی ہے کہ اس فن کی معلومات عام کر دی جائیں۔ اس لئے مُلک کو کرنل صاحب کا ممنون ہونا چاہئے کہ انھوں نے اُردو میں اپنے تجربات کو قلمبند کر کے عوام کو اُن کے سمجھنے کا موقعہ دیا

ڈاکٹر محمد اشرف الحق صاحب کے رسایل کے بعد یہ دوسری مستحسن کوشش ہے۔ جس کی قدر مُلک کو کرنا چاہئے

یہ کتاب تین روپیہ (عہ) میں کتب خانہ لُطف زندگی اعوان منزل لاہور سے مل سکتی ہے

اصغر گونڈوی کی شاعری

اس کے مؤلف کوئی صاحب سرکوب الہ آبادی ہیں اس تالیف کا مقصود یہ ثابت کرنا ہے کہ اصغر مطلقاً شعر کہنا نہیں جانتے اور جب ان کو چیلنج دیا گیا کہ وہ کسی صحبت میں سب کے سامنے کسی طرح پر غزل کہیں، وہ جان بچا گئے

ہر چند اس کتاب میں اصغر صاحب کے خلاف و موافق دونوں مضامین جمع کئے گئے ہیں۔ لیکن مؤلف نے نتیجہ یہی نکالا ہے کہ وہ فن شعر سے بالکل نابلد ہیں

اس نوع کی تالیفات میرے نزدیک سنجیدہ طبائع کو متاثر کرنے میں کبھی کامیاب نہیں ہوسکتیں، کیونکہ ان کا تعلق یکسر ذاتیات سے ہوتا ہے اور دیکھنے والا بہ اول نظر خراب رائے قائم کرنے پر مجبور ہوتا ہے

محض یہ امر کہ اصغر صاحب نے چیلنج کو قبول نہیں کیا، اس امر کا ثبوت نہیں کہ وہ شعر نہیں کہہ سکتے، اور ہر سنجیدہ شخص کو وہی طرزِ عمل اختیار کرنا چاہیئے تھا جو اصغر صاحب نے اختیار کیا۔ اگر اس کے بجائے اصغر کی شاعری پر تبصرہ کرکے اس کے نقائص کو ظاہر کیا جاتا۔ تو بھی خیر کوئی بات ہوتی، گو ایسی اہم وہ بھی نہیں —— معلوم نہیں اصغر صاحب اپنے شاعر ہونے پر فخر کرتے ہیں یا نہیں، لیکن میرے نزدیک ایک انسان کو سب سے پہلے اپنے انسان ہونے پر فخر کرنا چاہیئے

اگر اصغر صاحب اپنے اخلاق کے لحاظ سے صرف انسان ہیں اور شاعر نہیں تو بھی ان کے لئے یہی بس ہے اور شاعر نہ ہونا اُن کی عظمت کو کم نہیں کرسکتا

مجھے یہ کتاب دیکھ کر تکلیف ہوئی اور میں سرکوب صاحب کو مشورہ دوں گا کہ وہ آیندہ ایسی کوشش سے باز رہیں کیونکہ اصغر کو غیر شاعر ثابت کرنے کے سلسلہ میں اپنے حسنِ اخلاق کا جو نمونہ وہ پیش کررہے ہیں، وہ حد درجہ قابل نفرت ہے

یہ کتاب ۸ر میں مہدی علی خاں بک سیلر چوک الہ آباد سے مل سکتی ہے

بہار کی پکار

جناب سید فرید جعفری مچھلی شہری کا دوسرا افسانہ ہے جو علیحدہ رسالہ کی صورت میں شایع ہوا ہے۔ اس کہانی کا مقصود زلزلۂ بہار کی تباہیوں کے متعلق لوگوں میں جذبۂ ہمدردی پیدا کرنا ہے

فرید صاحب نے جس مقصد کے ساتھ یہ تصنیف پیش کی ہے وہ ہر آئینہ قابل قدر ہے اور چونکہ اس کی آمدنی زلزلہ فنڈ میں جائے گی اس لئے لوگوں کو قدر کرنی چاہیئے۔ قیمت درج نہیں ہے

ملنے کا پتہ سکرٹری بہار سنٹرل ریلیف کمیٹی پٹنہ ہے

رسالۂ معلومات

"افادیت" میں تجارت یقیناً شامل ہے، لیکن صرف تجارت تو افادیت کا مقصود واحد نہیں

اس نظریہ کو سامنے رکھ کر ملک کے موجودہ رسایل وجرائد پر نگاہ ڈالئے اور فیصلہ کیجئے۔ کہ ان سے انسانی زندگی کا کون سا مفاد متعلق ہے۔ یعنی کیا تجارت کے علاوہ کوئی اور مقصد ان کے سامنے ہے —— پھر تجارت تجارت میں بھی فرق ہے۔ امریکن وانگریزی مصنوعات کی مانگ چاہے کتنی ہی کم ہو۔ لیکن ان کی مضبوطی کا اعتراف ہر شخص کو کرنا پڑے گا۔ برخلاف اس کے کہ جاپان کا نام آتے ہی جنس کے ناکارہ، وناپائدار ہونے کی

طرف خود بہ خود خیال منتقل ہو جاتا ہے

بالکل یہی کیفیت ہمارے ملک کے رسایل کی ہے کہ وہ تجارت بھی کرتے ہیں تو بالکل جاپانی قسم کی کہ چیز بظاہر نہایت خوشنما و ارزاں ہے، لیکن اگر نقش و نگار مٹا دیجئے تو اندر سوائے ردی کاغذ اور بوسیدہ لکڑی کے اور کچھ ہاتھ نہ آئے گا

یہ وبا اول اول پنجاب سے شروع ہوئی۔ اور اب تمام ہندوستان اس میں مبتلا نظر آتا ہے ——

آپ کسی رسالہ کو اٹھا کر دیکھئے، سرورق نہایت خوشنما و رنگین ہوگا، تصویروں کی بھرمار ہوگی۔ غزلیں بھی ہوں گی فسانے و ڈرامے بھی نظر آئیں گے، ہنسنے ہنسانے والے مضامین بھی ہوں گے، لیکن آپ یہ چاہیں کہ ان کے مطالعہ کے بعد آپ کی معلومات میں کوئی اضافہ ہو یا کسی ذہنی و دماغی ترقی کی طرف خیال مایل ہو، تو آپ کو سخت مایوس ہونا پڑے گا

معارف اور سچ وغیرہ قدامت پرست مذہبی رسایل کا ذکر نہیں کہ وہ تو کولھو کا بیل ہیں۔ جن کے لئے آنکھ پر پٹی باندھ کر ایک ہی حلقہ میں چکر لگانا مقسوم ہو چکا ہے اس طرح نہ اُن رسائل کا ذکر ہے جو مذہب کے پردہ میں لغو و مہمل کتابوں کی تجارت کرنا چاہتے ہیں اور جو آپ کے دماغ کو سال بھر تک ادنیٰ قسم کا مذہبی لٹریچر سے تباہ کرنے کا معاوضہ بارہ آنے ایک روپیہ سے زیادہ نہیں لیتے، بلکہ افسوس تو اُن لوگوں پر ہے جو اپنے آپ کو روشن خیال و روشن دماغ کہتے ہیں اور پھر بھی اُن کے سامنے افادیت کا مفہوم ارزاں تجارت کے علاوہ کچھ نہیں ——

پنجاب میں اس وقت بعض رسایل ایک خاص مرتبہ و امتیاز کے مالک سمجھے جاتے ہیں۔ لیکن میں دیکھتا ہوں کہ ان کا عنصر غالب بھی افسانوں اور غزلوں کے سوا کچھ نہیں ہوتا، درانحالیکہ ان کے مالک ایسے ہیں جن کو کوئی مادّی فائدہ اٹھانا مقصود نہیں ہے۔ اور اگر وہ چاہتے تو اپنے رسائل کو اقتصاد و سیاست اور معیشت و معاشرت کے اُن مسایل کے لئے وقف کر سکتے ہیں جن کی تعلیم و اشاعت کی اس وقت سخت ضرورت ہے۔ البتہ اگر دہلی پنجاب میں شامل سمجھا جائے تو رسالہ جامعہ کو مستثنیٰ سمجھنا پڑے گا، جو واقعی صحیح معنے میں ملک و قوم کی برمحل خدمت انجام دے رہا ہے

یو۔پی کے رسایل اس سے زیادہ بدبختی میں مبتلا ہیں کہ اُن کو تجارت کا بھی سلیقہ نہیں اور کجن و زبیدہ کی تصویریں شایع کرنے کے بعد بھی خریداروں میں اضافہ نہیں کر سکتے۔ پھر اس کا سبب یہ نہیں کہ مفید چیز کی مانگ نہیں ہے بلکہ وجہ صرف یہ ہے کہ پہلے رسایل کی ترتیب پڑھے لکھے لوگوں کے ہاتھ میں تھی اور اب ہر وہ شخص جو ایک بورڈ کی قیمت ادا کر سکتا ہے اڈیٹر بنا ہوا ہے

البتہ اب سے ۸ سال قبل یہیں لکھنؤ سے اور رسالے صبح امید اور معلومات ایسے جاری تھے جو واقعی مفید تھے۔ صبح امید کے احیاء کی تو کوئی توقع نہیں، لیکن معلومات پھر جاری ہوا ہے

اس کے اڈیٹر مسٹر عبد الوالی۔ بی۔ اے نہایت روشن خیال اور وسیع المطالعہ انسان ہیں اور اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ ملک و قوم کے سامنے کس قسم کا لٹریچر پیش کرنے کی ضرورت ہے، چنانچہ مارچ و اپریل کے رسالوں میں انھوں نے بعض بین الاقوامی مسایل پر نہایت مفید و جامع مضامین لکھے ہیں اور ایسی صاف و شگفتہ زبان میں کہ پڑھنے والے کے دماغ پر کوئی بار نہیں ہوتا

ہرچند افراد قوم جو ادنیٰ درجہ کا ارزاں لٹریچر اور صرف نقش و رنگ دیکھنے کے عادی ہو گئے ہیں اس طرف جلد متوجہ نہ ہوں گے۔ لیکن عبد الوالی صاحب کو مطمئن رہنا چاہیئے ایک وقت آئے گا جب ان کے مساعی کی قدر کی جائے گی۔ اور اگر یہ نہ ہو تو بھی ان کے اطمینان ضمیر کے لئے یہ کیا کم ہے کہ انھوں نے پبلک کے ذوق کو خراب کرنے میں کوئی حصہ نہیں لیا

شہوانیات یا ترغیبات جنسی

حضرت نیاز کے قلم سے

جس میں فحاشی کی تمام فطری و غیر فطری قسموں کے حالات، اور اُن کی تاریخی و نفسیاتی اہمیت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اس میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ مذاہب عالم نے اس کے رواج میں کتنی مدد کی اور آیندہ اخلاق انسانی کی بنیاد کن اصول پر قایم ہونا ہے۔ الغرض اپنی نوعیت کے لحاظ سے یہ کتاب بالکل نئی چیز ہے اور ایک بار شروع کرنے کے بعد بغیر ختم کئے ہوئے آپ اسے چھوڑ نہیں سکتے۔ اس کتاب میں ایسے ایسے حیرت انگیز واقعات درج ہیں کہ آپ نے کبھی سنے نہ ہوں گے۔ اگر آپ نگار کے خریدار ہیں تو علاوہ محصول ۸ر کے مجلد کتاب صرف ۱۲ر میں۔ اور غیر مجلد عار میں ملے گی اور اگر آپ نگار کے خریدار نہیں ہیں تو مجلد عہ میں اور غیر مجلد عہ میں علاوہ محصول ۸ر کے ملے گی

اگر

ارشاد ہو تو کتاب ذریعۂ وی۔ پی روانہ کی جائے حجم ۲۷۵ صفحات۔ آرڈر میں مجلد و غیر مجلد کی صراحت ضروری ہے

منیجر نگار لکھنؤ

باب المراسلۃ والمناظرۃ

دعوائے مہدویت

(جناب سید محمد مہدی صاحب۔ الہ آباد)

میں شروع سے نگار کا مطالعہ کر رہا ہوں اور جو تدریجی انقلاب آپ کے خیالات میں ہوا ہے وہ پوری تفصیل کے ساتھ میرے سامنے ہے۔ پھر اس دوران میں کئی بار آپ کی تحریر نے وہ رنگ اختیار کیا کہ اس کے بعد سوائے اعلانِ مہدویت کے کسی اور منزل کی گنجایش نہ تھی لیکن افسوس ہے کہ میرا یہ خیال غلط نکلا اور آپ پھر ٹال گئے۔

دو تین سال ہوئے جو ہنگامہ کفر و الحاد کا آپ کے خلاف ہوا تھا، اس کو دیکھتے ہوئے میں نے خیال کیا تھا کہ شاید نگار کی روش بدل جائے گی اور اس طرح میری وہ تمام توقعات ختم ہو جائیں گی جو آپ کی طرف سے میں نے قایم کی تھیں، لیکن میں دیکھتا ہوں کہ نگار کا مشن بدستور وہی قائم ہے بلکہ سچ پوچھئے تو اس ہنگامہ کے بعد آپ نے جو مضامین لکھے ہیں وہ بہت زیادہ سخت ہیں اور مذہب پر نہایت کاری ضرب لگانے والے ہیں۔ اس لیے صورتیں تمام وہی موجود ہیں اور کوئی وجہ نہیں کہ پنجاب تو اتنے متقد دبنی اس وقت تک پیش کر چکے۔ اور ہمارا یو۔ پی ایک مہدی آخر الزماں بھی نہ پیدا کر سکے۔ یہ بھی کر دیکھئے، شاید کوئی صورت فلاح و اصلاح کی پیدا ہو سکے

(نگار) آپ کے مشورہ کا شکریہ، لیکن میرے محترم دوست، شاید آپکو معلوم نہیں کہ جو آپ کا منتہائے نظر و خیال ہے، وہ میری پرواز کے لحاظ سے ننگِ پر و بال ہے، آپ کے نزدیک مہدی ہو جانا گویا اتنی بڑی بات ہے کہ اس کے لئے کوئی خاص دعوے و اہتمام درکار ہوتا ہے۔ اور اگر آپ کسی پر طعن کرنا چاہیں تو یہ نام لیکر اس خواہش کو پورا کر سکتے ہیں۔ کاش آپ سمجھ سکتے

کہ انسان مہدی و نبی سے بھی گزر کر خدا بننے کے لئے عالم وجود میں آیا ہے اور اگر آپ مجھے مشورہ دینے پر مجبور ہی تھے تو میرے دستِ گستاخ کو دامنِ الوہیت کی طرف بڑھنے کی دعوت دیتے، عرش و کرسی پر چھا جانے کا ایما فرماتے نہ کہ دعوائے مہدویت جو میرے حوصلہ و عزم کے لحاظ سے کہیں فروتر ہے

مجھے نہیں معلوم کہ آپ دجال و مہدی وغیرہ کے ظہور کے قایل ہیں یا نہیں، لیکن اگر آپ آل رسول ہونے کے لحاظ سے واقعی "امام مخفی" کی آمد کے منتظر ہیں تو کیا دیر ہے

بال بکشا دصفیر از شجر طوبےٰ زن

آئیے، اور اس دلِ خانہ خراب کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو جائیے - آپ کی توقعات تو کسی طرح پوری ہوں "امام منتظر" کے لئے آپ کی یہ اختر شماریاں تو کسی طرح ختم ہونے میں آئیں

میرے عزیز دوست، باور کیجئے کہ آپ حضرات، اخلاق کی جس منزل سے گزر رہے ہیں، وہ میرے نزدیک خدا اور مذہب دونوں کے لئے باعثِ توہین ہے —— اگر خدا اتنی مدت کے بعد بھی انسان بنانے میں کامیاب نہیں اور اس کا بتایا ہوا مذہب ہزاروں سال کی عمر پانے کے بعد بھی ہنوز تکمیل انسانیت کی راہیں متعین نہیں کر سکا تو ایسے خدا و مذہب کو لے کر ہم کیا کریں ——

کتنا اندھیر ہے کہ آپ اس روشن زمانہ میں بھی خدا اور نبی کی جستجو میں لگے ہوئے ہیں اور خود اپنی جستجو کی طرف سے غافل ہیں

سر روحانیاں داری و لے خود را ندیدستی
بخواب خود در آتا قبلۂ روحانیاں بینی

دار المصنفین اور سیرۃ نبوی

(جناب عبد الحمید صاحب - حیدر آباد)

کسی گزشتہ پرچے میں آپ نے دار المصنفین سیرت نبوی پر تنقید کی تھی میں نے اس کتاب کو منگا کر دیکھا تو آپ کی باتوں کی حرف بحرف تصدیق کرنی پڑی - قرآن تو کہتا ہے قل انما انا بشر مثلکم اور در حقیقت رسول اکرم کی عظمت کا راز یہی خالص بشریت ہے اور اسی قرآنی تعلیم نے مسلمانوں کو صحیح راستے پر قائم رکھا کہ انھوں نے اپنے اتنے بڑے رسول کو عیسائیوں کی طرح خدا نہیں بنایا لیکن سیرت

ان کو خدا بنانا چاہتی ہے اس کی چوتھی جلد کے صفحہ ۸۰ میں ہے کہ رسول اللہ مافوق البشر ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ قل لا اقول لکم انی ملک۔ پھر جب مافوق البشر ہیں اور فرشتہ ہونے سے انکار ہے تو سوائے الوہیت کے اور کیا صورت ہوگی۔ اس کے مؤلف کی قرآن دانی کا یہ حال ہے کہ اس میں صفحہ ۳۵ میں آیت ولا یشفعون الا لمن ارتضی کو جو ملائکہ کے متعلق ہے انبیاء کے شان میں قرار دیا ہے صفحہ ۱۰۳ میں آیت وما انزلنا علی قومہ من بعدہ من جند من السماء کا عجیب ترجمہ لکھا ہے کہ ہم نے اس کے مرنے کے بعد اس پیغام کو دے کر اس کی قوم پر آسمان سے کوئی فوج نہیں اُتاری وہ سمجھتا ہے کہ فوجوں کا کام پیغام لے کر جانا ہے۔ غرض اسی قسم کی قرآن سے ناواقفیت بلکہ عمیق جہالت اس کتاب میں نظر آتی ہے آپ حسب ذیل امور کا جواب ضرور لکھیں

(۱) دار المصنفین کا مالک کون ہے

(۲) اس میں کون کون لوگ کام کرتے ہیں اور ان کی علمی قابلیتیں کیا کیا ہیں

(۳) اس کو کن کن ریاستوں سے کتنی کتنی امداد ملتی ہے اور آج تک پبلک سے کس قدر چندہ لیا

(۴) کیا آپ کے خیال میں یہ جماعت کتابوں کی تجارتی کمپنی سے کچھ زیادہ حیثیت رکھتی ہے

(۵) یہ جماعت قدیم الخیال مولویوں کی نمائندہ ہے پھر اس کو کیا ترجیح دیوبند یا دیگر مدارس کے علماء پر حاصل ہے جس کی وجہ سے یہ امداد کی مستحق ہے اور اس کے پاس وہ کیا چیز ہے جو مسلمانوں کے سامنے پیش کرنا ضروری ہے

(نگار) آپ نے جس نوع کے اسقام و اغلاط کا ذکر کیا ہے اُن کی سیرۃ نبوی میں کمی نہیں آپ یا کوئی کہاں تک ڈھونڈھے گا۔ اور کب تک سر پیٹے گا ـــــ افسوس ہے کہ تاریخ اسلام میں یہی ایک چیز ایسی تھی جو دنیا کے سامنے پیش کرنے کی تھی۔ لیکن مولویوں نے اس کو بھی اس قابل نہ رکھا کہ خود اپنے ہی لوگ دیکھ سکیں، چہ جائیکہ اغیار! سچ تو یہ ہے کہ دار المصنفین کی سیرۃ نبوی سے بدرجہا بہتر بعض مستشرقین مغرب کی وہ تصانیف ہیں۔ جن میں کم از کم دس جگہ تو عقل و انصاف سے کام لیا گیا ہے، یہاں تو شروع ہی سے اس کا التزام رکھا گیا ہے کہ سوائے مسلمان کے کوئی اور اسے پڑھ نہ سکے۔ اور اگر پڑھے تو محمدؐ کو دیوتا یا علم الاصنام کا کوئی کیرکٹر سمجھ کر خاموش ہو جائے ـــــ پھر تماشہ یہ ہے کہ اس غلو کا نام محبت رسول رکھا جاتا ہے، سچ کہا ہے کسی نے کہ خدا مجھے میرے دوستوں سے بچائے آپ نے جو اور سوالات کئے ہیں۔ ان کا جواب آپ براہ راست دار المصنفین ہی سے طلب فرمائیں تو بہتر ہے

باب الاستفسار

کوثر

(جناب لطف الٰہی صاحب ۔ بنگلور)

قرآن میں لفظ کوثر سے کیا مراد ہے کیا واقعی وہ کوئی حوض یا چشمہ ہے جو جنت میں پایا جاتا ہے اور مسلمانوں کے لئے مخصوص ہے

(نگار) لفظ کوثر کلام مجید میں صرف ایک جگہ آیا ہے :۔

اِنا اعطیناک الکوثر یہاں لفظ کوثر بروزن "فوعل" "کثر" سے مشتق ہے اور خیر کثیر کے معنی میں آیا ہے ، یعنی ہم نے تجکو بہت سے برکات بخشے ہیں ۔ لیکن افسوس ہے کہ عام مفسرین نے اس حقیقی معنی کی طرف بالکل اعتنا نہیں کیا اور احادیث پر اعتماد کرکے کسی جگہ یہ ظاہر کیا گیا ہے ۔ کہ کوثر ایک نہر ہے فردوس کی اور کہیں یہ کہ رسول اللہ نے فرمایا کہ وہ پانی کا حوض ہے جو میرے لئے مخصوص ہے اور جو معراج کے وقت مجھکو دکھایا گیا

مکی سورتوں میں فردوس کی نہروں کا ذکر اجمال کے ساتھ اور مدنی سورتوں میں زیادہ تفصیل کے ساتھ پایا جاتا ہے :۔

مثل الجنتہ اللتی وعد المتقون ۔ فیہا انہار من ماء غیر آسن وانہار من لبن لم یتغیر طعمہ وانہار من خمر لذۃ للشاربین وانہار من عسل مصفی

یعنی ان میں پانی ، دودھ ، شراب اور شہد کی نہروں کا ہونا ظاہر کیا گیا ہے ——— عیسائی اور یہودی روایات میں بھی جنت کی نہروں کا ذکر پایا جاتا ہے اور سوائے اس کے کوئی فرق نہیں کہ وہاں دودھ اور شہد کے علاوہ تیل کی نہر کا بھی ذکر ہے اور مسلمانوں میں تیل کے بجائے پانی ہے

رسول اللہ کی حیات میں تو لفظ کوثر خیر کثیر ہی کے مفہوم میں لیا جاتا تھا لیکن آپ کے بعد وہ چشمۂ فردوس بن کر رہ گیا اور بقول طبری اس کا پانی برف سے زیادہ سفید اور شہد سے زیادہ شیریں ہے ـــــ پھر یہ بدعت اسی جگہ ختم نہیں ہو گئی بلکہ اس میں شاعرانہ مبالغہ سے کام لے کر یہ بھی بتایا گیا کہ اس نہر کے ساحل سونے کے ہیں اور اس کی تہ میں موتی اور لعل بچھے ہوئے ہیں ـــــ اسی کے ساتھ یہ جغرافی تحقیق بھی پیش کی گئی کہ جنت کی تمام نہریں اسی کوثر کے اندر آ کر گرتی ہیں جس کا دوسرا نام "نہر محمد" بھی ہے

قرآن میں جابجا فردوس کی عشرتوں اور جہنم کے مصائب کا ذکر پایا جاتا ہے۔ اور یقیناً وہ سب بیان تشبیہی و تمثیلی ہے جس کو مادی صورت سے کوئی واسطہ نہیں، لیکن ہمارے مفسرین نے جنکے لئے موضوع احادیث کی کوئی کمی نہ تھی ان تمام باتوں کو دنیاوی لذت والم کا مفہوم سامنے رکھ کر پیش کیا اور اس طرح ایک بڑا دفتر "صنمیات" کا مرتب ہو گیا ـــــ انھوں نے ایسا کیوں کیا۔ اس کے دو ہی سبب ہو سکتے ہیں، یا تو وہ خود حقیقتاً ان تمام باتوں کو صحیح باور کرتے تھے یا یہ کہ صرف بربنائے مصلحت عوام کو ایسا سمجھاتے تھے تاکہ ان میں رغبت و شوق پیدا ہو مجھے اس کے ماننے میں تامل ہے کہ مقصود صرف ترغیب و تشویق تھی بلکہ وہ حقیقتاً جنت و دوزخ کو اسی مفہوم و معنی میں لیتے تھے جو یہود و نصاریٰ یا قدیم ایرانی روایات میں پایا جاتا ہے اور چونکہ اسرائیلی حکایات بیان کرنے کی ممانعت نہ تھی اس لئے رفتہ رفتہ تمام وہ قصے کہانیاں جو اُس وقت رائج تھیں اور جن کو وہ لوگ اکثر سنتے رہتے تھے، اسلام میں شامل کر دی گئیں اور موضوع احادیث کے ذریعہ سے ان کی توثیق بھی ہوتی رہی تاکہ لوگوں کو چون و چرا کا موقعہ نہ ملے

قرآن مجید میں دوزخ و جنت کے حقیقی مفہوم کو بھی جابجا ظاہر کیا گیا ہے۔ یعنی نہایت صاف الفاظ میں ان کو غیر مادی ظاہر کرتے ہوئے ان کا مفہوم قوم کا زوال و عروج بتایا گیا ہے، لیکن افسوس ہے کہ کلام مجید کو احادیث سے علیحدہ کر کے کبھی سامنے پیش نہیں کیا گیا۔ اور روایات موضوعہ سے ہٹ کر کبھی اس کا مطالعہ نہیں کیا گیا ورنہ یہ حقیقت واضح ہو سکتی

پھر تماشہ یہ ہے کہ یہ واہمہ پرستیاں کسی خاص زمانہ سے مخصوص نہ تھیں بلکہ تقریباً ہر دور میں پائی جاتی تھیں اور رفتہ رفتہ برابر ان میں اضافہ ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ خرافیات کا ایک انبار ہو گیا اور اسلام اس کے اندر ہمیشہ کے لئے دفن کر دیا گیا

اس سے قبل نگار کے صفحات میں دوزخ و جنت کے حقیقی مفہوم پر کافی بحث کر چکا ہوں اس لئے اعادہ و تکرار کی ضرورت نہیں اسے ملاحظہ فرمائیے

اگر آپ چاہتے ہیں

کہ آپ کی فرمائش کی تعمیل فوراً کر دی جائے تو نمبر خریداری ضرور لکھئے

مینیجر نگار

لکھنؤ کی ماعری

اے زبانِ لکھنؤ، اے لکھنؤ کی شاعری
اے سراپا تیرا آورد، اے تکلف کی پری

اے تصنع پر فدا، اے صنعتوں کی تاجدار
باغِ آب و رنگ میں کاغذ کے پھولوں کی بہار

کچھ تجھے معلوم ہے تو نے لیا کیونکر جنم
کچھ تجھے معلوم ہے تجھ میں ہوا کیا بیش و کم

یعنی دلّی جب جمالِ شعر کی دیوانہ تھی
شاعری سے سرزمینِ لکھنؤ بیگانہ تھی،

میں نہیں کہتا کہ اس جا کوئی آبادی نہ تھی
میں نہیں کہتا یہاں دریا نہ تھا، وادی نہ تھی

میں نہیں کہتا کہ اس جا صاحبِ دولت نہ تھے
میں نہیں کہتا کہ اس جا صاحبِ حشمت نہ تھے

میں نہیں کہتا کہ انساں اس جگہ ملتے نہ تھے
میں نہیں کہتا گل و غنچہ یہاں کھلتے نہ تھے

مالکِ سیف و قلم تھے صاحبِ ایجاد تھے،
دلبرانِ خوش ادا تھے عاشقِ ناشاد تھے

تھی یہی خاکی زمیں، اور تھا یہی چرخِ کبود
ہاں نہیں تھا، تو نہیں تھا شعر کا اس میں وجود

رمز دانانِ تخیل اس جگہ ملتے نہ تھے،
شعر کی تاثیر سے دل اس جگہ ہلتے نہ تھے

ناگہاں اتنے میں بدلا رنگ فیض آباد کا
لکھنؤ مسکن ہوا ہر صاحبِ ایجاد کا

اس طرف دلّی کی قسمت میں ہوا اک انقلاب
یعنی وہ ہنگامۂ عشرت ہوا ماضی کا خواب

ٹھوکریں کھاتے ہوئے پھرنے لگے اہلِ ہنر
گھر سے نکلے، شہر چھوڑا، خاک اڑائی در بدر

بینوا کچھ آ گئے اس جانب گدائی کے لئے
امن کے جویا تھے دفعِ بینوائی کے لئے

میرزا سودا بھی تھے ان بیکسوں میں میر بھی
جرأت و انشا بھی تھے اور سوز بھی اور مصحفی

اپنے اپنے رنگ میں کی شعر خوانی اس طرح
طائرانِ خوش نوا گلشن میں چہکیں جس طرح

جب بیاں کرتے تھے وہ فرقت کے حالاتِ زبوں
آتے تھے بیساختہ آنکھوں سے سب کے اشکِ خوں

جب وہ کہتے تھے کہ ہم نے یوں گذاری زندگی
بنتی تھی فوراً شبیہِ بے قراری، زندگی

گوشہ گوشہ ہو رہا تھا مستِ صہبائے سخن
بچہ بچہ بن گیا تھا بادہ پیمائے سخن،،

میر کی تخئیل نے دنیا کو حیراں کر دیا، سوز نے اک جوشش دنیا میں نمایاں کر دیا
مصحفی نے سیکھنے والوں کو جو تعلیم دی شعر خوانانِ ادب نے شوق سے تسلیم کی
وہ ضمیر خوش بیاں، وہ آتشِ رنگیں نوا وہ اسیر نکتہ داں، وہ غافلِ معنی سرا
ایک پر گیا ایسے ایسے سیکڑوں دیوانے تھے شمع گو تھی ایک، لیکن ہر طرف پروانے تھے
ایک اس کامل نے دنیا بھر کو کامل کر دیا، حلقۂ درس و ادب میں سب کو شامل کر دیا
دینِ شعر و شاعری یکسر مکمل ہو گیا، لکھنؤ جو کچھ نہ تھا دلّی سے افضل ہو گیا

دورِ نیرنگِ فلک نے اک نیا دکھلا دیا شاعروں میں یعنی اک ناسخ کو بھی پیدا کیا
کون ناسخ جس نے کر دی شاعری یکسر تباہ شعر کا دفتر کا دفتر کر دیا جس نے سیاہ
کون ناسخ جس کی ہے الفاظ پر نام و نمود کون ناسخ ہے تصنع جس کا سازِ ہست و بود
جس نے لفظوں سے بنایا اک گھروندا شعر کا، جس نے پائے خامہ سے میدان روندا شعر کا،
جس نے ایہام و تناسب کو بنایا راہ بر، جس نے تضیعِ ہنر کا نام رکھا تھا ہنر،
جس کو آتا ہی نہ تھا ہرگز تنافر کا خیال تھا نمایاں جس کے شعروں میں سراسر ابتذال
چنڈ کی آواز کو سمجھا جو آوازِ ہزار، جس کا مرغِ دل تھا دروازے کی بلی کا شکار
ماٹھ بگڑا شاعری کا اس کی سعئ تام سے نفرت آئی اہلِ دل کو شاعری کے نام سے
ہو گیا آخر اسی اک رنگ پر جب اجتماع آتش اور آتش کے شاگردوں نے بھی کی اتباع
انتہا یہ ہے کہ پیرو ہو گئے اس کے انیس جیسے وہ تھے ہو گئے ویسے ہی پھر ان کے جلیس
وہ انیسِ خوش بیاں جن کا جہاں میں نام ہے شاعری جنکی جہاں کے واسطے پیغام ہے
شاعری سے گو نہیں تھا ان کو کوئی واسطہ، کیونکہ داخل شعر میں ہرگز نہیں ہے مرثیہ
اس میں جو آہ و بکا ہے شعر میں داخل نہیں شعر ہے ظاہر میں لیکن شعر میں شامل نہیں
اور اگر ہم مان لیں اس کو کہ ہو وہ شاعری پھر بھی وہ رنگِ تغزل کی نہیں جلوہ گری
یہ مناظر صبح کے، یہ شامِ رنگیں کا بیاں اور یہ گھوڑے کی روانی صورتِ برقِ تپاں
تیزئ شمشیرِ بُراں، صورتِ جوششِ وغا ہونے کو سب کچھ ہیں، لیکن ہیں تغزل سے جدا
وہ تعشق، وہ صبا، وہ رند، وہ خوشگو امیر سب کے سب تھے ایک ہی دامِ تعلق میں اسیر
شعر کہنے کو تو لاکھوں ہیں مگر کچھ بھی نہیں نالۂ بیکار لاکھوں ہیں اثر کچھ بھی نہیں

ایک کے ہاتھوں سے ہے دامانِ سنبل تار تار — ایک کمسن قاتلوں میں ہو گیا جا کر شکار
ایک نے تو جا جنوں میں جا کے دامانِ سحر — ایک تربت پر ہوا مجنوں کی جا کر نوحہ گر
ایک نے ڈھونڈ ہی کمر لیکن کہیں پائی نہیں — ایک مفلس ہو گیا ہے گھر میں اک پائی نہیں
ایک کے ہاتھوں سے چھوٹا توسنِ عمرِ رواں — دوسرے نے نقدِ جاں دے کر کیا سودا گراں
ایک نے دشتِ جنوں میں خاک اڑائی عمر بھر — ایک نے سیلابِ گریہ سے بہایا اپنا گھر
قصہ کوتہ رنگِ دنیا بھر کا یکساں ہی رہا — شعر کا دفتر پریشاں تھا پریشاں ہی رہا
رفتہ رفتہ آگیا دنیا میں پھر دورِ صفیؔ — اُن کی شہرت مٹ گئی اور ان کی اب شہرت ہوئی
تھے معاصر انکے مرزا ثاقبؔ و آبر و بہار — فاضل و ثروتؔ، عزیزؔ نکتہ دانِ نامدار
باہمی کرتے تھے مِل مِل کر یہ ایجادِ سخن — محفلوں میں شعر کی دیتے رہے دادِ سخن
اوّل اوّل ان کا بھی لیکن قدیمی رنگ تھا — لکھنؤ کا بچہ بچہ جس کے اوپر دنگ تھا
نکتہ دانوں کے لئے وہ ایک سیدھی راہ تھی — جس میں کچھ کچھ آہ شامل اور کچھ کچھ واہ تھی
تھی وہی پھر بار دُور از عقل تشبیہات کی — تھی وہی گیسوئے جاناں میں سیاہی رات کی
تھا وہی بادام کی صورت میں آنکھوں کا ظہور — تھا وہی عارض کی رنگینی میں پنہاں نورِ طور
رفتہ رفتہ جب خرابی اس کی دکھلائی گئی — متفق ہو کر یہ اک تجویز ٹھہرائی گئی
چاہئے اب منعقد کرنا ہمیں اک انجمن — جس میں سب آپس کے شامل ہو کے دیں دادِ سخن
اب قدیمی رنگ میں لازم ہے کچھ قطع و برید — اب پُرانے عمر دوں کے آخر ہیں کب تک شہید
رنگ ناسخؔ کا نہیں ہے آجکل کچھ دلنشیں — جو پُرانے بت ہیں وہ قابل پرستش کے نہیں
جادۂ غالبؔ پہ رکھنا چاہئے، ہم کو قدم — اس سے ممکن ہے کہ پھر دنیا میں ہوں مشہور ہم
الغرض قائم ہوئی اس وقت بعدِ سعیِ تام — انجمن شعر و سخن کی جس کا تھا معیار نام
اک طرف ناطقؔ، صفیؔ، اور اک طرف محشرؔ عزیزؔ — اک طرف ابرؔ و بہارؔ و ثاقبؔ والا تمیز
اسمیں ثروتؔ بھی تھے، عالمؔ بھی تھے اور فاضلؔ بھی تھے — ماسوا ان ہستیوں کے اور اہلِ دل بھی تھے
مل کے ان سب نے کیا تبدیل رنگِ شاعری — یعنی ٹھہری مرثیہ کے ساتھ جنگ شاعری
جب نہ ان سے ہو سکے مضمونِ غالبؔ سے بہم — آخرش سب نے اٹھایا اِل کے نوحہ پر قلم
جانکنی کے سب کے سب ساماں بہم ہونے لگے — رفتہ رفتہ موت کے مضموں رقم ہونے لگے
ایک کی اینٹھی رگیں یعنی تشنج ہو گیا — ایک کا منہ پھر پھرایا اور تبسم ہو گیا

ایک کو یرقانِ اصفر کی شکایت ہو گئی ایک روئے اسقدر بہ شدت سے لقوت ہو گئی

اُس نے گورستاں میں مُردوں سے کیا جاکر کلام موت کی ہچکی سے آیا دوست کا اس کو پیام

الغرض اس وقت سے یہ رنگ جاری ہو گیا خون بن بن کر رگ و پے میں یہ ساری ہو گیا

آجتک سب اہل دل ہیں اس بلا میں مبتلا شاعری کا واہ کیا اچھا ملا ان کو صلا

وہ سراجِ نکتہ داں، اور وہ قدیرِ ذی ہنر آرزو و منظر و آشفتہ، و الا گہر،

سب اسیر رنگ و بوئے باغ پیشینہ ہوئے سب قتیلِ خنجرِ معشوقِ دیرینہ ہوئے

آجتک ان کا وہی ہے تار و پود شاعری

شاعری کیوں کہیئے اس کو بلکہ کہیئے "ماعری"

ہوش (ملیح آبادی)

صرف پچپن روپیہ

یا

پانچ روپیہ ماہوار

میرے والد کا حال ہی میں انتقال ہو گیا ہے اور میں مجبور ہوں کہ کسب معاش کے لئے خود ہاتھ پاؤں ہلاؤں —— میں نے الہ آباد کے زنانہ نارمل اسکول میں داخلہ کا انتظام کر لیا ہے جس کا سشن یکم جولائی سے شروع ہوتا ہے اور گیارہ مہینے میں ختم ہو جاتا ہے

میں اپنے بے شمار بھائیوں اور بہنوں سے اپیل کرتی ہوں کہ یا تو گیارہ ماہ کے لئے ایک مشت ۵۵ کی امداد فرمادیں یا پانچ روپیہ ماہوار کا وظیفہ مرحمت فرمادیں

میں وعدہ کرتی ہوں کہ ملازمت کے بعد جس کا ملنا یقینی ہے۔ بہت جلد اس رقم کو واپس کر دوں گی

الف۔ جیم۔ ذریعہ دفتر نگار۔ لکھنؤ

کلام اختر

ہیں وہی صبر آزما بے سرو سامانیاں
مٹ نہ سکیں عمر بھر میری پریشانیاں

طائرِ مجروح ہوں، میرے لئے وقف ہیں
روح کی بیچینیاں، دل کی پرافشانیاں

نزع کی طاری ہے گو مستقل اک کیفیت
سانس نہیں ٹوٹتا، اُف رے گرانجانیاں

درد دوا ہو گیا عشق میں بپایانِ کار
راز سکوں بن گئیں، غم کی فراوانیاں

میری نظر میں نہاں روح کی افسردگی
میری جبیں پر عیاں قلب کی ویرانیاں

کاش کبھی پا سکیں رازِ مئے بیخودی
عقل کی بے راہیاں، ہوش کی نادانیاں

ڈوب چلی نبضِ دل، درد نہ کم ہو سکا
آج بھی اشکوں کی ہیں، ویسی ہی طغیانیاں

دل ہے ترا آئینہ، دل سے نگاہوں کو ربط
تیری تمنا کا راز ہیں مری حیرانیاں

اختر ناکام ہے اور وہی، ہمت شکن
درد کی جانکاہیاں، غم کی فراوانیاں

میری مشکل نہ ہوئی دہر میں آساں کوئی
نہ ملا آہ، مرے درد کا درماں کوئی

سوچتا ہوں کہ بایں غفلت و مجبوری و یاس
زندگی ہے مری یا خوابِ پریشاں کوئی

اور کس کام کے ہیں قلب و جگر کے ٹکڑے
زیبِ داماں ہو کوئی، زینتِ مژگاں کوئی

جان کیوں تن سے نکلتے ہوئے گھبراتی ہے
عیشِ سرمد تو نہیں، عمرِ گریزاں کوئی

لاکھ لبریز مئے رنگ ہو مینائے بہار!
دل میں بجھتا ہے شرارِ غمِ پنہاں کوئی

ٹوٹتے ہیں کہیں بے مے بھی حجاباتِ نظر
مل چکا شیخ! تجھے رتبۂ عرفاں کوئی

الاماں سوزِ محبت کہ یہ عالم کب تک!
جیسے ہو دل میں نہاں شعلۂ لرزاں کوئی

وقت پر آنہ سکے، اور جب آسکے نہ رُکے
زندگانی پہ نہیں موت کا احساں کوئی

میں رہا صرفِ شبِ وادیٔ وحشت اختر
میرے عالم میں نہ تھی صبحِ گلستاں کوئی

اختر (حیدرآباد دکن)

اشکِ بیتاب

جب پسِ کہسار چھپ جاتا ہے مہرِ تیز گام — اور سنہری بال بکھرائے ہوئے آتی ہے شام
چھیڑتی ہے جب الم کے گیت جوئے خوش خرام — آہ! ان محروم آنکھوں سے ٹپک جاتے ہیں اشک

جب سرورِ خواب میں مدہوش ہو جاتا ہے دہر — جب ردائے سیم کے دامن میں سو جاتا ہے دہر
جب سکوت و خامشی کی لے میں کھو جاتا ہے دہر — آہ! ان محروم آنکھوں سے ٹپک جاتے ہیں اشک

چاندنی میں گونجتے ہیں جب حدی خوانوں کے گیت — رات کے یا آخری حصے میں دہقانوں کے گیت
بیخودی میں جبکہ سنتا ہوں دیوانوں کے گیت — آہ! ان محروم آنکھوں سے ٹپک جاتے ہیں اشک

جب فضائے آسماں پر گھر کے آتے ہیں سحاب — بجلیوں کی کوند میں ہوتا ہے پیہم اضطراب
یاد آتے ہو مجھے تم اور وہ عہدِ شباب — آہ! ان محروم آنکھوں سے ٹپک جاتے ہیں اشک

آم کا وہ پیڑ جو ہے برلبِ آبِ رواں — بچپنے میں کھیلتے رہتے تھے پہروں تک جہاں
رات کو جب چاندنی میں جھانکتا ہوں وہاں — آہ! ان محروم آنکھوں سے ٹپک جاتے ہیں اشک

شیدا

صدائے دل

مآلِ عشق کی ناکامیوں میں محو ہوں گم ہوں
کہ میں سازِ شکستِ آرزو کا اک ترنم ہوں
مجھے اب قید و بندِ زندگی سے واسطہ کیا ہو
ہوئی مدت کہ اپنی روح سے محوِ تکلم ہوں

حجابِ تیرگی کچھ اس طرح اٹھا مرے دل سے
اُجالا دفعتاً پیدا ہو جیسے ماہِ کامل سے
حقیقت کی تجلی نے کیا ہے روح کو روشن
مری ہستی نظر آتی ہے آگے حدِ باطل سے
فریبِ زندگی سے اب مجھے نسبت نہیں کوئی
نکل آیا ہوں آگے ہستیٔ فانی کی منزل سے

حقیقت کی طلب کرتی رہی بیجد حزیں مجھکو
ملی تسکیں کہیں مجھکو، نہ چین آیا کہیں مجھکو
حیات و موت کی تھی کشمکش اور روح گریاں تھی
حقیقت خود ہی آئی دیکھ کر اندوہگیں مجھکو
اب اپنی روح سے اکثر کیا کرتا ہوں یوں باتیں
کہ جیسے ہستیٔ فانی سے مطلب ہی نہیں مجھکو

نبی احمد دبریلوی

مطالبات

نگاہِ محبت فزا چاہتا ہوں
مسافر ہوں اک رہنما چاہتا ہوں
تجلّی نظر آشنا چاہتا ہوں
تجھے جلوہ گر دیکھنا چاہتا ہوں
ابھی خام ہے کچھ، مذاقِ تمنا
کہ پیمانۂ صبر آزما چاہتا ہوں
مجھے کوئی کافر مسلمان کر دے
مجازِ حقیقت ادا چاہتا ہوں
دلا دے کوئی یاد، بھولا ہوں کسکو
بتا دے کوئی، ہائے کیا چاہتا ہوں
خریدار ہے کون دنیا میں دل کا
کہاں اور کیا بیچنا چاہتا ہوں
خطا پر ندامت خطا در خطا ہے
خطا کر کے دادِ خطا چاہتا ہوں
کیا ہے محبت نے گستاخ کتنا
کہ تجھ سے تجھے مانگنا چاہتا ہوں
ہوس چاہتی ہے تجلّیٔ عریاں
مگر میں نگاہِ رسا چاہتا ہوں
جو قیدِ مجاز و حقیقت اٹھا دے
وہ کیفیتِ دل کشا چاہتا ہوں
تمنائے دل اور محدود! کوکب
مقام ورا، الورا چاہتا ہوں

کوکب (شاہجہانپوری)

آیندہ جنوری ۳۵ء کے رسالہ نگار کیلئے

مخصوص علمی و ادبی دعوت

مکرمی - تسلیم -

یہ حقیقت غالباً جناب سے مخفی نہ ہوگی کہ گزشتہ چند سال سے نگار کا جنوری نمبر کسی نہ کسی مخصوص موضوع کے لئے وقف ہوتا ہے چنانچہ اسوقت تک مومن نمبر ظفر نمبر اور غالب نمبر شایع ہو کر ملک میں کافی مقبول ہو چکے ہیں جنوری ۱۹۳۵ء کے نگار کو میں لکھنؤ اور دلی کی شاعری کی تنقید کے لئے وقف کرنا چاہتا ہوں - اور متمنی ہوں کہ آپ بھی تھوڑا سا وقت نکالکر اس خدمت میں میری اعانت فرمائیے - اور اگر زحمت نہ ہو تو ابھی سے مطلع فرما دیجئے - کہ آپ کس موضوع پر اپنا مقالہ عنایت فرمائیں گے - اسی کے ساتھ یہ بھی استدعا ہے کہ اپنے افکار عالیہ کے ہمراہ اپنا فوٹو (یا بلاک اگر ہو تو وہ) مرحمت فرمائیں تاکہ مقالہ کے ساتھ وہ بھی شایع کیا جائے - آپ کے ایماء کے بعد آپ کا اسم گرامی عام اطلاع کے لئے نگار میں شایع کر دیا جائے گا

ذیل میں مختلف مباحث کی فہرست آپ کو نظر آئے گی، لیکن اگر موضوع سے متعلق آپ کسی اور مسئلہ پر تحریر فرمانا چاہیں تو آپ کو اختیار کلی حاصل ہے، لیکن بہتر ہو اگر عنوان سے آپ آگاہ فرما دیں — یہ ضروری نہیں کہ مضمون طویل ہو، لیکن جتنا ہو آپکے بہترین لمحات فرصت کا نتیجہ فکر ہونا چاہیے

خاکسار

نیاز فتحپوری

عنوانات جن پر مقالے درکار ہیں

(۱) دہلی اور لکھنؤ اسکول کی شاعری پر مؤرخانہ نظر اور انکی خصوصیات
(۲) دونوں اسکولوں کے اکابر اور ان کا فرق مدارج
(۳) فن اور زبان کی حیثیت سے دونوں کا مرتبہ
(۴) لکھنؤ اسکول پر دہلی کا اثر
(۵) دہلی اسکول پر لکھنؤ کا اثر
(۶) دونوں اسکولوں کی غزلگوئی پر تفصیلی تبصرہ
(۷) لکھنؤ اسکول کے تین بہترین شاعروں کے ۲۰، ۲۰ شعر
(۸) دہلی اسکول کے تین بہترین شاعروں کے ۲۰، ۲۰ شعر
(۹) منظوم افسانے یا مثنوی لکھنؤ اسکول میں
(۱۰) منظوم افسانے یا مثنوی دہلی اسکول میں
(۱۱) دکن اور اُردو شاعری (اسوقت تک تمام ادوار پر تبصرہ)
(۱۲) پنجاب اور اُردو شاعری (اسوقت تک تمام ادوار پر تبصرہ)
(۱۳) تذکرہ نگاری کی حیثیت سے لکھنؤ اور دہلی کے خدمات
(۱۴) دونوں اسکولوں کے کارنامے، رباعیات، مرثیہ، قصیدہ و نعت میں
(۱۵) دولت مغلیہ کے انحطاط کا اثر دہلی کی شاعری پر
(۱۶) شاہان اودھ اور لکھنوی شاعری
(۱۷) دہلی اور لکھنوی شاعری میں اخلاقی و مذہبی عنصر
(۱۸) شاعری۔ لحاظ سے لکھنؤ کا دور زریں
(۱۹) شاعری کے لحاظ سے دہلی کا دور زریں
(۲۰) لکھنؤ اسکول کا سب سے پہلا شاعر جسنے دہلی کا تتبع کیا
(۲۱) دہلی اسکول کا سب سے پہلا شاعر جس نے لکھنؤ کا تتبع کیا
(۲۲) لکھنؤ اور دہلی کے وہ شعرا جنھوں نے ملک قوم کو کوئی خاص پیغام پہنچایا
(۲۳) کیا دہلی اسکول روبہ انحطاط ہے اور کیوں
(۲۴) کیا لکھنؤ اسکول روبہ انحطاط ہے؟ اور کیوں
(۲۵) رام پور کا تعلق دہلی اور لکھنؤ اسکولوں سے
(۲۶) حیدر آباد اور لکھنؤ و دہلی اسکول کا اس سے تعلق
(۲۷) کیا لکھنؤ اسکول نے کلکتہ میں بھی شاعری کو متاثر کیا؟
(۲۸) کیا لکھنؤ اسکول میں اصلاح کی ضرورت ہے؟ اگر ہے تو کیا
(۲۹) کیا دہلی اسکول میں اصلاح کی ضرورت ہے؟ اگر ہے تو کیا
(۳۰) مستقبل میں آپ کو اُردو شاعری سے کیا توقعات ہیں؟
(۳۱) دونوں اسکولوں کے وہ شعرا جنھوں نے قدامت کو ترک کر کے کسی ابداع و اختراع سے کام لیا
(۳۲) لکھنؤ اور دہلی کے ریختی اور ہزل گو
(۳۳) لکھنؤ اور دہلی کی خواتین جنھوں نے شاعری میں نمایاں حصہ لیا
(۳۴) لکھنؤ اسکول کے مختلف ادوار اور ہر دور کے بہترین شاعر
(۳۵) دہلی اسکول کے مختلف ادوار اور ہر دور کے بہترین شاعر
(۳۶) آگرہ اور دہلی کا شاعرانہ تعلق

نوٹ:۔ لکھنؤ اور دہلی کی شاعری سے مراد وہ تمام شعرا ہیں۔ جو یہاں کی شاعری سے متاثر ہو کر اسی رنگ میں شعر کہتے ہیں اس کے لئے کسی خاص جگہ کا باشندہ ہونے کی شرط نہیں ہے

خواتین کے مطالعہ کی کتابیں

- گودڑ کا لال ۱۲ر
- شوکت آرا بیگم حصہ اول ۳ ہے
- ٫ حصہ سوم ہے
- سعیدہ کے خطوط عمر
- پیاری سہیلی ۱۰ر
- نئی نویلی پیاری سہیلی ۱۴ر
- عورتوں کی انشاء عمر
- انشاء نسواں ۸ر
- سیرۃ الکبریٰ ۱۲ر
- طرز زندگی حصہ اول و ۲ ۱۲ر
- محمدات تیموریہ ۱۲ر
- ازواج النبی ۱۲ر
- ازواج الانبیا ۱۲ر
- سیرۃ عائشہ صدیقہ ۱۲ر
- عفت المسلمات ۱۲ر
- سبیل الجنان ۱۴ر
- بچوں کی پرورش ۶ر
- حرز اطفال عمر
- تہذیب نسواں ۱۲ر
- بیوی کی تعلیم ۱۴ر
- بیوی کی تربیت عمر
- تربیت اطفال ۱۲ر
- فرائض مادری ۱۲ر
- افسانہ نادر جہاں ۱۲ر
- اقبال دولہن ۱۲ر
- حسن معاشرت ۱۲ر
- ایامیٰ ۱۲ر
- سولہ کہانیاں ۱۲ر
- سترہ کہانیاں ۱۲ر
- سو قصے ۸ر
- مرأۃ العروس ۸ر
- بنات النعش ۸ر
- توبۃ النصوح ۱۲ر
- کنیز فاطمہ ۸ر
- پنگھٹ پاپ ۸ر
- نصیحت کا کرن پھول ۸ر
- برکات سلطانی ۸ر
- ابن الوقت ۱۲ر
- چند پند ۴ر
- منتخب الحکایات ۴ر
- تندرستی عمر
- حفظ صحت عمر
- طبیب نسواں ۱۲ر
- رہبر صحت ۸ر

ناول، ڈرامے اور افسانے

- قطرات اشک ۱۲ر
- جتندر ناتھ عمر
- بس کا روکھ عمر
- فسانۂ سعید ۸ر
- خوفناک ڈکیتی ۱۴ر
- سیلاب اشک تصویر ۱۴ر
- بے زبان دوست ۶ر
- جمال ہم نشیں عمر
- تفسیر عصمت عمر
- جوہر قدامت ۱۲ر
- تائید غیبی ۸ر
- پراسرار قتل ۱۲ر
- اعلان آزادی ۵ر
- سرگزشت ہاجرہ ۱۰ر
- نوحۂ زندگی ۱۲ر
- قلب حزیں ۸ر
- عروس کربلا ۱۲ر
- شہید مغرب عمر
- ماہ عجم ۱۴ر
- تیغ کمال ۱۲ر
- سراب مغرب ۸ر
- منازل السائرہ کامل ۱۲ر
- سوتنی ۱۲ر
- وداع ظفر ۱۲ر
- یاسمین شام ۱۲ر
- طوفان اشک عمر
- شاہین و دراج ۸ر
- درس عشق ۱۲ر
- گرو دیتی چوہ ۱۴ر
- تین بندوق باز ۱۲ر
- گرنیوہ رقابت ۸ر
- انقلاب قسطنطنیہ ۸ر
- شاہد رعنا ۱۲ر
- دیڈیا کی سرگزشت ۴ر
- شگوفۂ محبت ۷ر
- نسوانی زندگی ۸ر
- ولایتی ننھی ۸ر
- شمع خاموش ۸ر
- شب زندگی کامل ۱۲ر
- مو دودہ ۸ر
- چندر کلا ۸ر
- گلستان خاتون ۱۴ر
- صبح زندگی ۱۲ر
- شام زندگی عمر

تاریخ و سوانح عمریاں

- تاریخ مغرب ۱۲ر
- مختصر تاریخ اسلامی ۸ر
- ٫ ٫ حصہ ۲ ۹ر
- ٫ ٫ حصہ ۳ ۱۰ر
- ٫ ٫ حصہ ۴ عمر
- الصالحات ۱۲ر
- امت کی مائیں عمر
- الزہرا ۱۲ر
- اسوۂ حسنہ ۸ر
- ہندو شعراء ۱۴ر
- شوق بہار ۱۲ر
- سوانح اکبر الہ آبادی عمر
- سفرنامہ عراق عمر
- تاریخ اقاعنہ ۱۲ر
- اسلام اور غیر مسلم ۸ر
- سیر المصنفین حصہ ۱ ۱۲ر
- ٫ ٫ حصہ ۲ ہے
- تاریخ اسلام ۵ جلد صہ
- اخبار الاندلس ۳ جلد ۱۲ر
- خلافت موحدین عمر
- خلافت مولدین ۱۲ر
- عرب اور اسکا مستقبل ۱۲ر

لغات و ادب

- بازاری زبان ۸ر
- لغات سعیدی عمر
- لغات کشوری ہے
- گنجینۂ تحقیق مجلد عمر
- منتخب اللغات فارسی ۱۲ر
- محاورات نسواں ۸ر
- جواہر اللغات ۱۲ر
- گوہر اللغات ۱۲ر
- چراغ سخن عمر
- دکھنی لغت ۸ر
- جواہرات کلیات نظیر ۱۲ر
- عزیز اللغات ۱۲ر
- تذکرۂ ریختی عمر
- تاریخ اردوئے قدیم ۱۲ر
- دکن میں اردو ۱۲ر
- منتخب کلام ہندی ۱۲ر
- رباعیات عمر خیام ۱۲ر
- منتخب کلام ہندی ۱۲ر
- اردو کے اسالیب بیان ۱۲ر
- تصریح الاغلاط ۴ر
- ملخص اردو ۵ر
- نور اللغات ۴ جلد للعہ

دواوین فارسی

- دیوان شمس تبریز ۱۲ر
- کلیات عراقی ۱۲ر
- دیوان حافظ ۱۲ر
- دیوان بیدل ۱۲ر
- دیوان عرفی ۱۲ر
- کلیات جامی ۱۲ر
- کلیات غالب ۱۲ر
- کلیات صائب ۱۲ر
- دیوان ناصر علی ۶ر
- کلیات سعدی ۱۲ر
- کلیات حزیں ۱۲ر
- دیوان عنصری ۱۴ر
- دیوان غنی کشمیری ۶ر
- دیوان ہلالی ۶ر
- اسرار خودی و رموز بے خودی ہے
- زبور عجم ہے
- پیام مشرق ہے
- قصائد عرفی مجلد ہے

دواوین اردو

- کلیات ظفر ۱۲ر
- کلیات مومن ۱۴ر
- دیوان ناسخ ۱۴ر
- کلیات میر ۱۲ر
- کلیات سودا ۱۲ر
- کلیات انشاء ۱۲ر
- کلیات نظیر اکبرآبادی عمر
- گلزار داغ ۱۴ر
- دیوان زہد ۱۲ر
- دیوان ذوق ۱۲ر
- گلکدۂ عزیز عہ ۱۲ر
- مرأۃ الغیب عہ
- صنم خانۂ عشق ۱۲ر
- فریاد داغ ۱۴ر
- عالم خیال باتصویر عہ
- دیوان شہیدی ۴ر
- کلیات اکبر الہ آبادی للعہ
- نمونۂ دل شاہجہانپوری ۱۲ر

رجسٹرڈ نمبر اے ۱۱۰۴

ذیل کی کتابیں نگار بک ایجنسی سے طلب فرمائیے

رجسٹرڈ نمبر اے ۱۱۰۴

تذکرہ و تاریخ

پیغمبر اعظم ۸ر
شب معراج عہ ر
سراج منیر عہ ر
پیغمبر عالم ۸ر
سوانح حضرت رسول عہ ر
سید المرسلین ۸ر
حیدر کرار ۸ر
سیرۃ الصدیق عار
عمر ابن خطاب ۸ر
ابوبکر صدیق عہ ر
ائمہ اسلام ۱۲ر
الحبیب عار
عمر بن عبد العزیز ۸ر
دولت نادر و تیمور عار
مکمل سوانح زیب النسا بیگم عہ ر
تذکرہ اولیا عار
تذکرہ اولیائے ہند للعہ
مراۃ المومنین ۸ر
قصص الانبیا مکمل ۱۲ر
سفرنامہ چین عار
تلخیص التواریخ عہ ر
خاتون جنت ۸ر
تجارات الصوفیہ عہ ر
خواتین انگورہ عہ ر
مشاہیر نسواں عہ ر
مشاہیر ہند عار
مخدرات مجموعہ عار
بیگمات بنگال ۶ر

جاسوسی ناول

شرلاک ہومز عار
محاصرہ پیرس ۸ر
شیخ چلی ۴ر
بہرام کی واپسی ۴ر
انقلاب فرانس عہ ر
بحری قزاق عہ ر
فطرتی جاسوس ۸ر
ترکی حرم سرا ۸ر
جنگ طرابلس ۴ر
بہرام چور ۱۲ر
زر پرست ۱۲ر
گنجی کا راز ۸ر
عبد الرحمن ناصر عہ ر
عروس مصر عار
سیلاب خون ۸ر
سیاحت زمین ۸ر
سیاحت ہوا عہ ر
نازنین مراکش ۸ر
سمندر کی سیر عار
اسرار یا مشنریزم ۸ر
عروج بیلی ۔ ر
ہومن بیگ ۱۲ر
حجاج بن یوسف ۸ر
یوسف پاشا ۸ر
انقلاب عثمانی ۸ر
بہرام کی رہائی ۸ر
بہرام کی آزادی ۸ر
بہرام کی سرگزشت ۸ر

مراثی

مراثی دبیر عار
مراثی انیس کامل للعہ
مراثی ضمیر عہ ر
مراثی مونس ۱۲ر
مراثی دلگیر ۱۲ر

عجائب و غرائب

عجائب مخلوقات
تصویر رنگین ۔ } عہ ر
بلا تصویر سادہ للعہ
مجمع الفنون عار
طلسم فرنگ عار
کارخانۂ عالم عہ ر

رنالڈز کے ناولوں کے ترجمے

الدین دیلی ۸ر
فریب حسن عار
سوزن عشق ۸ر
روزا لیمبرٹ للعہ
ناول اسرار عار
شام جوانی ۱۲ر
حرم سرا ۔ ر

ناول سجاد حسین

احمق الذی ۸ر
حاجی بغلول ۸ر
پیاری دنیا ۸ر
کایا پلٹ ۸ر
میٹھی چھری ۶ر
طرحدار لونڈی عہ ر
طلسمی فانوس ۱۲ر

ناول جوالا پرشاد

مرنالنی ۱۰ر
مار آستین ۱۰ر
بنگالی دولہن ۱۲ر
معشوقۂ فرنگ ۸ر
پرتاب ۱۲ر
رومنی ۱۰ر

ناول سرشار

سیر کہسار ۔ ر
خدائی فوجدار عار
جام سرشار ۸ر
الف لیلہ بطرز ناول عہ ر
کامنی ۸ر
سوانح عمرو عیار ۸ر

ظفر عمر بی اے

چوروں کا کلب ۹ر
نیلی چھتری ۸ر
بہرام کی گرفتاری عہ ر

ادبی کتابیں

مکمل شرح دیوان غالب ۔ ر
بزم خیال عہ ر
مشاطۂ سخن عہ ر
مکاتیب محسن الملک ۸ر

تذکرۃ الشعراء

تذکرۂ حسینی ۱۲ر
گلشن بہار ۱۰ر
سراپائے سخن عہ ر
سوانح نظیر اکبر آبادی عار

ناول شرر

جنید بغدادی عہ ر
مخدرات ۸ر
ننجو یائے حق للعہ
لعبت چین عہ ر
فاتح و مفتوح ۸ر
ملک العزیز ورجنا ۸ر
ایام عرب عار
قیس و لبنیٰ ۸ر
یوسف و نجمہ ۸ر
زوال بغداد ۸ر
حسن کا ڈاکو ۸ر
دربار حرام پور ۱۰ر
مینا بازار عہ ر
مقدس نازنین ۸ر
رومتہ الکبریٰ ۸ر
فلپانا ۸ر
شوقین ملکہ ۸ر

مولانا شبلی نعمانی

سیرۃ النبی جلد اول عہ ر
" " دوم للعہ
" " سوم ۔ ر
الفاروق ۔ ر
الغزالی ۸ر
المامون ۸ر
رسائل شبلی ۸ر
موازنۂ انیس و دبیر ۔ ر

کلام شبلی اردو ۸ر
الکلام ۸ر
علم الکلام ۸ر
شعر العجم جلد اول عار
" دوم عار
" سوم عار
" چہارم ۸ر
" پنجم ۸ر

نگار بک ایجنسی لکھنؤ